

سرگرمی
کتاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کی سب سے بڑی
انٹرنیٹ کی ویب سائٹ
www.paksociety.com

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ستمبر 2014ء

کا ایک معرکہ الآرا
خاص نمبر



خط نمبر

خطائے اقل
انسانی تاریخ کی پہلی خطا، ایک سیر حاصل تحریر

خطائے سیاست
سیاست دانوں کی خطائیں جس نے نقش بدل دیا
سائنسی خطائیں

سائنس کی وہ خطائیں جنہیں سچ سمجھا جاتا تھا
فحش خطا

برصغیر کی اس لڑکی نے خطائی اور امریکا کی ریپسٹ انیم شخصیات متہم چھپائے زلیں
خطائے ہواباز

یونان کے ساتھ پوری دنیا میں ہلچل مچا دینے والی کتھا

گزشتہ تمام خاص

شماروں سے اہم شمارہ

لڑکی کی عداوت

بہت سی خطا کی حیرت انگیز، دلچسپ اور دہلا دینے والی
کتھائیں۔ سچ بیانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

نزدیکی بک اسٹال پر آج ہی اپنا شمارہ مختص کرائیں



ایک — بیسا در وطن
پرست کا زندگی نامہ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے شوق اور آپ کے سوال

ایک صفحہ میں کھلی، مختصر، مختصر
ایک ماوراءِ زمانہ کا تعارف



ہوا دم خورشیدیں
نے تبای مچا دی

14 یا 15 اگست ہمارا
یومِ آزادی کون سا ہے

پاک — افغان سرحد
پر جس کے تیلے کا تذکرہ



ہامیڈ کے گروہ میں
پہننے لوگوں کے لیے مشغلہ رہی

فلمی دنیا سے خدمت
اساں ہم کے سفر کی موداد

مستحقِ محبت کی کہانیاں
مستحقِ محبت کی باتیں یادیں



بند حوصلوں اور بے مثل دلوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

عیسوی مہینوں کے ایک دم
مہینے کا تذکرہ حساس

لی آئی اے کے ایک
ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

ماہِ محرمِ شریف میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق میچ و فصل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی لفظ اور لفظ کے لئے اس کے آئی جی جی
کی ہر صحت با کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ کو کوئی پارہ جہی کا حق نہ ملتا ہے۔
● تمام اشتہارات ٹیکسٹ کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس حوالے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔



بیت بازی

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

علمی آزمائش

ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی آستین کے لیے منفرد و نفاذی سلسلہ

آزادی راستہ

اس میں مصروف و شیراز کے پاس ایک ایسی راستہ چاہتا



مرزاواں

دور حاضر میں ایک نئی نادرانی سرزد ہوئی ہے

مجبور

محبتی بے کے جبر میں وہ حوالے میں پہنچ گیا

راز داں اپنا

راز داں اپنی رقیبہ روسیہ بن گیا



علاج

ڈاکٹر نے علاج کے لیے پڑوسریقہ و حوٹا

چھوٹا آدمی

وہشتی کے ہاتھوں کہیں سے کہاں پہنچ گیا

چھپا تم

ملک کے خلاف سازشیں سرٹن چرہا



بازی گر

لوگ ٹھٹھنے کے لیے کہے گئے ماسے نکال رہے ہیں

لوگرنگی

میاں جی کے چہرے سے ایک اور بچ بیانی

پاپے

دشمنی سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پاپے

قرآن حکیم کبر مفسر، اہتمام و ادارہ و نشر و توزیع کی ذمہ داری دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں، ان کا احترام و تکرار ہر فرض میں آتا جس سے صلوات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بن کر منہ سے صاف نکالیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

روحان المبارک کا مہینا اس بار عالم اسلام کوڑا لگنے آیا ہے۔ غزہ میں جس طرح انسانیت کی تڑکیل ہوئی، ظلم و ستم کا بازار گرم کیا گیا، جس طرح جنگیزیت کا مظاہرہ ہوا اور اس پر عالم اسلام کی خاموشی سرشرم سے جھکانے کو کافی ہے۔ صرف ترکی کے صدر نے تھوڑا سا لہجہ تبدیلی کر کے اسرائیل کو لٹکادیا ہے یا پھر ایران نے اور آج پاکستان نے، باقی اسلامی دنیا نے اب تک ہونٹ سی رکھے ہیں۔ ایران نے بھی اس لیے زبان کھولی ہے کہ ”حماس“ کی پیٹھ پر اس کا ہاتھ رہا ہے۔ گویا ترکی کے علاوہ کسی میں جرأت نہیں کہ وہ اسرائیل کو لٹکارے۔ لگتا ایسا ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ مسلمانوں کی حمیت کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ مگر یہی صورت حال رہی، مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہر مسلم ملک کا حشر یہود و نصاریٰ ایسا ہی کر دیں گے۔ فلسطین میں تین دن سے مسلسل چھ نمازیں ہو رہی ہیں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور نماز جنازہ۔ ہر روز چالیس پچاس قبریں بن رہی ہیں اور عرب دنیا بشمول پاکستان عالمی فٹ بال ٹرائی دیکھنے میں مشغول ہے کیونکہ بے کسی نے ہمیں گھیر لیا ہے اور ہم گلوں میں بٹ گئے ہیں، عربی، گجی، شیعہ سنی، حنفی وہابی، افریقی ایشیائی۔ اسی پر تو علامہ اقبال نے لٹکاد تھا

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم بھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

معراج رسول

جلد 24 • شمارہ 09 • اگست 2014ء

ماہنامہ
پاک سوسائٹی

مذہب و اخلاق: نذر رسول

مصور: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات: 0333-2298788

لہارہ کراچی: 0333-2168391

لاہور: 0323-2855525

فریڈکوش: 0300-4214400

♦♦♦

قیمت فی کپی: 80 روپے • فیروزانہ: 700 روپے

پبلشر اور ایڈیٹر: نذر رسول

مقام اشاعت: 5.9-6.1 فیز 11 انیس ٹینٹ

ڈائریکٹر: کمال الدین

کراچی: 759911

پرنٹر: بیسن سن

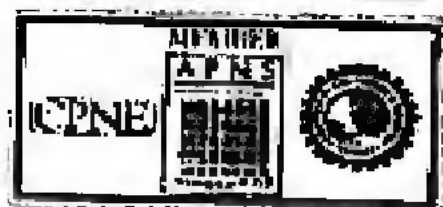
مطبعہ: انجینئر ہنگوہ

باکی اسٹیٹیم کراچی

ٹیکٹ: 742841 • سٹریٹ نمبر: 982 کراچی

Phone: 3333-2298788 Fax: 3333-2298788

Website: www.paksociety.com



ادب کا بابا آدم

سرگزشت

اس کا نام ایما ایم تھا اور وہ ان لوگوں میں سے ایک تھا جسے نسل کے پانی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت دریاے نسل پر گزارے۔ اس کی بیوی سی کشی تھی دن رات نسل کے پانی پر تیرتی رہتی۔ یوں بھی مصر اور ایسے ممالک جس کے ساحل نسل سے متصل ہیں۔ وہاں کے لوگ اس دریا کو بہت مستحضر خیال کرتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا رزق بھی نسل ہی سے حاصل کریں۔ زیادہ سے زیادہ وقت نسل میں گزاریں۔ ایما ایم بھی اسی سوچ کا حامل تھا۔ اس کی ایک بیوی سی کشی تھی جس پر وہ اپنا وقت گزارتا۔ ساتھ میں اس کی بیوی بھی ہوتی۔ 1879ء کی بات ہے۔ نسل کی آغوش میں تیرتی اسی کشی پر اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کی گود میں اس کا وارث دے دیا۔ اولاد فریاد پا کر وہ خوشی سے پھوٹے نہ بہہ رہا تھا۔ اس خوشی میں اس نے اپنے تمام واقف کاروں کو کشی پر جمع کیا اور ایک چھوٹی موٹی سی تقریب کا اہتمام کر لیا۔ اسی تقریب میں اس نے بچے کا نام حافظ رکھا۔ عطا حافظ ماں باپ کی محبتوں کے درمیان پروان چڑھتا رہا۔ ابھی حافظ چار سال کا ہی ہوا تھا کہ اس پر مصائب کا کوہ گراں بار لوٹ پڑا۔ ایما ایم کو اجل نے تاج لیا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ ماں کے ساتھ ماسوں کے گھر منتقل ہو گیا۔ اس نے کچھ عرصہ قاہرہ میں گزارا پھر وہ طحطا چلا گیا۔ شہر طحطا قاہرہ جیسا بڑا شہر نہ تھا مگر یہاں زندگی کی جملہ ضروریات پڑ سکتی حاصل ہو جاتی تھیں۔ اس کے ماسوں نے طحطا والا گھر اسے دے دیا تھا۔ وہ اسی گھر میں رہنے لگا تھا۔ اسی شہر میں رہتے ہوئے وہ عربی شاعری سے روشناس ہوا اور اشعار کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں سر چھپانے کے لیے مکان تھا۔ وقتاً فوقتاً ماسوں کچھ نہ کچھ ارسال کر دیا کرتے تھے مگر ہر قاعدہ روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ بے روزگاری دور کرنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے وزارت دفاع میں خدمت کر لی مگر فوجی زندگی اسے اس نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنا چاہیہ ٹھکر داخلہ میں کر دیا۔ اس نے ایک عہدے دار کی حیثیت سے مشرقی سوڈان میں لارڈ کچر کی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ 1908ء میں واپس قاہرہ آ گیا اور مملکتی عہدہ سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں پر اس نے خود کو ادب و شاعری کے لیے وقف کر دیا۔ شاعری میں ناپختہ تھا، اس لیے اس کی شاعری مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مصر کا ہر دل عزیز شاعر کہلانے لگا۔ اسی دور میں سعد زعلولہ، مصطفیٰ کامل اور قاسم امین جیسے سیاسی قائدین سے اس کی قربت بڑھی۔ اس کا سیاسی شعور پختہ ہوتا گیا۔ 1911ء میں اس کی سیاسی بصیرت سے استفادہ کی خاطر اسے سول سروس کا رکن بنایا گیا پھر اسے کتب خانہ خدیو کے ادبی حصے کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اس کی شاعری میں جدیدیت کا عنصر اتنا زیادہ تھا کہ اسے جدید شاعری کا استاد کامل کہا جانے لگا جبکہ اس فکر کا قائد سامی الباردی تھا۔ اس نے اس زمانے کے مصر کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے گلی پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمویا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شاعری الازہر کے علمی حلقوں میں پسند کی جا رہی تھی۔ اس نے دکتیریہ گوئی MISERABLES میں سے کئی غنائی قصوں کا ترجمہ بھی کیا۔ اس نے طلیل مطراں سے مل کر PAUL-LEROY-BEAULIEU کی تصنیف کا ترجمہ الموزنی فلم الاقصا کے نام سے شائع کرایا۔ عربی ادب کے اس جدید ہوا آدم کا انتقال 21 جولائی 1932ء کو ہوا اور یہ حافظ ایما ایم کے نام سے مشہور ہے۔



مگر ایاز رائی نے ہنس کر دیکھا ہے "اس ہمارا شہرہ جہاں کثرت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلی سرگزشت دہلی کی، دہلی کی، ہر ادب شناس کا دل خوش ہوا ہوگا۔ وہ باتیں جو سوتی سوتی کتابوں میں نہیں آتے آپ نے نہایت خوبصورتی سے صرف ایک صفحے میں سمادیا۔ یہ کارنامہ صرف سرگزشت کا خاصہ ہے۔ شیر خیال کے دوست و معتمد کی مبارک یاد کیونکہ عید کی اصل خوشیاں تو روزِ وادوں کا ہی ہے۔ اس بارچہ سے بیٹے میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک ہی دعا کی ہے کہ یہود و نصاریٰ جو چاہیں بھجایا ہے مسلمانوں کی جانی کا سامن کیا ہے۔ ایک کے بعد ایک مسلمانوں کے ملک کو گھنڈہ بٹا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے ہی قتل کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس القاد سے نجات دلا دے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ ہماری بہادر فوج جاگ رہی ہے جو اس نے اس ملک کو چاہی سے بروقت بچالیا۔ ہم لاکھ گنتہ گارسی مگر وہ غور و فکر نہیں ہمارے ملک کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی کی امداد ہے کہ ہم سب محفوظ ہیں۔ اب چلتے ہیں دوبارہ شہر خیال میں۔ رانا محمد جہاد کا شہرہ بہت اچھی تھا۔ اعجاز حسین سجاد اور چورنگل اور طاہر و گلبرہ و قشیری جیسے کے شہرہ و تنقید افکار و اجمال کا مظہر رہا۔ اعجاز حسین لدھیانہ اور محمد عمران جو تالی کا کتب و خیال نامہ (ان اول کے لیے تقویت کا باعث بنا، سرت کا مسلمان ہم کا بھائی۔ باقی احباب نے بھی خوب لکھا ہے لیکن میں نے اگر فردا فردا جواب دینا شروع کیا تو خطوط میں خود دیگر احباب کا حق غصب ہو جائے گا۔ اس لیے مضامین و مباحثین کی جانب رخ موڑ لیتا ہوں۔ رہنما ایک حوصلہ بخش سوانح حیات تھی۔ ایک اچھی رہنما کو اس طرح لکھیں تو ہم بدنامی میں ہیں۔ تار کی کا آسپہ بھی ایک ہمسور معنی کا سوانح تھا۔ خاندان پر ہندو کے بارے میں کیا لکھیں، لیکن ایک مضمون پر سے شمار سے پر حادی ہے۔ اسرائیلیوں نے فلسطینیوں پر کم مبالغہ نہیں توڑے۔ ایسے القاد و واقعات ہیں جو مسلمانوں کا عالم کے من پر طاری ہے۔ اب تو اسرائیل نے اسلام دشمن طاقتوں کے اتحاد سے پورے عالم اسلام میں ایسی آگ بھڑکا دی ہے جو ہر مسلمان تک کو خفا کھنکھاتا ہے۔ گھنڈہ بٹاتا جا رہا ہے۔ جنگ و محبت کے باب میں مذکور واقعہ میرے لیے بالکل نیا ہے۔ اسی الف لیلہ اور چوڑائی رات سے اللہ واداع کی دہلی۔ سبیل نمبر ۶۵ کی دہلی کا گزارے واقعی تھی۔ جولائی میں بیان کردہ واقعات اقتصاد کی وجہ سے اچھے مگر شکستہ تھے۔ سچی بیخندوں میں پھر وہی غلطی اڑی لے گئی۔ کالا علم اور نہیں بالکل نہیں بہت زیادہ پسند آئی۔ دہلی بھر رہی۔ بے حس نے تو ذہن کو بھٹوڑ دیا۔ وارث بھی پسند آئی۔"

سرگزشت کے ایک پر، نے ہماری انتہائی حسین نے نڈو جان محمد میر پور خاص سے "ہمدردی لکھی، کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے بہتر کچھ نہیں ہے۔ جو کام زبان سے لیا جائے اور کام اس کہانی سے بہ آسانی لیا جاسکتا ہے۔ میری بیگم نے بطور خاص یہ کہانی بچوں کو پڑھائی ہے۔

الطاف سید نے لکھا ہے۔ "اس شمارے میں میری پسندیدہ شخصیت چوہدری ادا کی کو دیا۔ یہ مجھ پر ایک احسان ہے۔ ہم سب کو ان کی مالانہیزدگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ غربت میں پرورش پانے والے لڑکے جو ان کے کس طرح ایک نفس میں ڈوبی قوم کو دیا کی ترقی یافتہ قوم کے صف میں لاکر آگیا۔ رہنما ایسے ہوتے ہیں کہ ہر علامت پر بھی قوم کی ترقی کے لیے کام کرتے رہیں۔ اسپتال کو بھی دفتر بنادیا۔"

سردار بانو ناگوری کا غلوں نامہ کراچی سے "لکھے اور سادہ رنگوں سے سمارو رقی لکھوں کو بے حد بھلا لگا۔ ہمارے کے صفحے پر پہنچے تو ان کی فکر انگیز باتیں دل میں اتر گئیں۔ واقعی اس بلاغ و محسن کا احترام دہرے دہرے میں ہوتا جا رہا ہے۔ وہ محنتیں اور نڈو دلی جو اس کا حصہ ہوا کرتی تھیں اب ان کا ثمران ہو چلا ہے۔ پہلے قتلوں میں کھانا سجا کر کھانے کے غریب اور نادار لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا تاکہ کوئی بھی دہی تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم نہ رہے لیکن اب وہ سب تو اک خواب ہو چلا ہے لکھ اب شہبازی عروج پر ہے۔ ہمارا شمارہ تو ان لوگوں

تھوڑا سا ہے جو ہنگامی کاروان بھی روکتے ہیں لیکن اگر ہم کسی مارکیٹ میں چلے جائیں تو ہمیں وہاں کی دھڑکنے کو جگہ بھی نہیں ملتی۔ ان حالات میں ادیش دینے تو کیسے دیں؟ اگر ہم دھڑکی تو کس کے سر دھڑکی؟ ایسی خاصا کاروانوں پر دم لڑنا ہے۔ رانا محمد شاہ کا تجزیہ پہلے نمبر پر رانا محمد شاہ اور بلال عظیم احمد مجسمہ اپنے لوگوں پر مجسم کیا لیکن آپ کو شہر خیال میں جگہ مل گئی ہے، مٹی فریز سے اپنے خوبصورت تجربے کے ساتھ حاضر ہوئے۔ عزیزہ ہمالی آپ کی مٹی اور مکاری ہم نام لیکن کو ہمارا سلام کہئے گا۔ طاہرہ گلزار، کچھلہ پورہ، مٹی ہنگامی ہو گئیں۔ ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں کہ پاکستانی آدمی سے اگر آپ محبت کرتی ہیں تو ہمارا بھی وہاں وہاں ان جہانوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ رانا محمد شاہ، طاہرہ ہلالہ، بیگم اور سعید احمد چاہے طیر حاضر ہے۔ مٹی لطف لیل میں مسکراہٹ کا موضوع اس قدر بھایا کہ ہم انہی صفحات پر تصویر کر آگے بڑھنا ہی بھول گئے۔ خاص کر حزیل آغون اور کے قصبے نے ہمیں بھی مسکراہٹ پر مجبور کر دیا۔ اگر بڑوں کی قوت میں ان کی مسکراہٹ کا بہت بڑا کردار ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ آپ اپنی مسکراہٹ سے پوری دنیا راغ کر سکتے ہیں۔ بیگم و محبت میں تیمور کی محبت کا لوگنا خوب بچھا لگا۔ لیکن کبیر کی تحریر مقام نے ہمیں لرزایا دیا۔ جبری نامی شخص اپنے ماضی پر کتنا ہی ہر وہ ڈال رہا لیکن بالآخر اسی ماضی کی پرچھائیں اس کی کم مٹی میں اس کی موت کا سبب بن گئی، مہر نام کا مطروحات سے گہرا "جوانی" دلچسپ رہا۔ بیت ہزاری میں مٹی سلطان کا طعیر بازی لے گیا۔ مٹی کی جگہ جانی میں اکیلے نے مناسب طریقے سے اپنی مٹی کو برائی سے بچالیا۔ شاہد راجا کی کوئی بھی مٹی ہوئی تو وہ بھی اپنی مٹی کے لیے بچی کرتی۔ نہانے یہ ماری مٹی آخر ایک جگہ کیوں ہوتی ہے؟ دھڑل اور مہربان سادہ پ لے۔ ہمالی کے نقشے میں جھوٹی بو لادھن کی مٹی بھری مٹیوں کو ہند کر کسی انہماں شخص کے لیے خود کو بڑا دیکھ کر لیتی ہے؟ آکا ش کوئی تو اس تحریر سے سختی سمجھ لے تاکہ ایک مرتبہ پھر مٹی کی دہرائے سے بچ جائے (اس تحریر کی اس بار مٹی پذیر مٹی ہوتی ہے کہ میں جہان ہوں۔ ایک صاحب نے مٹی کی مٹی کر کے بتایا کہ اس کی بولی کی فونو انشیت کر کے انہوں نے ہمارے ماسٹر (ٹیکنیٹ) میں تسلیم کیا ہے) اور مٹی بڑا کر دل دیکھ سے بھر گیا، جانے کیوں لوگ دانت کی خواہش میں اپنے رب کی نافرمانی کر جاتے ہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ خود بھی تو ایک عورت کے صلیب سے پیدا ہوئے ہیں۔"

محمد فکیل حیدر واسو جگ سے لکھتے ہیں "میں شہر خیال میں مٹی اور دلدہ حاضر ہوا ہوں لیکن سرگزشت سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ 1992ء میں جب میں میٹرک کا امتحان دے کر لاہور ہوا تھا تو ایک دوست نے سرگزشت چڑھنے کے لیے دیا جس پر رانا محمد شاہ اور راج کا دل۔ درمیان میں بہت کچھ بدلا ہے بڑے حالات دیکھے مگر سرگزشت سے میری محبت میں ذرا بڑا بڑی فرق نہ آیا۔ جو ٹوڑے میں نے مٹی اور دلدہ چڑھا اس میں حبیب جالب صاحب کی سرگزشت اور مٹی اللہ میں نواب صاحب کی حال حاضر زندگی مٹی۔ میری آمد کا مقصد فی الحال کہانوں پر تجربہ نہیں بلکہ چند فرمائشیں ہیں۔ امید ہے ضرور۔ میری کہیں کے۔ مجھے ہندوستان کا سفر نامہ چڑھنے کا بہت شوق ہے۔ رانا شاہ صاحب "سیر پاکستان" کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ اگر دھندلی کاغان اور نارائن کے ساتھ ساتھ کھیل سیف ایلوگ کے حوالے سے معلومات دیں تو حرا آجائے، اگر چہ یہ سب مقامات میں مٹی اور دلدہ دیکھ چکا ہوں مگر معلومات کے حوالے سے کنگ باقی ہے (رانی صاحب دادی کا قاتل وہ نہیں پر لکھ چکے ہیں) مٹی کا کام ہندوستان پر مٹی کی طرح قیاسی خطا نہیں مٹی لا جواب ہوگا۔ (آپ کا زمین کا احاطہ حالہ ہے گا) ایک دہرہ فرمائش آقا قاتی صاحب سے ہے۔ آپ کی مٹی الف لیلہ میں سب ادا کاروں کا تذکرہ ہوتا ہے، برائے مہربانی پاکستان سے نظام کی اللہ میں اور ہندوستان سے لاسکو ڈاٹر کھن چکر دہی کے بارے میں بھی مفصل لکھیں کیونکہ یہ دونوں ہوا کا تقریباً 40 سال سے قلموں میں کام کر رہے ہیں۔ (اتفاق ہے کہ ان دونوں کا تذکرہ مٹی بار ہو چکا ہے پھر بھی فرمائش پوری کی جائے گی) آخر میں شہر خیال کے سب دوستوں سے ایک گزارش ہے کہ اتنی طرح سرگزشت سے اپنی محبتوں کا سلسلہ جاری رکھیں۔ سب ادیب اور اداکار کے عام سے عام اور خاص سے خاص کارکن کو میری طرف سے عید الفطر کی دینی دلی مبارکباد!"

بشری افضل بھٹو پورے لکھتی ہیں "دھڑکی کی باتیں میں ایک مٹی سرگزشت چڑھ کر بہت کچھ معلوم ہوا۔ اپنی محبت میں پہنچو رانا محمد شاہ کو کرسی صدارت پر پہنچے پالا دے کر دھڑ سے برا بھلا کہیں۔ غرور تو آقا جاتا ہے اتنی مٹی بھر مٹی افضل خیر سے ڈاک کی کارکردگی کی غرور ہو گئیں جس میں مٹی محمد عزیز نے مٹی تو رانا کا ادیب کی جلال مٹی، اوسط کر چک گئی۔ دھڑکی اگر آپ کے لٹاک میں مٹی 2005ء کا شمار ہے تو مجھے ہائی ڈاک بھیجا دیں میں دلم اور مال کر دوں گی (انہوں نے انہوں نے سب یہ ممکن نہیں) طاہرہ گلزار مٹی آپ کا تجزیہ تو ایک سوالیہ ہے۔ یہ بلا ہے کہ اگر ہمارے مٹران کر پٹن فٹم کر دیں تو ہمارا ملک تمام ملکوں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ دوسرا شہر کی ذات تو دھڑکی کی طرح رنگ بدلتی ہے۔ اگر یہ مٹی شہر اپنی مٹی کو نکال دے، اپنی ماں مین کے سامنے اس سے بھی بڑھ کر، لولا کو مٹی اپنی مٹی کے خلاف استعمال کرے کہ یہ لولا دماں کی نہ مٹی کر دے۔ لولا دماں کی ہے عزتی کرے اور اس سے شہر کو تسکین ملے۔ ایسے مردوں کے لیے حکومت کو کوئی نہ کوئی سرخسہ رو دینی چاہیے لولا آپ لوگوں پر غصہ کرنا چھوڑ دیں۔ اپنی مٹی دل بٹائیں گی۔ دھڑکی ملک صاحب خدا آپ کو صحت کا لہ حلا فرمائے۔ سب قارئین اور اشاف کو دہنوں کی مبارک باد۔ میری کہانی "خطا نہیں" میں لکھ سکتی ہے (فیصلہ لیلہ دھڑکی بورڈ کرے گا)۔ شاہ حسین آریسٹ کو خدا صحت کا لہ حلا فرمائے۔ رانا شاہ اُمید پر تو دنیا قائم ہے۔ کاظم، اس کہانی نے تو مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ دھڑکی دنیا میں اس علم کا وجود ہے جس میں کچھ لوگ جاوونے کو نہیں مانتے جلاو برحق ہے۔ آنسوؤں کو دشمنوں نے نہیں بٹھا ہے چاری طاہرہ اشکر ہے کہ

www.paksociety.com

www.paksociety.com

دھیر لیا لی نے اس کا علاج کیا اور شالی۔ کرنے والا تو خدا ہے زمین پر تو خدا نے دیئے ہوئے ہیں مٹا جاؤ گے یہ کیا جا رہا ہے اسے گھسوں تو ایک محل کتاب میں جائے۔ سکول کی جانب سے جانے کے لیے مجھ پر عمل کروائے جا رہے ہیں۔ خدا سے یہ اتنی کوئی نہیں ہو گا۔ خدا میرا بہت ساتھ دے رہا ہے لیکن دشمن بھی پیچھے ہٹا کر میرے پیچھے ہیں، میری تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ کرسی حاصل کرنے کے لیے انسان اتنا گر سکتا ہے میرے تصور سے اب رہے۔ انشاء اللہ خدا آگے بھی لے جائے ان کے شر سے محفوظ رہے گا۔ دل میں جو سانپ ہے وہ اصل وہ ناگ تھا جو موت دکھائی ہے وہ ناگ، ان کے بچوں کو لاکھی میں مارا تھا اس کا دل لے لے کے لیے ناگ انسانی روپ میں سو سال کے بعد آ جاتا ہے یہ تو تھا آج پڑھ بھی لیا۔ روم، جس بھوکا بہت بڑا طرف تھا کہ اپنی دشمن کی انکی خدمت کرتی رہی۔ بیل جیسے بھیڑیا کے روپ میں ایک ماں کو لاء کی خاطر بلیک میل کرتا رہا۔ پھر ظلم کی انتہا میں کی کہ لاد کو ماں کے ظلم میں لائے بغیر قتل کر دیا۔ بیت بازی۔ جس فیم صدیقی کا شر بازی نے کیا۔ علی ستین آقائی نے ترکی کی سیر کر لی۔ نہیں اگل نہیں، مغربی معاشرے میں بھی غیرت پائی جاتی ہے غیرت ہے۔ دور آریو معاشرہ ہے۔ ہولن میں ان کیوں سے بچ کر رہنے کی تحقیر کی بدلت ہے۔

عظمیٰ شکوہ سرگودھا سے لکھتی ہیں "سرگزشت میں پلاٹ ہے میرا۔ اُمید ہے خوش آمد یہ کہیں گے۔ جس لکھتی ہوں۔ بہت سے رسالوں میں تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ خط لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میں بکری کہانی کو کچھ بھیڑوں تو کیا شائع ہو جائے گی (پڑھنے کے بعد فیصلہ ہو سکتا ہے) میں اپنی کہانی بھی تو دوں مگر روگنا ہے کہ منظور ہو جائے تو اس طرح تو دل نوٹ جائے گا میرا مگر پھر بھی میں کہانی بھیج دوں گی۔ ختم سے بہت سی شوق ہے کہ میری کہانی سرگزشت میں شائع ہو جائے۔"

قیصر عباس خاں کا دریا خان بھر سے خط "ادارے میں کچھل پڑت نہیں تھی، جس کمزوری یا بولتی کی بکری کی تھی۔ وہ اب معمول بن گیا ہے۔ دادا گھر پہنچ کر ہی عمارت پر تھے، بہت سارے لوگ۔ اس کا اور جائزہ تو تھا۔ اور ساتھ پاٹا پر گزرا، کئی مرتبے لندن، لیسٹر شائر، ہیران اور عباس شاہ، حامی، اچتر حسین، بشری، انٹل، ڈاکٹر فرنا آئین صاحبہ بھی اسے بھر پور تہرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ بہت اچھے تہرے کے ساتھ حاضر ہوئیں ہیں لیکن ادارے سے حلق نہیں تھیں جین داتے تھی نہیں دلت۔ جو کہ حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ بہت ڈانگی رہا کرتی ہیں۔ ہمیں انتظار ہے گا۔ باقی سب کے تہرے پسند آئے۔ جو لوگ فیر حاضر ہیں وہ حاضر ہوں، جاری انتہاس ہے۔ ساری کہانیاں انجمن میں۔ پھر وہی قلمی پروڈیوسر قلم نے بہت اچھے غریب سے اپنی بیٹی کو ڈیڑھ کے جالی سے نکالا جو کہ اس بات کا دلیل ہے، ہوسکے اور بارہ قلمی نہیں کرنا، کاش قلم کے مال باپ بھی ایسا نہ کرتے تو قلم بھی ہونہار اور شعور پر و فیر کی زندگی میں شمولی والدین کو براہ راست نہیں پڑتی چاہیے بلکہ طریق سے مسئلہ کا حل تلاش کریں، دوسرا آج کل اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ واپس دے آئیں۔ ورنہ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوا فرشتہ مفت لوگ دنیا میں موجود ہیں۔ درد جب بھی پڑے گا مطالعہ کیا ہر کوئی اپنی دورنگی یا رخ دور دور بھری کہانی لکھتے ہیں جو کہ حقیقت پائی ہوئی ہے لیکن میرا نوچنے کر اور بہت کچھ پڑھنے کو لیتے ہیں۔ بہت غریب کی بات ہے کہ وہ دینے والے کو راست پہنچا جو کہ بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنا داتے آئیں ابھیر یا بھیل کیا انسان تھا۔ مروتا، آخر کیا تھا بہت سی بڑا انھوں اور بے غیرت شیطان تھا۔ انسانیت کی تو جینا کہ ہے، مقدس رشتہ کی تو جینا کہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے ایسے انسانوں کو واپس دے دے یا دے اٹھالے۔ آئین کا لفظ "آج کل کے دور میں لوگوں نے ایمان کو لائق قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پائرمانی کو کچھ سمجھتے نہیں۔ لوگوں کا سکون دیکھا نہیں جا رہا اور اپنے مقصد کو جانے کے لیے سب کچھ کر جاتے ہیں۔ اب طاہرہ عیسیٰ مصوم لڑکی کے ساتھ جو ہوا ہے اللہ کرے بر باد ہو جب تکیں گا۔ ظلم والے آپ سب لوگوں کو اپنے دلی عید سارا کہی ہو۔ کیونکہ جب گستاخ کا چہرے کا جب عید ہو گی اور لے والی ہو گی اللہ کرے عید کی خوشیاں سب لوگ اپنے عیدوں کے ساتھ منائیں۔ ایک بات کروں گا اور داتے بھی مانگوں گا سب رزق و خیر سے۔ سواک فون پر ایس ایم ایس اور کال پر بھی باتیں کرنا وہ دیکھیں کہ اور کچھ حیرت کے ساتھ گھر سے بھاگ جا رہا قیصر، اور اس کا شر اس مت جا رہا ہے، کیا ترکی ہے یہ یا کچھ اور۔ میرے پھولے سے گاؤں میں ایسے واقعات بہت ہورہے ہیں۔ ہم نئی ٹیکنالوجی کا استعمال کی طرح کر رہے ہیں؟ ان کا مقصد وہی لی وہی کے ساتھ سوائے عشق، محبت، ملتی جلتی، میرا بھائی کے ساتھ کیا پیش کر رہے ہیں جس واسطے میں رہے صرف لڑکی کی بات ہے، مجھو و پسند نہیں وہ پسند ہے۔ شادی محبت کے علاوہ آدھے کپڑے، کئے پال، پردہ نہ کرنا اور پردہ کرنے والے کو راد کی اسلف کرنا کہ یہ لہالی پا کداسن میں رہی ہے۔ ہم کہاں جا رہے ہیں مجھے داتے چاہیے اس کا مل بھی مل جائے تو بھرے۔"

وحید ریاست بھٹی بکرمیدان راولپنڈی سے لکھتے ہیں "ماہی کے شارے میں متری شہد جہانگیر شاہ کا حقیقی مضمون شاعر اعظم، دل کی آنکھوں سے پڑھا۔ یقیناً مانیں ایک ناقابل فراموشی گریز صرف اور صرف آپ کے سرگزشت کا ہی خاصہ ہو سکتی ہے۔ پھر ماہ جون میں شاہ جہانگیر شاہ صاحب کو کرنی صداقت پہنچا کر آپ نے؟ بہت فرما دیا کہ اگر ہم اپنے آپ کو بچان جا نہیں تو شاہ جہانگیر میں سکتے ہیں۔ وہ اسی اس اعزاز کے قابل تھے مانیں میری جانب سے اتنی کامیابیوں پر میرا ساری مبارکباد عرض کر رہے تھے۔ ماہ جولائی کا شمار 28 جون کو معمول ہو گیا۔ سب سے پہلے ایک کئی سرگزشت میں عظیم شاعر داروغہ لہوری کا زیست نامہ لکھ کر ملا، بہت لطف محسوس ہوا۔ پھر ہم آگ برسات موسم میں شہر خیال میں داخل ہوئے۔ پرانے اور نئے دوستوں سے محفل کو سہا ہوا پایا۔ رانا محمد سجاد کو کرنی صداقت پہ جاندار

اگست 2014ء

سے اسلم عالم کے تہرے بھی خوب تھے۔ شرقی اعلیٰ بیادید اور طاہرہ نگراں پتلا دریا دیر سے پہنچی مگر یہ کیا کم ہے کہ ان کا نام لیٹ کر میں آگیا۔ اب کہانوں کی طرف آتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کا چراغ انوب بہرہ رست رہا۔ عکاس آواز صاحب کی دو کون تھے، ماضی کے جہر و کون سے انہی تحریر تھی۔ ان کی کیر کی تھیلیاں، کانہی جہاب نہیں تھا۔ علی سفیان آفاقی کی ترکیبی و اہم، یکہ پیکر رقی۔ ڈاکٹر مہر مہر بھٹی کی جرہ و کاف، جس شیف کا انجام پڑا کر دل طول ہو گیا۔ علی سفیان آفاقی بھی اہل لیلہ میں، تھوڑی سا جگہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ پتلا در کے فکاروں کا حال بھی پڑھنے پتلا در کی سنگلاخ زمین میں ایسے ہی سورفتاروں نے جہم لیا۔ جہنم ہائی کی مٹھلوں میں چڑھتے جہاں ہر عمل غور و بھی شامل تھے۔ دیکھائی میں غائب کسی لیلہ آفاقی، موت یا حیات، انہی تھی۔ اشرف لاہوری ان دیکھا سوزا، پسند آئی۔ مگر نظر حسین کی احترام گناہ آفاقی نے مٹا دیا۔ ڈاکٹر دہلی اس وقت غائب ہیں۔

حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگ مہارانی سے لکھتے ہیں "میر صاحب شہر خیال میں شرکت کر رہے ہیں۔ دریا سے سندھ لے کر ہمارے گاؤں نورنگ کو لنگر لیا ہے اور ہم لکھنؤ کی کر کے دیکھ کر میسوز آگئے ہیں۔ جہت سنت رسول اکرم ہے۔ فارغی اور آپ ہمارے لیے دعا فرمادی کہ کئی جگہ ہمارے لیے رہیں آئے۔ فارغی کے محبت ہمارے سامنے ہیں شاہ جہاںگیر شاہ کا طویل خط پڑھا۔ وائی احمد ان کا نظریہ ارتقاء غلط مٹھو نے پتی ہے لیکن پھر بھی ہم نے یورپ والوں کے غلط نظریات کو ہیٹھ لگا دیا ہے۔ آفاقی حسین مٹھو اور پتلا در کے کھنکھرتے کے مستقل لکھنا دی ہیں۔ سدرہ بانگوری، ڈاکٹر فرہاد علی، نور ماس شاہ، ماس شاہ ساجد احمد شاہ، احمد خان تو حیدری، شعیب محمد عزیز نے کے خوبصورت خطوط پڑھے۔ محمد عمران جھانی باپ کا نمبر ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔ ان خطوط میں اپنے خط کے ایک رحمت، طاہرہ نگراں اور اپنے خاص دوست احسان عمر شامل تھے۔ ایک اور دوست ساجد اہوال کے راجہ ناگب بھی مرحوم سے لکھتے تھے۔ سب سے سب ہیں۔ بکھڑوں پہلے لاہوری کی حالت میں خزانہ لپی لپی کو اپنے شوہر اور قانون کے رکھوالوں کے سامنے بیٹھوں سے مار مار کر ہلاک کر دینے والے واقعے پر دل بہت دگنی ہوا۔ محکم اسلام میں یہ واقعہ اہل دل کے صدمہ کا مظہر ہے۔ کہ ہر جادو ہے، دیکھ لیں اور عوام سب خاصو فی قضا شانی سے مرے سپہ ظہر دیکھتے رہے۔ یہ واقعہ پڑھ کر (اختیار میں) ہمارا سر شرم سے جھک گیا۔ یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ نور ماس پاکستانوں کی بے بسی کو اجاگر کرتا ہے۔ اب آتے ہیں سرگزشت کے مضامین کی طرف۔ سرگزشت ایک شاہکار ادبی رسالہ ہے۔ چراغ ادب میں سرگزشت جعفر علی خان کی زندگی کے حالات کو احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی عمر کاوش ہے۔ دو کون تھے؟ ایک تحقیقی مضمون ہے۔ حق را آواز صاحب نے زمانہ قدیم کی پراسرار فیکٹوں کی سے نہیں روکنا کرایا ہے۔ ماہرین آثار و تاریخ نے اب تک جو کچھ لکھی اور ہفت کیا ہے وائی اس نے ہمیں دور رس حیرت میں ڈال دیا ہے۔ احمد کیر کی تھیلیاں دیکھیں، اہل سرچا کی تین بیویوں کی عمر کہانی ہے۔ ڈاکٹر عبد الرزاق بھٹی کی جرہ و کاف وائی جنگ عظیم دوم کا انوکھا واقعہ ہے۔ جناب علی سفیان آفاقی کی لکھی اہل لیلہ میں گنگا دھرم دھرم کے حالات کی پڑھیں وائی، ایک اچھے نگار تھے۔ مگر انہوں کی بے پروائی اور انسانی غفلت کا مظہر ہو گئے کہ در دل میں ہم لوگ اچھے اچھے گویاں گویاں جاتے ہیں۔ خوشونت سنگھ آفاقی تاریخ کا عجیب کردار ہے۔ لکھی اہل لیلہ میں ایک بات ہے کہ سفیان صاحب بار بار ایک ہی واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ طویل سلسلہ میں شہباز ملک کو پھر اٹھایا میں پھنسا دیا گیا ہے۔ بہر حال بار و حاد کا ایک مقبول سلسلہ ہے۔ گئی آپ قتل میں موت یا حیات میں موت ذات کو لکھی ہو کر کیا گیا ہے۔ سب نزلہ ہے چاری عورتوں پر ڈالنے کر عرو حشرات پر تر ہو جاتے ہیں۔ استادی، لکھی تحریر ہے۔ اندکی سوچ ایک معاشرتی الیہ کو نگاہ کرتی ہے۔ نام نہاد بدو نے اپنے اڈے چلانے کے لیے جہیز بھی عورتوں کو دیا۔ بار کھا ہے۔ بے چاری شریف عورتوں کے ساتھ ساتھ اہل عزت بھی گنوار لکھتی ہیں۔ یہ ایسے لوگ معاشرہ میں، نامور ہیں۔ آخری کہانی احترام گناہ ہے جس میں ایک معاشرتی غلطی کو جان کیا گیا ہے۔ کہ صاحب کا لے تھے ان کی محبت پہ بھی کافی تھی تو ان کو عظیم صورت اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ وائی صاحب مضمون بنگ لکھتے تھے۔ لاہور احترام گناہ کر کے اپنی غلطی کی معافی کے طالب ہوئے۔ معاشرہ میں محتاج اور معذور لوگ ہماری توجہ کے طالب ہوتے ہیں لیکن معاشرہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس معاشرہ کی برائی سے بچائے آمین۔"

ملک جاوید محمد خان سرکافی، بدوئی پنجھ سے آتے ہیں "جناب شاہ جہاںگیر شاہ شہر خیال کی صدارت اور مرزا احمد القادر بیدل پر لکھے گئے تحقیقی مضمون کی اشاعت پر جہاں اتنی بڑی بڑی مبارک بادیں آپ کو ملی ہیں ان میں ایک لکھی کی مبارک باد ہماری بھی شامل کر لیں۔ ایک بڑے کام کو آپ نے منظر کر جامع اور موثر انداز میں طبع بند کیا۔ اگر سوائے ادب نہ ہوتا یہ کیوں گا گویا سندھ کو گڑے میں بند کر دیا۔ حق لکھا ہے کہ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ ہمارے حسین صاحب نے مرزا بیدل کو شہر دل لکھی دلی لکھی بک شاعر دلی لکھا تھا۔ دلی اور صوفی عموماً مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر فرہاد علی صاحب احساس کتری تو ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے جو آپ کہہ رہی ہیں یہ احساس محرمی اور احساس شرمندگی ہے۔ اگر یہ احساس امت سلسلہ کے داخلوں کے دلوں میں بھی پھیلے ہو جائیں تو حالات بدلے میں صد اس نہیں لکھی گئی کہنگ باقی ہے انہی رنگ ہمارے خون پھر میں۔ آپ جائزہ لے لیں کہ مہندہ دلی وسائل مسلمانوں کو عطا کیے گئے ہیں لیکن ہمارے پیر کار وہاں ان نعمتوں کو مسلسل جھٹلا رہے ہیں۔ یکم مہر معید شہید نے پاکستان کے بارے میں کہا تھا کہ سورہ دھان کی کھلی تفسیر ہے۔ طاہر قریب صاحب مشاہیر مہارانی کے سلسلے میں ایک مشورہ ہے کہ مولانا اللہ یار خان اور مولانا محمد اللہ چکراوکی کے نام بھی اپنی تحقیق میں شامل کر لیں۔ مولانا اللہ یار خان ایک ممتاز عالم دین، عظیم مناظر، لکھی کتابوں کے مصنف اور سلسلہ لکھی بندہ اور سب کے شیخ طریقت

تھے۔ 1869ء کو ولادت ہوئی، 16 فروری 1984ء کو وفات پائی اور گاؤں پکڑال میں دفن کیے گئے

رانا محمد شاہد کی پوری زندگی ادبی فوج کی محبت میں گزرتی رہی۔ آپ نے فوج میں بھی فوجی برکات کا آخری معتبر ادارہ ہوتی ہے جو آپ کی حفاظت کیجے یوں کرتی ہے کہ آپ جتنی فوج کے حوسے لے رہے ہوتے ہیں اور یہ فوج سرحدوں پر پھرتی رہتی ہے۔ بھارت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے آج ہمیں 85 سالے ہونے کی ضرورت ہے۔ جب فوج سے محبت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی فوج کے لیے جان و مال سب کچھ دیتے پر تیار تھے۔ شہر خیال میں شاہد جہاگیر شاہ کا طویل خط دلچسپ رہا۔ جہاں ان کے کراٹا میں گزرنے والے بچپن کے کلام کا ذکر ہوا، وہاں ان کی عمر کا اندازہ بھی ہو گیا، بالکل ایک انڈین سینئر شاہد کی جانتی ہیں کہ وہ خوب لڑتے ہیں۔ کئی جگہ ہوائی کے ساتھ خود بھی میدان میں اترتے تھے۔ سدرہ بانو ناگوری! جس معاشرے میں تعلیم کو کاروبار بنالیا جاتے۔ وہاں بچوں کو تعلیم کم دینی جاتی ہے اور گھروں کے کام زیادہ کر دئے جاتے ہیں۔ کئی گلی، محلے محلے میں کل یہ تو اکیس سال اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ خوب کاروبار ہے تعلیم کی۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ اگر غریب کے بچے بھی تعلیم حاصل کرنے گئے تو سرزد، چھوٹی اور دیر سے کہاں جائیں گے۔ کس پر حکومت کریں گے؟ یہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے اور ڈاکٹر قمر الحسن نے بھی لکھا کہ پاکستان میں کس کے ساتھ ساتھ سال بھر مختلف تقریبات و تدارکات کے ذریعے طریقہ والدین سے لاکھوں روپے وصول کیے جاتے ہیں جو بھٹکنا اپنے بچوں کو تعلیم دلا پاتے ہیں۔ محمد عمران جرنالی ماضی میں اگر امن ہوتا تو ساتھ ساتھ رواداری، وضع وادی بھی ہوتی تھی جو آج مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ آئیے اب احمد لکھنوی! اگلی حالت میں کہیں بڑھ رہا تھا کہ امر کی صفائی ہمارے سامنے قیامت کی لٹائی کو بول کر لیا ہے۔ قیامت کی لٹائی ہے کہ سوریہ مغرب سے آئے گا۔ ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرقی کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ انیسٹ اور مجر کہکشاؤں نے اپنے راستے کی سمت تبدیل کر لی تھی۔ باہرین کے مطابق سوریہ سے گردش میں تبدیلی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے۔ اس کی گردش بھی مختلف سمت میں ہوگی اور سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ایسا جلد ہوگا۔ اسلم عالم کا ای میل چڑھ کر خوشی ہوئی کہ بھارت میں سرگزشت جانتا ہے اور وہاں بھی شرق سے چڑھ جاتا ہے۔ (انہیں ہک پر اطمینان اس پر ہے کہ جتنی تعریف کرتے ہیں وہ کچھ خوشی ہوئی ہے) ماضی میں سرگزشت کو حاصل کرنے کی تک وہ خاص دلچسپ ہوئی ہے۔ سرگزشت سے ان کی محبت ان کے شوق کا پتا دیتی ہے۔ ویسے ڈاکٹر ساجد احمد اس بات کی داد دیتا ہوگی کہ وہ اکثر ان شخصیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جن سے عام آدمی بالکل ناواقف ہوتا ہے۔ یوں ڈاکٹر صاحب ادب کی خوب خدمت کر رہے ہیں اور چراغ ادب روشن کیے ہوئے ہیں۔ ہمارا آواز کی وہ کون تھے ایک حقیقی و مصلوخی مضمون تھا۔ یہ کہ ہے کہ تاریخ میں سب کچھ حقیقت نکلتا ہے مگر یہ کہ بہت سی باتیں مٹا کر مٹا دی گئی ہیں۔ مٹنے بہنوں کی جد جہد آزادی کی داستان ان کی کبیر کی زبان پر جتنے کوئی۔ یہ کہ ہے کہ آزادی کی تہذیب اور احساس وہی لوگ پا سکتے ہیں جو غلامی کے چر آشوب دور سے گزر رہے ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ادب کی دوسری جنگ عظیم کا واقعہ جرم و قاتل ایک مفرد دلچسپ تحریر تھی۔ ماضی الف لیلہ میں اس بار شخصیت نگار پر جو ملی سفیان آغا نے لکھا اور وہ خاصے کی چیز تھا۔ مظلوم جرنل کے سینے کی مناسبت سے معلومات بخوبی پہنچا رہے تھے۔ محمد لیا راہی کی کہانی بھوک آغا کے دور کی عکاسی کر رہی تھی۔ مظلومی تہذیب نے مشرقی نوجوانوں کے دلوں کو مظلوم کر کے رکھ دیا ہے اور آئے دور ان کے دلوں کے دھڑکنے پر بد بخت جو جرم کرتے نظر آتے ہیں اور وہ بھی انسانیات کو مظلوم پر نظر آتے رہتے ہیں اور ان جرائم کے پیچھے بھی ہتھیاروں کی وجہ و فائز دہانی ہے۔ جو مغرب سے ہمارے معاشرے میں تقریباً سرایت کر چکی ہے۔ اس میں اگر ملک ٹاپ پر ہے۔ مفرد کی بیانیوں کی سرگزشت کی پیمائش ہیں۔ ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹر ساجد احمد، ڈاکٹر عبدالمطلب، ماضی، کاشف زہیر، ان کی کبیر اور دوسرے معروفت و مشہور کی سرگزشت بھی شائع کیجئے۔ ونگ فکٹری ہو (آپ کی تجویز ٹوٹ کر لی ہے)۔

منشی محمد عزیز نے کائنات سے آخری وقت میں موصول خط سب سے پہلے آنے والی ایک بات کا جواب دیا یا نہیں دے دیتے گا کہ میری کہانی خطا میری ہے آپ میرے ڈاک خریہ پر واپس مجھے بھیج سکتے ہیں (بہت مشکل ہے اس لیے کہ مسٹر و کھاناں رومی میں ڈاکو کی جاتی ہیں، ہر روز 10، 15 کھاناں مسرور ہوتی ہیں اس لیے رکن نمک نہیں) آپ نجانے کب محترمہ شہانہ حنیف کے ساتھ رابطہ کر وائیں گے ملا کسی بھی خواتین ایئر کا فیس ہم کسی کو نہیں دیتے بلکہ خواتین کو فیس دے کر کہہ دیتے ہیں کہ آپ اپنے طور پر پہن کر لیں۔ ادارہ تدارک نہیں ہے، بلکہ مسٹر کبیر سمری فکٹر سے حدیث کے بعد ادارہ سے تک پہنچے، ماضی ہاں انھیں محترمہ اشیتان تو مقید ہے لیکن اس کے چیلے اس کی جگہ بڑے اسن طریقے سے ڈیول ہمارے ہیں۔ شاعر جادو خیال میں دارال دہلی کی داستان حیات چڑھنے کوئی۔ شہر خیال کی صدارت دلائے محمد سجاد صاحب کے حصے میں آئی۔ مبارکباد دانا محمد شاہد اس مرحلہ پر غیر حاضر ہے۔ محمد احمد جسم خان کا تذکرہ کیا، وہ لکھنوی۔ انڈین سینئر شاہد کیسے ہیں پیارے بھائی؟ آپ کی بات سے میں بھی شوق ہوئی کہ شہر خیال کا رتبہ بڑھا دیا جائے۔ چھوٹی دہلی و شہرین اس مرحلہ پر تھرے کی بجائے تلخ کرتے ہوئے نظر آئے۔ لڑکی چلتے چلتے ہم طاہرہ گلزار کے قریب پہنچے تو انہوں نے پشور آپ کرا دیا۔ محترمہ آپ کا نام گھنٹے میں دواصل ادب، مانع تھا، اوستا تھا کہ کہیں "بے لونی" نہ کر بیٹھوں مگر نہ اور تو کوئی وجہ نہ تھی۔ ویسے ماشاء اللہ لکھا ہے پتہ اور میں سارا "گولا" کیا ہے یعنی شاہد جہاگیر شاہد، شوکت رحمن ٹنگ، طاہرہ گلزار، تیوں کے نام بھی زہد دست ہیں، کام بھی۔ سدرہ بانو!

اگست 2014ء

[21]

ماہنامہ سرگزشت

ماہ اگست 2014ء کے باکس کا خصوصی ٹیڈ سرے شمارہ نمایاں ہے

کراچی ماہنامہ پاک سوسائٹی



رفعت سراج کی اصانت میں عیاں ہوئے کئی راز

ترک وفا میں نایاب جیلانی نے اٹھائے کئی سوال

میرہ سید کے گہرا دل

کے ساتھ رضوانہ پرنس نے

رکھی ایک خوبصورت نشست

دل شامِ حشر باران

میرہ سید کے گہرا دل

دس نمبر کا سوال ناہید سلطانہ اختر کے قلم کا ایک اور شاہکار



شائستہ عزیز، شیریں حیدر، عقیلہ حق اور سمیرا حمید کے

پیش افسانوں کے ساتھ ساتھ پڑھیے ام تمامہ، نیرانی شفق،

عذرا فردوس، ام مریم اور حمیرا خان کی چونکا دینے والی خوبصورت تحریریں

بے حد پسند آئیں اور منتظر رہیں کہ پیش کشیں سراج آپ جیسے بہادر اور باوقار قارئین کے لیے



ڈاکٹر ساجد امجد

ہر سودہشت گردی کی فضا ہے اور خون شہداءں کو یہ تولیہ کرنے کی سازشیں ہیں۔ کئی سو سال کی غلامی کے بعد حاصل کردہ آزادی کے خلاف مفاد پرستی کو پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ ایسے نازک وقت کی پکڑ ہے کہ نئی ہود کو جذبہ حب الوطنی سے سرشار انواع پاکستان کے کارنامے بتائے جاتیں۔ جنہوں نے اپنا آج بھلے کل کے لیے قربان کیا ہے۔ قوم کے انہی مجاہدین میں ایک اہم نام راشد منہاس شہید کا بھی ہے۔ اس کم سن شہید نے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا یہ سب کو پتا ہے مگر کس وجہ سے اس نے قہد ہو کر جان بھانے کی بجائے موت کو گلے لگایا اس بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

ایک دن پرست گرامے کے ایک شہید کا واقعہ

اس کے سر پر ہاتھ بچھ رہا ہے۔
"آشوق کیا حرکت ہے۔ کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔"
آشوق فرما کہتے کے پاس سے ہٹ گیا۔ کتے نے بھی اسی میں جانیت جانی کہ دم دبا کر کیا ڈنڈ سے باہر نکل جائے۔ ڈھائی سالہ آشوق نے باپ کی فنگر تھامی اور گھر میں چلا آیا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن پھر مجید صاحب کیا ڈنڈ میں داخل ہوئے تو آشوق اسے کتے سے کھیل رہا تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ لیے کیونکہ مجید صاحب نے کہا تھا کہ کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے اپنے ہونٹ کتے کی نگوئی سے دگڑا لے۔

"ارے ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو۔"
"آپ نے کہا تھا کہ کتے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ میں نے کہا تھا تو نہیں لگا رہا۔"
ڈھائی سال کے بچے سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی شرارت کا جواز اس طرح غشی کرے گا۔ انہوں

کا لے رنگ کا ایک کتا کیا ڈنڈ میں داخل ہوا اور زمین سونگھا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر وہ رک گیا جیسے اس کی مطلوبہ چیز اسے مل چکی ہو۔ اس نے آسمان کی طرف منہ کر کے ایک مخصوص آواز نکالی اور ایک طرف پیٹھ کر اپنے بلاؤں کا اثر دیکھنے لگا۔

آشوق یقین نہیں تھا کہ آج اس کا دوست اس سے ملے اتنی جلدی آجائے گا۔ اس نے جھپٹاؤ ڈال کر کیا ڈنڈ کی طرف بھاگا۔ اس کا دوست کیا ڈنڈ میں آگے چل گیا اس پر لپٹا ہوا تھا۔ آشوق دیکھتے ہی کتا کھڑا ہو گیا اور دم ہلا کر اس کا استقبال کرنے لگا۔ اس کے منہ سے اس وقت بھی کچھ آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کہ رہا ہو یا دم اتنی دیر سے آئے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ آؤ نیلے۔

آشوق اس کے پاس پیٹ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ بچھنے لگا۔ اسی وقت اس کے والد کیا ڈنڈ میں داخل ہوئے۔ آج سب کام وقت سے پہلے ہو رہے تھے۔ اس کے والد مجید صاحب بھی کچھ پہلے گھر آ گئے تھے۔ انہوں نے یہ نظارہ دیکھ لیا تھا کہ آشوق کتے کے قریب بیٹھا ہے اور



نے سید احمدمہر میں جا کر بتا دیا۔۔۔ سب ہی اس پڑے۔
کئی دن تک گھر میں اس کی لہانت کے چہرے
ہوتے رہے۔

مجید صاحب فوج میں سول انجینئر تھے۔ وہ راجپوتوں
کے قبیلے "منہاس" سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دوسری جنگ
عظیم کے زمانے میں فوج میں شامل ہوئے تھے۔ انہوں
نے کچھ عرصہ عراق اور ایران میں بھی گزارا تھا۔ پھر برما اور
بنگال و آسام کے محاذوں پر بھی خدمات انجام دیں جہاں
جاپانیوں کی تباہ کن افواج کا سامنا تھا۔ جنگ کے اختتام پر
انہیں انڈیا میں لے کر آئے اور مرانی میڈل دیے گئے۔
دنیا کے نقشے پر ایک آزاد مملکت پاکستان کے نام
سے وجود میں آئی تو وہ اپنے وطن خاندان کے ساتھ کراچی
آ گئے۔ جہاں ان کا قیام ڈرگ روڈ پر واقع "ایم ای ایس"
کے ٹکوں میں ہوا۔

وہ اپنی تین لڑکیوں کے ساتھ کراچی پہنچے تھے۔ ابھی
تک ان کے گھر میں کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں ان
کے گھر۔۔۔ ایک لڑکا پیدا ہوا۔ تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا
تھا اس لیے فطری طور پر بے انتہا خوشی منائی گئی۔ اس لڑکے
کا نام راشد منہاس رکھا گیا۔ مجید صاحب اسے گھر میں
"آشو" کہہ کر پال رہے تھے۔

کراچی میں انہیں پاکستان ایسٹرن کوآپریٹو ہاؤسنگ
سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس) میں ہزار گز کا پلاٹ بھی ملا
تھا۔ اس پلاٹ پر انہوں نے تعمیر شروع کر دی۔ اس کا نام
انہوں نے "منہاس دلا" رکھا تھا۔

جب یہ بگلا تیار ہو گیا تو ان کی ہوسٹنگ اس وقت کے
شرقی پاکستان کے شہر "جسور" میں ہو گئی۔ راشد منہاس
اس وقت دو سال کا ہو چکا تھا۔ مجید صاحب نے بگلا کرائے
پر دیا اور خود جسور پہنچ گئے۔

شرقی پاکستان (موجود بنگلہ دیش) اپنی دلچسپ
جھیلوں اور بہرہ زاروں کے باعث دیکھنے سے تعلق رکھتا
تھا۔ جسور کا علاقہ خوبصورت جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ مجید
صاحب کو چہرہ ہنس ملی تھی اس کے کیاؤنڈ میں بھی جنگلی گھاس
آگے ہوتی تھی۔ کیاؤنڈ سے باہر بھی دو دو تک جتنا میدان تھا وہ
گھاس سے لڑھکا ہوا تھا۔ میدان میں ایک چھوٹی سی ایئر فیلڈ
بھی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی سامان بردار جہاز کھن گرج کے
ساتھ اتر جاتا تھا۔ راشد جب بھی جہاز کی آواز سنتا دوڑتا
ہوا آتا اور کیاؤنڈ کے جنگل سے لگ کر جہاز کو دیکھتا رہتا۔

اس کی حیثانی پر پڑے ہوئے ڈال ہوا میں لہراتے
رہتے۔

ابن دلوں اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ اس کا لے
کتنے سے کھیلتا جو کیاؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتا تھا اور اس سے اس
کی دوستی ہو گئی تھی یا ایئر فیلڈ پر اترتے ہوئے جہاز کو دیکھتا۔
کچھ دلوں کے لیے ایک کھلونا اور اس کے ہاتھ آ گیا
تھا اور وہ بھی جسور کے قیام کے دوران ہی پیدا ہونے والی اس
کی چھوٹی بہن جسے وہ کسی کو ہاتھ لگاتے نہیں دیتا تھا۔

ابھی اس کے یہ مصوم مشغلے جاری تھے کہ مجید
صاحب کا تہ دلہ بہاول پور (مغربی پاکستان) ہو گیا۔
یہ خاندان شرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کے شہر
بہاول پور آ گیا۔

راشد کی عمر ابھی بہت کم تھی لیکن اس نے بہت جلد چلنا
سیکھ لیا تھا اور عمر سے پہلے ہی خوب بولنے لگا تھا۔ باتیں بھی
ایسی فصاحت کی کرتا تھا کہ بہاولپور پہنچنے ہی بعد صاحب نے
سوچا اسے اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ والدہ کی محبت
رہی اسے اسکول بھیجے میں مانع تھی لیکن اسے اسکول بھیج دیا
گیا۔

ملازمت کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ مجید صاحب کو ایک
ہفتہ تک نصیب نہ ہوتا تھا۔ بہاولپور میں رہتے ہوئے چند ہی
ماہ ہوئے تھے کہ تھادلے کے احکامات آ گئے۔

"کیا بات ہے آپ پریشان کئی نہیں ہیں، دیکھی ہیں
نظر نہیں آتے بلکہ لگتا ہے کہ کھال دسے رہے ہیں۔" بیوی نے
پوچھا۔

"مجھے فکر مند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میری نوکری کی
نوعیت ہی ایسی ہے لیکن لگ رہی ہے کہ آشو (راشد) کو
اسکول میں داخل ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں۔ اگر کچھ عرصہ
وقت مل جاتا تو اس کی بنیاد مضبوط ہو جاتی۔"

"نوجویں کا مقدمہ کیا ہے۔ اب آپ کا تہ دلہ لاہور
ہو رہا ہے۔ وہ ایک بڑا شہر ہے۔ راشد کی تعلیم کا وہاں اور بھی
اچھا انتظام ہو سکے گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اب تم تیاری کر لو۔ ہمارے پاس
زیادہ وقت نہیں ہے۔"

اس خاندان نے ایک مرحلہ پھر سامان اٹھایا اور لاہور
آ گیا۔ یہاں راشد کو کوئین میری کالج کے "گئی" سیکشن
میں داخل کر دیا گیا۔

دو دن بھی تھا اور اسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس

معمولی کلاس سے وابستہ تھے عموماً فضاہ کی کتابوں تک محدود رہتے تھے لیکن وہ گھر میں آنے والے اخباروں کی ورق گردانی کرتا رہتا اور ایک دن اس نے سب کو حیرت میں ڈال دیا جب اس نے انگریزی اخبار "ڈان" کا ایک حصہ پڑھ کر سنا یا۔ اور پھر یہ اس کا معمول ہو گیا۔

ہوائی جہازوں سے اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ شوق اسے اس وقت بھی تھا جب وہ مجھ میں تھا اور گھر کے قریب مال بردار جہازوں کو اترتے اور اڑتے دیکھتا تھا۔ لاہور میں یہ سہولت تو نہیں تھی لیکن لاہور کا آسپان ان جہازوں کی گزرگاہ ضرور تھا۔ وہ ان جہازوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا تھا اور اپنی بڑی بہنوں سے اس عزم کا اظہار کرتا تھا کہ وہ بھی ایک دن ایسا ہی ایک جہاز اڑائے گا۔

"تو تم پائلٹ بنو گے۔"

"جی نہیں۔ مجھے ٹرک چلانے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو فائربولنگ گا۔ اپنا طیارہ اڑاؤں گا اور دشمن کا طیارہ مار گراؤں گا۔"

"تم نے خود کو دیکھا ہے؟" دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔
 "تم بھی کہنا چاہتی ہو کہ میں چھوٹا ہوں۔ بہت چارہ دیکھ لوگی کہ میں چھوٹا نہیں ہوں۔ میں تم دونوں سے بڑا ہوں۔ دیکھ لیتا تم۔"

وہ بڑی شان سے کہتا اور دوبارہ آسمانوں میں جھانکے لگتا۔

اس کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب نے اسے طیاروں سے متعلق چند فلمی کتابیں لا کر دے دیں۔ اب اسے ایک اور مشغلہ ہاتھ لگ گیا۔ ان کتابوں کو بار بار پڑھتا رہتا۔ اب اس کے امدادوں میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہو گیا وہ سینہ پھلا کر کہا کرتا تھا کہ میں نے کئی ترکیبیں سیکھ لی ہیں۔ میں اپنا طیارہ خود بہنوں گا۔

اس کی بہنیں اس سے بڑی تھیں اور ظاہر ہے تعلیم میں بھی آگے تھیں۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس سے آگے ہو اور وہ بھی نہیں جو ہر وقت اس پر دھبہ بھانے رہتی تھیں۔ وہ نہ تو عمر میں ان سے آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ تعلیمی کلاسوں میں۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ وہ خود کو ان سے زیادہ کچھ دلچسپ کرے اور یہ کچھ بوجھ کتابوں ہی سے آسکتی تھی۔ اسے سب سے زیادہ پسند آتے تھے۔ اس کے لیے اس نے حراج سے بھرپور لاکھ پڑھنے شروع کیے۔

کر دیے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے اس کی ایک کمزوری گھردانوں اور خاص طور پر بہنوں کے ہاتھ آگئی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل تھا۔ وہ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہ اختیار ہنسنے لگتا۔

"تم زیادہ زور سے ہنس کر دوسروں کو کیوں دھڑکاتے ہو۔ چپ چاپ کیوں نہیں بیٹھتے ہو۔"

"میں کیا کروں۔ ہنسی کی باتوں پر مجھے تو ہنسی آ جاتی ہے۔"

"دیکھنا ابو کے ہاتھوں کی روز خوب پڑو گے۔"

"مجھے اس وقت بھی ہنسی آ جاتی ہے اگر انہوں نے اگلے سیدھے ہاتھ مجھ پر اٹھائے۔"

دو دن بھی موقع بے موقع ہنسی پڑتا تھا۔ ہنسی کو بند بھی کرنا تو اس کی آنکھیں ہنسنے لگتی تھیں۔ ہنسی کو خیرہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو وہ دولت تھی جسے لانے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اس کی یہ عادت ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔ اس کی اس عادت نے اسے کئی مرتبہ مشکل میں پھنسا یا لیکن وہ ہنست ہی رہا۔

اسے سب سے آگے بڑھنا اور بڑا ہونے کا شوق تھا۔ وہ چاہتا تھا سب اسے بڑا سمجھیں اور اس کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ وہ ایسا سب کچھ کرے جو دوسرے نہ کر سکیں۔ وہ صوفی کہتا ہی نہیں تھا بلکہ ایسے عمل قدم بھی اٹھاتا تھا جس سے اس کی برتری ثابت ہو چاہے اس شہر کے کسی غلام سرور کے پاس سے۔

اس کے ماموں غلام سرور کے پاس سے بچے تھے۔ وہ جب ملازمت کے سلسلے میں لاہور آئے اور مجید صاحب کے گھر میں کچھ دنوں کے لیے ٹھہرے تو راشد کو سنا جی مل گئے اور ان پر دھبہ بھانے کا موقع بھی خوب ملا۔ شرارتوں کے نئے دور داؤد سے مکمل گئے۔

ایک دن تمام بچے گھر میں گئے جہاں کے بڑے کے چچے جمع تھے اور اوپر کی طرف تک رہے تھے جس پر کچھ ہوئے جہاں گئے تھے۔ اوپر جائے بلیم یہ جہاں اتر نہیں سکتے تھے اور درخت پر چڑھنے کی ہمت کسی کی نہیں تھی۔ درخت کی اونچائی اتنی تھی کہ کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا کزن نوسال کا تھا لیکن وہ بھی چنگا ہوا تھا۔ راشد کی عمر اس وقت سات سال تھی لیکن اسے اونچائی سے اور بھی خوف معلوم نہیں ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ درخت پر وہ چڑھے گا۔ سب بچے خوش ہو گئے کہ اب جہاں کھانے کو ملیں گے۔ وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس کی شاخیں ہلاتا رہا۔

میں نے کر دی تھیں اور وہ خوشی سے سرے لگا رہا تھا۔
"کھاؤ پیو خوب جاسن کھاؤ۔"

گھر والوں نے جب سنا کہ وہ درخت پر چڑھا تھا تو اس پر غلبہ ڈانٹ پڑی۔

"میں یہ یہ کچھ نہیں سکتا تھا کہ میرے گھر میں جاسن کا درخت ہوا اور مجھے جاسن سے محروم ہوں۔"

"مگر تم گر جاتے اور بڑی بلی لوٹ جاتی تو کیا ہوتا۔
آجہ سے تم درخت پر نہیں چڑھو گے۔"

"چلو ہم کوئی اور کھیل کھیل لیا کریں گے۔"

اس نے "کھیل" نے یہ شکل اختیار کی کہ راشد نے اپنی چھری دلی بندھ کر نکالی۔ اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور گھر کے کچن میں چڑھوں کا شکار کرنے لگے۔ جب کچھ دیر گزر گئی تو ان کے دل میں ایک دلو کھا خیال آیا۔

"پلو منالی کرنے والی کے کوئلہ پر اٹک کر رہا۔"

دلوں نے پوزیشن سنبھالی اور ملازمہ کے کوئلہ کی طرف بڑھے۔ راشد کے ہاتھ میں چھری دلی بندھ کر تھی۔

وہ اس کارخ کوادر کی طرف کیے ہوئے دبے قدموں آگے بڑھ رہا تھا کہ جیسے ہی دشمن سامنے آئے وہ اس پر اٹک کر رہے۔ اسی وقت ملازمہ باہر نکل اور راشد کی اگلی ٹرنگ پر

دب گئی۔ مگر اسے چھری نکالا اور ملازمہ کے چہرے کو چھوٹا ہوا گزریا۔ پھر ہوئی تھی لیکن ملازمہ نے چیخ مچا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔

بڑوں نے راشد اور شاہد کی اچھی طرح خبر لی۔ مجید صاحب کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو انہوں نے چہ خاں تک راشد کو شاہد کے ساتھ کھیلنے پر پابندی لگا دی۔

یہ پابندی برقرار رہتی لیکن انہی دنوں اس کے ہاموں غلام سرور جو ہر آد سے لاہور آگئے۔ ان کی پہلی لاہور میں تھی لیکن وہ خود جوہر آباد میں تھے۔ پندرہ دن بعد آئے تھے۔

بچوں کے اسکول کی چھٹیاں تھیں لہذا یہ پروگرام بنا کہ سب لوگ جوہر آباد چلیں اور وہاں سے سکس کے بل اسٹیشن چلیں۔

بچے پہاڑی مقامات کی سیر کر لیں گے۔ راشد اور شاہد بھر یک جا ہو گئے۔

جوہر آباد پہنچ کر مل اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں راشد اور شاہد کی شوجیاں سب کا دل بہلاتی رہیں۔ راشد کی جیسی یہ بھی اپنا کام دکھا رہی تھی۔ وہ ہنسنے پر آمادہ ہوتا ہی چلا جاتا۔ یہ تفریق کاموقع تھا اس لیے اس کی بے جا جیسی کسی کو اعتراض نہیں تھا۔

بچے چلی مریجہ کی پہاڑی سلسلے میں سڑک کر رہے تھے

اس لیے یہاں کے العرب مناظر ان کی دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ گاڑی کا شور سن کر خرگوش اور تیز جھاڑیوں میں ادھر ادھر چھپتے پھر رہے تھے۔ راشد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گاڑی سے کود کر ان کا پیچھا کرے۔ اس وقت تو صرف تیسروں پر ہی گزارا ہو سکتا تھا۔

دلی سون میں داخل ہوتے ہی سڑکیں ٹھیک کی طرف اترنے لگیں۔ وہ ڈر بھی رہا تھا اور لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔ اس نے بچے جھانک کر دیکھا۔ دو بچوں میں سلیپ دھواں نظر آ رہا تھا۔ اس کے بڑوں نے اسے بتایا کہ وہ بادلوں کے اوپر سڑک کر رہے ہیں۔ یہ اطلاع ہی اس کے لیے بڑی دلچسپ تھی۔

"ایک دن دیکھتا ہوں میرا اطلاع بھی ان بادلوں سے اندر سڑک رہے گا۔"

"تم اپنے خیال سے گاؤں ضرور چلے آتے۔"

اس کی بہن نے کہا۔

"کیوں نہ ہو؟ میں اب بڑا ہو گیا ہوں۔ طیارہ اڑا سکتا ہوں۔"

اس نے کہا اور دوبارہ داوی میں بھاگنے لگا۔

"کاش! میں مجھے چلا جاؤں اور یہاں کے لوگوں کو دیکھوں۔"

اس کی دعا قبول ہوئی۔ جب گاڑی ملن کھاتی سڑکوں سے ہوتی ہوئی بچے داوی میں آئی تو دلوں گاڑیاں بھرے بازار میں رک گئیں۔ راشد کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ یہاں کے لوگ نہایت مہمان نواز ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر فوج میں جاتے تھے۔ کئی رجا ترقی نہیں ملے جو لب دکانیں چلا رہے تھے۔ مجید صاحب کا تعلق بھی فوج سے تھا اس لیے بھی ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔

سکس پہنچ کر کئی دلچسپی کی چیزیں نظر آئیں جو اس کے لیے ظاہر ہے بالکل نئی تھیں۔

یہ سفر اس کے لیے مطالعاتی سرچا بہت ہوا۔ وہ ایک ایک چیز کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ مجید صاحب کو پہلی مریجہ اس کی اس خوبی کا علم ہوا کہ وہ ہر بات کی گہرائی تک جاننے کا شغور رہتا تھا۔ بچوں میں یہ "بارہ" ہوتا ہے لیکن اس کی تنہید کی پر سب کو حیرت ہو رہی تھی۔

واپس آنے کے بعد بھی وہ اس سفر کے حقائق باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر نشست اپنی دلی کے ساتھ

جنتی تھی۔ وہ فارسی پر عبور رکھتی تھیں اور ادب کا اہم ذوق بھی تھا۔ ان کے پاس بچوں کو سنانے کے لیے بہت سی کہانیاں تھیں۔ ان میں سے بیشتر اسلام کے ان بہادر فرزندوں کے کارناموں پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ راہنما کی کہانیوں کو سننا تھا اور جیتنا سوچنا بھی ہوگا کہ وہ بھی وطن کے لیے اپنی جان قربان کر دے گا۔

اس کی تعلیم کا سلسلہ لاہور کے کوئٹہ میری اسکول کے پرائمری سیکشن میں ہو رہا تھا۔ یہ ادارہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا لیکن اساتذہ اگر بڑے تھے جبکہ راشد کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس کی اس کی کو دیکھتے ہوئے مجید صاحب کے بڑے بھائی عبدالرشید منہاس نے فیصلہ کیا کہ وہ راشد کو اسلامیات اور اردو کی تعلیم دیں گے لیکن جلد ہی مجید صاحب کا تبادلہ کر رہی اور پھر راولپنڈی ہو گیا اور پھر راشد کی اردو ہمیشہ بکثرت پڑھتی رہی۔

وہ چنڈی میں تھا کہ اسے نامیٹا مل جھوٹا۔ طارح کے لیے اسے کہا کہ ٹھہری ہسپتال (سی ایم ایچ) میں داخل کرانا پڑا۔ اتفاق سے انہی دنوں صدر ایچ ب بھی بیمار ہوئے اور اسی ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کی عیادت کے لیے ایئر مارشل صخر خان اسپتال آئے۔ اس بیماری میں بھی راشد کا طبیاروں کا شوق مدد کر آیا۔ صدر ایچ ب کو دیکھنے کی خواہش تو نہیں جاگی لیکن وہ یہ ضد کرنے لگا کہ وہ ایئر مارشل کو دیکھے گا۔ ایئر مارشل تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس کا تالیا داو بھائی منگور منہاس اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے اسے کتھڑوں پر اٹھایا اور ایئر مارشل کی جھک کھالایا۔

"ایک دن میں بھی ایئر مارشل بنوں گا۔" اس نے ہنسنے پر لپٹے ہی کا پتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کا یہ شوق ذہنی نہیں تھا۔ جہازوں سے اس کا عشق جنوں کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہر آنے جانے والے سے وہ جہازوں کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہازوں کے بارے میں اس کی معلومات بھی بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ اس نے کہیں سے جہازوں کے بارے میں بہت سی معلوماتی کتابیں حاصل کر لی تھیں جن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

ان کتابوں میں طیارہ سازی پر بھی کئی کتابیں تھیں۔ ان کو دیکھ دیکھ کر طیاروں کے ماڈل بنانے لگا اور بہت جلد اسے گڑی کے چھوٹے چھوٹے جہاز بنانے کے فن پر عبور حاصل ہو گیا۔ اس کے بنائے ہوئے جہاز آہستہ آہستہ

حرکت بھی کرتے تھے۔ وہ اپنی مادری کو تو یہ سنا رہا تھا کہ جیسے ہی وہ بڑا جہاز بنانے میں کامیاب ہو گیا، انہیں اپنے جہاز میں بٹھا کر کنک لارنڈ لے جائے گا۔

اسی جہاز سازی کے شوق نے اسے یہ شعور دے دیا تھا کہ دشمن کو مار دیا جاتا ہے اور اس میں کوئی عرج نہیں۔ گھر میں ایک طوطا پلا ہوا تھا۔ ایک گھبرائی اس کے پیچھے پڑ گئی تھی اور اکثر اسے تنگ کیا کرتی تھی، راشد کے نزدیک وہ دشمن تھی اور دشمن کو مار دینا چاہیے۔ ایک دن اس نے غلیل اٹھائی اور اس کا کام تمام کر دیا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر خوش ہوا اور اپنے بچا کے پاس بٹھا گیا۔

"بچا جان! یہ گھبرائی میرے طوطے کی دشمن تھی۔ میں نے اسے مار دیا۔ دشمن کو مار دینا ہی اچھا ہوتا ہے۔ مگر یہ بات اچھوتے بتائیے، ہوش مجھے ڈانٹ پڑے گی۔"

"جب گھبرائی کو دشمن کہہ رہا ہے تو تو ڈانٹ سے ڈرتے کیوں ہو؟"

"چلو نہیں لڑتا۔ بتا رہا۔"

"نہیں تم ڈرتے ہو۔ میں نہیں بھاؤں گا۔"

اس نے گھبرائی کو ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

اس کے بہن بھائی اس کے ان افعال کو دیکھ کر کہتے تھے کہ اس کا دھیان مکمل کر رہا ہے۔ جہازوں کے ماڈل بنانے کے سوا اسے کچھ اتنا ہی نہیں۔

اس کی دوستی اپنے خالہ زاد مظہر سے بہت زیادہ تھی۔ اس کے خالو چنڈی میں تھے لہذا مظہر سے اکثر ملاقات رہتی تھی، اپنے دوستی بھی عجیب تھی۔ مظہر اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ مظہر کو انیکٹرکس سے شغف تھا۔ غالباً اس کا بچپن شغف راشد کو اس کے قریب لے گیا تھا۔ وہ انیکٹرکس کے بارے میں ان سے معلومات لیتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ خالو کے گھر گیا۔ مظہر کا ایک ہم جماعت آیا ہوا تھا۔ دونوں اپنی کتاب میں شامل سرکوائر اسکاٹ کی ایک نظم پڑھ رہے تھے لیکن اس کے بعض حصے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ راشد کچھ دیر تو ان کی بے بسی کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بھل دیئے بغیر بند ہو گیا۔

"اگر آپ لوگ کہیں تو اس کی تشریح میں کروں؟"

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تم ابھی یہاں تک کہاں پہنچے ہو گے۔"

"تو کچھ آپ پڑھ رہے ہیں وہ میں سن رہا ہوں اور میرے خیال میں اس کی تشریح میں کر سکتا ہوں۔"

اس نے کتاب ہاتھ میں لی اور تشریح کر دی۔

”جو شخص اپنے وطن سے محبت نہ کرے اسے اذیت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب وہ مرتا ہے تو اس پر ماتم کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، خواہ وہ زندگی میں کتنا ہی بارسوخ کیوں نہ ہو۔“

اسی دن مشہور کو معلوم ہوا کہ اس کا مطالعہ اس کی عمر سے کہیں آگے ہے۔ اس کی عمر تیرہ سال تھی اور وہ ایسی شکل نظم کی تشریح کر سکتا تھا۔

وہ منظر کے دل میں اپنی کامیابی کا سکھ بٹھا کر گھر واپس آیا ہی تھا کہ اس کی بہن نے اسے بتایا کہ خالہ حمیدہ بھی اب پنڈی آگئی ہیں۔ ان کا مستقل قیام وارنک میں رہے گا۔

خالہ حمیدہ کے شوہر ونگ کمانڈر تھے۔ ان کی وردی اور ٹوپی براشڈ کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اگر بھی اس نے لٹرائی جوائن کی تو ایسی ہی وردی اسے بھی ملے گی۔ وہ والدہ کے ساتھ خالہ کے گھر گیا اور یہ سوچ کر خوش ہوا کہ وارنک اور پنڈی کا درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ وہ یہاں تک پڑائی آسکتا ہے۔

وہ ان کے گھر پابندی سے جانے لگا تھا۔ جہازوں اور لٹرائی کے ماحول کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ خالو کے یہاں کوئی بیٹا نہیں تھا لہذا وہ اسے اپنا بیٹا سمجھنے لگے تھے اور گھنٹوں بیٹھ کر طیاروں اور جنگوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ کس طرح ٹیلز کی تربیت ہوتی ہے۔ دوران تربیت انہیں کن کن باتوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس گھر کی صحبت نے اس کے دل میں یہ عزم پختہ کر دیا کہ وہ ضرور لٹرائی جوائن کرے گا۔

ٹاپیٹا کا مرض اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ حیرہ برس کی عمر تک کھینچے کھینچے وہ مرتا ہوا ٹاپیٹا کا شکار ہو چکا تھا جس نے اسے دبلا چلا اور کمزور کر دیا تھا لیکن اس کے عزم اور حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ آرام طلب نہیں بن گیا بلکہ ہمیشہ متحرک رہنے لگا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہوا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتا ہوا۔

فوج میں جانے کا اس کا شوق برابر ترقی کر رہا تھا۔ اس کی عمر بھی اب چودہ سال ہو گئی تھی جو یقیناً ہوش مند کی عمر ہوتی ہے جبکہ وہ ضرورت سے زیادہ سمجھدار تھا۔

لٹرائی اور جنگ اس کے محبوب موضوع تھے کہ

۱۹۶۵ء میں جنگ کو قریب سے دیکھنے کا عملی تجربہ ہوا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اس کے دل میں انڈیا کی طرف سے غارت کا جو جذبہ موجزن تھا اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کا گھر راولپنڈی میں ظری کے چول وید کوٹار کی حدود میں واقع تھا۔ اس کے گھر سے یہ مشکل ڈھالی سوگڑ کے قصبے پر طیارہ شکن توپیں نصب تھیں اور ان سے ڈرا آگے پاکستان کے فوجیوں کے مورچے قائم تھے۔ اس نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ساتھ لیا اور مورچوں پر پہنچ گیا۔ فوجیوں سے جنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور ان کی جرات و حوصلے کی تعریف کرتا رہا۔ اس عزم کا بھی اظہار کرتا رہا کہ اگر اب بھی جنگ ہوئی تو وہ اپنا طیارہ لے کر جائے گا اور دشمن کے طیاروں کو مار گرائے گا۔

وہ ان مورچوں پر تو اتار سے جائے لگا۔ فوجیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی متحرک زندگی کو دیکھ کر سخت متاثر ہوا۔

ان دنوں تک کی لٹرائی دوسری تھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جنگی ترانے نشر ہو رہے تھے۔ بلیک آؤٹ کے اندھیرے میں یہ ترانے گونجنے تو دلوں میں لہو جوش مارنے لگتا۔ وہ گھنٹوں ریڈیو کے سامنے بیٹھا رہتا اور یہ لمحے سن رہتا۔

اے وطن کے بچے جہازوں میرے تھے تمہارے لیے ہیں۔

فوجیوں کی شان میں جس طرح نغمے گائے جا رہے تھے اور جس طرح ہودی قوم اپنی کی مدح سراہی کر رہی تھی اس سے اس کے دل پر غلبہ ہوتا جا رہا تھا کہ جو لوگ وطن کے لیے لڑتے ہیں وہ خاص عزت کے مستحق ہوتے ہیں اور جو اس مادہ میں شہید ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتے ہیں۔

اگر سترہ دلوں کی یہ جنگ نہ ہوتی تو اس کا یہ احساس اس قدر پختہ نہ ہوتا۔ اس جنگ نے اس کی ذہنی تربیت میں زبردست حصہ لیا۔ اس جنگ کی یادگاری زندگی بھر اس کے ساتھ رہی۔

اس جنگ کے دوران میں اس کی نظریں خاص طور پر ٹوٹا کا طیاروں پر رہیں۔ مزاح بھی اس کے کارنامے بھی اسے متاثر کرنے کے لیے کم نہیں تھے لیکن ایم۔ ایم عالم کا تو وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔

جنگ ختم ہوئی تھی۔ اب ان بہادر سپاہیوں کے کارنامے بیان ہو رہے تھے اور ان پر تیسرے کیے جا رہے تھے۔ تحلیلات سامنے آرہی تھیں کہ ان سپاہیوں نے کیا کارنامے انجام دیے۔ راشد ان تیسروں کو غور سے سن رہا تھا۔

”اسکو ڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیق اس دستے کی قیادت کر رہے تھے جو ہواؤں کے بھارتی لٹائی لڑے کو تباہ کرنے روانہ ہوا تھا۔ یہ دستہ صرف تین پرانے سہر طیاروں پر مشتمل تھا۔ ہدف کو نشانہ بنانے سے پہلے ہی بھارتی لٹائیپ کے ایک درجن ہنٹر طیارے اس پر لوٹ پڑے۔ سرفیق نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہنٹر مار گرایا اور دوسرے کا نشانہ لے کر لوٹ پڑے مگر صبح اسی وقت ان کے طیارے کی مشین گنز خام ہو گئیں۔

”یوں اب قیادت قہرے قہار سپرد ہے۔ میری مشین گنز کام نہیں کر رہی ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے یوٹس کے عقب میں دفاعی پوزیشن لے لی۔ وہ اس وقت اپنے طیارے کا رخ پاکستان کی طرف موڑ سکتے تھے لیکن انہوں نے خود کو ساتھیوں کے دفاع کے لیے ان کے ساتھ رکھا اور ہوا بازی کے داؤ بیچ آزما کر دشمن کی سطحوں میں اتھری پھیلاتے رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھیوں نے تین ہنٹر طیارے مار گرائے مگر اس عدوان میں خود رفیق کا طیارہ بھی دشمن کی زد میں آ کر چھلکی ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ اس صبح کے میں یوٹس بھی شہید ہو گئے۔ لاسٹ لیفٹیننٹ سلی چودھری نے ایک اور ہنٹر شکار کرنے کے بعد باقی ماندہ بھارتی ہوا بازوں کو پکڑ دیے اور بغیر وایت واپس آ گئے۔“

اسکو ڈرن لیڈر ایم ایم عالم اپنے پرانے سپر میں سرگودھا کے نزدیک پرواز کر رہے تھے۔ ان کا اسکو ڈرن بھی ان کے ساتھ تھا اور یہ لوگ سرگودھا کے دفاع پر مامور تھے۔ بھارت کے پانچ ہنٹر طیارے لٹائیپ میں سمون ہوئے۔ ایم ایم عالم نے مشین گن کے جن پر دھاؤ ڈالا اور کے بعد دیگرے پانچوں ہنٹر مار گرائے۔ یہ ہوا بازی کی تاریخ میں ایک حاکم اور یکارڈ ثابت ہوا۔

ایم ایم عالم کے اس واقعہ نے راشد کے دل میں شدید تڑپ پیدا کر دی تھی۔

”میں ایم ایم عالم سے بھی زیادہ جہاز گراؤں گا۔“ وہ اکثر کہتا تھا۔

خود راشد کے گھر میں عزم و ہمت کے کئی نصابے دیہرائے گئے تھے۔ اس کے والد کے جاننے والوں میں نوجوان کپٹن نصیر احمد تھے جن کا راشد کے گھر میں آنا جانا تھا۔ بعد میں کپٹن نصیر احمد کی شادی راشد کی بہن فریدہ سے ہوئی۔

کپٹن نصیر احمد نے بھی جنگ خیمبر میں حصہ لیا تھا۔ سالکوت کے نزدیک خضر وال کے گاؤں میں وہ اپنی جان پر تھیں گئے اور نہایت دلیری سے دشمن کا مقابلہ کر کے اس علاقے کو بچا لیا۔ اس دوران میں وہ زخمی بھی ہوئے۔ انہیں ستارہ جرات کا اعزاز عطا ہوا۔

جب وہ اسپتال میں تھے راشد اکثر ان کی عیادت کو جاتا تھا اور جنگ کے واقعات سنا کرتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وطن کی حفاظت کے لیے جان کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہے یہ جنگ نہ ہوئی ہوتی تو اس کے دل میں وطن پر جان قربان کرنے کی حمت اتنی جلدی پیدا نہ ہوتی۔

یہ جنگ اس کی جذباتی زندگی میں ایک اہم موڑ بن گئی۔ اس کے بعد اس کی زندگی اسی جنگ کے تجربے پر گھومتی رہی۔

جنوری 1966ء میں مجید صاحب کی پوسٹنگ کراچی ہوئی۔

وہ چھ سال پہلے کراچی آیا تھا۔ دھندلی دھندلی یادیں اب بھی اس کے دل پر نقش ہیں مگر اب یہ شہر بہت بدل گیا تھا۔ سوسائٹی کا علاقہ بھی پہلے سے زیادہ آباد ہو گیا تھا مگر اب بھی خالی زمین کے ٹکڑے دیکھے جاسکتے تھے۔

مجید صاحب نے ڈارگ روڈ پر سوسائٹی کے قریب انگریزوں کے زمانے میں بنائی گئی بھوکوں میں قیام کیا۔ اس وقت تک وہ بے شہر کتابیں پڑھ چکا تھا۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اس کی معلومات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا بلکہ یہ احساس بھی قزوں ہو گیا تھا کہ اب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ نہ کیا جائے۔ اس کی سمجھ داری اور ہوشیاری کو تسلیم کیا جائے۔ اس احساس نے اس لیے سر اجمارا تھا کہ اس کی نازک جسامت اور بھولی بھالی صورت کی وجہ سے سب اس کے ساتھ بچوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔

بڑی بچوں کی موجودگی اور ان کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے اس کے مزاج میں لڑکوں کا اکثر پن نہیں بلکہ لڑکیوں جیسی ملامت آگئی تھی۔ اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے وہ

ہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شرمیلا واقع ہوا تھا لیکن خوش مزاجی نے اس کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دوستوں کے درمیان اس کی شخصیت رنگا رنگ اور لطیف ہمار نظر آتی تھی۔ بزرگوں کے سامنے منجید رہتا تھا لیکن بچی بچی یہ بھی ہوتا کہ کوئی بچی کی بات ہو جاتی تو اسے اپنی بچی پر قابو نہ رہتا۔

ایک روز گھر میں ایک تقریب تھی۔ تمام بچے جو اب بڑے ہو چکے تھے ایک گوشے میں جمع ہوئے۔ انہوں نے کوئی ایسا کھیل کھیلا جس میں کرسیاں درکار تھیں۔ لڑکوں کے ڈتے کرسیاں لانے کی ڈپولی لگی۔ راشد بھی ایک کرسی لٹا لایا اور خاندان کی ایک لڑکی کو پیش کر دی۔ اس لڑکی نے کرسی قبول کی اور نہایت دل پذیر انداز میں اس سے کہا "تم اب کافی ہوشیار ہو گئے ہو۔ راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے بالآخر اسے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ عمری لڑکی تھی کہ اس کے لطیف جذبوں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ گھر آ کر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔

"عمری زندگی کا عظیم ترین دن۔ اب یہ بالکل بدل گئی ہے۔" یہ لڑکی بہت دن تک اس کے اعصاب پر سوار رہی۔ گھر حروفیات کا انبار ایسا آیا کہ وہ اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ بچی بھی خیال آ جاتا تھا کیونکہ وہ لڑکی اس کی زندگی میں پہلے ہوا کے جھوٹے کی طرح آئی تھی۔ وطن اس کی جھلی محبت تھی۔ اس کی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہوا تھا۔

ہم ہمیشہ ندہ نہیں رہ سکتے
ہمیں ایک دلقہ تو مرنے ہے
تو پھر کیوں شاپے وطن کو دے دیں
اپنی جان جو ہم بہ آسانی دے سکتے ہیں
ایک جگہ لکھا

"ہم نے سوچ لیا ہے کہ ہوائی جہازوں کے نقشہ جات حاصل کروں گا اور پھر ایک حیرت انگیز جہاز بنائوں گا۔" وہ عمر کی ایسی منزل سے گزر رہا تھا جہاں متقی اور مثبت رویے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ بہت سی لاشیں ایک ساتھ جلتی ہیں اور ایک دوسرے کو کاٹتی ہیں۔ جذبات اور عقل ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں۔ "اس لڑکی" کا خیال اسے بار بار آ رہا تھا لیکن وہ اس خیال میں ڈوب کر اپنے مقاصد سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے چلنے سے بڑے بڑے مقاصد تھے۔ اس کی یہ جھنجھلاہٹ خطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ذاتی مفاد کا حصول

میں سے طریقے اپنا کر لیتا تھا تاکہ اسے نہ صرف بڑا لڑکا بلکہ مستعد اور محرک تسلیم کیا جائے۔ کھیل کود سے وہ ہمیشہ دور رہا تھا۔ اس کی کوہ سکانوں میں غرق رہ کر دور کر رہا تھا۔ اس کی لنگی روز بروز چمٹی جا رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات دوسروں تک پہنچا کر اپنی اہمیت منوانا چاہتا تھا۔

وہ ایک روز اپنے خالو کے گھر گیا اور اپنے خالو نے وہاں منظر سے ڈائری کی لکرائش کی۔

"بھائی جان! آپ کے پاس کوئی ڈائری ہے کار پڑی ہو تو مجھے دے دیں۔"

"جہیں ڈائری کا کیا کرنا ہے۔"

"میں جو کچھ سوچتا ہوں، جو کچھ پڑھتا ہوں اس ڈائری میں نوٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"اس سے یہ ہوگا کہ جو میرے خیالات ہیں وہ دوسروں تک پہنچ سکیں گے۔ انہیں معلوم ہو کہ میں کیا سوچتا ہوں۔"

منظر نے بھی زیادہ صلہ و محبت مناسب نہ سمجھی۔ ان کے پاس لپا آئی اسے کی ایک ڈائری رکھی ہوئی تھی وہ انہوں نے راشد کو دے دی۔

کچھ دنوں بعد اس نے وہ ڈائری منظر کو دکھائی بلکہ منظر نے خود دیکھنے کی فرمائش کی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس ڈائری میں بڑی بڑی قطعیتوں کے اقوال درج ہیں۔ یہ اقوال زیادہ تر حب الوطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک جگہ مرغیام کی چھ باغیات کا ترجمہ درج تھا:

میری شکل بڑھتی جا رہی ہے

اسے بچا پائیں ہاں سکا

نہ یہ اب مجھے ساحل پر رہنے دے گی،

میرے دل میں یہ رزا ہے

کہ میری آرزو اس کے قدموں سے

بڑیاں آتا رہی جائیں

کیونکہ یہ قید مجھے کانٹے کی طرح کلکتی ہے

1968ء میں اسے سینٹ پیٹرک اسکول کے کیمبرج

سیشن میں داخل کیا۔ یہ اسکول اس کے گھر سے قریب تھا

اور دونوں چھوٹے بھائی راحت اور انجم بھی اسی اسکول

میں تھے لہذا تینوں بھائی پیدل اسکول پہنچ جاتے تھے۔ اس

کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی لیکن ہر ایک سے

دوستوں کی طرح خوش اخلاقی سے ملتا تھا۔ گہرے دوست نہ

اس کی زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔
 "..... میں اس خیال کو ذہن سے نکال دیتا پسند
 کروں گا۔ میں جہاز بنانے کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔
 پھر اول چاہتا ہے کہ میں بہت سی چیزوں کے خواب دیکھوں
 لیکن میں کوشش کروں گا کہ یہ بیماری چھوٹ جائے۔"
 وہ اس میں کامیاب رہا اور اپنی زندگی کو متحرک کرتا
 رہا۔

وہ ایک دن اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک خبر پر اس کی نظر
 پڑی اور وہ اچھل پڑا۔
 "کراہی میں طیارہ سازی کا پلانٹ لگایا جائے گا۔
 اور اگلے سال اس منصوبے پر عمل شروع ہو جائے گا۔"
 اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ اب اس کے مستقبل
 کا فیصلہ ہو گیا ہے۔

وہ کئی دن تک طیارہ سازی کے خواب دیکھتا رہا لیکن
 پھر اسے احساس ہونے لگا کہ طیارہ سازی اس کی منزل
 نہیں۔ پھر وہ کیا کرے؟ ایک بے نام تنہائی میں جو اس کے
 ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی کے
 رنگین گوشوں کی طرف دیکھ لیا۔ یہ رنگیں گوشے خوب
 لکھیں دیکھنا اور ہونے والی باتوں میں گمانے سنتا تھے۔ شام کا
 وقت اسکول کے لیے گراؤں میں گزرتا۔ وہ دھماکا ڈی
 نہیں تھا۔ یہ شامیں سوشل ایکٹوٹی کے طور پر گزرتی تھیں۔
 رات ہوتی تو کچھ وقت بہنوں کے ساتھ مل سہانے میں گزار
 جاتا۔ پھر وہ اپنے خوابوں کو اڑھ کر سو جاتا۔ اس کی چنے کی
 عادت اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی اس لیے کسی پر ظاہر نہ ہوتا
 تھا کہ وہ کتنا ادا ہے۔ یہ سہانے کزنز کے ساتھ بھی ہوتے
 رہتے تھے۔ وہ اپنی ڈائری میں ان سہانوں کی تفصیل لکھتا
 رہتا۔

"آج ماسوں سرور کے یہاں اس موضوع پر بحث
 ہوتی رہی کہ لڑکیوں کو سائنس میں دلچسپی ہونی چاہیے۔ اکثر حساب کے
 محسوسات میں بھی کمزور پائی جاتی ہیں۔ ہم بارہ بچے ماسوں
 سرور کے گھر سے لوٹے۔ وقت خوب گزرا۔"

طیارہ ساز ایرونائیکل انجینئر بننے کا خواب دیکھنا اس
 نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کیا کرے گا؟ یہ اضطراب اس کے
 ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس بے گنتی سے نجات پانے کے لیے اس
 نے اپنے کزن شاہد کو ساتھ لیا اور کوئٹہ چلا گیا جہاں اس کے
 بہنوئی کیپٹن نصیر فیضیات تھے۔ اس سفر کا مقصد بھی شاہد کی
 تھا کہ شاہد کی خواب کی تعمیر مل جائے۔ بھروسے پرانوں

ماہنامہ مسرگوزشت

میں گھرا ہوا کوئٹہ شہر اسے بہت اچھا لگا۔ چھاؤنی کا ملاقہ شہر
 سے زیادہ خوبصورت تھا۔ صاف ستھری سڑکوں کے کنارے
 خوبصورت درخت قطار اور قطار باہر کھڑے تھے۔ یہاں پہنچے
 ہی اس کی اداسی نے ایک فرحت بخش انگڑائی لی۔ وہ اسٹاف
 کالج کے میڈیٹیم میں گیا اور جدید اسلحہ دیکھا تو اس کے
 خوابوں نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ بہنوئی کے فوجی
 دوستوں سے ملا۔ ان سے دفاع وطن کے موضوع پر خوب
 باتیں کرتا رہا۔ اس کے خواب اسے ہر بار بیدار کرتے
 رہے کہ اسے بھی دفاع وطن کے لیے کچھ کرنا ہے۔ صرف
 طیارے بنانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وطن کا دفاع تو طیارے
 اڑانے سے ہو سکتا ہے۔ شہیدوں کے قصے سے یاد تھے۔
 وہ ذاتی طور پر تیار ہوا تھا کہ اس بار وہ بھی شہید ہو سکتا
 ہے۔ یہاں وہ کراس نے اپنا فوٹو گرائی کا شوق بھی خوب
 پورا کیا اور لیکن بہنوئی کے ساتھ چہ کر لکھیں بھی دیکھیں۔

وہ کراہی لوٹا تو ہمشاش بچش تھا۔ اسکول کھل گئے۔
 زندگی دوبارہ اپنی اگر پر آ گئی۔ ماسوں سرور کے گھر اس کا
 آنا جانا بڑھ گیا تھا کیونکہ ایڈمیکل سیکشن میں اپنی کمزوری
 دور کرنے کے لیے وہ شاہد سے پڑھنے کے لیے جانے لگا
 تھا۔ ایک دن وہ ماسوں کے یہاں گیا تو اعلیٰ سے "اس
 ٹوکی" کے گھر والے آئے ہوئے تھے۔ وہی ٹوکی جسے اس
 نے کھیل کھدوایا تھا کرسی چیل کی تھی۔ ان لوگوں سے مل کر
 وہ ایک عجیب ذہنی کش کش میں مبتلا ہو گیا۔ جسے بھلائے
 ہوئے تھا وہ یاد آ گئی۔ مجھے کیا کرنا ہے؟ وہ ایک مرتبہ پھر
 سوچنے لگا۔ میری منزل "اس" کے گھر تک ہے یا کچھ اور بھی
 ہے؟ اس رات گھر آنے کے بعد اس نے ڈائری میں لکھا۔

"ہم آج ماسوں سرور کے گھر گئے۔ آج ان کے گھر
 میں مجھے کافی عجیب بات سمجھائی ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ
 میں ایک بڑی غلطی کر رہا ہوں اور اب میں اس کے لیے
 کچھ کر رہا ہوں۔ آج میں نے اپنے دل میں پکا وعدہ کر لیا ہے
 کہ میں تین ماہ سے کسی ایک فوج میں جاؤں گا اور
 کبھی نہیں ہچا ہے کچھ ہو جائے۔"

اتحادیات ختم ہو گئے۔ فراغت کی فراغت تھی۔ اس کا
 کزن شاہد بھی سینئر انجینئر کا امتحان دے کر فارغ تھا۔
 دونوں خوب محوم پھر رہے تھے۔ ملی پارک ان کی
 سرگشتیوں کے لیے بہترین جگہ تھی۔ ایک دن نیم بھائی نے
 اسے دیکھ لیا۔ قالہ ایک آدمی مریض اور بھی دیکھا ہوگا۔ نیم
 بھائی اس کی بڑی خالہ کے بچے تھے اور عمر میں اس سے ہیں

اکتوبر 2014ء

سال بڑے تھے اس لیے ہوا حق رکھتے تھے کہ اس سے بچہ بچہ کرتے۔

"میں کئی مرتبہ بچہ چکا ہوں کہ تم بونہی بے کار گھوم بھر کر اپنی بوقت ضائع کرتے رہتے ہو۔"

"بھائی جان کیا کروں۔ اسکول جانا ختم ہو گیا ہے۔ وقت ہی وقت ہے۔"

"اس وقت کو استعمال کیوں نہیں کرتے۔"

"کچھ سنا میں ہیں گھر پر ان کا مطالبہ کرتا رہتا ہوں۔"

"اس وقت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ کسی کالج میں داخلہ لے لو" انہوں نے کہا اور بھر بھر سوچتے ہوئے بولے "تم کسی دن میرے دفتر آؤ۔ میں تمہیں کالج میں تمہارے واسطے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ ایک دن شاہد کو لے کر ان کے دفتر چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نسیم بھائی ابھی آئے نہیں تھے۔

"کیا بھائی سے کہیں بیٹھ کر چائے پی لیں۔ اس وقت تک نسیم بھائی بھی آ جائیں گے۔"

وہ دونوں اگلے دو دو پر ایک پتھان کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران ہی شاہد ایک اس کے دل میں ایک خیال آیا اور بھر بھر سے وہ بے چین ہو گیا۔

کوئی تو تھی جیسا کہ اپنی طرف اشارہ ہی تھی۔

"یار شاہد۔ اس طرف غریب تو چند قدم کے فاصلے پر لیٹر فورس سٹیشن اینڈ انفارمیشن سینٹر ہے۔"

"ہاں ہے۔ تو بھر۔"

"وہاں تک چلتے ہیں۔ مجھے ایک انفارمیشن لینا ہے۔"

"دیکھو۔ نسیم بھائی سے بھی ملتا ہے۔"

"ہیں ہوں گے اور ہوں آئے" اس نے چائے کے کپ کا آخری ٹھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے چائے کے پیے ادا کیے اور سینٹر کی طرف چل دیے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سٹیشن کے لیے درخواستوں کی وصولیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ درخواست دے سکتا ہے۔

وہ ایسا خوش تھا کہ جسے اس نے درخواست بھیجی اور اس کی اس کا سٹیشن بھی ہو گیا۔ نسیم بھائی سے ملنا بھی بھول گیا اور دوڑ دوڑا گھر چلا آیا۔ مگر کچھ ہی اس نے ماں سے ذکر کیا۔

"ایسا ابھی تو تمہارے سینٹر کیمپس کا رزلٹ بھی نہیں آیا۔"

"درخواست تو دے رہا ہوں۔ اس وقت تک رزلٹ بھی آ جائے گا۔"

"میں تمہارے شوق سے واقف ہوں۔ تمہیں جہاز اڑانے کا شوق ہے تو پی آئی اے میں پائلٹ بن سکتے ہو۔"

"ٹوک (رائیڈر) نہ بن جاؤں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعوں پر وہ بھی کہتا تھا۔ پھر اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "ہات صرف جہاز اڑانے کی نہیں ہے۔ میں دشمن سے لڑنا چاہتا ہوں۔ دشمن کا دفاع کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی میں اپنے دشمن کو ہرگز زندگی ہی کیا۔ بے مشغور زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ میرا دشمن یہ ہے کہ میں دفاع دشمن میں حصہ لوں۔ اس کے لیے لڑنا یہ مناسب ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ مجھے وہاں جانے سے نہیں روکیں گی۔"

"میں تمہیں جس قدر دوستوں کی مگر تم اپنے ابو سے مل کر بات کرو۔"

"مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو پھر میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے گا۔ آپ پہلے انہیں ابھی طرح سمجھا دیں بلکہ راضی کر لیں پھر وہ مجھے بلا کر پوچھیں گے تو میں بات کر لوں گا۔"

اس کی ماں نے بیٹے کی یہ خواہش اب تک پہنچا دی۔ مجید صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"جیسا میں تو تمہیں ابھی بتاتا چاہتا تھا۔"

"پہلے میں بھی کیا سوچا کرتا تھا لیکن اب میں نے ہمارا بدل دیا ہے۔"

"کل کو پیارا وہ بھی بدل دے گا۔"

"نہیں۔ یہ فیصلہ میں نے سوچ بچ کر کیا ہے۔ میں برسوں اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں تب اس فیصلے پر پہنچا ہوں۔"

"دیکھو! اس میں خطرے ہی خطرے ہیں۔"

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ اپنے دماغ کے بغیر زندگی نہیں۔ آپ خود بھی زندگی بھر خطروں سے کھینچتے رہے ہیں۔ پھر مجھے کیوں روکتے ہیں۔"

"میں تمہیں روک نہیں رہا ہوں۔ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح نہیں دے

اپنی جاں نذر کروں.....

میر محمد اکرم شہید 14 اپریل 1938ء کو ضلع گجرات کے قصبہ ڈنگھ میں پیدا ہوئے۔ 13 اکتوبر 1963ء کو درہ (سابقہ) شرقی پاکستان میں شہید ہوئے اور پچیس برس قبل فرنگی رجنٹ فورس کی کمان سونپی گئی۔ 1971ء کی جنگ چھڑنے کے وقت وہ ملی جملہ کے اگلے علاقے میں جہاں ہندوستان نے زبردستی اور مسلسل دباؤ ڈال رکھا تھا اپنی کپڑی کی قیادت کر رہے تھے دشمن کی صفائی پس کے قوب خانے ہو کر پندرہ رستوں کو روکے رکھا اور اسے پاکستان کی سر زمین پر ایک ایسی جگہ آگے بڑھنے نہ دیا۔ ایک موقع پر تو دشمن بھر پور حملے کے ارادے سے پارے برقیہ کی فوری لے کر جس کے ہمراہ ٹینکوں کا ایک اسکواڈرن بھی تھا اس کپڑی پر چڑھا یا مگر تعداد اور اسلحہ کے لحاظ سے دشمن کی برتری کے باوجود میر محمد اکرم اور ان کے جیالے جوالوں نے دشمن کو نہ صرف دو مہینے تک دھپ دھپا بلکہ بھاری جانی نقصان پہنچاتے ہوئے اس کے ہر حملے کو ہٹا دیا۔ 24 دسمبر 1971ء کو کئی دن حیدر کے حق دار ٹھہرے۔

دیا گیا جہاں بھاری بارشیں پر ان کا طبی معائنہ ہوا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا جو اسے ملے کرنا تھا۔ اس طبی معائنے کا معیار بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ اپنی مختصر عمر میں شہید ہوا۔ تاہم لا کا فکرا ہو چکا تھا کہ جسٹس جیٹا سے بھی دباؤ چکا تھا۔ اس کی والدہ ڈر رہی تھیں کہ کبھی اس سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ وہ طبی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ شاید کوہنہ سن کر کتنا دھچکا لگے گا۔ وہ بچپن سے یہ تمنا لیے بیٹھا ہے کہ وہ خطائی نہیں جائے گا۔ اے اللہ! اس کی تمنا پوری کر۔

مجھے نے اسے گھر بھیج دیا کہ محلہ کالج گھر کے پتے پر اور سال کر رہے جائیں گے۔ وہ کالج آنے کے ابتکار میں دن بھر کرتے رہے۔ پھر ایک دن اس کی بہن داغوشی نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا۔ خوشی کے احساس سے گھر گھر کاہنے لگا۔ وہ کیڑا تنگ ہو گیا تھا اور اب اسے رسالہ پور چاہا تھا جہاں ایک اور ٹیسٹ سے گزرنے کے بعد یہ ملے ہوا تھا کہ اسے کس گریڈ میں رکھا جائے۔

وہ بی اے ایف اکیڈمی رسالہ بھی گیا جہاں تربیت سے پہلے کا سیلاب ہونے والے نئے کیڑوں کا ٹیسٹ لے کر ان کی درجہ بندی کی جاتی تھی کہ کون کس قابل ہے۔ وہ کیڑا بھی بلائے گئے جو سینئر تھے۔

اسے اس کے گزرنے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ جی سینئر کیڑا ہوتے ہیں اپنے جونیئر کے ساتھ نہایت سخت رویہ رکھتے ہیں۔ لہذا ان سے بچ کر رہنا۔ ان کے ہاتھ میں اپنی کوئی کمزوری نہ دینا ورنہ بڑی دھمکتے ہوئے گئی وہ ہٹا کر آ دیں گے کہ یاد رکھو گے۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ سینئر کو وہاں دیکھ کر وہ کم گما تھا لیکن بہت جلد اپنی اصل حالت پر لوٹ آنے کی اسے عادت تھی۔ وہ پھر

نکلے۔ تم نے ہماری کبھی کوئی بات نہیں مانی پھر میں تمہاری بات کیوں مانوں۔ تم شوق سے درخواست دے دو لیکن ایک شرط ہے کہ اگر درخواست منظور نہ ہوئی تو پھر تمہارا دوسرا آپشن ایکسٹرنل ہوگا۔

”مجھے یقین ہے کہ میری درخواست منظور نہیں ہوگی۔“

اجازت ملنے ہی اس نے درخواست دے دی۔ سینئر کیمرج کا رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اس کا رزلٹ شائع ہوا تھا لیکن درخواست کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ اس نے اس ایم سائنس کالج میں داخلہ لے لیا کہ بی اے ایف کی جانب سے درخواست کا جواب آنے تک اس کا وقت ضائع نہ ہو۔

باید صاحب ریٹائر ہو گئے اور یہ قائد ان اپنے ذاتی بچے منہاس رانا میں منتقل ہو گیا۔ اس نے اس ایم کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ کالج میں اردو کا مضمون بھی تصاب میں داخل ہے۔ اب وہ اپنی کمزور اردو کو درست کر لے گا لیکن اسے یہ موقع نکل سکا اور خطائی کی جانب سے استروپو کال آگئی۔

اس نے استروپو دیا۔ اعلیٰ جینس ٹیسٹ کے علاوہ میڈیکل بھی ہوا۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد اسے اس قابل سمجھا گیا کہ وہ ایمر سرو سٹیشن بورڈ (آئی ایس ایس بی) کا سامنا کرنے کو ہٹا جائے۔ وہاں دوبارہ استروپو ہوا۔ آئی کیو اور جسمانی اہلیت کے علاوہ قائدانہ صلاحیتیں بھی چاہی گئیں اور پھر بورڈ کے سامنے پیش ہونے والے دوسرے لڑکوں کے ساتھ اسے بھی داخل کر لیا گیا۔

ماہنامہ ستر گزشت

سے داخل ہو گیا اور اکیڈمی کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں ایئر لیڈ موجود تھی۔ طہارے تھے۔ اسے یہاں چار پختے مسلسل قیام کرنا تھا۔ وہ محروموں کو خط لکھتے بیٹھ گیا۔

"یہاں مجھ کو پاس ہونے کے لیے سخت محنت کرنی ہوگی اس لیے شاید آپ کو اتنے خط نہ لکھ سکوں۔"

اب انہیں ایک ہفتہ خصوصی کلاسوں میں جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں معلومات حاصل کرنی تھیں اور پھر دس ہفتہ کھینے کی اذان کا دورانیہ چھوٹے چھوٹے وقتوں میں پیدا کرنا تھا۔

وہ سمجھتا تھا جہاز کی ساخت اور مشینری کے بارے میں جاننے کے لیے اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن اس کا یہ خیال جلد ہی غلط ثابت ہو گیا۔ اس نے کچن سے اب تک جہازوں کے بارے میں جو معلومات حاصل کی تھیں، مکمل تیاری اس سے کہیں زیادہ دشوار تھی۔ ایسی سینکڑوں اصطلاحات تھیں جن سے وہ بالکل ناواقف تھا۔ اس نے سخت محنت کی اور جب ایک پختے بعد امتحان ہوا تو وہ تمام ٹوکوں سے باز رہ گیا۔

اب پروگرام کے مطابق فلائنگ کا آغاز کرنا تھا لیکن موسم کے حیر بدل گئے اور یہ پروگرام کچھ دنوں کے لیے تاخیر کا قار ہو گیا۔ تمام لڑکے فلائنگ لائن کے پاس جاتے اور دن بھر وہیں بھرے رہتے۔

اس نے ابھی تک کیڈٹ کٹ ہال نہیں کھوائے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ مل ہو گیا تو خواتین کو کراپی جا کر بند رہیں کر گھومنا پڑے گا اور اگر پاس ہو گیا تو بیٹھ پلٹ کٹ رہنا پڑے گا لہذا کچھ دن کیش کے ہیں وہ گزریں۔ جو نیئر زچنگ ابھی تک منتخب نہیں ہوئے تھے اس لیے انہیں بہت سی رہائشیں حاصل تھیں۔ اس لیے بھی کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن ایک روز وہ ایک سینئر کے ہتھے چڑھ گیا۔

"اور ابھی تک تم نے ہال نہیں کھوائے۔"

"میں ابھی منتخب نہیں ہوا ہوں۔ اس لیے میری مرضی۔"

"یہاں تمہاری نہیں جلدی مرضی چلتی ہے۔"

"جب تک میں منتخب نہیں ہو جاتا۔ تمہاری مرضی نہیں چلے گی۔ تم مجھے وارننگ دے سکتے ہو مگر انہیں۔"

"یہ تم ابھی دیکھ لو گے۔"

کئی سینئر زبردستی اسے حمام کے پاس لے گئے۔ وہاں سے وہ اس رست میں اپنے کمرے تک واپس آیا کہ اس کے ہال کئے ہوئے تھے۔ اس کا دم بیٹ طارقی اچھل پڑا۔

"میرا رجسٹر لکھ لکھ لایا ہے مگر۔"

"اذا لو میرا حلق۔ جب تم بھی سینئر کے ہتھے چڑھو گے تب پوچھوں گا۔"

"بھائی یہ طارقی ہے طارقی۔ میرا سینئر کچھ نہیں ہگاڑ سکتے۔"

دوسرے دن دن طارقی ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہا تھا۔ ایک سینئر نے اسے دیکھ لیا۔ وہیں سے بھاڑ کر حمام کے پاس بھیج دیا۔ کھانا بھی اچھوڑا رہ گیا اور ہال بھی آدھے چلے گئے۔

راشد کھانا کھانے کے بعد کمرے میں آیا تو طارقی کو بندر بنا بیٹھا دیکھا۔

"کیوں طارقی صاحب۔ تم تو طارقی تھے۔ تمہارا سینئر کچھ نہیں ہگاڑ سکتے تھے۔ میرے کیا ہو گیا۔"

"یاد رکھو ہم کامیاب ہو گئے تو سینئر کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ بس یہ سوچ کر چپ ہو گیا۔"

"دیکھو ایک بات ہے تم مجھ سے بڑے بندر لگ رہے ہو۔"

دونوں کے تپہوں سے کمر اٹھ گئے۔

فلائنگ ٹیسٹ کا آغاز ہوا۔ طہارہ انٹر کوری چلا تا تھا اور امیدوار ٹوکوں کو یہ ثابت کرنا ہوتا تھا کہ وہ کدے دھاؤ کو برداشت کر سکتے ہیں۔ سب ٹوکوں کے لیے اس دھاؤ کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ راشد کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔

تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ راشد بھی دوسرے ٹوکوں کے ساتھ واپس کراپی آ گیا۔

اب اسے حتی باوے کا انتظار تھا۔ کمرہ بلی کر اپنے کارناموں کو بڑھا چھا کر پیش کرنے کے سوال سے کوئی کام نہیں تھا۔ زیادہ تر وقت انہیں دیکھنے اور مطالعہ میں گزارنا تھا۔ اس کے پاس ڈائری لکھنے کے لیے بھی بہت وقت تھا۔ بھی لکھی وہ یہ سوچ کر کہ اس بھی ہو جاتا تھا کہ اگر لیل ہو گیا تو کیا ہوگا لیکن حادثہ کے مطابق جلد ہی اپنی اصل حالت پر لوٹ آتا تھا۔

چینی مور بے چینی کے بدن بھی گزر گئے اور حتیٰ بہادر
آکھیا۔ اس کا نام تربیت حاصل کرنے والوں میں شامل کیا
'جاچکا تھا۔ اسے "لوئر لوپ" جا کر ایک سال کی تربیت حاصل
کر لی تھی۔ پھر دسایہ اور جا کر تیسری، چوتھی اور پانچویں درجہ
کے امتحانات دے رہے تھے۔ پھر کہیں جا کر اسے بی ایس سی کی
ڈگری اور تھانہ کی گریجویٹیشن کا اعزاز ملا اور وہ پائلٹ وافر
ہوا۔ اسے اپنی قابلیت پر پورا اعتماد تھا۔ اسے چھین تھا کہ اب
اس کا خواب پورا ہو جائے گا۔

لوئر لوپ پہنچے ہی اس کا دل بار بار ہلکا ہوا گیا۔ گرد و پیش
میں پہاڑی جنگل کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اتنی پر کشمیر کی
برف پوش چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک بے شمار
عدی تالے اور پہاڑی جھٹے بکھرے نظر آتے تھے۔ ان
دلوں بارشیں ہو رہی تھیں، لہذا تمام عدی تالے جو لانی پر
تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں کینڈوں کا ابتدائی ٹریننگ مرکز
قائم کیا گیا تھا۔

وہ نہ جانے کب تک ان مناظر سے لطف اُوروں ہوتا
لیکن جلد ہی بے کینڈوں کو سینٹروں نے آدھو چا، کینڈوں
کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بکس تھے۔

"اپنے اپنے بکس سروں پر رکھ لو اور فراگ جب
(میٹنگ کی طرح اچھلتے ہوئے) لگاتے ہوئے سامنے والی
پہاڑی پر چڑھو۔"

ان سب نے حکم پر عمل کیا۔ راشد نے بھی اپنا بکس
اپنے سر پر رکھا اور فراگ بکس لگاتے ہوئے اوپر چڑھنے
لگا، یہ تقریباً 72 فٹ سینے جیسے جنہیں ملے کر کے اوپر پہنچنا تھا۔
وہ اوپر پہنچتے پہنچتے کئی مرتبہ گرا اور اچھی طرح کچھڑ میں لٹ
ہت ہو گیا۔ کئی حالت دوسرے کینڈوں کا بھی تھا۔ سینٹرز بھی ان
کے ساتھ اوپر آئے اور ان سے کئی دردناک حقیقتیں
کراہیں۔ بقول فیضے جوڑ جوڑ ڈھینا کر دیا۔

اللہ اللہ کر کے سینٹرز سے جان چھوٹی تھیں سے برا
حال تھا اب اس کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اپنے
گھر سے میں جا کر بستر پر دراز ہو جایا جائے۔ گھر سے
میں پہنچ کر اس میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ کپڑے تہہ بٹی کیے
جاتے۔ صرف جوڑے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ بدن
کا ایک ایک جوڑہ درد کر رہا تھا۔ یہ ابرو والے چنگ پر اس کا
روم میٹ طاری لینا تھا۔

"طاری۔"

"ہوں۔"

حاجنا مسرگزیشت

"میں سوچ رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ سینٹرز رات کسی
وقت دوبارہ آجائیں اور میں دوبارہ رگڑاؤں، ابھی ان کا
دل بھرا نہیں ہوگا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"تو بھائی تمہاری قم جانو۔ میں تو چنگ کے نیچے
سوتے جا رہا ہوں تاکہ سینٹرز آئیں تو خالی چنگ دیکھیں۔
میری جان تو فگ جائے گی۔"

طاری کھانا کھا، مذاق کر رہا ہے۔ لیکن راشد کچھ
چنگ کے نیچے چلا گیا۔ بستر جیسی ٹینڈ ٹنگے فرش پر کہاں آنے
والی تھی۔ کھدیر کر دیکھیں بدلتا رہا۔ ٹینڈا کھسوں میں چھو رہی
تھی لیکن فرش سوتے نہیں دیتا تھا۔ بالآخر رہا نہیں گیا۔ وہ
دوبارہ بستر پر آ گیا۔

لوئر لوپ میں یہ اس کا پہلا دن تھا جو نہایت تھکا دینے
والا ثابت ہوا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو تمام لڑکوں کو دو
اسکواڈروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ طاری سے اس کا ساتھ
چھوٹ گیا کیونکہ طاری اسکواڈرون نمبر 1 میں تھا لہذا اسے
دوسرے گروپ میں جانا پڑا۔

اس کے بعد انٹری ٹیسٹ بھی دینا پڑا جس سے ان کی
اہلیت کا اندازہ لگانا مقصود تھا۔ راشد نے اس ٹیسٹ
میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

پہلی ٹرم کا آغاز ہوا۔ اس ٹرم میں انہیں جسمانی طور
پر مضبوط کرنا تھا۔ اس کے لیے ڈرل کے علاوہ شام کے
دقت پائی بھی ہوتی تھی۔

ڈرل بہت سخت مرحلہ تھا۔ اگر کسی کیلٹ کی آنکھ کی
پتلیاں بھی مل جاتیں تو اسے پکڑ لیا جاتا اور سزا کے طور پر
اسے تین میل دوڑنا پڑتا تھا۔ راشد اس صورت حال سے
سخت پریشان تھا۔ اس کی بچپن کی کمزوری ابھی تک برقرار
تھی یعنی وہ اپنی فسی پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ اسے ڈرل
سار جٹ کی حرکات و سکنات پر اکثر فسی آ جاتی تھی۔ اسے
تقریباً دو سزا بھگتی پڑتی تھی۔ سینٹرز کو اس کی کمزوری معلوم
ہو گئی تھی اس لیے اس پر خاص طور پر نظر رکھی جاتی تھی اور وہ
پکڑا جاتا تھا۔ شامت تو اس وقت آئی جب سزا کے بعد
اسے دوبارہ ٹھہر میں کھڑا کر دیا جاتا اور حکم دیا جاتا کہ اب
سب خاموش رہیں گے اور کوئی نہیں سکرائے گا۔ اس اعلان
کے ساتھ ہی پہلے اس کی آنکھیں چلتیں اور پھر ایک جاندار
سکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی اور وہ پھر سزا کا

اگست 2014ء

[37]

سستی قرار پاتا۔

معاذ بھی ایک مطلب سے کم نہیں تھا۔ وہاں جوڑے تھیں غرض ہر شے اس کی زد میں آ جاتی۔ وہاں پر ذرا اس بھی بلی ہوئی تو بس شامت آ جاتی۔ کالرز راز مینا ہوتا تو اگلی اہل کر بن کر ڈر دیا جاتا۔ شیعہ تک پرش اچھی طرح دھلا ہوا ہو۔ سٹیٹ راج میں ایک ہال بھی نظر نہ آئے۔ راشد البتہ اپنی بکھیروں سے آزاد تھا کیونکہ راشد کے ابھی شیوہ نہیں آئی تھی مگر وہ یہ سوچتا ضرور تھا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

تفریحات کے مواقع بھی نکلنے رہتے تھے لیکن مشکلات یہاں بھی تھے جسے راشد پسند نہیں کرتا تھا۔ خاص طور پر سینئر کی برتری اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن وہ ان کی حکم برداری بھی نہیں کر سکتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ اس سخت گیر ماحول کا عادی ہوتا گیا۔ برسات شروع ہوئی تو انہیں کچھ آرام مل گیا۔ یہ عرصہ خوب بٹے گلے میں گزرا۔ البتہ فرصت ہوئی تو گھر بہت یاد آنے لگا جسے وہ سچ یادوں کی طرح ذہن سے جھٹکتے لگا۔ اکیلے میں خوب ہنسا اور اپنا دل خود پہلا تار پتا۔

اسے پہلی تنہا ہوئی تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ یہ اس کی پہلی ذاتی کمال تھی اور بڑی محنت کی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں سے کچھ پیسے بچا کر اپنے گھر بھیجے گا لیکن MESS (میس) کا مل آتا ہو گیا تھا کہ مل ادا کرنے کے بعد گھر بھیجنے کے لیے پیسے باقی نہ رہے۔

جیسے جیسے وہ پرانا ہوتا جا رہا تھا سینئر کے رگڑوں کی شدت میں کمی آنے لگی تھی۔ شام کے وقت باہر جانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ ساتھیوں کے ساتھ کھونٹے نکل جاتا تھا۔

نقشبہ ٹیسٹ ہوتے رہے، ان میں جسمانی ٹیسٹ بھی تھے اور نفسی بھی۔ اس کی کارکردگی شاندار رہی۔ وہ گاہے گاہے پنڈی جا کر رشتہ داروں سے بھی مل آتا تھا۔

اسی دوران میں اسے معلوم ہوا کہ اس کی والدہ لاہور آ رہی ہیں۔ ٹرینگ ونگ میں وہ دن کی چھٹی بھی تھی لہذا وہ جاسکتا تھا۔ فضائی سفر کا انتظام بھی ہو گیا لہذا وہ لاہور پہنچ گیا۔ والدہ سے بہت دنوں بعد مل رہا تھا۔ ان کا دل بڑھانے کے لیے اپنی کامیابیوں کے قصے سناتا رہا۔

وہ صرف دونوں کے لیے آیا تھا یہ دونوں گزر گئے کہ پتا ہی نہ چلا اور وہ ٹرینگ ونگ ونگ واپس آ گیا۔ سردی

کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

انہی دنوں سینئر کو دس اپنی فرم پوری کر کے سابلیم چلا گیا۔ ان کی جگہ نئے کپٹن آ گئے۔ اب نئے آنے والے جو نیئر ہو گئے اور راشد اور اس کے ساتھی سینئر ہو گئے۔

سینئر ہو جانے کے بعد راشد کوئی پریشانی لاحق ہوئی۔ اس کے ہنسنے مسکرانے کی عادت ابھی تک قائم میں نہیں آئی تھی۔ جس وقت وہ اپنے جو نیئر زکوہ گزرا دے رہا ہوتا تھا چانک اس کی ہنسی نکل جاتی۔ اس کے ساتھی بے حد جھلاتے تھے۔ اور پھر یہ ہوا کہ رگڑا دیتے وقت راشد کو رہاں سے ہٹا دیا جاتا۔

راشد نے مشکلات پر قابو پالیا تھا لیکن یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ وہ اب بھی کم عمر نظر آتا ہے کیونکہ اس کے چہرے پر رواں تو آ گیا تھا شیعہ نہیں آتا تھا۔ اس نے گھبرا کر شیوہ کرنا شروع کر دیا تاکہ جلدی ہال نکل آئیں لیکن اس کا اثر نکلا ہوا۔ وہاں بھی صاف ہو گیا البتہ مزید کم عمر نظر آنے لگا۔ وہ پھر بھی شیوہ کرتا رہا۔

پہلی فرم ختم ہوئی تو وہ چھپاں گزرا دے کراہی آ گیا۔ پانچ ماہ بعد اپنے گھر میں قدم رکھتے ہوئے اسے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ کامیابی کا نشہ بھی تھا اور اپنے بڑے ہونے کا احساس بھی۔ گھر کی ہر چیز بھی بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ جس طرح کی زندگی وہ گزار کر آ رہا تھا وہ گھر کی زندگی سے مختلف تھی۔ اس کے دوسرے بھائی اسے غیر مستحضر اور ڈھیلے خانے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سینئر بن کر انہیں رگڑا دے۔

مزید واقعات اب اسے پچھلے سے زیادہ اہمیت دے رہے تھے۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ اب اس کی باتوں کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس سے کپٹن لائف کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے اور جو کچھ وہ بتا رہا ہے اسے سب غور سے سن رہے ہیں۔ کوئی اس کا خالق نہیں اڑا رہا ہے۔

چھ ہفتوں کی چھپاواں چلک بھیجتے گزر گئے اور وہ دوبارہ نوٹرو پہنچ گیا۔

اب وہ افسانہ برس کا ہو چکا تھا۔ اسے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا لیکن پھر بھی مطالعے کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بہن کو خط لکھا۔

”کچھ عرصے سے میں خامے متنوع موضوعات کے بارے میں پڑھتا رہا ہوں۔ میں اب کہانی کے طور پر لکھیں پڑھتا جیسے میں پہلے کیا کرتا تھا۔ بلکہ اب میں ذہنی

سہل کے بچے کیسے خوش ہو سکتے تھے۔ بڑھ کر ادھر ادھر ڈال دیتے تھے۔ بڑے اس لیے خوش ہو جاتے تھے کہ ان کا بیٹا انہیں بھولا نہیں ہے۔ اتنی مصروفیات میں بھی انہیں یاد رکھتا ہے۔ ان غلطوں سے انہیں یہ فکری بھی ہوتی تھی کہ ان کا بیٹا ان کا نام روشن کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے اسے ایک خط میں لکھا تھا۔

”جئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور پوری ایمانداری سے کام کرو تو ہر کام میں کامیابی ملے گی اور جس شوق سے تم ایئر لائن میں گئے ہو، مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل و کرم سے اتنا اعلیٰ اور کامیاب سفر بنائے گا جس پر پورا خاندان فخر نہیں بلکہ پورا پاکستان فخر کرے گا۔“

یہی باتیں وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو کر رہا تھا۔
 ”ایک ایسا انسان بنو کہ لوگ تم پر فخر کریں۔ رہنما میر عزیز بھائی! چہل قدمی عظیم کی طرح تم پر فخر کر سکیں۔“
 جو کچھ وہ اپنے لیے سوچ رہا تھا دراصل وہی اپنے بھائیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ وہ اس سے چھوٹے تھے اور بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے انہیں سمجھاتا اپنا حق سمجھتا تھا۔ جو صفات غرور اس میں تھیں وہی اپنے چھوٹوں میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم خود غرضی یا او جیسے بین کا مظاہرہ مت کرو۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے بگڑا منہ مٹا کر سے کام مت لو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی اس خوبی سے غور و مت ہونا جو تم دونوں میں موجود ہے یعنی وہ ٹوک ہونے کی صفت۔ اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہوگی ہے تو ہوتی ہوگی۔ بھلا کوئی تمہارا کیا ہکا بھکا ہے لیکن اگر تمہیں اس پر شرمندگی کا احساس ہو جائے تو اس کا اظہار بھی کرو اور معافی مانگ لو۔“

اس وقت ان غلطیوں کی اہمیت کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ صرف یہ خط ہی یاد رہ جائے گا۔

دس جنوری 1970ء کو تیسری طریم کا بھی اختتام ہوا۔ اس حرج اسے صرف دس دن کی پھٹی ٹی تھی۔ یہ دس دن اس نے بڑے بھائی کی حیثیت سے کراچی میں گزارے اور چھوٹے بھائیوں کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا رہا۔

نورجہ طریم میں لاناٹک بھی شروع ہونے والی تھی۔

راشد کو اس گھڑی کا شدت سے انتظار تھا بلکہ یوں کہاں جائے کہ بچپن سے انتظار تھا۔

وہ لاناٹک کو آسان سمجھ رہا تھا لیکن یہ اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے لیے پڑھائی کو پس پشت ڈال کر ساری توجہ ہوا پڑی پر مرکوز کر لی پڑی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض کیتھولوں کو نال تراردے کر فضا میں رخصت کیا جا رہا ہے۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ اسے مراحل طے کرنے کے بعد کسی کو نال تراردے دیا جائے۔ اسے خود براحتہ تھا لیکن پھر بھی وہ کاپ اٹھا۔ اگر وہ اس مرحلے پر ٹھہر چلا گیا تو کس منہ سے جائے گا۔ یہ پروازیں انٹر کنٹر کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لیے غور کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا تھا البتہ بعض غور و خوض ایسے تھے جن سے قوت ارادہ کی ہی سے قابو پایا جاسکتا تھا۔ وہ پہلے دن تربیت کے لیے روانہ ہوا اور جہاز سے قبل آف کیا تو اسے ہکا بھکا کیا۔ بچے بین کا احساس ہونے لگا۔ تیزی سے کوئی چیز زمین سے آسمان کی طرف جائے تو اس کیفیت کا ہونا لازمی ہے۔ بعد میں پائلٹ اس کا تجربہ ہو جاتا ہے لیکن اسے پائلٹ کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس کیفیت پر وہ کتنی جلدی قابو پایا ہے یا ہکا بھکا آنے کی شدت کتنی ہے۔ راشد کا سر ہکا بھکا ضرور لیکن یہ کیفیت اس کے قابو سے باہر نہیں ہوئی اور وہ انٹر کنٹر کے منتظر رہا۔ کس سے بھاڑا۔ آٹھ آٹھ دس منٹ کی چھ پروازوں کے بعد اس نے اس کیفیت پر قابو پایا۔

لاناٹک کے دوران میں اسے ہوجانا بھی نا اعلیٰ کا بڑا سبب تھا۔ بعض کیتھول اپنی اس کمزوری پر قابو نہ پاسکے اور نال ال ہو گئے۔ راشد نے اس سے بچنے کے لیے یہ ترکیب وضع کی کہ پرواز کے وقت خالی پیٹ رہنے لگا حالانکہ انٹر کنٹر کی ہدایت تھی کہ کوئی کیتھول خالی پیٹ پرواز پر نہ جائے۔

تفصیلات میں 180 کیتھول لاناٹک کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد انہیں ”سولو“ یعنی تنہا پرواز کی اجازت مل گئی۔

وہ دن اس کی زندگی کا یادگار دن تھا جب اسے پہلی مرتبہ تنہا پرواز کے لیے روانہ ہونا تھا۔ انٹر کنٹر کی موجودگی کے بغیر وہ اکیلا جہاز اڑائے گا۔ یہ خیال اعلیٰ سے خوش کرنے کے لیے بہت تھا۔ دوسرے کیتھولوں کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ پہلی مرتبہ جب تنہا پرواز کی جاتی ہے تو سخت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ عمل بھی کتنی تھی کہ کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور ہوتی ہوگی لیکن اسے ادا بھی ادا محسوس نہیں ہوا۔ ہدایت کے

مطابق آٹھ دس منٹ لٹا میں رہنے کے بعد اسے بچے آنا چاہا اس جسم کی چھوٹی چھوٹی پروازوں کے بعد اسے پورے ایئر میں کا پکڑ لگانے کا سوسچ دیا گیا۔ اسے "سرکٹ" کہتے تھے۔

جب وہ سیدھی سیدھی کچی پروازیں کر چکا تو اسے مختلف کرتب سکھائے گئے۔ یہ بھی تربیت کا حصہ تھا۔ کسی طرح جہاز کو تھکا ہوا ہی کھاتی ہے۔ چلتے چلتے کسی طرح ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ کسی طرح بچے آنا ہے، کسی طرح اچانک اوپر چلے جاتا ہے۔

پورے تھرم نظام ہو چکی تھی۔ گویا اب منزل بہت قریب آگئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے مگر جانے کا موقع مل گیا۔ اسے ایک ماہ کی رخصت ملی تھی۔

اسی مرتبہ یادہ دن رہا تھا اس لیے اس نے رسالہ پور کی یاد تازہ کرنے کے لیے فوج اور فضائیہ کے نامور سپاہیوں کی تصویریں اس کمرے کی دیواروں پر چسپاں کر دیں جو تینوں کھانچوں کا مشترکہ کمرہ تھا۔ اس کی والدہ نے دیکھا تو بہت خفا ہو گئی۔

"راشد! کوئی دیواروں پر تصویریں چپکا تا ہے۔

اب انہیں اکھاڑ دے تو سب چنٹ ٹراپ ہو جائے گا۔ تمہارا بچپن ابھی کیا نہیں ہے۔ یہ سبیں آخر سوچیں گی کیا تھی۔"

"اُمی جان یہ میں نے بڑا دلچسپ کیا ہے۔ یہ میں نے

راحت اور انجم کے لیے کیا ہے۔ یہ دونوں ٹھیک گود

میں بچے رہتے ہیں ان تصویروں کو دیکھیں گے تو ان کے دل میں بھلائی کے کام کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔"

وہ جب یہ بھی تھا تو اپنی بہنوں فرزانہ اور رخسانہ پر

اپنی طبیعت کا رعب ڈالتے کے لیے ان سے ہنکڑ مار رہا تھا۔

اسی مرتبہ وہ آیا تو اس میں یہ تبدیلی آئی کہ اپنی زنت

دادیوں کو محسوس کرنے لگا۔ اسے یہ احساس شدت سے

ہونے لگا کہ بہت جلد یہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی

جا جائیں گی۔ یہ تو مہمان تھا ان سے کیا لڑنا۔ مجھے تو ان کی

شادیوں کے لیے بہت سارا دیا کھانا ہوگا۔ لڑکا بوجھ لگا

کرنا ہوگا۔ اس دوسرے میں وہ اکثر ماں کے پاس بیٹھ کر

فرزاتہ اور رخسانہ کی شادی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔

اس نے ایک دن باتوں باتوں میں والدہ کے سامنے

"اس لڑکی" کا ذکر پھیر دیا۔ "اس لڑکی" کے گھر والے

راشد کی والدہ کے لیے اچھی نہیں تھے۔ ان گھرانوں کا

عرصے سے انہیں میں رہنا چاہتا تھا لیکن والدہ کو یہ معلوم نہیں تھا

کہ راشد اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔

"تم اسے کب سے پسند کرنے لگے ہو۔"

"ایک قریب میں اس نے میری تعریف کی تھی پھر

مجھے لایسٹ دی تھی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کوئی مجھے

اہمیت نہیں دیتا تھا۔"

"پس اتنی ہی بات پر تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ تمہیں پسند

کرتی ہوگی۔ اس نے رسالتہاری تعریف کر دی ہوگی۔"

"نہیں اُمی جان وہ جب بھی لکھی ہے میں نے اس کی

آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی دیکھی ہے۔"

"یہ تمہارا اندازہ ہو سکتا ہے جو ممکن ہے لگتا ہو۔"

"میرا اندازہ لگتا ہو سکتا ہے لیکن میں لگتا نہیں ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے لیے ایک مناسب لڑکی رہے گی۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو راشد؟"

"میں ہر وقت مذاقی نہیں کرتا۔"

"تم ابھی فریٹنگ پر ہو راشد۔ تم یہ خوب ابھی سے

دیکھنے لگے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔"

"مجھے جلدی نہیں ہے۔ شادی تو میں فضائیہ کا افسر

بننے کے بعد کروں گا۔ ابھی آپ لوگ کوئی بات دات تو

کہہ سکتے ہیں ورنہ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہو جائے گی۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔ لڑکی تو وہ مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔"

اس جنت اتنی ہی بات ہو سکتی تھی۔ راشد نے ضد کرنا

مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں بڑوں کو

سوچتے دیکھنے کا موقع دینا چاہیے۔

اس کی والدہ نے مجید صاحب سے تذکرہ کیا۔ اس کی

سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی حیران ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک

مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی۔

"اس عمر میں سارے لڑکے اسی طرح سوچتے ہیں۔

یہ کم عمری کا جنون ہے پھر کچھ نہیں۔"

"وہ بہت سنجیدہ ہے۔"

"مگر پر خالی بیٹھا ہے اس لیے سنجیدہ ہے۔ فریٹنگ

پر جائے گا تو سب بھول جائے گا۔"

"آپ اسے جانتے ہیں۔ جس بات کی نشان دہی

ہے ضرور کرتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ہمارا

فرماں بردار ہے۔"

"پھر بھی اس کی خوش اگر پوری کر دی جائے۔"

"میں نے کب انکار کیا لیکن اسے کسی قابل تو ہوتے

”۔“

”وہ کہہ رہا ہے بات یہی کر لی جائے۔ شاہی ہند میں ہو جائے گی۔“

”یہ قتلِ ارادت ہو گا۔ اگر وہ کسی قابل ہو گیا اور پھر اس کا معیار بدل گیا تو ہم خواہ مخواہ مجھ سے بڑیں گے۔ وہ اپنی ٹریننگ مکمل کر کے گھر آ جائے پھر دیکھا جائے گا۔“

اس کے گھر والوں نے اس کی شادی کو کم عمری کا جنون سمجھا اور بات دہلی کی وہیں رہ گئی۔ وہ پھر بھی مطمئن تھا کہ گھر والوں نے اس کی کوئی پند نہیں کیا تھا۔ وہ جب آئسیرین جائے گا تو پھر اس قصے کا ٹھکانے گا۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ پانچویں فرم پوری کرنے کے لیے درسا پور بھی گیا۔

اس فرم میں زیادہ تر وقت قلائف میں گزارتا تھا۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی کہ کچھ سوچنے یا غلط کئے کا وقت کم ہی ملتا تھا۔

1970ء کے آخری مہینے چل رہے تھے۔ ایک دن راشدا اپنی تنہا پرواز کے لیے قندھار میں بلند ہوا۔ وہی سٹ مقرر تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا کہ چل رہا تھا۔ اس کا طیارہ مسٹر سے کالی در در لکل آیا تھا کہ اچانک اسکرین پر کوئی چیز نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ کوئی چیز اسکرین سے ٹکرائی ہے۔ چند لمحوں بعد یہ پتہ چل گیا۔ یہ چیز انہیں گھبراہٹ میں ملنے لگی تھی۔ آکل ایک دور ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں اسکرین چل سے ڈھک گئی۔ سامنے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کے اصحاب کا امتحان تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سوچا۔ اس نے کنٹرول ٹاور کو آگاہ کیا۔ وہاں سے حکم ملا کہ طیارے کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور ہرجاٹھ کے ذریعے پیچھے کود جاؤ۔ اسے لمحوں میں لیٹ کر نا تھا کہ حکم کے مطابق عمل کرے یا نہیں۔ اگر وہ کود گیا تو طیارہ تباہ ہو جائے گا۔ وہ طیارے کو اتنی آسانی سے تباہ نہیں ہونے دے گا۔ اس نے سوچا اور کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا۔

”میں طیارہ تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے طیارہ واپس لانے کی اجازت دی جائے۔“

اس کی درخواست منظور ہوئی اور پھر اسے اسے ہنگامی لینڈنگ کے لیے ہدایات ملنے لگیں۔

”اے اللہ اگر میں دن دے پر بھی سلامت نہ آ سکیا تو وہ چل پھرانے کے ادا کر دے گا۔“

وہ فکری ہدایت کے مطابق ہرجاٹھ کے ذریعے پہ

آسانی سے اتر سکا تھا۔ ہنگامی لینڈنگ میں خطرہ تھا۔ اس نے یہ خطرہ مول لیا اور نہایت شاندار لینڈنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دن دے پر اتر گیا۔

وہ جہاز سے ماہر نکلا تو اس کے جوتوں میں تیل لگا ہوا تھا۔ وہ چند قدم چلا تھا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ حزام سے نیچے گر گیا۔ دوست اسے سنبھالنے آ گئے۔

”بازو پر رہتے تو سب ٹھیک تھا۔ لیجے آئے اور یہی ہو گئی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا اور دل میں کہنے لگا ’کوئی بڑی مصیبت اس چھوٹی مصیبت سے ٹل گئی۔“

اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے جہاز کو بچا لیا تھا اور ساتھ ہی اپنے مضبوط اصحاب کا ثبوت بھی دیا تھا۔ وہ اگر طیارے کو تباہ ہونے دیتا تو کوئی اس سے بچنے والا نہیں تھا کیونکہ یہ ایک فنی خرابی تھی لیکن اس نے خود کو بھی بچا لیا اور طیارے کو بھی محفوظ رکھا۔ اکیڈمی میں اس کے اس کارنامے کی بہت تعریف ہوئی اور اسے تحریک ملی۔

اس نے اپنے اس کارنامے کا گھر والوں سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کی پیشانیوں کے اوپر اس لیے بھی کہ وہ اپنے کسی کارنامے کا ذکر کرنے کو شرمی سمجھا کرتا تھا۔

اس کی تربیتی پروازیں چل رہی تھیں کہ ملک میں کئی سیاسی تبدیلیاں آئیں۔ صدر ایوب رحمت ہو چکے تھے اور جرنل یحییٰ صدر تھے۔ انگلش ہونے تو اس کا بھی جی چاہا کہ دوٹ ڈالے لیکن اس کی عمر کم تھی۔ دوٹ ڈالنے کے لیے کم سے کم عمر اکیس برس تھی جبکہ اسے بیس سال کا ہونے کے لیے بھی مزید دو ماہ درکار تھے۔

انگلش تو یہ غیر دشواری ہو گئے لیکن انقلابِ اقتدار میں پس و پیش ہونے لگی۔ دو انقلابی ہتھیار پارٹی نے مغربی پاکستان میں شامدہر کا مقامی حاصل کی تھی جبکہ شرقی پاکستان میں محبوب الرحمن کی عوامی لیگ جیت گئی تھی اور مجموعی طور پر کامیابی حاصل کی تھی۔ بہر حال یہ سیاسی معاملات تھے کہ محبوب الرحمن کو حکومت کیوں نہیں دی جا رہی ہے۔ اکیڈمی میں چہ بیگوٹیاں ضرور ہو رہی تھیں لیکن عمل کر کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اندیشے ضرور ظاہر کیے جا رہے تھے کہ یہ مسئلہ اگر طویل کشیدگی کا تو کثرتِ دشواری پر ختم ہو گا۔ یہ اندیشے اس لیے زور پکڑ رہے تھے کہ شرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دشمن ملک بھارت تھا جو اس سے لاکھوں افواہیں سناتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے شرقی پاکستان میں خود مختاری کے

نعرے بلند ہوئے گئے۔ انہی دنوں اس نے سنا کہ اس کے والد نے ٹویٹنگورڈ خریدی ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔ اس کی پانچویں فرم ختم ہونے والی تھی۔ وہ خوش ہو گیا کہ گھر جا کر اس گاڑی میں خوب سیر کرے گا لیکن یہ خوشگواہی ثابت ہوئی۔ نرم میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ اب دو ماہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔

گاڑی کا تو بہانہ تھا۔ اسے یہ بھی جلدی ہو رہی تھی کہ خالص فرم مکمل ہو گئی ہے اب وہ گھر جانے کا اور گھر والوں سے اپنی شادی کی بات کر سکے گا لیکن اب وہ بہترین انتظار کرتا تھا۔ اس پر تنہائی کا شدید حملہ ہوا۔ وہ سبک اور حبیب الی محمد کی گاڑی ہوئی قزلوں میں پناہ لینے لگا۔ اس نے اپنی ڈائری میں غالب کے یہ اشعار درج کر دیے۔

پیشگی ہمدردی قسمت کو دو سال پار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے تکی انتظار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے میرے حیرت کش کو

وہ غلط کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اس کی سائگرہ بھی ٹریک کے دوران میں آگئی۔ گھر والوں کی جانب سے برآمدے کا دروازہ موصول ہوا تو اس کا دل ہل گیا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں انسانی زندگی میں اتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس نے یمن و خسانہ کو نہایت جذباتی خط لکھا۔

یہ اس کی آخری سائگرہ اور آخری خط ثابت ہوا۔ دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس نے اپنی تربیت مکمل کر لی۔ جب اس نے تربیت کا آغاز کیا تھا اس کے ساتھ 35 لڑکے تھے اب اب صرف سولہ خوش نصیب بچے جو یہاں تک پہنچے تھے۔

13 مارچ 1971ء کو پاکستان آؤٹ ہوئی۔ اس موقع پر اس کے والدین اور دونوں بہنیں بھی آئیں ان کی آمد نے اسے سرور کر دیا۔

وہ کراچی آیا تو کراچی کا سرور میں اس کے لیے ایک نئی دنیا ثابت ہوا۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا دور تھا جس میں سرکاری فضاپیہ کے لیے مارخی طور پر تیار کیا گیا تھا۔ جنگ کے بعد برطانوی حکمرانوں نے اسے مستقل صورت دے دی تھی۔ آزادی کے بعد یہ پاکستان فضاپیہ کی اولین تربیت گاہ ثابت ہوا۔

راشد یہاں پہنچا تو بے اختیار خوش تھا۔ اس لیے کہ اب وہ کیلٹ نہیں رہا تھا اور اس لیے بھی کہ یہاں رسالہ

سے کہیں زیادہ آزادی تھی اور شاید اس لیے بھی کہ اب وہ ہر پختے کی تمام گھر جاسکتا تھا اور اتوار کا دن چھٹی کے طور پر گھر گزرا سکتا تھا۔ رسالہ میں وہ کیلٹس میں کھانا کھاتا تھا۔ یہاں آفیسرز میں بہ حیثیت آفیسر کھانا کھا سکتا تھا۔ خود کو آفیسر ٹکا کر کرنے کے لیے اس نے سوچا بھی یہی وہ کہ لی فیس اور پس کر کہا کرتا تھا "اب میرے وزن میں سو پچھوں کا اضافہ بھی ہو جائے گا" پاکستان آفیسر کی حیثیت سے اس کی تنخواہ میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تنخواہ ملنے کے بعد اس نے گھر کی کئی خدمت داریاں بھی سنبھال لی تھیں۔ چھٹی کے دن بھائیوں کو لے کر نقل جانا اور لان کی پسند کی چیزیں انہیں دینا۔ اس کے اپنے اخراجات بھی تھے۔ کتابوں کا شوقین تھا اور گرامفون پر پکارا ٹریڈ تھا۔

شرقی پاکستان میں حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اس وقت موضوع فی یہ تھا کہ انقلاب اقتدار کیسے ہو۔ اس کے گھر میں بھی یہ بحث اکثر چل رہی تھی۔ اس کے بہن بھائی فریدہ اور کئی نصیر کراچی آئے تو یہ بحثیں تو اتر سے ہونے لگیں۔ راشد کا خیال تھا کہ اقتدار کیسب الرحمن کے حوالے کر دینا چاہیے۔

فریدہ اس سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "تم بنگالیوں کے بڑے حمایتی ہو حالانکہ اگر بھی تم ان کے بٹے چڑھ گئے تو وہ تمہارے ساتھ کوئی رہایت نہیں رہیں گے۔"

یہ قبولیت کی لپٹ گھڑی تھی کہ بعد میں یہی ہوا۔ قائد اعظم لیجنٹ مطیع الرحمن ایک تیس سالہ لوجمان تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم ڈھاکہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد مغربی پاکستان آ کر اس نے سرگودھا (مغربی پاکستان) میں بی اے الہ کے پبلک اسکول سے بی اے ویس جامعہ پاس کی اور پھر خدائے میں شامل ہو کر رسالہ پر سے کیٹن حاصل کر لیا۔ کراچی سے جیت طیاروں کا کورس مکمل کرنے کے بعد اسے پشاور بھیج دیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں تھے لہذا وہ مشرقی پاکستان گیا اور اپنی بیوی اور دو شیرخوار بچوں کے ساتھ واپس آ گیا۔

مشرقی پاکستان کے حالات خراب ہونے اور بنگالیوں کی دغا دہی پر شک ہونے کی وجہ سے خدائے کے بنگالی افسروں کی خدائی خدمات واپس لے لی گئی تھیں اور انہیں زمینی خدمت دلا دی تھی۔ تب محدود کر دیا گیا تھا لہذا مطیع الرحمن کو بھی سرور میں ڈپٹی سیکرٹری آفیسر کر دیا گیا۔

وہ کچھ وقت مشرقی پاکستان میں گزار کر آیا تھا۔ اس کے خیالات بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ اب اس کی ہمدردیاں بنگالی بھائیوں کی پسندوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہونا چاہتا جن کا مقصد مشرقی صوبے کو پاکستان سے الگ کرنا تھا۔ وہ ایک بہترین پائلٹ تھا اور اس ہنر کو کام میں لاتے ہوئے طبعی پسندوں کی مدد کرنے کے لیے بے قریب رہتا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ کئی بانی (بگ) ویش قائم کرنے کی کوشش کرنے والی لوجی (تفہیم) نے بھارت میں یکپہ قائم کیے ہیں۔ اس نے سوچا تھا کہ پاکستان کا طریقہ کار بھارت کے لیے جائے۔ اس سے دو فائدے اس کے پیش نظر تھے۔ اگر طریقہ بھارت پہنچ جاتا تو پاکستان سے اپنے مطالبات منوائے جاسکتے تھے اور دوسرے وہ کئی بانی میں شامل ہو کر پاکستانی فوجیوں سے خبردار رہا ہو سکتا تھا۔ دنیا کو یہ تاثر بھی ملتا کہ پاکستانی لوجی بھی پاکستان کے خلاف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے ارادے کئی مرتبہ اپنی بیوی پر بھی ظاہر کر چکا تھا اور اب موقع کی تاک میں تھا۔

راشد کو جیٹ ٹریڈر 33 اڑانے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کی دو عطا پروازیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ اب تیسری پرواز باقی تھی اس کے بعد اسے پاس آؤٹ کر کے پشاور جانا تھا۔

پشاور جانے سے پہلے اس کے گھر والوں نے ہانس بے پر ایک پنکھ اسٹیک کی۔ یہ گویا اس کے لیے اہل وادی دعوت تھی۔ بہت سے عزیز واقارب اور چائے دلے اسٹے ہوئے۔

پنکھ کے بعد اس نے اپنے بڑوں کو اپنی فرمائش یاد دلائی۔ وہ انہی "اس ٹریڈر" کو بھولا نہیں تھا اور اس کی ابھی کہیں اور شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ پائلٹ آفیسر بن چکا تھا۔ یہی اس کا مشن تھا۔ یہی اس کا عہدہ کہ وہ آفیسر بننے کے بعد اپنا گھر بسالے گا۔ گھر والوں کو اس کی پسند کا علم تو تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹریڈر کی اب بھی اسے ایسی شہت سے یاد ہے۔ انہیں اس کی فرمائش پر حیرت ہوئی۔ وہ جسے ٹریڈر کا جنون سمجھتا ہے تھے وہ اس کے بارے میں اس قدر سنجیدہ ہے۔ انہیں بھی اب سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس کے پشاور جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اسے فائٹر پائلٹ بننا تھا۔ اس نوید کے جواب میں اس کے بے تکلف دوست اسے امیئر تے رہتے تھے۔ اس وقت بھی

وہ سرور نہیں میں دوستوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ غرض کہیاں ہو رہی تھیں کہ ایک دوست نے اس کی جسامت کی طرف اشارہ کیا۔

"یار تم فائٹر پائلٹ ہو؟ اچھا تو دیکھو۔ اپنی عمر دیکھو۔"

راشد کے بولنے سے پہلے اس کا دوست صلاح الدین بول اٹھا۔ "یہ مت کہو۔ جب ایم ایم عالم پشاور گئے تھے اس وقت بھی اسے دیکھ کر لوگوں نے یہی کہا تھا۔ یہی آدمی ہے جو پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کرے گا؟ اور پھر تم نے دیکھا کہ وہی عالم نے ایک ساتھ پانچ جہاز گرائے۔ دیکھ لیتا منہ اس کے ساتھ بھی نہیں ہوگا۔"

اب راشد کی باری تھی۔ اس نے سید بھلا کر کہا۔ "اٹھا واٹھ ایسا ہی ہوگا۔"

ان دنوں وہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی فوجاء کے کارناموں کے متعلق ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسے دستے کی تاریخ پر مبنی تھی جس کے پائلٹ اپنے مایہ ناز دشمنوں کے بحری جہازوں سے ٹکرا رہے تھے۔ جیسے جیسے کتاب پڑھتا جا رہا تھا اس کے خون میں حدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ کئی عمارتیں اتنی بھرپور تھیں کہ وہ انہیں بار بار دہراتا رہا۔ کتاب پر جا بجا اپنے ریمارکس بھی لکھتا رہا۔ یہ کتاب کئی دن سے اس کے زیر مطالعہ تھی۔ آخری باب میں ہوا بازوں کے وہ خطوط شامل تھے جو انہوں نے اپنے گھر والوں کو لکھے تھے۔ وہ ان ہوا بازوں کی جگہ خود کو کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان کی قربانیاں۔۔۔ سے جاپان نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ میں بھی ایک ہوا باز ہوں۔ میرا بھی ایک وطن ہے۔ دقت آیا تو میں بھی اپنے وطن کی وہی طرح حفاظت کروں گا۔ موت کی پروا کچھ نہیں۔ ایک ہوا باز کی کہیں ہوئی یہ بھارت اس کے سامنے تھی۔

"انسان تو لافانی ہے۔ موت زندگی ہی کی طرح ایک اتفاق امر ہے۔ کل کی عمر کے لیے مجھے اپنی معیتوں پر اعتماد ہے۔"

راشد نے یہ سطر میں نشان زد کر دیں۔ گویا یہی اس کا مشن بھی ہے۔

۱۹ اگست کی چھٹی ہوئی تو وہ گھر آ گیا۔ یہ فتح کا دن تھا۔ اس کے بعد ان کی بھی چھٹی تھی۔ یہ دونوں دن اس نے بڑے بھرپور گزارے، چستر دشت دار اس وقت کراہی میں رہائش پذیر تھے۔ ان سب سے ملاقاتیں ہوئیں۔

"جیسی تمہاری مرضی۔ یہ تمہاری آخری پرواز ہے۔
اس کے بعد تو تمہیں پٹا در چلے ہی جانا ہے۔ آج کیا
سمارت ہے 20 اگست۔ جبر کے شروع میں تم پٹا در چلے
جاؤ گے۔"

"اس آخری فلائٹ کے بعد گھر والوں کے ساتھ
خوب وقت گزاروں گا۔"
ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک پائلٹ آفیسر
وہاں پہنچا۔

"راشد تمہاری بیادری آگئی ہے۔"
"اچھا یاد طاری۔ یومل آدھی رہ گئی ہے۔ میری
دراپس تک گرم ہو جائے گی۔ کیا یاد کرو گے پتا دمی یومل تم ہی
لیا۔"

راشد فلائٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ کئی لڑکے اور بھی
تھے جنہیں پرواز پر جانا تھا۔ راشد نے بھی ایک طیارے کی
بک فلائی اور اس طیارے میں جا بیٹھا۔

طیج الرحمن دودھ کھڑا دیکھ رہا تھا کہ راشد کس طیارے
کی "بک" اٹھاتا ہے۔ جب راشد اپنے طیارے میں بیٹھ
چکا تو طیج الرحمن نے طیارے کا نمبر نوٹ کیا۔ وہ اپنی اولیٰ
کار میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ ٹیکسی ایک لڑیکہ کی
طرف تھا۔ ٹریڈر طیارے کو ہلکی گھیر لیں حاصل کرنے کے بعد
ٹیکسی ایک لڑیکہ سے گزر کر دن دے پر آتا تھا۔ ٹیکسی ایک
کا ایک گوشہ بھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہاں طیج الرحمن
نے اپنی گالری روک دی۔ طیج الرحمن زبردستی پچھلے کاک
پٹ میں داخل ہوا۔ طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور ٹیک
آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ راشد
نے کنٹرول ٹاور کو ریزلٹس پر پیغام دیا۔

"دون سکس سکس انوا کیا جا رہا ہے۔"
راشد نے اپنا پیغام بار بار دہرایا۔ طیارے نے ٹیک
آف کیا اور پھر طیارے نظر دوں سے اوجھل ہو گیا۔
"اے لڑکے طیارے کو انڈیا کی طرف جانے دو۔"
طیج الرحمن فریاد کیا۔

"یہ خبر اہری ہے۔ میں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"
"تم کنٹرول ٹاور کو پیغام دے چکے ہو۔ تم نے اچھا
فرض پورا کر دیا۔ اب تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"
"میں اپنے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے تم سے
لڑوں گا۔"
"اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

جب وہ جانے لگا تو خلاف معمول یہ فیصلہ ہوا کہ والد
اور والدہ اسے چھوڑنے سے سرور نہیں چاہیں گے۔ شام
کے وقت جب روانگی ہونے لگی تو اسے قرآن شریف کے
سینچے سے گزارا کیا۔ یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ اس نے
دونوں بیٹوں کو باری باری خدا حافظ کہا۔ وہ اس قسم کی رسمی
رخصتی کا قائل نہیں تھا۔ دونوں بیٹوں کو خوب ہول "شکر ہے
اس کو اتنے آداب تو آئے۔" رخصتانے فرزندہ سے کہا۔
سرخ لڑیوں کا تیار ٹھہری تھی۔ والد اور والدہ اس کے
ساتھ بیٹھے۔ وہ خود ڈرائیو کرنے لگا۔ راحت پورا ٹیم 6۔
وقت گھر پہنچ گئی تھی۔ کئی میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ
کرکٹ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بھائی بی بیس ایک
جنگ دیکھی اور سرخ لڑیوں کو گزر گئی سرور میں پہنچ کر اس نے
مٹی اور اینڈ کو خدا حافظ کہا اور اپنا بیگ اٹھا کر اپنے کمرے کی
طرف بڑھ گیا۔

20 اگست کو اس کی تیسری سولہ فلائٹ تھی۔
طیج الرحمن اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے موقع کی
تلاش میں تھا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ راشد منہاس اکیلی
پرواز پر جانے والا ہے تو اسے اپنی منزل قریب نظر آنے
لگی۔ راشد منہاس جسمانی طور پر بہت کمزور اور دہلا چکا
ہے۔ اسے آسانی سے قابو کیا جاسکتا ہے۔ ابھی زیر تربیت
ہے۔ زیادہ دواؤں کی آئے نہیں ہوں گے۔ میری مہارت کے
ساتھ بہت جلد بار مان لے گا۔ ابھی تو جہان ہے، کم عمر
ہے۔ بہت سی خواہشیں اور ارمان دل میں ہوں گے۔ دن
سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گا اور زیادہ حراست
نہیں کر سکے گا۔ اس نے سوچا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی کے
جہاز کو انوائمر کے بھارت لے جائے گا۔ اس سے اچھا شکار
اور کوئی جسم بھل سکتا۔ ایک لمحے کو یہ بھی خیال آیا کہ بے چارہ
کم سن ہے۔ یہیں دوسرے ہی سے وہ نفرت غالب آگئی جو
مشرق پاکستان والوں کی طرف سے اس کے دل میں تھی۔
سولہ فلائٹ کے روانہ ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔
راشد کیشین چلا گیا۔ اس کا دست طاری تر لٹکی بھگن اس کے
ساتھ ساتھ تھا۔ راشد نے کوا کولانا کا آمڑا دیا۔

"یار اس وقت یومل مت بچ۔ پرواز میں وقت
ہو گی۔" طاری نے اس سے کہا۔
"کوئی نہیں۔ مجھے سرکٹ سے باہر نہیں جانا ہے اس
لیے کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا اور زیادہ اوجھا اڑنا بھی
نہیں ہے۔" راشد نے کہا۔

”مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا۔“

”بے ڈولی مت کرو۔ تم انڈیا کی قتل میں دو تین ماہ سے زیادہ نہیں رہو گے لیکن اگر تم نے نادانی کی تو اپنی جان سے ہاؤ گے۔“

”مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہوگی۔“

کاک پٹ کے دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار تھی اور اس کا رابطہ صرف باؤتھ فلیں اور ونڈ فون کے ذریعے ممکن تھا۔ راشد کے دل میں کئی خیال آئے اور چلے گئے۔ اسے گھر والوں کا خیال آیا۔ وہ لڑکی یا لڑکی۔ چھوٹے بھائیوں کا خیال آیا۔ اس نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے سامنے صرف پاکستان تھا۔ اس دنگلی کے نہ جانے کیا جزا تھی۔ طیارے کو انڈیا لے جانے کے بعد نہ جانے وہ کسی قسم کی شراکتہ پاکستان کے سامنے رکھے۔ پاکستان کو بلیک میل کرے، میں اسے کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اس نے مطیع الرحمن کو ایک حربہ بھر سمجھانے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن مطیع الرحمن کی برتر صلاحیت اور تجربے کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ طیارے کو انڈیا کی سرحد میں گر کر داخل نہ ہونے دے۔ پاکستانی علاقے ہی میں اسے زمین سے گرا دے۔ اس کی موت جیٹنی تھی مگر وہ اپنے دشمن کو بھی تو مار دے گا اس نے سوچا۔ موت کو سامنے دیکھ کر اسے گلے لگ لینا بڑے حوصلے کی بات ہوتی۔ وہ صرف بیس سال کا تھا۔ اس عمر کا بڑا حصہ ٹریننگ میں گزر گیا تھا۔ جو درخت اس نے لگایا تھا اس کے پھل کاتنے کا وقت اب آیا تھا۔ وہ آسانی سے سر چڑھ کر سکتا تھا۔ انڈیا میں وہ قوی قیدی ہوتا اور واپس آ سکتا تھا۔ قتل تو یہی کہتی ہوگی لیکن مشق کا نصاب کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی قتل پر وطن کا مشق غالب آ گیا۔ وہ مشق جو اس کی دگ دگ میں سبایا ہوا تھا۔ اس کی حدت خون میں بڑھ رہی تھی۔ وطن کی آبرو کا سوال تھا۔ اس نے سوچا میں تو واپس آ سکتا ہوں لیکن وطن کی عزت واپس نہیں آ سکتی۔

بھارت کی سرحد صرف 32 میل دور رہ گئی تھی۔ طیارے کے لیے یہ فاصلہ کچھ نہیں ہوتا۔

دریائے سندھ اور بحیرہ عرب کے تنگ کے قریب شاہ

بندر کے علاقے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام ”چنڈ“ تھا۔ گاؤں کے باہر درختوں کے جھنڈ تھے اور چاول کے کھیت تھے۔ یہاں کے لوگوں نے بڑی جرات سے ایک چھوٹے سے طیارے کو دیکھا جو قلابازیاں کھارہا تھا۔ کبھی ایک طرف جھٹکا تھا کبھی دوسری طرف مڑتا تھا کبھی اوپر اٹھتا تھا کبھی نیچے جھٹکا تھا۔ پھر یہ طیارہ آخری دلدہ جھٹکا اور گاؤں سے دو میل باہر بڑی تیزی کے ساتھ پہلے کی طرف آیا اور زمین سے ٹکرا گیا۔

سرور میں کی۔ میں طیارے کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ چنڈ کے قریب طیارے کا ٹکڑا مل گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش بھی مل گئی۔ راشد کا جسم طیارے کی کاک میں پڑا گیا۔ مطیع الرحمن کی لاش کا وہاں ملنا اور کسی ایک کے قریب اس کی گاڑی کا پایا جانا یہ حقیقت واضح کر رہا تھا کہ طیارے میں ہوا کیا لیکن ابھی کچھ کہنا تھا اس وقت تھا۔ تحقیق کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا تھا۔

سرکاری اعلان میں تحقیقات کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ ”اس نوجوان کا ایک انٹرکٹر پائلٹ زبردستی پھیلے کاک پٹ میں داخل ہوا طیارے کے کنٹرول پر قبضہ کیا اور قہر آف کر کے طیارے کا رخ بھارت کی طرف موڑ دیا۔ پاکستانی علاقے کے صرف 40 میل دور جانے پر تنہا اس کے سامنے طیارے کو بھارت میں داخل ہونے سے روکنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ بلیر کسی انٹیکھاٹ کے اور پاک فضائیہ کی اہل ترین روایات کا پاس رکھتے ہوئے راشد تنہا اس نے اپنے طیارے کا کنٹرول واپس لینے کی کوشش کی مگر اپنے انٹرکٹر کی برتر صلاحیت کی وجہ سے اسے ناممکن پانے پر بھارتی سرحد سے 32 میل دور ایک مقام پر زمین سے گرا دیا۔ ایسا کرنے میں پائلٹ آفیسر تنہا اس نے جانتے بوجھتے ہوئے پاکستان اور جس فوج سے اس کا تعلق تھا اس کی آبرو کی خاطر عظیم ترین قربانی پیش کر دی۔ فرض کی پاد سے بڑھ کر اس شہادت کے کارنامے پر صدر پاکستان پائلٹ آفیسر راشد تنہا اس کو ”ان حیدر پیش کرتے ہیں۔“

☆☆☆

جس روز راشد کی لاش تھی اور اس کا طیارہ غائب ہوا تھا عہدید صاحب دوپہر کے وقت سرور میں آئے ہوئے تھے تاکہ جب وہ واپس آئے تو اسے لے کر گھر چلے جائیں۔ اس وقت تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ راشد پر کیا حثیت

مکئی ہے۔ مجید صاحب سے کہا گیا کہ راشد کی پرواز لیٹی ہوئی ہے۔ آپ اس وقت گھر چلے جائیں۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا اسے گھر بھیج دیا جائے گا۔ مجید صاحب مطمئن ہو کر واپس آ گئے۔

..... اور پھر گزرتی۔ شام ہوئی اور بھر رات آ گئی۔ راشد اب تک واپس نہیں آیا تھا۔

"راشد اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔ پرواز کتنی لمبی ہو گئی۔" رشید دینگم (راشد کی والدہ) کہنے لگا۔

"بہن! میں سوچ رہا ہوں۔ وہ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں۔ اسے گھر آ جانا چاہیے تھا۔"

"میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ آپ اس کے اسکوڈرن لپڈ سے فون کر کے معلوم تو کریں۔ کہیں وہ چار تو نہیں ہو گیا۔"

"الگزمند ہونے کی بات نہیں۔ کل ہفتہ ہے۔ اس نے سوچا ہوگا وہ ایک اینڈ پر گھر جائے گا۔ انشاء اللہ کل دوپہر کے کھانے تک وہ گھر آ جائے گا۔"

رشید دینگم اس وقت تو خاموش ہو گئیں لیکن ماں قسمی۔ وہ رو کر راشد کا خیال آ رہا تھا۔ پوری رات بے چینی میں گزری۔ صبح ہوئی۔ مجید صاحب نے دینگم سے پوچھا۔

"راشد دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھائے گا۔ آپ آج کیا بکرا رہی ہیں۔"

"میں نے ملازمہ سے پوچھا تھا۔ وہ کرے گوشت پکا رہی ہے۔"

"تم نے یہ کیا بکرا لیا۔ راشد کو کرے گوشت بالکل پسند نہیں۔ بکرا اور بچاؤ۔"

"اسے تو پلاؤ اور آلو گوشت پسند ہے۔ میں ملازمہ سے کہتی ہوں وہ ان چیزوں کا اہتمام کرے۔"

کھانا وقت سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔ بس اب راشد کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور کھانا شروع کیا جائے۔ کھانے کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس دوران میں مجید صاحب سرور شمس پر کئی بار فون کر چکے تھے لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس صورت حال نے سب کو کھلم کھلا کر دیا تھا۔

"میں خود جاتا ہوں اور شریہ کو گھر لے کر آ جاؤں۔ پہلے کا دن بھی دوستوں میں گزرا ہے۔ میں صاحبزادے۔"

وہ ابھی جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔

یہ اسکوڈرن لپڈ کا فون تھا۔
"آپ گھر پر ہیں۔"
"جی ہاں۔"

"گھر پر ہی رہیے۔ میں آ رہا ہوں راشد کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے۔"

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ مجید صاحب نے اس وقت بھی سوچا تھا کہ راشد سے ڈچن کی کوئی فلفلی ہو گئی ہے۔ اسی لیے اسے گھر بھی نہیں بھیجا اور اسکوڈرن لپڈ خود اس کی اطلاع دے رہے ہیں۔

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ صرف اسکوڈرن لپڈ ہی نہیں۔ اس کے ساتھ چند دوسرے افسر بھی جنہاں دلائل بھیج گئے۔ انہوں نے یہ خبر سنائی کہ راشد اب بھی واپس نہیں آئے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ آسانی سے من لی جاتی۔ اسکوڈرن لپڈ کی زبان سے الفاظ ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ مجید صاحب کے اصحاب جواب دے گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہم تو یہ سمجھے تھے کہ اس سے ڈچن کی کوئی فلفلی ہو گئی ہے۔"

فلفلی کیسی۔ اس نے تو وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ تاریخ اسے ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آپ کو ایسے بچے پر فخر ہونا چاہیے۔"

"کیا میں تفصیلات دریافت کر سکتا ہوں۔"

"میں اس وقت صرف اتنا بتا سکتا ہوں جتنا بتانے کی مجھے اجازت ہے۔ باب تک جتنا معلوم ہو سکا ہے۔ ایک سینئر افسر طیارہ پائی جیک کرنا چاہتا تھا مگر راستے میں طیارہ کرش ہو گیا۔ باقی تفصیلات تحقیق کے بعد سامنے آئیں گی۔"

"میرے بچے کی تلاش؟"

"تھوڑی دیر میں تائید آ جائے گا۔ لاش مل گئی تھی۔"

اچھی دیر میں منہاس دلا کے دو دیوار سوگاری کی چادر لٹا دی گئی تھی۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ کیسا حادثہ گزر گیا ہے۔ اس کے بھائی اداسی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ بیڑوں کا برا حال تھا۔ رشید دینگم ہسکت تھیں۔

"کہنا میں اپنے راشد کا چہرہ دیکھ سکوں گی؟"

اسکوڈرن لپڈ سوچی میں پڑ گیا۔

"عام طور پر ایسے واقعات میں ہلاک ہونے والے

پائلس کی لاشیں دکھائی نہیں جاتیں۔ آپ کے لیے خصوصی اجازت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے لیکن میرا مشورہ پھر بھی یہی ہوگا کہ آپ نہ دیکھیں۔ اس نوعیت کے حادثوں میں لاش اور اس کا چہرہ اتنا بدل جاتا ہے کہ آپ اس کی تاب نہ لائیں گی۔ آپ تو بس یہ سوچیں کہ آپ ایک شہید کی والدہ ہیں اور یہ آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔"

رشیدہ تنگم نے آنسوؤں کی جگہ سے مجید صاحب کی طرف دیکھا۔ کیا یہ آپسٹر ٹیک کہہ رہا ہے۔ کیا ہمیں اپنے بیٹے کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہیے۔

"نہیں۔ میں اپنے بیٹے کا آخری دیدار نہیں کروں گی۔ میرا بچہ ہر وقت ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔ میں اس کے اسی چہرے کی یاد کو اپنی آنکھوں میں تازہ رکھوں گی۔" سن کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

مزید واقعات اب سے گھر بھر گیا۔ "وہ لڑکی" بھی آئی ہوئی تھی اور بچی بچی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رشیدہ تنگم اپنے بیٹے کی موت کا سن کر اتنا نہیں روئی ہوں گی جتنا اسے گئے لگا کر دوئیں۔ پداشد کی پسند کی جیسے وہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد تابوت آگیا۔ دیکھنے کو تھا کیا۔ بس ایک رسم تھی جو دوا کر دی گئی تھی۔ یہ بتانا تھا کہ دیکھنا اپنے پر پداشد گھرا آگیا ہے۔ اب دور چار ہے۔ کبھی خدا آئے کے لیے۔

منہاس وہاں میں کھرام کھا رہا تھا۔ مجید صاحب منجیل گئے تھے۔ ایک ایک کو تسلیاں دے رہے تھے۔ شہید کی میت پر دوا نہیں کرتے۔ تابوت دکھانا تو تسلیاں پھر بہ کار چلی گئیں۔

اس شہید کو کوئی قبرستان میں پورے اعزاز کے ساتھ دفن کروایا گیا۔ جس وقت تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا رشیدہ تنگم اچانک ضبط ہو بیٹھیں۔

"بیٹا میں نے تمہیں خدا یہ میں بھیجا تھا کہ تم نے کہا تھا دشمن کے جہاز گراؤ گے۔ یہ تم نے اپنا ہی جہاز کیوں گرا دیا۔"

ایک مرتبہ پھر اسکا اذرن لینڈنگ کے بڑھا۔ "آپ کے بچے نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا ہے اور اس کی موت وطن کی خاطر واقع ہوئی ہے۔ اس سے

زیادہ تفصیلات ابھی آپ کو نہیں بتا سکتے لیکن جب وہ آپ کو بتائی جائیں گی تو آپ اپنے بیٹے کے کارنامے پر فخر کریں گی۔"

راشد منہاس کے لیے ابتدا میں سترہ گز بردست تجویز ہوا تھا لیکن 29 اگست کو ریڈیو ٹیلی ویژن پر اعلان ہوا کہ صدر یحییٰ خان نے شہادت کا سب سے بڑا اعزاز نشانِ حیدر اس کی نذر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسرے دن کے اخبارات ان خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ تفصیلات سامنے آئیں تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ منہاس نے لٹا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور ملک کو کتنی بڑی رسوائی۔ چاہیو ہے۔ عوام میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی۔ منہاس وہاں میں تعزیت کرنے والوں کا ٹامٹا بندھ گیا۔ اب راشد قونی پیر تھا۔ طے پڑے گا کہ محض حادثہ نہیں تھا۔ لوگ طرح طرح کی حقیقت کا اظہار کر رہے تھے۔ دانا جہانوں نے اپنے لہو سے ایک خط مجید صاحب کے نام لکھا۔

"اللہ! اللہ پاکستان کا ہر شہری راشد منہاس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا۔ اگر اللہ سے ملک پر کسی نے بد نیکی کی نظر اٹھائی ہم اس کو نیست و نابود کر دیں گے۔ اللہ واللہ۔"

اس کی قربانی پر شہزادے نے اپنے عقیدت پیش کیے

دوستو آج کہ ہر نام و نسب کی باتیں
عیش و عشرت بے پروا مال پدم ہوتی لہا
آ آ ہم جشن منائیں کہ ہزاری مانگیا
اب بھی راشد سے سپوتوں کو جہم دیتی لہا (رحمان کیانی)

اسے مری ملت کے شہر بہ مثال
تیری قربانی رہے گی لازوال
کام تیرا ہے نیازِ فتح و شام
نام تیرا اور اسے مادہ سال (صہب اختر)
اخباروں نے کالم لکھے۔ راشد منہاس پاکستان سے نکل ہو کر تاریخ پاکستان کے قصہ درام میں داخل ہو گیا۔ اس عمر میں نشانِ حیدر پانے والا پہلا سپاہی۔

ماخذ: راشد منہاس
از..... حرم علی شعیق

واخاننی خان

مختار آزاد

پھرنا، اور پھرتے رہنا، وادی وادی چکراتے رہنا یہی ہنجاؤں کا
مقدریہ، خان بدوشوں کی زندگی ہے۔ اس علاقے سے اس علاقے تک
محو سفر ایک خانہ بدوش قبیلے کے بارے میں چشم کشا تحریر جسے
بڑی تحقیق کے بعد ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔ ایسی تحریریں
صرف سرگزشت کا خاصہ ہیں۔



ہر فکریں پہاڑوں کے ناکس میں چرتے واسطے ایک لیلے کا کردار

خان کا خواب ایک کار فرما ہے۔ اُسے کوئی فرق
نہیں پڑتا کہ اس کا پناہ گرا ہوا تو بھی کار چلانے کے واسطے
وہاں سڑک نہیں ہے۔ اُس کے والد علاقے کے بچھے خان
تھے جو ساری عمر وہاں سڑک کی تعمیر کے لیے کوششیں کرتے
رہے۔ نیا خان بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے
وہی سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ مجھے بھی گودلی سرکار کا کوئی افسر
سمجھ کر سڑک کی تعمیر پر اس طرح قائل کرنے کی کوشش کر رہا
تھا کہ جیسے میں مان گیا تو اس کے لیے وہاں سڑک موجود

ہوگی۔

”ایک سڑک ہی اس بات کی اہالت دیتی ہے کہ وہاں بسنے والوں کے علاج و معالجہ کے لیے ڈاکٹر اور دوائیں پہنچائی جاسکیں۔ یہاں بیماروں سے لوگ مرتے چلے آ رہے ہیں۔ آج نہیں، بعد میں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ شہر آب و تاب بدل چکی لیکن پھر بھی لوگ علاج و معالجہ کے بنا ہی مر رہے ہیں۔ یہ مرنے سے بچنے کا سبب نہیں ہے۔“

جانتے ہو گیوں..... ”یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ ”اس لیے کہ یہاں سڑک نہیں ہے۔ ڈاکٹر اور دوائیں اس علاقے میں پہنچ ہی نہیں پاتے۔“ ”یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔“

”ایک سڑک یہاں کے بیماروں کو مرنے سے بچا سکتی ہے، صرف ایک سڑک۔“ ”یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا۔“

”مصرف بیماروں کی ہی بات نہیں۔“ اس نے جذباتی لہجے میں دوبارہ بات شروع کی۔ ”سڑک نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو استاد یہاں کا درس نہیں کرتے، بچے کن پڑھتے، ان چھ ہیں اور سڑک نہ بنی تو طاعون آنے والی تھیں گی ان پڑھ اور یہ علاقہ اسکول کے بنا ہی رہے گا۔“ اس نے توقف کر کے بخود میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”ہمت صرف صحت اور تعلیم تک ہی محدود نہیں، سڑک نہ ہونے کے سبب یہاں نہ تو سوداگر آتے ہیں اور نہ سیاح، حتیٰ کہ سبزی فروش بھی یہاں کا رخ نہیں کرتے۔۔۔۔۔ ہے نا یہ طاعون زندہ کیوں کا الیہ؟“

انگلستان کے انتہائی دور دراز پہاڑی علاقے کے ان کرغز خانہ بدوشوں کو بھی دوسرے انسانوں کی طرح ترقی کے ثمرات سے استفادے کا پورا پورا حق ہے اور ان جو ان خان اس سڑک کی تعمیر کے حق میں دلائل و سبب ہاتھ میں پر وہ اپنے خواہشوں کی کارروائی اسکے۔

”تو یہ ہے ہمارا الیہ..... ایک سڑک تو بہت سے مسئلے حل کر سکتی ہے۔“ ”ورنہ.....“ اس نے مجھے سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

ماحول خاصا رنجیدہ ہو چکا تھا، سب خاموش تھے۔ میں نے موضوع بدلتا جا ڈا۔ ”وہیے خان..... تمہیں کس قسم کی کار چاہیے؟“

”یہ نہ کہ اس کی اوپر کوئلے کی کھائی سوچوں میں ابھی سی تر خمر اہت ہوئی، قانباؤہ سوچوں تلے سکرایا تھا۔“ ”وہیے، تم مجھے کس قسم کی کار دینا چاہتے ہو؟“ اس نے سوال کے

جواب میں ہی سوالیہ لٹا دیا تھا۔

میں اسے کسی بھی قسم کی کار نہیں دینے والا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہاں کوئی سڑک نہیں اور سفر کے لیے کار کی بجائے پاک ضروری ہے اور یہ سہولت صرف اسی کو نہیں، وہاں کے تمام کرغز خانہ بدوشوں کو حاصل بھی اور اس وقت ہم انہی کے پاس کھڑے تھے۔ ایک پاک کی گیل کا سراخانہ کے ہاتھ میں تھا، وہ اس کے برابر کھڑے تھے۔ وہ وہاں کی کاؤن تھا۔ خان کا جو بھی سامان تھا اسے باندھ کر پاک کی پشت پر لٹا دیا جا رہا تھا۔ خان کے ہاں دستار میں پاک اور بھیڑوں کے ملاوہ، چند سلور کی کیتلیاں، ایک اسٹو، کچھ گگ، ایک کار بیٹری، دو سوپر پٹیل، چٹا لیس کپل اور ایک چمڑے سے بنا اور نوپر سے گنڈا ناخیر شامل تھا۔ یہ چمڑے ت کھلاتا ہے اور وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں میں اس کا استعمال عام ہے۔ یہ گرائی چراگاہ کی طرف نقل مکانی کا وقت تھا۔ اس کے بھائی اور کچھ دیگر ساتھی سامان اٹھاتے ہوئے لادنے میں مدد کر رہے تھے۔

چلتا ہی خانہ بدوشوں کا کام ہے لیکن جہاں تک انقلابت ان کے کرغز خانہ بدوشوں کا تعلق ہے تو وہ سہلی میں جہاں ہر نقل مکانی کرتے ہیں لیکن اس کا زیادہ تر دہرہ اور مذہبی حالات اور بھیڑ بکریوں پر مشتمل گلے کے لیے چراگاہوں میں چارے کی فراوانی پر ہوتا ہے۔

انگلان کرغز خانہ بدوش اپنے علاقے کو بام دُنیا کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب ہے دُنیا کی سمیت۔ بلاشبہ یہ نام بننے میں نہایت دھڑبڑ اور شاعرانہ ہے لیکن ”بام دُنیا“ کا قدرتی ماحول نہایت سخت اور غیر شاعرانہ جبکہ وہاں انسان کی ماحولیت جو کم سے بھری ہے۔

کرغزوں کا ”بام دُنیا“ قدرتی دنیا میں داخان کی پٹا کھلاتا ہے۔ یہ علاقہ دو بہت بڑے اور طویل گلیشیروں کے تلے سے جنم لینے والی وادیوں کی سرزمین پر مشتمل ہے۔ یہ گلیشیر وسط ایشیا سے تعلق رکھنے والے پہاڑی سلسلے پامیر میں واقع ہیں اور اس علاقے کی سطح سمندر سے بلندی چودہ ہزار فٹ کے ارباب قریب ہے۔ یہاں چلنے والی انتہائی سرد ترین ہوا رگوں میں ایو جماتی ہے اور زمین ایسی کہ جس پر فصل کاشت کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ سال کے تین سو خستہ میں سے تین سو چالیس دن، یہاں کا درجہ حرارت مستقل طور پر نقطہ انجماد سے نیچے رہتا ہے۔ یہی نہیں، ہیرالی اور ہٹل کا تو تصور ہی نہیں۔ بہت سے کرغز تو ایسے ہیں

جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی درخت کو دیکھا
تک نہیں۔

افغانستان کے اپنی شمال مشرق میں واقع یہ دریاں اور
سرزمین اور خوف زدہ کر دینے والی سرزمین وہ بڑی
گلخیز پانی سلسلے کے درمیان چمنے کی ماحول ہے۔ اسی لیے
شاید اپنی اس کے نام کا حصہ بن۔

داخان کی پٹی... اس خطے کا یہ نام انیسویں صدی
کے درمیان میں روس اور برطانوی سلطنتوں کے درمیان وسط
ایشیاء تسلط کے لیے لڑی گئی اُن جنگوں کی دین ہے، جسے نام
نہا کر میٹ گیم کہا گیا تھا۔ اُس وقت کی دنیا کی ان دو عظیم
طاقتوں نے، 1873ء سے لے کر 1895ء کے درمیان
طے شدہ معاہدوں کے ایک سلسلے کے نتیجے میں اس راہ گزر کو
بلوچ پھر زوناً دوہرایا۔

ان معاہدوں کے ذریعے دراصل تاج برطانیہ، روس
روس کو ہندوستانی سرحدوں سے دور رکھنا چاہتا تھا اس سے
نکل، ماضی میں داخان کی یہ پٹی بھی اُس شاہراہ ریشم کا
سنگ رات کا حصہ تھی جو اسے چین سے ملتا تھا جبکہ مغربی
خطے پر یہ فوج، بیسائی جلیغین اور بہت سی خطرناکی کھوج
کرنے والے ہم جہازوں کا راستہ تھی۔ سن بارہ سو کے اواخر
میں تاریخ کے مصروف ہم جہاز کو چلنے لگے بھی داخان کی پٹی
میور کی تھی لیکن 1 9 1 7ء میں روس کے
کیونسٹ اور 1 9 4 9ء میں چین کے سرخ
انقلاب کے بعد سے یہ سرحد اور راستہ تقریباً متروک
ہو چکا ہے۔

انیسویں صدی ختم ہونے سے بہت پہلے دنیا سے تو
آباد پانی دور گزر چکا، چرخی کا ایک باب کھل کر بند ہوا
اور اب نیا دور ہے۔ آج کی دنیا میں داخان کی پٹی کی
سرحدیں شمال میں تاجکستان، جنوب میں پاکستان اور مشرق
میں چین سے متصل ہیں۔ اس سرزمین کا بلحاظی حصہ
افغانستان ہے جو پٹی کے مغرب میں واقع ہے لیکن اس سے
کچھ دور فاصلوں ہوتا ہے۔ لگ بھگ دو سو میل طویل اس
الٹان پٹی کو بعض کرغزائی جنگوں میں بلوچ حوالہ غیر ملک قرار
دیے ہیں۔

آج کے داخان کی یہ پٹی ماضی کی طرح سلاخ کر
برف پوش اور دشوار گزار پہاڑوں، پابانوں اور گلیشیروں کی
بیسائی وہ سرزمین ہے جو تاریخ میں سیاست اور خطرناکی
تسلط کے تنازعات کے بوجھ سے دلی چین اس کا ماحولیاتی

ماضی حال میں بھی رعبہ ہے۔ بالادستی کے لیے عالمی طاقتوں
کی کھینچ کب کی ختم ہو چکی۔ افغانستان بیسویں صدی کی
آخری دہائیوں سے لے کر دیکھو بیسویں صدی کے ابتدائی
ذریعہ مشرق سے تک، یہ وہیت تسلط سے شروع ہونے والے
ہم استحکام اور خانہ جنگی کا نظارہ ہے اور ختم نہیں کہ یہ لبر کب
تک جاری رہے مگر ایک جنگ واضح 'افغان داخان کی پٹی'
ان تمام اثرات سے کچھ دور ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو
وہ اپنی کرغزائیوں کے لیے افغانستان غیر ملک ہے۔

تک اور پُر پچا پہاڑی وہ گزراؤں سے، یہاں کی
ترب ترین مرکز بھی تقریباً چین دن کی پیدل مسافت پر
ہے۔ ان راستوں سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچنا کس طرز
خطرے سے خالی نہیں۔ پہاڑی راستوں پر ایک طرف بلند و
بالا پہاڑ تو دوسری طرف گہری کھائیاں اور تنگ دڑے ہیں۔
اگر چلنے چلنے پاؤں اور اسانگ گایا تو کھائی میں گرنا چینی اور
زندگی بچنے کی کوئی امید نہیں ماسوائے اللہ کے ا

یہ وہی مرکز ہے جسے توسیع دلو کر خان اس علاقے
تک لانے کی کوشش کر رہا ہے جہاں یہ آباد ہیں۔ اگرچہ
موسم کے ساتھ ہجرت اب بھی اس قبیلے کا مقدمہ ہے لیکن وہ
جہاں بھی جائیں، موسم نہیں ہیں۔ اب ان کے قدم بھی
زمین پکڑنے لگی ہے۔ شاید اسی لیے مرکز بھی اس کے لیے
اکیڑا وہ اہم ہو چکا ہے۔

مرکز میں توسیع کی جستجو چین کو باپ سے ترکے میں
لینے والی میراث ہے۔ موجودہ خان سے پہلے اس کا والد
قبیلے کا خان تھا۔ اس نے بھی مرکز میں توسیع کرانے کے
لیے بہت کوشش کی۔ وہ دنیا سے اٹھ چکا ہے۔ مگر جستجو اور
کوششیں، دونوں جاری ہیں۔ خان کے مرنے سے امید
نے دم نہیں توڑا۔ حالات دیکھ کر تو یہی گھٹا ہے کہ موجودہ
خان بھی یہ میراث اپنے بڑے بچے بلور اس قبیلے کے مستقبل
کے خان کو سونپ کر علی دنیا سے سکھ کی طرح خالی ہاتھ ہی
لوہے جاتے گا۔ قارئین مرکز ہوتا نہ جانے کس خان کا مقدمہ
ہے۔

خان کے گاؤں سے قریب ترین قصبہ بھی مرکز سے
حری ایک رات کی دشوار گزار پیدل مسافت پر ہے۔ اس قصبے
کی اہمیت، وہاں کا ایک چھوٹا سا ہسپتال اور چند دکانیں
ہیں۔ صبح فاتہ کی سہولتوں تک رسائی سے انجائی دور،
نہایت اگت تھک سر زمین پر رہنے والے کرغز خانہ بدوشوں
میں اصوات کی شرح بہت زیادہ ہے۔ نہ ڈاکٹر نہ ہسپتال،

صرف چند دامن ان کی رسائی میں ہیں۔ جس سخت اور شدید موسمی اثرات میں یہ گرفتاری زندہ ہیں، وہاں بڑی آسانی سے معمولی نژاد اور مرد بھی وہاں کی صورت گنجل جاتا ہے۔ یہاں کے حالات دیکھتے ہوئے اس پر کوئی شک نہیں کر سکتے کہ اکثر یہ بھی اموات کی وجہ بن جاتی ہے۔

واخان کی پٹی کے گرفتاریوں میں بچوں کی اموات کی شرح شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے۔ نومولود بچوں کی بمشکل نصف تعداد ہی پانچ سال کی عمر تک پہنچ پاتی ہے۔ پانچ، چھ یا پھر سات بچوں کا شیر خور ہی یا کسی بھی مرحلہ پر گرفتاری والدین کے لیے غیر معمولی بات نہیں۔ زندگی کے دوران میں ماؤں کی اموات کی شرح خطرے کی گھنٹی سے کسی طور کم نہیں۔

میں ایک جوازے کوچ خان اور عبدالملک سے ملا، جن کے گہوارہ بچے تھے۔ عبدالملک کا کہنا تھا کہ ہر سال اس کا ایک بچہ مر جاتا ہے۔ اس کے بچے زیادہ تر غیر خودمختار یا گھنٹوں کے ٹل چلنے کی عمر میں فوت ہوتے۔ یہ بچے جن معمولی بیماریوں کا شکار ہو کر دنیا سے جانے پر مجبور ہوتے، ان کا علاج نہایت آسانی سے ممکن تھا۔ کوچ کا کہنا تھا کہ بچوں کی موت نے انہیں جیتے جی مار دیا ہے۔ ان کا صرف ایک بیٹا پانچ سال کی عمر تک جیا اور اس کے بعد وہ بھی قبرستان میں جا سوا۔ بچوں کی موت کا غم بھلانے اور اپنا دکھ بھلانے کے تکرار میں وہاں بڑی انجمن کے عادی ہو چکے۔ غیبت، بالخصوص انجمن کی با آسانی دستیابی کے سبب گرفتاریوں میں انجمنوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

گرفتاریوں کی زندگی بہت محدود ہے۔ زیادہ تر کے لیے پوری دنیا صرف یہی ہے، جہاں تک ان کے قدم پہنچے ہوں۔ مگر خان کی بات دوسری ہے۔ اس نے واخان کی اس پٹی کے باہر کی دنیا بھی کسی حد تک دیکھی ہے۔ وہ دوبار اس علاقے سے باہر کا سفر کر چکا۔ وہ کاروباری مواقعوں کی تلاش میں گرفتار زمین پر آنے والے تاجروں سے بھی ملا رہا ہے۔ یہ وہ تاجر ہیں جو زبردات، انجمن، دھوپ کے جھٹے، جوتے، کپڑے، کالین اور لب موہاگل فون تک بچے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ واخان سرزمین پر سرافراہ گرفتارے بڑے بڑے بریلے پھالوں کو موہاگل فون کے کمزور سیٹلائٹ سگنلز عبور نہیں کر پاتے لیکن اس کے باوجود یہاں موہاگل فون فروخت ہوتے ہیں اور وہ بھی انہی خاص تعداد میں۔ یہاں موہاگل فون سے بات نہ کی جاسکے تو کوئی

بات نہیں۔ موسیقی سننے اور تصویر لینے کے لیے مٹی سڈیا اور کمرے والے موہاگل فون انہی خاصی تعداد میں تک جاتے ہیں۔ یہاں موہاگل فون کا صرف یہی استعمال ہے۔ خان کو اس تکلیف دہ حقیقت کا احترام ہے کہ دنیا روز بروز اس کے لوگوں کو پیچھے، بہت پیچھے چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔ تیزی سے بڑھتی آبادی والی دنیا میں، تیزی سے سینے گرفتار خانہ بدوشوں کی کل تعداد گیارہ سوہ گئی ہے اور ان کا تعلیمی نظام نہایت ہی بنیادی اور سیدہ بہ سیدہ چلنے والے علوم پر مشتمل ہے۔ خود خان بھی لکھنے اور چمکنے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اب دنیا بھر میں ہر شخص نورانی طور پر صحت کی سہولتوں تک رسائی رکھتا ہے اور اس کا بنیادی سبب، خان کے مطابق، کاروبار پیسہ لڑکے مارتے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لوگوں کا باہم شغف ہو جانا ہے۔

وہ اس حقیقت سے بھی باخبر ہے کہ اب صحت کی سہولتیں عام ہونے کے باعث دنیا بھر میں عام کی بیماریاں سے اتنے زیادہ بچے نہیں اور انہیں سرتے جتنے گرفتار خانہ بدوشوں کے۔ "اگر ہمیں بھی صحت کی سہولتیں ہوں تو ہمارا قبیلہ بھی بہت بڑا ہو جیسا اب تو ہم محسوس ہوتے جا رہے ہیں۔" اس ردز وہ نہایت حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہہ رہا تھا لیکن میرے پاس ہسپتال کرنے اور خاموش رہنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

گرفتاریوں کے اس خطے میں بہت کچھ ہوا ہے جسے قبیلے کے اس نوجوان رجسٹرار کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ خان کی عمر تیس برس ہے لیکن وہ اپنے لوگوں کی حالت اور ان کے مسائل پر کڑھتا رہتا ہے۔ وہ ترقی کا خواہشمند ہے مگر اس دشوار گزار سرزمین تک ترقی کا پہنچنا بھی کم دشوار بات نہیں۔ اس کی ذات اپنے خواہیوں کی تعبیر نہ ملنے کے انیسویں سے ملاتی ہے۔ قابل، کم عمری میں ہی نوجوان مرد اور بہت کچھ جان چکا ہے۔

پانچ لڑکے سات لڑکیاں خان مضبوط کسرتی جسم کا مالک ہے۔ اس کی آنکھیں گہری گھٹکی، ہال سیاہ اور گھبراہٹ سے رنگت زدہ مالک ہے۔ اس کے ہاتھ مضبوط لیکن سخت محنت کے باعث کھردرے ہوئے۔ جب وہ مصافحہ کرتا ہے تو جوش اور محنت سے ان ہاتھوں کی حرکت اور سخت ہو جاتی ہے۔

خان کی سرزمین پر حمل کرنا کسی تہوار سے کم اہمیت کا

حاصل نہیں۔ وہ ہر وقت فز کی موٹی جیکٹ، موٹے کپڑے کی چٹون اور دستانے پہنے رکھتا ہے ماسوائے اپنے بڑت کے۔ غصے کے اندر ہر وقت دیکھتے چہلے کی حرارت سے موسم اتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ فز کی جیکٹ اور دستانوں کے بغیر بھی انسان کو کچھ خاص طبع محسوس نہیں ہوتی۔ اندر بیٹھ کر یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ باہر کا موسم نقطہ بھرا دہی نہیں بلکہ اس سے ڈیڑھ درجن ڈگری زیادہ ہے۔

خان اپنے لوگوں کے حالات اور انہیں درپیش مسائل کے باعث اکثر افسردہ رہتا ہے لیکن بڑا ہی زندہ دل بندہ ہے۔ جب وہ لطیفہ سننے پر آئے تو سناٹا ہی چلا جاتا ہے۔ خود بھی ہنستا ہے دوسروں کو بھی ہنساتا ہے۔ گھبراہٹ وقت وہ سارے فصول سے دور رہتی تھی کہ سڑک اور کار، دونوں کے خیال سے بھی بہت دور نکلی چکا ہوتا ہے۔

خان کا اصل نام حاجی روشن خان ہے۔ یہاں 'حاجی' سے مراد وہی ہے جو برصغیر میں اس وقت سے لی جاتی ہے اور نسبت منہ سے ہی کر کے لائے کی ہے۔ خان کی بیوی کا نام طوٹی لک ہے اور وہ چار بیٹیوں کے والدین ہیں۔ لقمی اقباب سے گزرنے والی مسلمان ہیں۔ سن وہ ہزار آٹھ میں روشن خان نے اپنے والد کے ساتھ حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ وہ اپنے چودہ بچوں کے ساتھ سڑک مبارک پر گئے تھے۔ بیرونی دنیا سے خان کے رابطے کا یہ سب سے پہلا موقع اور اس کی زندگی کا سب سے طویل سفر تھا۔

دوسری بار اس نے گزشتہ موسم بہار میں واخان کی سرزمین سے باہر قدم رکھا تھا۔ اس سفر میں خان کی حیرت کاٹل گئی، جہاں اس نے ایک وزیرو کے ملاوہ افغان صدر حامد کرزی سے بھی ملاقات کی تھی۔ افغان صدر سے ملاقات میں خان کی درخواست تھی کہ اس کے علاقے میں ایک اسپتال، چند اسکول اور یقیناً ایک سڑک تعمیر کی جائے۔ سڑک کو وہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ کار اس کا خواب ہے اور سڑک اس کے پہلا ہونے کی بنیادی ضرورت۔

روشن خان کا والد بھی قبیلے کا سردار تھا۔ یہاں سرداری کا لفظ عداوت نہیں، جو خان کا فیصلہ وہ پورے قبیلے کا۔ سن دو ہزار نو میں جب عبدالرشید خان کا اقتدار ہوا تو سب ہی یہ جانتے تھے کہ اب نیا خاں کون ہوگا، سردار کا سب سے بڑا بیٹا۔

وہ موسم گرما کا ایک خوشگوار دن تھا جب کرفز خانہ بدوشوں کی نہایت محرز اور بزرگ شخصیت ایر علی بھائی نے

قبیلے کے تمام ٹھکاندین کو اپنے بڑے میں آنے کی دعوت دی۔ وہ مرحوم سردار کے ہم عمر اور ان کے قریبی ساتھی تھے۔ بڑے کو کرفز باشندوں کی دائمی زندگی میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ دو تین خانہ بدوش خاندان اکٹھے ٹپک ٹپک کر رہتے ہیں۔ ان کے مال بردار پاک اور پالتو مویشیوں کے گھگھے، سب سا بچے ہوتے ہیں۔ ایک اماٹے کے اندر ان کے الگ الگ بڑے ہوتے ہیں، جنہیں گھپ کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح سے تختہ بن جاتا ہے۔ اس دن ایر علی بھائی نے خانہ بدین کو اپنے کھمبہ پر بلایا تھا۔

اگرچہ کرفزیوں میں کاغذ کی کرنسی کا رواج نہیں لیکن اس کے باوجود یہ غریب نہیں۔ ان کے پالتو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، گھوڑے، پاک، مال بردار گدھے اور خیر دراصل خاصی بھاری مالیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کرفز خانہ بدوشوں میں کرنسی کی بنیادی مالیت ایک بھیڑ ہے۔ اس کی تعداد چھٹی بڑا ہوتے جاؤ، قیمت میں اضافے کا قیمن ہوتا جائے گا۔

یہاں ایک ڈاکٹر فون کی قیمت ایک بھیڑ جتنا ہی ہے کی مالیت دس بھیڑ ہے۔ اپنی نسل کا ایک گھوڑا بھی اس بھیڑوں کے عوض لیا جاسکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ کرفزیوں میں یہی مالیت بھی ملے شہ ہے۔ شادی کے لیے لہجہ کے عوض ڈاکٹر کو سو بھیڑیں لڑکی والوں کو پیش کرنا ہوتی ہیں۔

یہ روز مروانہ کی شے کی مالیت کا قیمن ہے لیکن جب کسی کی امارت کا قیمن کرنا ہو تو اس کی نشانی ہونٹ ہے، وہ بھی دو کو بان والا۔ جس خاندان کے پاس یہ ہے وہ سب میں مالدار تصور ہوتا ہے۔

دو کو بان ہونٹ یہاں 'بختری' کہلاتا ہے۔ ستاون سالہ ایر علی کے پاس جو دو دو کو بان ہونٹ ہیں۔ ان کے گلے میں عقل سے بنی گھنٹیاں لگی ہیں، جب وہ کہیں سے گزرتے ہیں تو یہ آواز سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ ایر علی کا قافلہ گزر رہا ہے۔ پہلے یہ گھنٹیاں ایر علی کی آمد کا اعلان کرتی تھیں لیکن اب ایک سے دوسرے گھپ تک ایٹے کے لیے واکی ٹاکی متبادل ہو چکی ہیں۔ یہ بھی لوٹ کھانے کے لیے 'پام' زینا کا رخ کرنے والے چالاک تاجروں کی دین ہے۔ اب ایر علی بھی واکی ٹاکی کا استعمال کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

محل مکانی کے سفر میں، واکی ٹاکی سے تیز رفتار اور

فوری رابطے کے باعث آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ شاید
راخانی خانہ بدوشوں کے لیے اس کی اہمیت اُس سوچاؤ سے
کسی طور کم نہیں جنہیں دنیا بھر کے زیادہ تر حصے میں، شہری ہو
یا دیہاتی زندگی کا لازمی جزو مان لیا گیا ہے۔

اہل اہل بھائی کی ایک اور خوبی بھی ہے۔ اُن کے پاس
دنیا کی انتہائی منفرد سرخیوں کا جواڑا تھا۔ یہ نسل کرغزہوں کی
پہچان تھی۔ مرقا ہو یا مرقی، ان کی صرف ایک ٹانگ ہوتی
ہے۔ ایک سرخ شہید خطہ کے باعث مرقچا دوسرے کی
حفاظت و اول و جان سے کرتے ہیں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اہل کے ٹیپ پر کرغز بھائیوں
کے دعوت کی۔۔۔ سب کو علم تھا کہ دعوت یہی ہے اور کوئی
ایسا نہ تھا کہ جو آنے سے انکار کرتا۔ اگلے ملتے یہاں وہ سب
موجود تھے جنہیں مدعو کیا گیا تھا۔ یہ کل چالیس افراد تھے
جنہیں باہمی مشاورت سے نئے خان کا انتخاب کرنا تھا۔ وہ
نیرت کے اندر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور ان کی
خاالت کے لیے کرغز روایت کے مطابق بھیڑیں لانے کی گئی
تھیں۔ نو آئین کھانا تیار کر رہی تھیں۔

کرغز یا شہدوں میں بھیڑ کے گوشت سے تیار کردہ دیش
دعوت کا لازمی جزو ہے۔ یہ نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ ان کے
پاس اسے روایت کا درجہ حاصل ہے۔ بھیڑ کے گوشت کو اسی
کی چربی میں پکایا جاتا ہے۔ اس کی تیاری میں بہت وقت لگتا
ہے۔ گوشت کو اس وقت بدستور مدھم آجی پر پکا جاتا ہے،
جب تک چربی پھل کر زور رنگ کے شور ہے۔ یہی صورت
اختیار نہ کر لے۔

میں نے یہ لاش کھائی ہے۔ روایتی مصالحوں اور قدیم
طریقوں سے تیار کردہ یہ دیش سادہ مگر نہایت لذیذ تھی۔
اسے کچے کے لیے تقریباً آٹھ گھنٹہ رکھ دیتے ہیں۔

وہ کرغزہوں کی روایت کے عین مطابق دعوت تھی۔
کھانے کے بعد تھوہ، خیش کہا گیا اور پھر سہ پہر کے قریب
سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے اٹھ کھڑے
ہوئے۔ جب تک یہ ملے ہو چکا تھا کہ مرحوم عبدالرشید کی جگہ
ان کا بڑا بیٹا حاجی راجن خان کرغز خانہ بدوشوں کا لیا خان
ہوگا۔

اگرچہ قہاں کے بزرگوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا لیکن
ضروری نہیں کہ سب مراد کو سب کی حمایت حاصل ہو۔
حقیقت یہ تھی کہ قبیلے والوں میں ناحو خان کی شہرت ٹھیک
نہیں تھی اور اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں۔ سرخی اور

آزاد روایت میں کرغز دنیا کی حد تک مشہور ہیں۔

کلیہن باہر ہشیاں ہیں اور گزشتہ کی سالوں سے
کرغز خانہ بدوشوں کے درمیان رہ رہے ہیں۔ وہ ان کا
یوروپ میں پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ
کرغزہوں کے پاس خان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی
روایت نہیں لیکن آزادی ان کی لطرت میں شامل ہے۔ ان
کی زندگی خان کے گرد نہیں گھومتی، وہ اپنی سوچ کے تابع
ہیں۔ انہوں نے کرغزہوں کے بارے میں۔۔۔ ایک حکایت
بھی سنا کی جو لٹینے کی حد تک مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی ایک
نیرت میں تین کرغزہوں کو بٹھا کر چھوڑا ہوا ایک گھینے بعد پٹو
کے تھوہیں پانچ خان تھیں گے۔

نئے خان پر بعض کو اعتراض تھا کہ ابھی وہ کم عمر ہے۔
کچھ کہتے تھے کہ وہ سنگین نہیں۔ سنگین۔۔۔ کرغزہوں میں
جرات، ہمت اور بہادری کا استعارہ ہے۔ سنگین اصناف کا
حامل چندن کی طرح مضبوط ہوتا ہے۔ کرغزی، ہمیشہ سے
سنگین ہونے کی چادر رکھتے ہیں اور وہ اپنے خان میں بھی
اپنی صفات دیکھنا چاہتے ہیں۔ سنگار، ہے آب و گیارہ اور
سنگین خوسوں میں رہنے والے کرغزی خانہ بدوشوں کی یہ
خواہش بھی کچھ کم سنگین نہیں۔

تھوہ خان پر معترض بعض افراد کی یہ بھی رائے تھی کہ
اگر سب شائق نہ ہوئے تو پھر والوں کے دور دراز اور انتہائی
سیرے پر رہنے والا ایک سرکش اور مرحوم خان عبدالرشید کا
دشمن، روشن اس کی جگہ نیا خان بن سکتا ہے۔ کچھ اس پر مصر
تھے کہ بس اب وقت بدل چکا، خان کا عہد ختم، اب انکس
کسی خان کی کوئی ضرورت نہیں۔

ان سب آراء کے باوجود بنیادی حقیقت یہ تھی کہ اہل اہل،
نئے ناحو خان کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔ اس وقت کچھ
رائے یہ بھی تھی کہ نیا خان سفید موٹھوں والا کوئی بزرگ ہونا
چاہیے۔ ویسے اس وقت آوازیں اہل کی حمایت میں بھی
اٹھ رہی تھیں۔ اس کی سوجھیں دائیں سفید تھی۔ اس کے
پاس دو کوہانی اونٹ بھی تھے، اور وہ بھی ایک بڑو نہیں،
پہرے چو کے چھ بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا گلوہ بھی اس کے
پاس تھا۔

ان سب سے تعلق اور منسوب رائے کلیہن کی تھی۔ اُن کا
کہنا تھا کہ "اگر سفید دائیں اور سوجھیں سرور کی قابلیت اور
اہلیت کا اظہار ہے تو پھر ہمیں ایک بکرے کو خان منتخب
کر لینا چاہیے۔ بھاڑی بکرے کی دائیں اور سوجھیں،

دونوں ہی سید ہوئی ہیں۔ "یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔" جب ایسا ہی ہے تو مجھ کو بھرا بھی ان سرکشوں کا سردار بن سکتا ہے۔"

خان کی بدنامی کا سب سے بڑا سبب الخون لینا ہے۔ اگرچہ خان کا دونوں ہے کہ وہ الخون ترک کر چکا مگر یاد دہانی دینے کو چاہیے۔ اسی طرح کی ضیافت میں ملے کر وہ فیصلے کے مطابق اگرچہ اسے حالی روشن علی ہی کر فز خانہ بدوشوں کا خان ہے لیکن پھر بھی اس کی 'عمومی' مشکلات میں کی نہیں آئی۔ خان بننے کے بعد بھی اس کے خلاف آوازیں اٹھتی رہی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد کرانے میں مصروف رہتا ہے کہ منصب کے لیے اس سے بھڑکولی اور کر فز ہوئی نہیں سکتا۔

دنیا کے نہایت کھن قدرتی ماحول میں زندگی بسر کرنے والے کر فزیوں کو جن مسائل کا سامنا ہے ان کے حل کی خاطر خان کی کوششیں بھرپور ہیں۔ یہ خود کو سب سے بہتر ثابت کرنے کے لیے ہے۔ اسی کی خاطر وہ افغان صدر اور وزیر سے ملا تھا لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اسپتال، اسکول اور ہاں سڑک بھی۔۔۔ کسی کے کچھ آج نہیں۔

☆☆☆

نقل مکانی کے روز تیسری کی گرانی خان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ اس کا ذمہ ہے کہ قبیلے کے تمام ماہل بردار چھوڑ گئے، گھوڑے، مادہ پاک اس کے موسم گرما کے گھپ کے سامنے مقررہ وقت تک پہنچ چکے ہوں، تاکہ ایک ساتھ ماہل بردار جانوروں کا قافلہ روانہ کیا جاسکے۔

اگرچہ وہ جون کا مہینہ تھا لیکن آسمان اب بھی ابر آلود تھا۔ کبھی کبھار اچانک ہلکے برف بھی پڑنے لگتی لیکن خان کو اس کی تسلی کوئی پروا نہیں تھی۔ اسے سرمائی ٹھکانے پر طویل سردیاں گزارنے کے لیے اپنے مویشیوں کے واسطے، ہر حال میں چارے کا خاطر خواہ طویل کرنا تھا۔

خان اور اس کا خاندان، یوں تو سال کا بیشتر حصہ ریت میں ہی بسر کرتے ہیں، البتہ سرمائی ٹھکانے پر، سردیوں کے دوران میں وہ گھڑے سے نئی موٹی دیواروں والے کچے گھر میں رہتے ہیں۔ صرف خان ہی نہیں، تمام کر فز خانہ بدوشوں کی نقل مکانی اور خود کو گرم رکھنے کے واسطے سرمائی ٹھکانوں میں بد پاش کا بھی انداز ہے۔

سردیوں میں وہ وادی کے جنوبی حصے کی طرف ہجرت کرتے ہیں اور پھر موسم گرما شروع ہوتے ہی سبزے کی

حالت میں چند میل کی دوری سے پڑا ڈال لیتے ہوئے مثال کی جانب، آہستہ آہستہ پور کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اس بار سرمائی پڑاؤ کی طرف نقل مکانی کے سفر میں، عین بھی شریک تھا۔ مجھے ساری کے لیے خان کے رہیڑہ کا ایک پاک مل گیا تھا۔

نقل مکانی کے اس راستے میں ہی نہیں، پوری وادیاں پٹی میں چھوٹے ڈالو، پھاڑوں کی برف پوش بکھڑا ہوا چمنیاں اور ان کے پورے تیرتے ہادی ہی نظر آتے ہیں۔ یہ آسمان تک پہنچنے والی نظر کی مہار دے دے جتے ہیں۔ لگتا ہے کہ انسانوں کو اتنے قریب دیکھ کر آسمان بھی ہر دے کرنے پر آمادہ ہو۔

یہاں دنیا کی اس جہت پر، دنیا کے کئی بڑے پھاڑی سلسلے باہم ملے جاتے ہیں، جن میں ہندو کش، قرقرم اور پامیر شامل ہیں۔ وادیاں کی یہ پٹی اور اس پر بیستادہ برف پوش پہاڑی سلسلے، مشرق و مغرب کی سمت بہتے والے کئی بڑے دریاؤں کی جنم بھوی بھی ہیں۔ انہی میں سے ایک دریائے آمو یا بلور دریا بھی ہے۔ دریائے آمو وسط ایشیا کا ایک اہم آبی وسیلہ ہے۔

چلتے چلتے تاراکارواں دریائے ٹکسو کے کنارے پہنچا۔ سال کے ان تمام میں برف اور ٹکسروں کے پھٹنے کی رفتار جڑ بوجاتی ہے، جس سے دریاؤں میں پانی کی مقدار بہت زیادہ اور بہاؤ خاما تیز ہو جاتا ہے۔ اس وقت دریائے ٹکسو میں بھی خطراتی جیسا ماحول تھا۔ شطاب اور ہلکا ہنر نکل پانی شور مچاتا تھا گھانٹوں سے گزر رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر خان نے کچھ دیر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اندازہ تھا کہ بھاری بوجھ سے بوجھل پاک ٹھک چکے ہیں، انہیں بھی کچھ آرام اور پانی کی ضرورت ہے۔ پاک بھی ہاتھ دے رہے تھے، ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھیں پھٹی پھٹی لگ رہی تھیں۔ پیاس کی شدت اور ہانپنے کے باعث ان کے نتھنے ہار ہار تیزی سے گل بند ہو رہے تھے۔

تمام بار بردار جانور کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تھوڑا سا آرام بھی ہو چکا تھا۔ اب ہماری دریا پار کرنے کی جگہ اور وہ بھی خان کے۔ میرے لیے تو خیر یہ تجربہ بنا تھا لیکن ان کے لیے نہیں۔ خان کے برادر بستی کی ذمہ داری گھوڑوں اور دیگر ماہل بردار جانوروں کو دریا پار پہنچانے کی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی ٹانگیں اور دوسرے سے پاک کی ٹانگیں تھامی اور شخصے بہتے پانی میں کود گیا۔ جانور اور وہ تیرتے

ہوئے دوسرے کنا۔ نہ تک پہنچے۔ جانور دریا پار کر گئے تو اب باری تھی بچہ کو۔ دریا پار کرانے کی۔

خان کی سوانہ نے واسے ایک گھوڑا تھا۔ اس نے اپنی پانچ سالہ بیٹی راہبہ، ماسے بٹھایا۔ ایک ہاتھ اس کی گھر کے گرد حائل کر کے منہ بولی سے اسے تھا۔ اس کے پیچھے بیٹی اور دو سالہ بیٹی عارفہ تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے لگام تھام کر گھوڑے کو دریا میں اتار دیا۔ بچکنے سے نہ بچنے کے لیے اس نے پاؤں کو پراٹھا لیے تھے۔ اس کا چھ سالہ بیٹا کسل علی اور تین سالہ جوتکا اپنے ایک اور ماسوا کے ساتھ گھوڑے پر سوار دریا پار کر رہے تھے۔

ہم دوسرے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ تاہم نظر سرسبز چراگاہ، دریا کا شطاب، پانی اور دیوانہ۔۔۔ ایسے میں خان بدوش کے قدم خرد، خود غم جاتے ہیں۔ سرمائی ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلے ہی خان کی سرداری میں کرغز خانہ بدوشوں کا ہار بھی پڑا تھا۔ جب تک موسم سازگار اور چراگاہ پری بھری تھی، تب تک یہی ان کا مسکن تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پالو مویشیوں کے رہائز بھی دریا میں تھرتے ہوئے پار اترنے لگے۔

خان اور اس کا برادر بستی بل برادر یاگ، بھروں اور گھوڑوں پر لدرا سامان اتار کر نہت لگانے کی تیار ہواں کر رہے تھے۔ گھرواری خاتون کی ذمہ داری، لہذا خان کی بیوی کی چوری توجہ نہت لگانے پر تھی۔ اگرچہ جنگی طور پر یہ موسم گرما تھا اور خان کے مطابق خوشگوار بھی لیکن کچھ چھوٹو سروکات وار ہوا جسم کو سن کیے جارہی تھی۔

"یادو! خان ہے، اس کے حرسے لو۔" خان نے مجھے ہاتھوں کی پتیلیوں کو ہاتھ دگڑتے دیکھا تو اس کی مشورہ دیا۔ "نوی کر رہا ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ سرد موسم میں رہنے کے سبب میرے ہاتھوں کی کھال بھی کافی سخت ہو چکی تھی۔

خان کی بیوی بندھا سامان کھول رہی تھی، بچے ادھر ادھر پھر رہے تھے جبکہ مرد سواکل فون ٹی میڈیا پر بیٹھے کسی کرغز گانے کی دھن میں گن، نہت لگانے میں بیٹھے تھے۔ موسیقی کسی زبان کی پابند نہیں، مجھے بھی دھن اچھی لگ رہی تھی۔ وہ تین تاروں پر مشتمل ستار یا گٹا جیسے کسی ساز سے نکل سحر کن دھن تھی۔ یہ کرغز باشندوں کا روایتی ساز سمجھا افغانستان اور پاکستان میں بختونوں کے روایتی ساز زرباب سے مشابہ ہے۔ کرغزوں کا روایتی ساز شاید اس سے ذرا سا

تلف ہوگا۔ اس ساز کو کرغز زبان میں قور کہتے ہیں۔ نہت لگانا بھی ایک فن ہے۔ یہ کلروں میں ٹی کسی تصویر

کو درست طور پر جوڑ کر مکمل تصویر بنانے جیسا ہی ہے۔ اس کام میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ نہت کڑا کر لینے کے بعد، یہ راہرے ہانکل غیر متاثر گن اور کسی لیوٹرے آلو کی ماتہ بے کشش نظر آتا ہے۔ خود نہت کی طرح کرغز خانہ بدوش بھی بڑی حد تک غیر متاثر گن اور ساتھی سٹل ملاپ سے دور، کرغز دھن بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ سڈ پاؤں جتنے بھی نہیں، مسکرانے میں بھی بہت گھوس ہیں۔ ان کی کوئی کتاب نہیں، جس پر دعویٰ کر سکیں کہ ہم یہ میراث رکھتے ہیں۔ نہ وہ تاش بچھتے ہیں نہ ہی پورے پھیلے جانے والا کوئی دوسرا روایتی کھیل البتہ خوشی کے موقع پر دائرے میں جمع ہو کر مرد ایک روایتی رقص ضرور کرتے ہیں۔ ہر رقص کرنے والے مرد کے ہاتھوں میں زوال ہوتا ہے جو اس کے قور کے قدم کے ساتھ ساتھ ہوا میں لہراتا ہے۔ یہ پاکستان اور افغانستان میں آباد بختونوں کے تنگ ڈانس سے مماثلت رکھتا ہے۔

کرغز خانہ بدوشوں کے ایک لوجان کے سوا، جسے منسل سے پورلرٹ بنانے کا شوق تھا اور اس کے پاس ایک ڈرائنگ بک بھی تھی، جس میں اس کے بنانے لیاہت محمد چارلرٹ تھے، مجھے ایسا کوئی کرغزی نہ ملا، جسے قائم آدش میں دلچسپی ہوئی۔ میں نے کرغزوں کے یہاں شادی کی ایک تقریب میں بھی شرکت کی تھی مگر وہ بھی منسل طور پر بے تلف رہی۔

عام طور پر کرغز خانہ بدوشوں کو کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں البتہ خوشی ان کا روایتی کھیل ہے اور وہ ذوق و شوق سے اسے کھیلتے ہیں۔ یہ وسط ایشیائی ممانک اور خورہ افغانستان میں بھی کھیلا جانے والا صدیوں پرانا روایتی کھیل ہے، جس میں حصہ لینے والی ٹیموں کو میدان کے بچوں کا لہجہ کیے ہے۔ کرغز کے مینڈھے کو گھوڑا اور لاتے ہوئے اٹھاتا اور لہجے کے لیے متکین منزل تک پہنچاتا ہوتا ہے۔ ترکی اور افغانستان سمیت وسط ایشیا کی متعدد ریاستوں میں آج بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور ریاستی سطح پر اس کے نورمانٹ بھی منعقد ہوتے ہیں۔ اس رول شادی کی تقریب بھی اور مردوں کی خیریت و طبع کے لیے خوشی کا مقابلہ جاری تھا۔

عمومی طور پر کرغزوں کو بد اخلاق کہا جاسکتا ہے۔ اگر راہ چلتے، ہاتھیں کرتے کرتے کوئی کرغز بے لطفی سے آپ کی ہیب میں ہاتھ ڈال کر اندر سے کوئی شے باہر نکال لے تو

ذاتی زندگی میں ایک نیا دور



جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ چاندیہ ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 سال کا رسالہ

(شمارہ 12 ایک سال)

کتاب کے لیے 700 روپے

اس کا پتہ: لاہور، لاہور، لاہور

7000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے دو سال کریں۔ ہم فوراً آپ کے لیے ہوئے ہے۔ ہر رجسٹرڈ ایک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کا خط سب سے پہلے سب سے پہلے سب سے پہلے

ہر دن ایک سے زائد رسائل صرف ایک سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے دو سال کریں۔ ہم فوراً آپ کے لیے ہوئے ہے۔ ہر رجسٹرڈ ایک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

لاہور، لاہور، لاہور (فون نمبر 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

0301-2454188 (فون نمبر)

35802551 فون نمبر

اسے غیر معمولی خیال مت کرنا۔ خیال کرتے ہو تو یہ آپ کا ہی خیال ہوگا۔ ان کے لیے یہ معمول بات ہے۔ خود میرے ساتھ ایک سے زائد مرتبہ ایسا ہوا کہ ہاتھ کرتے کرتے کسی کرغز نے میرے کونٹ کی جیب میں یہ دیکھنے کے لیے ہاتھ ڈال دیا کہ اندر کیا رکھا ہے۔ ایسا بھی نگلی ہار ہوا کہ صاحب نے ہاتھ کرتے کرتے ایسا اجازت میری ناک پر ٹکا دھوپ کا چشما چک کر یہ دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا کہ اس سے دھوپ کبھی ٹھہر آتی ہے۔

کرغز گوشت خور ہیں اور بہت زیادہ گوشت کھاتے ہیں۔ وہ گوشت کو پتے پتے پارچوں کی شکل میں کاٹ کر بھوتے ہیں۔ ایک کرغز سے یہ بعید نہیں کہ وہ گوشت کا ایک پارچہ لے کر کھارہا ہو اور جب اس سے کھانا نہ جائے تو وہ جیب میں رکھ لے گا نگلی ہار بھوک لگنے کی صورت میں فوری کھانے کے واسطے۔

کرغزی، موہاں فون پر ہستی بننے کے بہت شوقین ہیں لیکن روایتی طور پر ان خانہ بدوشوں کو گیت گنگانے سے کچھ خاص رغبت نہیں۔ اس کی وجہ کچھ میں آتی ہے۔ جہاں خانہ "یہ وہ سرزمین ہے، جہاں کوئی بچہ پیدا ہو کر مرنے سے بچا جائے تو بہت تیزی سے بوڑھا ہونے لگتا ہے۔"

داخان کی بچی کے سخت ترین سوچی جہانے، کرغز خانہ بدوشوں کو زندگی کی جاکے سوا کچھ اور سوچنے کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔ سال کا نو پڑھ تر جہاں یہاں عروج حرارت نقطہ انجماد سے نیچے نہیں بلکہ بہت نیچے رہتا ہے۔ ٹھنڈ اور برف باری کے سبب ہر وقت لہو و گویں میں جوتا کھوس ہوتا ہے۔ مویشیوں کے گلے ان کا معاش ہی نہیں، خوراک بھی ہے۔ ان کی کھالیں سرد ترین موسموں سے بچاؤ کے لیے نہت ہانے سمیت کئی کاموں میں استعمال ہوتی ہیں۔ رنگوں میں لہو جھاتی، تقریباً سال بھر کی ٹھنڈ میں اگر انہیں کہیں سناڑ کار ماحول میں سیراتا ہے تو وہ نہت ہے۔ ہائے حیات، ان کا اول و آخر مقصد حیات ہے۔ یہاں زندگی مشکل نہیں، مشکل ترین ہے۔ ایسے میں کسی داخانی، کرغز خانہ بدوش کی جہانیاں کس کیسے پر ان چڑھ سکتی ہے، البتہ جہاں تک ان کے نہت کا معاملہ ہے تو وہ نہایت خوبصورت اور لمبہ گرمادینے والے رنگوں سے سہا اور ان کے ایسے جمالیاتی جذبے کا مظہر ہے جو صرف نہت کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ باہر سے بے کشش نظر آنے والے نہت کے داخلی دروازے پر چڑھ نہایت موٹے اور بھاری پردے کو اٹھا کر

جب تک اندر قدم نہ رکھا جائے، جب تک کمریزوں کے بحالیاتی ادویہ کا احساس ہی نہیں ہوتا لیکن پہلا قدم اندر رکھتے ہی جو احساس ہضم ہوتا ہے وہ خوشگوار محسوس ہوتا ہے۔ دوسری نظر نیرت کے اندر دلی ماحول پر پڑتی ہے اور اگر آپ میری طرح اچھی ہیں اور باہر کے موسم کی کھانسیوں سے لڑتے ہوئے کھلی پارکس نیرت میں قدم رکھتے ہیں تو پھر آپ کے لیے سب کچھ ایک دم تبدیل ہو جاتا ہے۔ سردیوں دنیا اور دھان کا سخت موسم، لہجہ بھر میں ذہن و دل سے محو ہو جاتا ہے اور آپ کمریز خانہ بدوشوں کی سرزمین کا آب و ہوا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

نیرت کی اندر دلی چادر دلی دیکھیں اور دیکھیں نقش و نگار والے قالینوں سے آراستہ ہوتی ہے۔ پھول، مناظر، گھوڑے، اقلیدی ٹھونے۔۔۔۔۔ یہ سب ان سہاؤنی قالینوں کی منفرد شگفتہ ہے۔ ان کے شوخ رنگ سرد موسم والے دھان کی پاشندوں کے لہو میں دھڑکی حرارت کا استعارہ ہیں۔ یہ صرف سہاؤنی اشیاء ہی نہیں بلکہ اس سے نیرت کے اندر کا درجہ حرارت خوشگوار رکھتے اور حرارت کے افراج کو روکنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے نیرت والے کھانا پانے، باتیں کرنے اور آرام کی خاطر استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کا بیڈروم، ڈرائنگ روم، لینڈنگ روم اور ڈائننگ ہل ہوتا ہے۔

نیرت کے اندر ایک الاؤ روشن رہتا ہے یا پھر نہ ہے کی بنی انگلیٹھی ہر وقت دھنکی رہتی ہے۔ دھان میں گھڑی موجود نہیں۔ الاؤ اور انگلیٹھی دھانے کے لیے پاک کے گور سے بنے اچھے استعمال کیے جاتے ہیں، جس سے نیرت کے اندر ہر وقت ایک عجیب سے نہ پھلکی رہتی ہے مگر اسے ناقابل برداشت ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

الاؤ ہوا یا انگلیٹھی، ان پر ہر وقت ایک کیتل دھری رہتی ہے، جس میں آہ آہ بنا رہا ہے۔ آہوا یا جائے دھانوں کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ وہ چائے میں شکر کی بجائے نمک استعمال کرتے ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دودھ پاک کا ہی ہوتا ہے۔ وہ آہوا کے شوقین نہیں بلکہ ان کی ایک لذت ہے۔ امر علی نے مجھے بتایا کہ وہ روزانہ تقریباً ایک سو بیس چائی قہور نوشی چیں فرماتے ہیں۔ اس تعداد پر دوسرے ملک کی انگلیٹھی کھاتے ہیں لیکن جس طرح میں نے کمریزوں کو قہور مقل میں باڈیٹ دیکھا اس کے لاشی ظہر کہہ سکتا ہوں کہ وہ چالیوں کی تعداد پر حاجت حاکر چاہتے ہیں

کمریز ہے۔ کمریز باشندے پاک کے دودھ سے بنا دی بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہ اندر استعمال والے دی کے مقابلے میں کچھ سخت ہوتا ہے۔ وہ پاک کے دودھ سے بنی بھی بناتے ہیں لیکن یہ بھی خاصا ٹھوس ہوتا ہے۔ وہ اسے کمریز کہتے ہیں۔ یہ بڑی حریر اور چیز ہے۔ آپ اسے توڑیں اور ایک ٹکڑا اندر میں ڈال کر کئی منٹ تک چھوٹ کر طرح چباتے رہیں۔ آہستہ آہستہ وہ منہ میں ہی ٹھنکے لگتا ہے۔ ان کی بدنیاں چیز اسے مشابہ ہوتی ہیں۔ گوشت عام خوراک میں شامل ہے مگر مہمانوں کی تواضع کے لیے خاص طور پر بھیج دینا کی جاتی ہے۔ ان کے کھانوں میں جنگلی میوے بھی شامل ہیں یا ان کا استعمال بھی عام ہے۔ عام طور پر یہاں پانی پالنے والی سہریاں لہجائی میں خاصیت چھوٹی ہوتی ہے۔

یہاں کمریزوں کے نیرت کے علاوہ دیکھنے کی ایک اور چیز بھی ہے۔ وہ ہے یہاں کی خواتین کے زیر استعمال روز مرہ کا لباس۔ مردہ ٹھنک کے موقع پر خاص لباس نہ پہنتی کہتے ہیں لیکن کمریز خواتین کا عام لباس بھی ٹھنک سلائی و کڑھائی کا شاپکار ہوتا ہے۔ وہ سر پر ایک لمبوتری لمبی پستی جیسا جس کے نیچے ایک بڑا سا دھنچا ہوتا ہے جو سینے اور گردن سے نیچے کمر تک کے حصے کو ڈھانپے رکھتا ہے۔ یہ ٹوپی شادی شدہ اور کنوار یوں کے درمیان فرق کا اظہار بھی کرتی ہے۔ کنواری سلیڈ جب کہ شادی شدہ خواتین سرخ رنگ کی ٹوپی اوڑھتی ہیں۔

عام طور پر کمریز خواتین کھلتے سرخ رنگ کے پڑے پہنا پسند کرتی ہیں، جس کے اوپر دھنک ہوتی ہے۔ یہ دھنک بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ کالر پر پلاسٹک کے رنگ برنگ ٹکٹ مائز کے بہت سارے ٹھنک، کوڑیاں اور سہاواں نمک نمک دی جاتی ہیں۔ میں نے ایک خاتون کو دیکھا جس نے اپنی دھنک پر پر ٹھنک کی ایک ٹکٹی سی چھوٹی بڑی کو بڑے سلیٹے سے آرائش کی خاطر نمک رکھا تھا۔ دھنک کے ہاتھلے حصے پر سورج کی شکل کا سرخ بڑھکا ہوا ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ چڑے کا ایک چھوٹا سا پر بھی لٹکا ہوتا ہے۔ اس پر عموماً آیات قرآنی کشیدہ کی جاتی ہیں۔ میں نے بعض خواتین کی دھنک پر مختلف ملکوں کے سکے بھی دیکھے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک کمریز خاتون کی دھنک کے سامنے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

مجموعہ خاص کیوں نہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

والے جسے پرکھی باخون کڑھکے دیکھے تو بہت حیرت ہوئی۔ معلوم کیا تو پتا چنا کہ ظہر بد اور بدوادی خاتون سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے 10 گنا تھا۔ یہ سب دیکھنے کے بعد بھی اگر میں کرفز خواتین کے بحال پائی لوق اور آرائشی اختراع کی بدادندہ تو بدی زیادتی ہوئی۔

کرفز خواتین کا ایک اور پہلو آرائش گیسو ہے۔ لیے ہالوں کی ایک ٹیبلٹ کئی چڑیاں گوندھی جاتی ہیں، جن پر چاندی کے آرائشی زیورات اٹکائے جاتے ہیں۔ انہیں سنگھار کے ساتھ ساتھ ہار کا بھی بہت شوق ہے۔ میں نے کوئی خاتون ایسی نہ دیکھی جس کی گردن خالی ہو۔ سب کے گلے میں ہار تھے اور ایک سے زیادہ۔ انہیں سنورنے کے ساتھ ساتھ بچنے کے لیے زیورات پہننے کا جو شوق ہے اس کی موثر مثال انگلیاں ہیں۔ درمیانی انگلی کو چھوڑ کر، کرفز خواتین کے ہاتھ کی ہر انگلی حتیٰ کہ انگوٹھے تک میں بھی رنگ بے رنگ پتھروں کی جڑاؤ انگلیاں نظر آتی ہیں۔ بات یہیں تک محدود نہیں، لیکن بھی عام استعمال میں ہے۔ مکے سے لازم ہیں لیکن بڑے سائز کے ہوں، ہندوستان کے جھسکوں جیسے اور گھڑی تو ایک کاٹی نہیں، وہ تین ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک خاتون کی دونوں گلائیوں پر گھڑیاں بندھی تھیں۔ مکا تو وہ چھوٹا تھا۔ شاید اسے یہ تعداد مناسب لگی ہو پھر بھی بہتری کی گنجائش ضرور موجود تھی۔

ان کی روز مرہ زندگی سخت مٹی سے عبارت ہے۔ کرفز خواتین کے روز مرہ معمولات میں سلاخی، کڑھائی، بنائی، کھانا پکانے، صفائی ستھرائی، بچے پیدا کر لے اور انہیں پالنے کے علاوہ دن میں دو بار پاک کا دودھ دوتے ہیں، ان سے دہی اور پنیر بنانا بھی شامل ہے۔ پالتو جانوروں کے اصطبل کی صفائی ستھرائی میں بھی حصہ لیتی ہیں اور فصل سکانی کی تیاری ان کے اہم ممکن ہی نہیں۔ یہ بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مرد ان کے قریب موجود ہو تو فصل بات نہیں کرتیں۔ مجھے ایک کرفز خاتون سے صرف یہ جانتے میں ایک گھنٹہ کا کہ آخر اس نے ہاتھ کی ایک گلائی میں تین گھڑیاں کیوں ہاتھ رکھی ہیں۔ کافی زیادہ رنج کے بعد شرماتے ہوئے اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔ "پہ مجھے اچھی لگتی ہیں۔"

ان کے شرمانے کا عالم یہ ہے کہ میں خان کے کیمپ میں اس کے ساتھ لیٹتے رہا لیکن کمال ہے کہ اس کی بیوی

نے بھی مجھ سے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ میں نے اتنی زیادہ شرمیلی خواتین پہلے نہیں اور نہیں دیکھی تھیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی زندگی بہت محدود ہے۔ اگر ایک اوسط عمر کی کرفز خاتون کی زندگی کا احاطہ کریں تو وہ جہاں پیدا ہوئی ہیں، وہاں سے صرف چند میل کی دوری تک ہی، اس کا سفر حیات محدود رہتا ہے۔ ان کی زندگی کا سب سے طویل سفر ماں باپ کے گھر سے بیاہ کر شوہر کے زیر تک پہنچنے کا ہے۔ یہ بھی چند میل سے زیادہ کا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا دائرہ اور بھی سست جاتا ہے۔ بقول خان "ہم ان اسی لوگوں میں سے نہیں ہیں جو ہر جگہ بیوی کو دم چھلانا پھرتے رہتے ہیں۔"

کرفز باشندوں میں کم عمر کی شادیوں کا رواج ہے۔ لڑکی اور لڑکا دس سے چودہ برس کی عمر تک شادیاں کر دی جاتی ہیں۔ جب خان کی شادی ہوئی تو وہ پندرہ جب کہ اس کی بیوی تیرہ برس کی تھی۔ عموماً ان شادیوں میں "لوہریج" کا قصور اور دور تک نہیں۔ شادیاں گھر کے پڑے پڑے کرتے ہیں، جن میں بچوں کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ جس پند کرفز خواتین نے مجھ سے مکمل کربات کی، ان میں ایک بزرگ خاتون یا زلی بھی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کا اعزاز تھا کہ عمر سفر میں تو ہوگی۔ ان کی پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ وہ سب کے سب اس جہان سے گزر چکے تھے۔ ہا زلی لی کا کہنا تھا کہ "مرد پاک کا دودھ نہیں دوتے، وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانا نہیں بنا سکتے، بچوں کی دیکھ بھال تو درکنار وہ تو خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اگر عورت نہ ہو مرد تو ایک دن بھی دنیا میں نہیں جی سکتا۔"

کرفز باشندوں کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں وہ بھی کسی حکومت یا کسی ایک بادشاہ کے تابع نہیں رہے۔ بیچ ان کی زندگی آزادی سے عبارت رہی ہے۔ ایک کرفز باشندے نے چارے فخر سے بڑی اہم بات مجھ سے کہی تھی۔ "ہم وہ آزاد جنگی کھولے ہیں جس پر آج تک کوئی شکری اپنی کند اٹلے میں کامیاب نہ ہو سکا۔" کرفزیوں کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ بات اب تک تاریخ کے تاریک پردوں میں لپیٹی ہے۔

کرفزیوں کا سب سے اولین تذکرہ دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی چینی دستاویزات میں ملتا ہے۔ جس میں ان کا تعلق اسی سلسلہ کوہ سے قایم کیا گیا ہے۔ یہ پھاڑی سلسلہ آج روپی ساہیو یا اور منگولیا میں واقع ہے۔

ماہر بشریات، نازف شاہرانی لفظ 'کرفز' کی وجہ تسمیہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "یہ ایک سے زائد الفاظ کا مجموعہ بھی ہو سکتا ہے جیسے 'کیرک جس' کا مطلب ہے 'چالیس اور کیز' جس کا مطلب لڑکی ہے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ چالیس ماں کی اولاد ہوں جو اتنی پہلی پھول کہ اس مناسبت سے 'کرفز' کہلانے لگی ہوں۔"

وجہ تسمیہ دلچسپ اور لوک کہانیوں جیسی ہے لیکن اس پر استغناء کر لیا، کیونکہ ہجرتیں۔ تاریخ کو کھنگالنے اور تحقیق کرنے کی یہاں بہت گنجائش موجود ہے۔

تعداد کے لحاظ سے افغان کرفز خانہ بدوش قبیلہ بہت بڑا تھا۔ یہ صدیوں سے وسط ایشیائی چراگاہوں میں پھرتے رہے ہیں۔ تاریخ میں یہ لوگ وسط ایشیائے گزرنے والے سنگ روٹ 'شاہراۃ ریشم' کے تہمتی قاصدوں کو لوٹنے کی بھی شہرت رکھتے ہیں۔

سن سترہ سو کے دوران میں انہوں نے افغانستان کی اس وادی میں اپنے قدم جمائے کا آغاز کیا جو آج موسم گرما کے لیے ان کے مویشیوں کی چراگاہ ہے۔ سخت سردیوں سے بچاؤ کے لیے وہ یہاں سے وادی کی ترابی میں اتر جاتے ہیں لیکن جونہی طویل اور سخت موسم سرما ختم ہونے لگتا ہے وہ ایک بار پھر بلندی پر واقع گہرائی چراگاہوں کے لیے نقل مکانی کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں، جہاں وہ اگلے موسم سرما کے شروع ہونے تک بڑا اٹالے رہتے ہیں۔

آزاد بخش کرفز قبائل کو بیرونی تسلط سے آزاد رہنے پر فخر ہے جو کچھ غلط بھی کہیں لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں دنیا کے اندر جاری نوآبادیاتی لہر اور کمیونزم کے گہراؤ سے برصغیر ہور روس کا جو گریٹ گیم شروع ہوا تھا، کرفز خانہ بدوش اور ان کا یہ خطہ بھی اس سے متاثر ہونے لگا۔

1950ء میں ان پر تمام سرحدیں بند کر دی گئیں اور نیڈرلینڈ نے کہا کہ "مکمل طور پر کرفز افغان باشندے ہیں"۔ اس کے بعد وہ کئی سالوں تک واکان کی پٹی تک ہی محدود رہے۔

1978ء میں، کابل میں بغاوت ہوئی اور اس کے نتیجے میں سابق سوویت یونین نے فوجی مداخلت کی۔ کرفز خانہ بدوشوں کو خوف لاحق ہوا کہ اس کے نتیجے میں افغانستان بھی کمیونسٹ ملک بن جائے گا۔ اس وقت تقریباً تمام کرفز باشندوں، جن کی کل تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ تھی، نے مختلف طور پر رحمان گل کو اپنا پہلا خان منتخب کیا اور

پاکستان میں شامل ہندو کش سلسلہ کوہ کی جانب ہجرت کر گئے۔

ہجرت کے پہلے ہی سال کرفز مہاجرین دہا کا کھار ہوئے اور چار یوں نے ایک سو سے زائد پھولوں اور بڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگرچہ اسی صورت حال نے انہیں واپسی پر مجبور کیا لیکن ان کے خان رحمان گل نے زور دیا کہ وہ پاکستان میں ہی رہیں۔ اس نے خبردار کیا کہ سوویت فوج صرف ان کی آزدی ہی سلب نہیں کرے گی بلکہ ان کے ایمان پر بھی حملے کرنے کی۔ ایسے میں بہت سارے کرفزیوں کو قیادت کی سوچ پر شک ہو رہا تھا۔

وہ دنیا کی بہت پر زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ ہجرت کے اس مرحلے میں انہیں اپنی وادی کی یاد دہانی طرح سنائی دیتی تھی۔ بس ابھی سے پاکستان ہجرت کرنے والے کرفزیوں میں تقسیم شروع ہوئی۔ وہ دھڑے بن گئے۔ ایک، مختلف منتخب رحمان گل کی حمایت کر رہا تھا، دوسرے کی سربراہی موجودہ خان کے والد عبدالرشید کر رہے تھے۔ بات بڑھ گئی۔ عبدالرشید نے تین سو کرفزیوں کے ساتھ افغانستان لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ساتھ واکان لوٹنے والوں میں اب علی بھی شامل تھے۔ یہ وہ موقع تھا کہ جب لوٹنے والوں نے رحمان گل کو سردار کے عبدالرشید کو اپنا نیا خان منتخب کیا۔

کابل پر سوویت تسلط مضبوط ہو چکا تھا۔ ان کے واپس لوٹنے پر سوویت فوج کابل مہرانی سے پیش آئی۔ پاکستان ہجرت کرنے والے تین سو کرفزی اپنی سرزمین پر لوٹ آئے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم ہو چکی تھی۔ اگرچہ کرفزیوں میں، شیر خوار بزرگسوں میں شرح اموات خطرناک حد تک زیادہ ہے لیکن پھر بھی، گزشتہ تین دہائیوں کے درمیان ان کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ آج ان کی تعداد ایک ہزار نفوس سے تجاوز کر چکی ہے۔

عبدالرشید کے بزرگس، جنہوں نے رحمان گل کی سربراہی میں پاکستان کے اندر ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ بھی نہ رہ سکے۔ انہوں نے بھی نقل مکانی کی۔ اس وقت وہ شرقی ترکی کے ایک گاؤں میں آباد ہو چکے ہیں، جس کا نام 'مکو کی کز' ہے۔ اسی گاؤں میں کچے مکانات ہیں۔ جہاں ان باشندوں کو بجلی، کیبل ٹی وی سیٹ ورک، پختہ سڑکوں اور کار گھسی تمام سہولیات حاصل ہیں۔ ان کرفز خانہ بدوشوں کی زندگی اب نئے رخ پر ہے۔ وہ اپنے نام کے آخر میں

لی لی کل فہرستیں گونیوں کی صورت میں خالی جاتی ہے اور غریب کو حساب کر کے مہینہ بھر
 سے دیکھ کر دیکھ رہی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے کبھی کھلتے ہوئے گود سے بچ کر بول والی
 ہے اور ساتھ ہی پیرے کے دارا ہے۔ آنکھوں نے گڑا دیتے ہیں۔ یہ گھر مرنے کی خبر دے گا۔
 جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے جہاں منید ہے۔ مردوں کے لئے نہیں ملتا۔
 کہ مرنے اور کریمیں ملنے پھر لیکن فہرستیں گناہوں نے لئے بہت کم ہیں۔

† Annual 4-11-2024 - 2025-2026

چھوٹے قدم والے دل چھوٹا نہ کریں ۱۱

گروہ

یہاں تک رسالہ اب ہو چیک ہے کہ جو معجزات سے اس نے اپنے

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو
گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

GROTTA

T

042-35789145 6.0334-4266255
Email: top.treatments@gmail.com Website: www.top.treatments.net

ترک شجاعت استعمال کرتے ہیں۔ ان کے بچے اس زندگی کے مادی ہو چکے۔ وہ گھڑ سوار اور بڑی شہر کے بھانے والے عجم سے لطف اندوز ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ان کے خصلتوں میں فراہمی و کلاسی آپ کا جدید نظام ہے اور وہ نو اٹل کے لیے لٹس سسٹم کی سہولت سے استفادہ کرتے ہیں۔

کابل کے تازہ ترین دورے کے دوران میں ایک ایک دن خان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ اسپتال گیا۔ ڈاکٹروں نے ایجنڈا کس کی سوزش تشخیص کی۔ آپریشن تجویز ہوا اور کامیاب بھی رہا۔ اگرچہ یہ نہایت معمولی نوعیت کا آپریشن ہے لیکن اس کے لیے بہت اہم تصور کرتا ہے۔ "اگر یہ مسئلہ میری راہی میں پیش آتا تو پھر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کئی ساتھیوں کو اس تکلیف کے باعث مرتے دیکھا ہے۔ اکثر اوقات، مخصوص رات کو نیرت کے خوش گوادر خان میں کھانے کے گروپ میں کھانے کی ہانکیاں بھرنے والے گھڑیوں کی شکل کا پند یہ موضوع ہے کہ آیا رہنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے؟ اکثر وہ اس معاملے پر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ ہجرت کے لیے تیار ہیں لیکن اس بار تازہ نوئی کا خطرہ لاحق ہے۔ ایمان پر اس بار اس سے کہہ دیا کہ اس بار معاملہ ہے یہاں تک کہ وہ اس

میں رہے۔ اس وقت کے بعد سے آج تک۔ ان کے پاس بہت سے بچے ہیں۔ ان کا ایک کے مختلف حصوں میں رہنے والی چاندنی ہے لیکن گھڑیوں کے داخلے میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں ان کا نظام ہے لیکن داخلے کے لیے گھڑی اب دلچسپی بنی تک۔ بعد از زندگی کے اندر سے یہ قدم کھانی کر دیکھ چکے۔ شاید وہ صدیوں تک چراگاہوں کی تلاش میں چل چل کر تھک چکے اور اب مٹی پر پاؤں جمانا چاہتے ہیں۔ ہجرت کا تجربہ ان کے پاس ہے اور نقل مکانی خون میں رہتی تھی۔ یہ لوگ لب و لہجہ کی بجائے کہیں اور جا کر بسنا چاہتے ہیں۔ گوکہ معاملہ اب تک صرف گھنٹوں کی حد تک ہے مگر گھنٹوں جلدی ہے اور یہ تفریق بھی بن سکتی ہے۔

داخان کے بہت سارے گھڑی اب ساتھی سوہیت یونین کی آزاد ریاست گھڑیوں کی ہجرت پر سوچ رہے ہیں۔ وہ صاف ظاہر ہے۔ زبان ایک ہے اور صدیوں

برائے طوفانی رشتے اور نسلی تعلق بھی۔ فی الحال تو اس کے آثار نہیں لیکن پتا چلتا ہے کہ وہ بھی اسی گھنٹوں کے ساتھ ہیں۔ آخر میں تو آزاد لٹس خانہ بدوش!

افغان گھڑیوں کے نو جوان خان کو بھی ضرور بات کے حل اور سہولتوں کی تلاش میں ہجرت کے اس خیال سے متفرق ہیں۔ خود اس نے بھی یہ حقیقت تسلیم کی۔ "میں بھی اکثر سوچتا ہوں کہ افغان چھوڑ کر افغان سرزمین کے کسی چھوٹے سے شہر میں جا کر بس جاؤں۔ میرے خاندان کے مسائل تو حل ہوں گے۔ ہمیں وہ سہولتیں تو ملیں گی جنہیں ہمارے جیسے دوسرے انسان استعمال کر کے اپنی زندگی آسان بنا رہے ہیں۔"

جب خان نے یہ اعتراض کیا، اس وقت اہم موسم گرما کی چراگاہ میں بیٹھے تھے۔ سامنے بھیلروں کا گلہ سرسبز میدان میں گھومتا تھا۔ خوش گوادر موسم میں گئی نیرت ہمارے سامنے تھے لیکن اس کی بات سننے کے بعد میرا ذہن کھٹک اور بھٹک رہا تھا۔

سہولتوں کی تلاش میں جب گھڑی اپنی صدیوں قدیم سرزمین چھوڑنے پر خود کو آباد کر بیٹھے ہوں تو پھر یہ کھانا مشکل نہیں کہ شاید آنے والی کسی دہائی میں داخان کی اس مٹی میں شاید ہی کوئی گھڑی خانہ بدوش اپنے رہائش گاہ سمیت چھوڑے گا۔ کادخ کرنا نظر آئے۔ کسی بلند پہاڑ پر چڑھ کر۔ لیکن وہ بہت اونچے تھے۔ یہ نیرت کی زبان کے ہاتھ پر تھکے ہوئے مرکی کا نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی گھڑی دکائی دے تو آج داخان کی اس مٹی کے ہاتھ کا گمہ، مینا جائے گا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ایک ہزار سے کچھ زیادہ کرنا خانہ بدوش صدیوں سے اس سرزمین پر آباد ہیں۔ انہی کے دم قدم سے دنیا کے اس انتہائی بلند مقام پر زندگی کی رمتی نظر آتی ہے۔ شاید داخان کی مٹی ان کے بعد بھوتوں کی ہمتی بن کر رہ جائے گی۔ "ایسا نہ ہو۔" میرے منہ سے نکلا۔ چٹ کر دیکھا تو میری خود دکائی ہے خان خیران نظروں سے مجھے کچھ بات نہ کہنے کے مسائل کا حل چاہتا ہے۔ تعلیم، علاج کی فراہمی سہولتیں، یہی سڑک اور ہل۔۔۔ ایک کار بھی۔

"کچھ ہوا۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس ارادہ ہے وہاں میں منہ سے کہہ نکل گیا۔" میں نے فریادہ کرتے ہوئے بات چلی۔ بتا دیتا تو وہ نہ ایمان جاتا۔ میری دعا شاید اسے بدو ہو سکتی۔

اسے دونوں سے اس کا شک کھارہا ہوں، شک خالی کا ہوں
بر ملا اعتراض! اچھا نہیں لگتا!

خان کی گرہائی چراگاہ میں پیدا ہوا تیسرا دن تھا کہ
جب ایک اہم خبر پہنچی۔ کامل سے دوسرا دن کی اجیتر
سروس کے لیے آئے تھے۔ وہ موجودہ سڑک کو اس کے
انعام سے لے کر کرغز پہاڑوں تک توسیع دینے کی
خاطر ایک سروس کرنا چاہتے تھے۔ یہ خبر خان کے لیے
بہت خوش کن تھی۔

"سڑک تعمیر ہو گئی تو پھر گھوڑوں کے لیے یہ تین دن کا
سفر چند گھنٹے کا رہ جائے گا اور میں کار بھی خرید لوں گا۔" یہ خبر
سن کر اس کا چہرہ ہنسا رہا تھا۔ خان کو ایک بار پھر اپنا خواب
تعبیر سے قریب تر دکائی دے رہا تھا۔ اسے انجینئروں سے
ملاقات کے لیے جانا تھا۔ یہ ملاقات خان کی حیثیت سے
ہونی تھی۔

ہم نارت میں بیٹھے تھے۔ دوسرے دن خان کو
انجینئروں سے ملاقات کے لیے بچے جانا تھا۔ اس کی
یاد آ رہی تھی کہ صندوق سے خان کا بہترین لباس نکال
دی گئی۔ اسے خان کے سفر کی تیاری کرنا تھی۔ وہ خود بھی
اس کے ساتھ جانے والی تھی۔ اس نے انوں سے بنا سرف
رنگ کا بہترین لباس لایا۔ واقعی اس پر بہت خوبصورت
اور ڈگڑاں پھول ڈالنے کا شید کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی
پٹے کے لیے سفری جوتے، پر بیوم کی فلیڈ، جھوٹی مین
بوتل اور سیاہ، سفید رنگوں سے بنا دوپٹا۔ وہ ڈار کی ڈلی
دکن نہیں بھونی تھی۔ دوسری کرغز خواجہ کی طرح وہ بھی
نوسہرا استعمال کرتی تھی۔ سڑک، بننے کی ڈیڑھ گھنٹہ کی
ساتھ بے لطف سفر یا تھی بندگی زندگی سے تھوڑا سا فرار۔۔۔۔۔
وہ بہت خوش تھی مگر میں اس کے خوش ہونے کی حقیقت دہ
بگھنے سے قاصر تھا۔

"سڑک بننے کی خبر سے سب ہی بہت خوش ہیں۔"
خان نے قہرے کی ہنسی بھرتے ہوئے کہا۔ میں نے گردن
گھما کر دیکھا۔ صندوق پر سر جھکا کر کٹری اس کی بھائی بھی
سر جھکا کر شوہر کی تائید کر رہی تھی۔

دوسرے دن وہ سویم سے سویم سے سفر کے لیے تیار
ہو گئے۔ دوا کی کے لیے گھوڑے پر سوار تھے۔ میں خدا حافظ
کہنے کے لیے کھڑا تھا۔ "اس بار سڑک بننے کے امکانات سو
بھید ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "دعا کرنا۔۔۔ اللہ
حافظ۔" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

ملیٹنہ مصر گزشت

اس کا یہ سلوک ویش آئندہ ہی رد کا تھا۔ اس دوران
میں مجھے تنہا ہی اس علاقے میں گھومنا پھرنا تھا۔ میں نے
اسے جانتا دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دعا کر رہا تھا کہ سڑک بن
جائے ورنہ کرغز جا بھی سکتے ہیں۔ میں نے دوا کی پر نظر
ڈالی۔ "اتنی اونچائی، سخت سردی اور مشکل ترین قدرتی
ماحول میں کرغز خانہ بدوش ہی رہ سکتے ہیں۔ یہ بھی چلے
مجھے تو اب کوئی اور یہاں آ کر آباد نہیں ہونے والا۔"
"لے لے اللہ۔۔۔ اس بار تو سڑک بنادے ورنہ۔۔۔" مجھے
یقین تھا کہ آگے کی بات اور والا کچھ چکا ہوگا۔ اتنی بات
پر دیے ہی اللہ اور فطرت سے انسان کا تعلق زیادہ گہرا،
قریبی اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

میں ایک پہاڑی کے اوپر پہنچا۔ وہاں سے میں خان
کو بچے اترتا دیکھ سکتا تھا۔ وہ بہت اچھڑے سے آڑے
ترجمے پہاڑی راستوں پر گھوڑا آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی
دراڑ دیکھ کر لگا کہ منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ ٹھہر رہا تھا
کہ وہ بس سڑک کے پسے دیکھتا تھا، اس بار حقیقت میں
جسے جارہا ہے لیکن ایک ہیسا ملک جہاں سخت غریبیت اور
پسماندگی ہو، جہاں امن کی حالت بھی اور خان بدوش کی
جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں، تنہا دلی سرگرمیاں کم اور صنعتی
پیداوار کم ہونے سے زیادہ ہو، جہاں درآمدات تو بہت مگر
برآمدات کچھ خاص نہ ہوں وہ ہیں انیس سڑک کی ترقی
تعمیر اور۔۔۔ وہ بھی خان کی سوچ کے عین مطابق۔
ملک کی ضروریات اور ترجیحات کا کچھ شمار نہیں۔ خان کی
سڑک کس حیثیت کی ہونی تھی۔

وہ بچے بھی افغانستان جیسے ملک میں ایک سڑک کی
تعمیر تیل کام نہیں، وہ بھی ایسی سڑک جسے دشوار گزار
پہاڑی علاقے میں چٹانوں کو تراش کر بنانا ہو۔ اس
پر انکھوں شاید کروڑوں ڈالر کا خرچ ہوگا۔ خرچ کم نہیں
لیکن اس سے جو سہولتیں ملیں گی، ان کی قیمت بھی کم نہیں،
خاص طور پر ان کرغزوں کے لیے جو ایک سڑک نہ ہونے
کے باعث تعلیم سے دور اور علاج کی سہولتوں سے محروم
ہیں۔ جس کے باعث وہاں شرح اموات خطرناک حد
تک زیادہ ہے۔ شاید ایک سڑک ان کی زندگی اور واخان
کی پٹی کے اس حصے میں موجود کرغز خانہ بدوش ثقافت کو
بچائے۔ شاید۔۔۔ یقین سے کہہ کر مشکل تھا۔ ہنوز
سڑک دور است!

اُس روز خان کی غیر موجودگی میں سڑک کی بات

اگست 2014ء

ساتھ تھی۔ "یہ علی نے ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف دیکھا۔" یہاں کے لوگ سڑک چاہتے ہیں تاکہ گھولے کی پیچھے کی جائے گا، کی نرم نرم گدیاں پر چڑھ کر سڑک پر چڑھ کر چلے گئے ہیں کہ اس سے انہیں خوشی ملے گی مگر....."

انہوں نے ہاتھ اڑھادی چھوڑی تو میں نے سنا۔

نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ گئے تھے، دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم ایک بار سے خانہ کونڈ کو مصروفیت دیاں اس اور پھر اسے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دنیا کا سب سے اہم مقام ہے۔"

یہ سننے کے بعد میرے ہاتھم تصور میں خانہ کونڈ آیا۔ سرخ گھولے کو اپنے نگاہ کر تھالی سے دوڑاتے ہوئے وہ سڑک کا سروے کرنے والے انجینئروں سے ملے جا رہا تھا۔ انکے ہی لمحے میں نے ان اڈے پر چھو پہاڑی راستوں پر غور کیا، اموار اور خوبصورت پاک رینگیں، جس پر خانہ کونڈ کا دوڑا رہا تھا۔ غرق کے شے لے گئے تھے۔ تیز ہوا سے ان کے لیے پل لہرا رہے تھے۔ اندر سے سڑک بگڑ رہا تھا۔

ایم علی کی باتیں سننے کے بعد میں بھی اب کئی اور انداز سے سوچ رہا تھا۔ چلو! خانہ کا خواب پورا ہو جائے۔ سڑک بن جائے، وہ اس پر اپنی کار بھی دوڑائے لیکن..... ان کو غرض خانہ بدوشوں کا کیا ہوگا..... بیچڑوں، پاک، رنگ، رنگ، کالین اور برت والے آزاد خلیں کو غرض جنہیں اپنی شناخت پر مان ہے۔ وہ جو بچھے دو ہزار برس سے دنیا کے تحت ترین سرد موسم والے علاقے میں خانہ بدوش زندگی بسر کرنے کے باوجود اب تک خود کو معدومیت سے محفوظ رکھے بیٹھے ہیں۔ کیا ایک سڑک بننے کے بعد، ہزار ہا سال سے محفوظ یہ خانہ بدوش قبیلہ تہذیبوں کی زد سے خود کو محفوظ رکھ پائے گا۔

"یہ میں ایم علی کی آواز سن کر چوٹا۔ میری طرف قبوہ کی پہاڑی پر چلا۔" ہم اب تک محفوظ ہیں اور اس کی وجہ چروائی دنیا میں خود کو گم نہ کرنا ہے مگر ایک سڑک..... "میں انکے ساتھ ان پر دو تہا تسلط نے غم نہیں کیا مگر کامل کے حکمرانوں کے یہ دوا انجینئر شاید ہمارے خاتمے کا آغاز کر دیں گے۔"

ساتھ بیٹھے بڑے ایم علی کا چہرہ گرم گرم قبوہ سے اٹھنے والی بھاپ میں دھندلا رہا تھا۔

ہو رہی تھی اور میری بھی ساتھ تھی۔ "سڑک کی تعمیر کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔" میں نے اُن سے اتفاق کیا۔

"تو یہ ہے تھے کہ جب موجودہ خانہ کے والد زندہ تھے، تب بھی ان کی کوششوں سے ایک بار کامل کے سرکاری انجینئر سڑک بنانے کے لیے سروے کرنے پہنچے تھے مگر....." انہوں نے سامنے پہاڑ کی طرف غور سے دیکھا اور پھر چہرہ میری طرف کیا۔ "اس وقت بھی سروے ہوا تھا وہ خانہ بھی بہت خوش تھا لیکن....." اس نے کھائی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم سب بھی گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ اس بار بھی سروے ضرور ہو گا۔" یہ بات کاہنا آسان نہیں۔ "وہ سب خانہ کا جوش جاتے تھے۔ ان کی دعا میں اسی کے ساتھ تھیں مگر پرانے خانہ کا تجربہ یادداشت سے خوش ہوا تھا۔ "سڑک کا بنانا آسان نہیں۔" یہ سن کر میں نے بھی سر ہلا دیا تھا۔ اب یہ غم نہیں کہ تانید میں ہلا تھا یا تردید میں۔

ویسے ایم علی اور خانہ کی سوچ میں کافی فرق تھا۔ خانہ کے لیے سڑک اور کار اہم تھی لیکن یہ کچھ اور بھی سوچتے تھے۔ "سڑک آسانوں کے ساتھ اپنے مسائل بھی لے کر آتی ہے۔" انہوں نے قبوہ کی چالی میری طرف بڑھائی۔ "تجربہ سڑک بننے کی تو سمجھتیں نہیں کی مگر اس کے ساتھ ہی پہاڑی فوج فوراً بھی سیاح بھی بنیں گے۔ زندگی نہ کوششیں ہیں تو خانہ سے تو جہان ہونے والی سیاح بھی شہر یوں کی طرح تین آمان اور دست ہو جائیں گے۔ ہمارے کھانے پینے، رہنے، رہنے، رہنے..... سب کچھ بدل سکتا ہے۔" سڑک انسان کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ انکا گہرا اثر وہ صدیوں پرانی اعیانہ کی بات اور اپنی ہزار ہا برس قدیم ثقافت..... تو ہمارے آئندہ سب سے لائق ہونا چاہتا ہے۔"

میں کچھ دیکھتا تھا۔ اسے عام طور پر جنریشن گیپ (سلوں کے درمیان سوچ کا فرق) کہتے ہیں۔ خانہ کے لیے کار اہم تھا۔ لیکن سڑک لیکن لگ بھگ پوری زندگی کے لیے اسے اپنے جہان دیدہ ایم علی کے واسطے اب کوششیں ہیں۔ اپنی ثقافت اور اجداد کے برکت و راج زیادہ عزیز ہے۔ اور خانہ ساتھ ساتھ تھے مگر دونوں کی سوچیں اپنے اپنے دائرے میں تھیں۔

اس کے بعد کافی دیر تک برکت میں خاموشی طاری رہی۔ آخر قبوہ نے کی جگہ میں حقیقت کی دنیا میں واپس لائی۔ بھاپ اڑاتے خوشبو گرم گرم قبوہ کی چالی

جائے نامہ سرگزشت

آزادی کے لیے ایک ایسے ہی جانی قربانی

یومِ آزادی

14 یا 15 اگست

عقیل عباس جعفری

ہم عرصہ سے اسی الجھن میں گرفتار ہیں کہ پاکستان کی تاریخ آزادی کون سی ہے۔ 14 اگست 1947ء بروز جمعرات بمطابق 27 رمضان یا 27 رمضان یعنی 15 اگست؟ اس معما کو حل کرنے کے لیے تحقیق کا باب کھولا گیا۔ اب آپ خود ملاحظہ کریں کہ اصل تاریخ کیا ہے۔ تمام ثبوت و شواہد سامنے رکھ دیے ہیں۔

پاکستان کو آزاد ہونے لطفِ جلدی سے لپا دیا
گندہ کا ہے۔ اس طویل عرصے میں ہم اپنی تاریخ کے کتنے ہی
کوشش سے ناواقف رہے۔ ہم اپنی یومِ آزادی کی تقریبات
ہر سال 14 اگست کو اور ہمارے ساتھ آزاد ہونے والا ہمسایہ
ملک بھارت اپنی اپنی تقریبات 15 اگست کو مناتا ہے۔ ہر
سال یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ ملک جو ایک ساتھ آزاد ہوئے
ہوں ان کے یومِ آزادی میں ایک دن کا فرق کیسے آگیا؟ اپنی
اس تحریر میں ہم نے اسی معما کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔



اگست 2014ء

65

عقیل عباس جعفری



قائد اعظم محمد علی جناح: دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

کی تاریخ 15 اگست 1947ء کیوں منی ہوئی اور اگر پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تو نام نے آزادی کی منی سالگرہ 15 اگست کی بجائے 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی؟ اور آج تک یہ سالگرہ 15 کی بجائے 14 اگست کو کیوں مناتے چلے آ رہے ہیں؟

آج ہم اپنی اس تحریر میں ای "سچے" کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ پاکستان اصلاً آزاد کب ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دستاویز Indian Independence Act 1947ء ہے جسے برطانوی پارلیمان نے منظور کیا اور جس کی توثیق شہنشاہ برطانیہ جارج ششم نے 18 جولائی 1947ء کو کی۔ اس قانون کی ایک کاپی پاکستان کے سیکریٹری جنرل چودھری محمد علی نے (جو بعد ازاں پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے) 24 جولائی 1947ء کو قائد اعظم کو ارسال کی۔

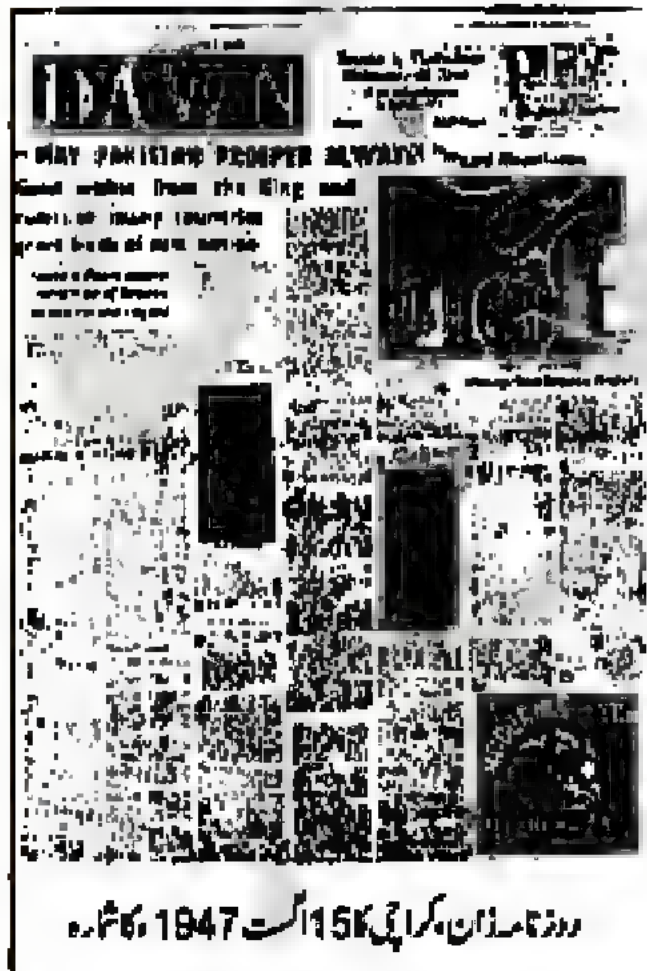
یہ قانون 1983ء میں حکومت برطانیہ کی شائع کردہ دستاویز The Transfer of Power کی جلد 12

نمبر سے بڑھ کر دیکھا جاتا ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان برصغیر کی 27 ویں شپ کو آزاد ہوا اور یہ کہ جس دن پاکستان آزاد ہوا اس دن جمعہ اللہ و اربع کا مبارک دن تھا پھر منیسا بتایا جاتا ہے کہ اس دن 14 اگست 1947ء کی تاریخ منی ہوئی اور ہم اپنے ساتھ آزاد ہونے والے ملک سے ایک "دن بڑے" ہیں۔ جب ہم 14 اگست 1947ء کی تقویم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دن تو جمعرات تھی اور بھری تاریخ بھی 27 مئی 26 رمضان تھی۔ پھر ہم پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ دیکھتے ہیں جو پاکستان کی آزادی کے 11 ماہ بعد 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوئے تھے۔ ان ڈاک ٹکٹوں پر واضح طور پر پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست 1947ء منی ہوا ہے۔ ہم پھر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان کا یوم آزادی بھی 14 مئی 15 اگست 1947ء ہے مگر پھر ہم آزادی کی پہلی سالگرہ 14 اگست 1948ء کو کیوں منائی گئی؟ یہاں ہم ایک مروجہ پھر الجھ جاتا ہے کہ پاکستان آزاد کب ہوا تھا۔ 14 اگست 1947ء کو یا 15 اگست 1947ء کو.....

اگر ہم 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوئے تو آزادی کے مہمانہ ماہ بعد شائع ہونے والے ڈاک ٹکٹوں پر یوم آزادی

hereafter in the Act referred to as "the new Dominions", and the said fifteenth day of August is hereafter in this Act referred to as "the appointed day."

اس قانون کے سلسل میں چاری ہونے والے چند امور
 احکامات ملاحظہ ہوں جن کے اقتضا سب سے اوپر ترجمہ ضمیمہ نمبر 1
 لاہوری نے اپنے مضمون "پیم آزادی: جمعہ المبارک 27
 رمضان یا 15 اگست" مشمولہ جریہ 36- شعبہ تصنیف
 تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی میں شامل کیا ہے۔
 ☆ 7 اگست 1947ء: اقوام متحدہ میں برطانیہ کے
 مستقل نمائندے کے نام دفتر خارجہ کا تار:



روزنامہ ذیل کراچی 15 اگست 1947ء کا شمارہ

"اب دیکھو! نے تار بھیجا ہے کہ مسلمان قائدین
 اقوام متحدہ کی رکنیت کے لیے درخواست دینے کی ضرورت کو
 تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ برطانیہ فوری طور پر
 پاکستان کی طرف سے درخواست وائر کرے اور جب پاکستان
 15 اگست کو ایک آزاد مملکت بن جائے گا تو وہ اس کی توثیق
 براہ راست خود کرے گا۔" (صفحہ: 570)

☆ 12 اگست 1947ء (ہندوستان اور پاکستان کی
 رکنیت کے استحقاق پر یکے بعد دیگرے اقوام متحدہ کے بیوروکریٹ کی
 پریس ریلیز سے ایک اقتباس)



15 اگست 1947ء کو لاہور میں
 پاکستان کے پہلے وزیر جنرل کے عہدہ سنبھالنے والے

کے صفحہ 234 پر اور اس کا ترجمہ قاضی اعظم بھیرو برہنہ
 کابینہ ڈویژن حکومت پاکستان اسلام آباد کے شائع کردہ
 جناح بھیرو (کے اردو ترجمے) کی جلد سوم کے صفحہ 45 سے
 صفحہ 72 تک ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون میں واضح طور
 پر درج ہے۔

1- (1) 15 اگست 1947ء سے برطانوی
 ہندوستان میں دو آزاد فرماں بردار مملکتیں قائم کی جائیں گی جو
 بالترتیب اظہارِ پاکستان کے نام سے موسوم ہوں گی۔
 (2) بعد ازاں اس قانون میں "نئی مملکتوں" سے
 مطلب نئی مملکتیں اور "مقررہ دن" سے مراد 15 اگست کی
 تاریخ ہوگی۔

لر اسفر آف پاور جلد 12 کے صفحہ نمبر 234 پر اصل تحریر
 یہی ہے:

Indian Independence Act, 1947
 1-(1) As from the fifteenth day of
 August, nineteen hundred and forty
 seven, two Independent Dominions
 shall be set up in India, to be known
 respectively as India and Pakistan.
 (2) The said Dominions are

مبینہ ممبر گزشت

اگست 2014ء

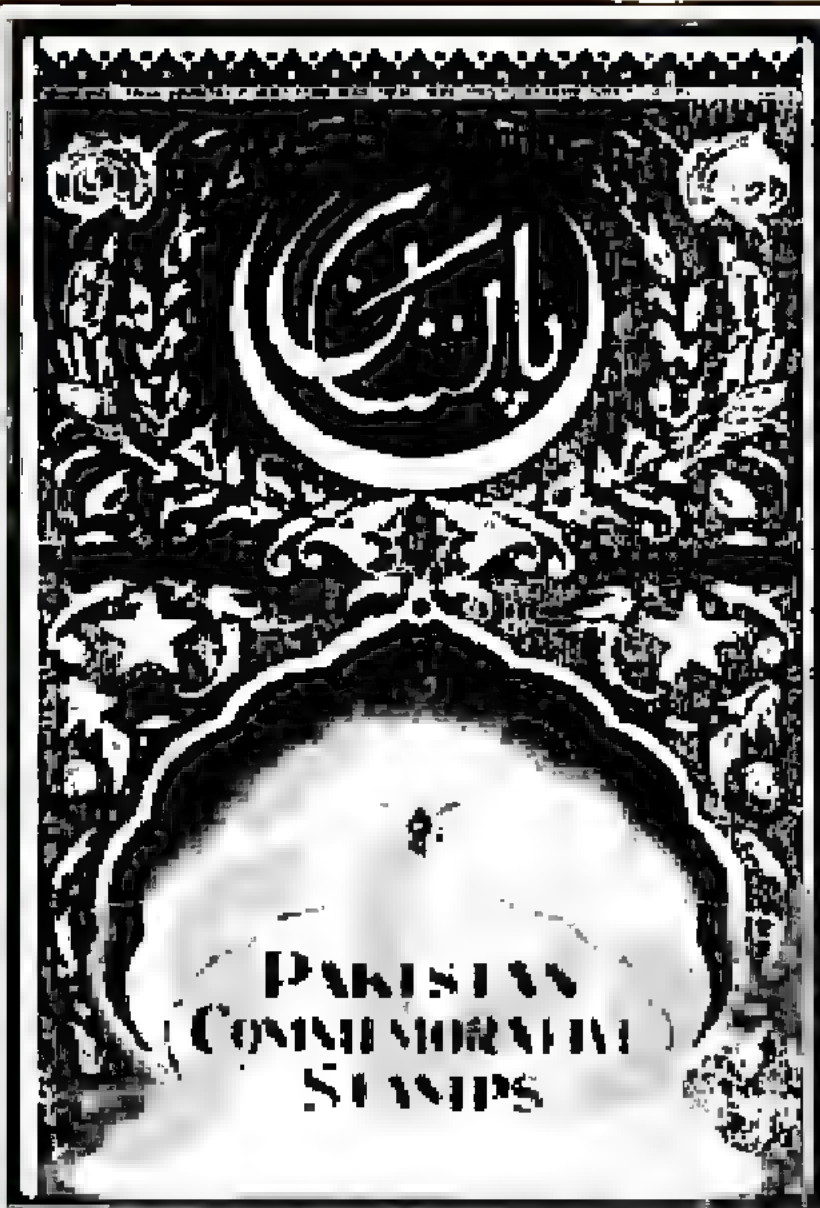
میں نے اسل پبلک لا میگزین کے شمارے نمبر 13 اگست 1947ء کو کراچی خلیفہ لائیں اور 14 اگست 1947ء کی صبح پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے

خطیبِ مبارک نے 303544 احادیثِ مبارکہ کے بارے میں
 15 جلدوں پر مشتمل 15 حصوں کی کتاب "احادیثِ مبارکہ" لکھی ہے۔

”میں ملک معظم کی صحت کا جام تجویز کرتے ہوئے ہے
 حدِ مسرت غموں کو مٹاؤں۔ یہ ایک نہایت اہم اور منفرد موقع
 ہے آج ہندوستان کے لوگوں کو کمزور ہاتھ اور ٹھیک ہونے والا
 جانے 15 اگست 1947ء کے مقرب و روشن آؤ اور خود مختار
 ملک پاکستان اور ہندوستان معرض وجود میں آجائیں گی۔
 ملک معظم کی حکومت کے اس فیصلے سے وہ اپنی دلچسپ نصیب
 احسن حاصل ہو جائے گا جو دولت مشترکہ کے قیام کا واحد مقصد
 قرار دیا گیا تھا۔“

میں نے ہی ملک کے سامنے ہر جوش عوام مناجا ہے۔ جب پاکستان کے ماحول گہرے جزل کاغذ اعظم مہر ملی

ایکستان کا پہلا ٹیٹ



پاکستان کے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی 15 ویں سالگرہ کی مناسبت 19.17 روپے کی قیمت پر

مثال ہے۔ میں تو قلعہ رکھتا ہوں کہ برطانوی دولت مشترکہ کے تمام ارکان، جمہوری اصولوں کو سر بلند رکھتے ہیں آپ کا ساتھ دیتا ہے۔"

اس پیغام کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الوداعی تقریر دی اور پاکستان اور پاکستانی عوام کی سلامتی کے لیے دعا کی۔ اپنی اس تقریر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واضح الفاظ

ملکایا: آج میں آپ سے آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے خطاب کر رہا ہوں، کل کی ڈومین پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہوگی اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومین آف انڈیا کا آئینی سربراہ ہوں گا۔ دونوں حکومتوں کے قائدین نے مجھے جوائنٹ ڈیفنس کونسل کا غیر جانبدار چیئرمین بننے کی دعوت دی ہے یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے جس پر ہر دلا تڑپنے کی کوشش کروں گا۔

کل روٹی خود مختار ریاستیں دولت مشترکہ میں ہوتی ہیں، یہ نئی اقوام نہ ہوں گی بلکہ یہ قدیم تہذیبوں اور

جناح لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک خصوصی جلسے میں سوار اسٹیبل ہاں پہنچے تو عوام نے بڑی خوشنودی اور تلیوں سے ان کا استقبال کیا۔ اسٹیبل کی تمام نشستیں بڑھ گئیں۔ گیلری میں ممتاز شہریوں، سیاست دانوں اور ملے اور غیر ملکی اخباری نمائندوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ کرنی صدارت پر دستور سارا سٹیبل کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح شریف فرماتے اور ان کے برابر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نشست تھی۔ انہوں نے کہا: اب اپنی اپنی نشستیں سنبھالیں تو کارروائی کا پتہ آج پتہ چلا گیا۔

سب سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہد پاکستان کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں قائد اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

"برطانوی دولت مشترکہ کی قوم کی صف میں شامل ہونے والی نئی ریاست کے قیام کے عظیم موقع پر میں آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ نے جس طرح آزادی حاصل کی ہے وہ ساری دنیا کے حریت پسند عوام کے لیے ایک

S.O. No. 2544/47

May 14, 1948.

My dear friend Ali,

You asked me some days back whether the United Nations should be asked to take over the administration of the 1948 issue. I have been thinking about it and I write to you now to say that I am inclined to think that the United Nations should be asked to take over the administration of the 1948 issue. I have not yet decided on the 30th August. I shall let you know when I have made up my mind.

Yours sincerely,

(Signature)

S.O. No. 2544/47,
Foreign Secretary,
Ministry of External Affairs.

وہی نیکر باہمی سہارا ملے گا جس کی ضرورت تھی کہ پاکستان کی آزادی کے لیے

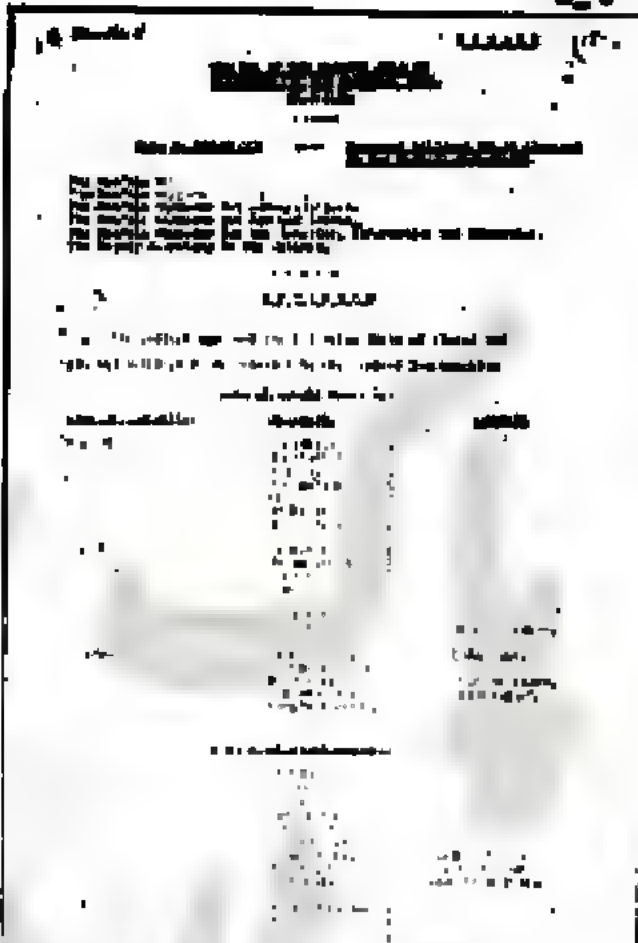
15 اگست 1947ء کی رات 12 بجے دنیا کے نقشے پر ایک نیا اور خود مختار اور نیا ملک اسلام کی سب سے بڑی خدمت کا اظہار ہوا۔ جس کا نام پاکستان تھا۔

جس دن اسی وقت لاہور، پشاور اور حاکم سے پاکستان ہوا کا شنگ سرورس سے پاکستان کی آزادی کا اعلان ہوا۔ اس سے قبل 14 اور 15 اگست 1947ء کی دو میانی رات لاہور، پشاور اور حاکم اسٹیشنوں سے رات 11 بجے آل انڈیا ریڈیو سروس نے اپنا آخری اعلان نشر کیا۔ 12 بجے سے پہلے پچھلے پندرہ گھنٹوں کی مشقوں میں جہاں تک پاکستان کا نام آتا تھا وہاں تک گریز کی زبان میں فضا میں ایک اعلان گونج رہا تھا کہ رات کے وقت پاکستان کی آزادی اور خود مختار مملکت سرورس وجود میں آ جائے گی۔ رات کے ٹھیک 12 بجے ہزاروں سائینس کے کانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ "پاکستان برادری کا شنگ سرورس ہے۔"

انگریزی میں یہ اعلان گونج رہا تھا اور اردو میں جہاں تک ملی جہاں تک اس اعلان کے فورا بعد مولانا آزاد کی تقریر کی اور ان کی آیات تلاوت فرمائیں۔ جس کے بعد ان کا ترجمہ نشر کیا گیا بعد ازاں خود بخود شیدا گونج کر رہ گیا تھا ایک شخص نے سازیدہ بھلا گیا مگر ستو خاں زادان کے ہم نوائے قوت میں علامہ اقبال کی نظم ساقی نامہ کے چند بند پیش کئے۔ ان شریات کا اتمام حیلہ ہوشیار پوری کی ایک تقریر پر ہوا۔ آدھی رات کے وقت علی ریڈیو پاکستان پشاور سے کتاب احمد نسل نے اردو میں اور مہاراجہ جان مہسوم نے پشتو میں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا جبکہ قرآن پاک کی تلاوت کا شریک بھی

اگست 2014

دارت تمام ہیں۔ وہی گھنٹہ خود پر آزاد ریڈیو کے میڈر بڑے ہر ہیں۔ دنیا بھر کی ٹیلی ویژن میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں ملک کے شاعروں، مفکرینوں، سیاست دانوں اور افریقہ کے انسانیت کی خدمت کے لیے ناقابل فراموش خدمت سرانجام دی ہیں۔ ان ریڈیو کی حکومتیں، تجربہ کار اور کٹر وٹنس ہیں۔ بگڑا ہوا بھر میں قیام امن اور ترقی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ بردار ہونے کی پوری صلاحیتیں رکھتی ہیں۔



1948ء کی رات 12 بجے سے پہلے پچھلے پندرہ گھنٹوں کی مشقوں میں جہاں تک پاکستان کا نام آتا تھا وہاں تک گریز کی زبان میں فضا میں ایک اعلان گونج رہا تھا کہ رات کے وقت پاکستان کی آزادی اور خود مختار مملکت سرورس وجود میں آ جائے گی۔ رات کے ٹھیک 12 بجے ہزاروں سائینس کے کانوں میں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں یہ الفاظ گونجنے لگے۔ "پاکستان برادری کا شنگ سرورس ہے۔"

لاہور، پشاور اور حاکم اسٹیشنوں کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر کا آغاز کیا انہوں نے سب سے پہلے شاد انگلستان اور ہمسرائے کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ "ہمارا ہمسرایاں سے باہر اور دوستانہ تعلقات کا جذبہ کبھی کم نہ ہوگا اور ہم ساری دنیا کے دوست رہیں گے۔" اسٹیج کی کارروائی اور اعلان آزادی کے بعد قائد اعظم محمد علی جناح لاہور ماؤنٹ نیشن کے ہر شاہی محل میں گورنر جنرل ہڈس واکس ہوئے۔ وہ پھر وہاں سے لاہور ماؤنٹ نیشن آئی دہلی متواتر ہو گئے جہاں اسی رات 12 بجے بھارت کی آزادی کے اعلان کے ساتھ انہیں بھارت کے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنا تھا۔

لاہور، پشاور اور حاکم اسٹیشنوں کے اعلان آزادی کے مطابق 14 اگست 2014ء

GOVERNMENT OF PAKISTAN,
Ministry of Interior,
Karachi.

Karachi, the 10th July, 1947.

NOTIFICATION

In exercise of the powers conferred by section 25 of the Negotiable Instruments Act (XXI of 1911), the Government of Pakistan is pleased to declare the 15th August 1947, the day on which the anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, as a public holiday throughout the Dominion of Pakistan for the purposes of the said Section of the said Act.

محمد علی بکر ظری
نائب وزیر داخلہ حکومت پاکستان

Deputy Secretary to the Govt. of Pakistan.

کے ساتھ میں آپ کو جنیت کا بیٹام دیتا ہوں۔ 15 اگست
آزاد اور خود مختار پاکستان کی بیدار ش کا دن ہے۔ یہ مسلم قوم کی
مجزول قعود کی علامت ہے جس نے بچنے چند برسوں میں
اپنے وطن کے معنوں کے لیے عظیم قربانیاں پیش کیں۔

اپنے اس نجات میں قائد اعظم نے پاکستان کے تمام
شہریوں کو پاکستان کی خود مختار حکومت کے قیام کی مبارک باد
پیش کی ہے۔ کہا کہ اس نئی حکومت کے وجود میں آجائے سے
پاکستان کے دشمنوں پر بدست و ذمہ داریاں عائد ہوں
تھیں۔ اب ان کے لیے قیامت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں کہ کس طرح
ان کو قوم پرستوں میں شکست کا مصیبت شال دینا۔ ان کے لیے مل کر
جنگ لڑتی ہے۔ یہ تحریر واقعی ہے۔

اس دن یعنی 15 اگست 1947ء کی صحیح اخبارات
پاکستان کے یوم تہذیبی کے حوالے سے خصوصی شمارے شائع

نہ احمد نے حاصل کیا۔ ان تحریرات کا اختتام جناب احمد عظیم
قاسمی کے لکھے ہوئے ایک خطے پر ہوا جس کے بول تھے
"پاکستان بنانے والے پاکستان مبارک ہو۔"

اسی وقت اسی لوحیت کا اعلان ہو چکا ہے پاکستان احسا
سے انگریزی میں کلیم اللہ نے کیا جس کا ترجمہ بھگت دہان میں
نشر کیا گیا۔

15 اگست 1947ء کی صبح کو پاکستان لاہور کی
نرسینہ کا آغاز ڈاکھ ہے۔ . . . آل عمران کی آیات
آیت سے ہوا۔ . . . قیامت لڑائی کی
خبر سے بعد انگریزی شہریوں کا آغاز ہندوستان سے ہوا۔
۔ . . لے چڑھیں۔ خبروں کے بعد ایک سارا سارا ڈاکھ ہے
قائد اعظم کی آواز میں ایک پیغام سنوایا گیا۔ جو پہلے سے
ریکارڈ شدہ تھا۔ (قائد اعظم کے اس خطاب کی آڈیو کاپ یہ
نائب ہے موجود ہے۔) قائد اعظم کی تقریر کا آغاز ان الفاظ
سے ہوا تھا:

"It is with feelings of greatest happiness and emotion that I send you my greetings. August 15 is the birthday of the independent and sovereign State of Pakistan. It marks the fulfilment of the destiny of the Muslim nation which made great sacrifices in the past few years to have its homeland."

(ترجمہ سنیہ پڑوسی مسرت اور احساس کے جذبات

عالمی انصاف سرگزشت

GOVERNMENT OF PAKISTAN
Ministry of Interior
Karachi

Public, the 10th July, 1947.

NOTIFICATION

In exercise of the powers conferred by section 25 of the Negotiable Instruments Act (XXI of 1911), the Government of Pakistan is pleased to declare the 15th August 1947, the day on which the anniversary of the birth of Pakistan will be celebrated, as a public holiday throughout the Dominion of Pakistan for the purposes of the said Section of the said Act.

Deputy Secretary to the Govt. of Pakistan.

اگست 2014ء

71

کی جن ۱۰ تعطیلات کا اعلان کیا ان میں 1948ء کے لیے
ہم پاکستان کی تعطیل کے آٹے 15 اگست 1948ء کی تاریخ
درج تھی (یہ مراسلہ پیش الائنڈ نیشنل سینٹر اسلام آباد میں
مقبوض ہے۔)

1948ء کی پہلی سہ ماہی میں پاکستان کے محکمہ ڈاک
نے پاکستان کے ابتدائی ڈاک ٹکٹوں کی ڈیزائننگ اور طاعت
کے کام کا آغاز کیا۔ یہ چار ڈاک ٹکٹوں کا سیٹ تھا جن کے
میتھ کی ٹین ڈاک ٹکٹ ایکسٹرنل پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ کے مصوروں
رشید الدین نور محمد لطیف نے حشر کے طور پر ڈیزائن کیے تھے

PAKISTAN TIMES

Founded by Quaid-e-Azam (Established by Law)

**Pakistan Broadcasting
Service to take
over 3 stations**

The three radio stations in
Pakistan, Lahore, Hyderabad
and Ferozpur will be taken over
by the Pakistan Broadcasting
Service at midnight tonight.

The Lahore station has a
range of 100,000 watts and
programmes in the Urdu, Hindi,
English and Punjabi languages.
The Hyderabad station has a
range of 50,000 watts and
programmes in Urdu, Hindi,
English and Punjabi.

The Ferozpur station has a
range of 10,000 watts and
programmes in Urdu, Hindi,
English and Punjabi. The
Pakistan Broadcasting Service
will be broadcast from
Lahore and Hyderabad will also
broadcast this message —APF

جبکہ چار ڈاک ٹکٹ نورانی کے ساتھ شائع ہونے والا نوٹدر
ملک کے عظیم مصور عہدائزمن چغتائی کی تخلیق تھا۔ یہ ڈاک ٹکٹ
:۱۰۰ روپے کے طہائی ادارے سے مسرور۱۰۰ روپے کی لاری میں شائع ہوئے
تھے۔ یہ ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو فروخت کے لیے
پیش کیے گئے اور ان پر بھی پاکستان کے ہم آزادی کی جھنڈی
15 اگست 1947ء شائع کی گئی تھی۔

گوینہ 9 جولائی 1948ء تک یہ بات طے تھی کہ
پاکستان 15 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔ پاکستان کا یوم

کیا اور انگریزی کے مشہور اخبار "ڈان" نے کراچی سے اپنی
اشاعت کا آغاز کیا۔ اس خصوصی اشاعت کی سرخی
"Max Pakistan Prosper
Always" Lord Mount Batten

اس سرخی کے نیچے جو غیر شائع ہوئی تھی اس میں لارڈ مائونٹ بیٹن کی اس
تقریر کا مکمل متن درج کیا گیا تھا جس کا اقتباس نوپر تحریر کیا
جایا ہے۔ روزنامہ ڈان نے اس موقع پر 32 صفحات پر
مستقل ایک خصوصی ضمیمہ بھی شائع کیا تھا جو ہمارے بذاتی کتب
خانے میں بھی محفوظ ہے اور یہ خوب :۱۰۰
15/8/1947ء کو شائع کیا جاسکتا ہے۔

ڈان کے اس ضمیمے میں قائداعظم محمد علی جناح کا ایک
پیغام بھی شائع تھا جو 10 نورنگز سہ روزہ نئی دہلی سے جاری
کیا گیا تھا۔ اس پیغام پر اس کے 12۱ کی تاریخ درج نہیں ہے
مگر یہ بات یقینی ہے کہ یہ پیغام 7 اگست 1947ء سے پہلے
جاری ہوا تھا۔ اس پیغام میں قائداعظم محمد علی جناح نے کہا:

"The first issue, I am informed
will appear from Karachi, the capital
of Pakistan on the 15th of August, the
appointed day."

(ترجمہ: مجھے بتایا گیا ہے کہ (روزنامہ ڈان کا) پہلا
شمارہ پاکستان کے دارالتعمیم کراچی سے 15 اگست کو راجو
مقررہ دن ہے، شائع کیا جائے گا)

اسی دن یعنی 15 اگست 1947ء کو پاکستان کا پہلا
گزٹ بھی جاری ہوا جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی بطور
گورنر جنرل پاکستان ضرر کیے جانے اور اسی دن سے ان کا یہ
عہدہ سنبھالنے کی اطلاع درج تھی۔ اسی روز لاہور ہائی کورٹ
کے چیف جسٹس :۱۰۰ جس عہد رشید نے قائداعظم محمد علی جناح
سے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف لیا اور
اسی روز لاہور :۱۰۰ ایالات علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی
کابینہ کے ارکان نے بھی اپنے عہدوں کے حلف اٹھائے۔

ان تمام معروضات اور دستاویزی شہادتوں سے یہ
بات زیادہ ثابت کی جاتی ہے کہ پاکستان 14 اگست 1947ء کو
نہیں بلکہ 15 اگست 1947ء کو معرض وجود میں آیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے پہلے برس کسی کو اس معاملے میں
ابہام نہیں تھا کہ پاکستان سب آزاد ہوا؟ اس بات کو تشریح
اس چیز سے بھی ہوتی ہے کہ 19 دسمبر 1947ء کو پاکستان کے
نوراعظم نے اپنے مراسلے 47/17 کے ذریعہ 1948ء



ایکس عثمان علی



مصطفیٰ علی بہرائی



نذیر رازا



فارخ: پروتھاپوری

میں، جس میں وزیر خارجہ، وزیر مواصلات، قانون و صحت، وزیر مہاجرین و آباد کاری، وزیر خوراک، زراعت و صنعت اور وزیر داخلہ، اطلاعات و نشریات موجود تھے، فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کے پہلے پیم آزادی کی تقریبات 15 اگست 1948ء کی بجائے 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں۔ وزیراعظم لیاقت علی نے کابینہ کو بتایا کہ یہ فیصلہ حتمی نہیں ہے۔ وہ یہ معاملہ قائداعظم محمد علی جناح کے علم میں لائیں گے اور جو بھی حتمی فیصلہ ہوگا قائداعظم کی حکومتی کے بعد ہوگا۔

وہ قائل جس میں یہ تفصیلی درج ہے اس کا نمبر ہے 196/CF/48 اور کیس کا نمبر ہے 393/54/48۔ اس قائل میں مندرجہ ذیل میں درج کارروائی میں تحریر ہے:

The Hon'ble the Prime Minister undertook to convey to the Quaid-i-Azam the suggestion that our Independence Day celebrations should be held on the 14th rather than the 15th August.

(ترجمہ: معزز وزیراعظم نے یہ اترہ دارائی سنہالی ہے کہ وہ قائداعظم تک یہ تجویز پہنچائیں کہ ہماری پیم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منائی جائیں) اس قائل میں یہ تحریر نہیں کہ اس تجویز کا محرک کون تھا۔ پیم آزادی کی تقریبات 15 کی بجائے 14 اگست کو منائے جانے کے حق میں کیا وہ قائل پیش کیے گئے تھے۔ کارروائی کے آخر میں بریکٹ میں تحریر ہے:

Quaid-i-Azam has approved the suggestion.

(قائداعظم نے تجویز کو منظور کر لیا)

آزادی 15 اگست سے 14 اگست کہہ ہوا یہ معاملہ کرنے کے لیے ہم نے پینل 11 کی پیچیدگی سینٹر، کینسٹ ڈی جین ماسلام آباد کے دروازے پر دستک دی۔ وہاں ہماری ملاقات اس سینٹر کے ڈائریکٹر جناب قمر احمد سے ہوئی۔ جن کی مدد سے ہماری رہائی اس سینٹر میں محفوظ رہا فائیکس تک ہوئی جو ایک طریقہ کار سے تک غلطی ہونے کے بعد اب محام کے لیے کھول دی گئی ہیں۔

اس فائیکس کے مطالبے سے ہمیں معلوم ہوا کہ سیکشن 29 جون 1948ء کو کراچی میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کابینہ کے ایک اجلاس



قائداعظم لیاقت علی خان آزادی کے بعد منائی لیتے ہوئے

پاکستان کی تمام بڑاڑوں، تمام ڈوچنوں، کیسٹ بیکری، دستور ساز اسمبلی، قائد اعظم کے پرائیویٹ اور پبلک بیکری، اکاؤنٹس جنرل پاکستان ریمو، آل انڈیا جنرل الیک پاکستان اور اہمیت میں پاکستان کے ہائی کمشنر کو مطلع کیا جائے۔

فائل میں محفوظ اگلا حکم نامہ 14 جولائی 1948ء کو جاری ہوا اور اس کا ڈی او نمبر ہے 390/CB/48۔ اس میں ایس (شہادت) عثمان علی نے (اپنی بیکری نووی کیسٹ) نے وزارت داخلہ کے لائی بیکری خان بہادر سید احمد علی کو مطلع کیا ہے اور انہیں مطلع کیا ہے۔

(ترجمہ) "آپ نے چند روز قبل کاہینہ کے اس فیصلے کے بارے میں کہ پاکستان کی یوم آزادی کی تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی، دریافت کیا تھا کہ کیا یہ فیصلہ صرف اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے ہے۔ میں آپ کو بالخصوص بتانا اور تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ نہ صرف اس سال بلکہ آئندہ ہمیشہ یہ تقریب 14 اگست کو منائی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر متعلقہ شخص کو جن فیصلے سے مطلع فرما دیں گے۔"

کاہینہ کے اس فیصلے پر عمل درآمد ہوا اور ملک بھر میں پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی گئیں۔ تاہم روزنامہ ڈان نے یوم آزادی کے حوالے سے اپنا پہلا سالانہ جو 100 صفحات کے خصوصی نمبر کی صورت میں شائع کیا تھا 14 کی بجائے 15 اگست 1948ء ہی کو شائع کیا۔

(شاید اس کا ایک سبب یہ ہو کہ اس سال 15 اگست کو اوزار کارکن تھا اور یہ دن کسی انتخابی ضلع کی اشاعت کے لیے نہایت موزوں تھا)

پیش کش ڈاکٹر یحیٰٰں سینئر میں ایک فائل 360/CF/48 بھی محفوظ ہے جس میں 1948ء میں منائی جانے والی سالانہ تعطیلات کی تفصیل درج ہے۔ اس فائل کے مطابق 1948ء میں یوم پاکستان کی چھٹی 14 اگست 1948ء کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس میں روزنامہ ڈان نے بھی 92 صفحات پر مشتمل اپنا خصوصی نمبر 15 کی بجائے 14 اگست 1948ء کو شائع کیا تھا۔

پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست کی بجائے 14 اگست کو منانے کا یہ دستور آج تک جاری ہے اور یہی آہستہ آہستہ ہات دلتا ہوئی کہ پاکستان 15 اگست 1947ء کو نہیں بلکہ 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوا تھا۔

اگست 2014ء



گفتگو آئی 15 اگست 1947ء کا شمار

فائل آگے چلتی ہے اور اگلے صفحات میں کیس نمبر 54/CM/48 مورخہ 12 جولائی 1948ء کے تحت کاہینہ کے لائی بیکری ایس جی جی کے دستخطوں کے ساتھ تحریر ہے کہ اگلا ہدایت کی گئی ہے کہ وہ وزیر اعظم کی زیر صدارت 29 جون 1948ء کو منعقد ہونے والی کاہینہ پیش کے فیصلے سے تمام وزراء اور ان کی وزارت کے متعلقہ سیکریٹریوں کو آگاہ کر دیں تاکہ اس فیصلے پر عملدرآمد ممکن بنایا جاسکے۔

فائل میں اگلے حکم نامے کا نمبر 15/2/48 ہے جو 13 جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔ اس حکم نامہ پر حکومت پاکستان کے ڈپٹی سیکریٹری احمد علی کے دستخط ہیں۔ حکم نامہ میں کہا گیا تھا کہ ملک کے پہلے یوم آزادی کی تقریبات 14 اگست 1948ء کو منائی جائیں گی۔ اس دن ملک بھر میں عام تعطیل ہوگی اور تمام سرکاری اور عوامی اداروں پر قوی پرچم لہرائے جائیں گے۔ اسی سلسلے میں ایک حکم نامہ اور بھی ہے جس پر حکومت پاکستان کے اسسٹنٹ سیکریٹری محمد عطاء کے دستخط ہیں۔ اس حکم نامہ کا نمبر بھی 15/2/48 ہے اور اس میں بھی وہی حکم دہرایا گیا ہے جو اس حکم نامے میں درج تھا۔ اس حکم نامے میں جو بات اضافی تھی وہ یہ تھی کہ اس فیصلے سے حکومت

ملتان سے گزشت



انجمن، قدرتی تقریب کے بعد چنگی کی ایک نادر تصویر

کیرا مین نے تصویر کھینچنے کے لیے لائن عبور کی تو ایک افسر اسے اٹھائے رکھ رہا ہے، غلاظت بھلن اپنا ایسے سے کھینکتا ہے، کھتر قاطر بنات اپنا پوٹھیک کر رہی ہیں صرف قائد اعظم کیرا مین کی طرف متوجہ ہیں۔

تفصیل و ترجمہ سید نصرت اللہ شاہ، قائد اعظم پیرز پروجیکٹ، کینسٹرو وین حکومت پاکستان، اسلام آباد، جلد سوم۔

(3) قائد اعظم محمد علی جناح، روز و شب کا تاریخ وار اشارہ ہے، تداوین ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ترجمہ خواجہ رضی حیدر، قائد اعظم اکیڈمی، کراچی۔

(4) پاکستان کا تاریخی انسٹیٹو پیڈیا، زاہد حسین انجم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔

(5) پاکستان کرائیکل، جیکل مہاس جعفری، مدد جلی کیشنز، کراچی۔

(6) گورنمنٹ پاکستان پبلسز، لاہور، 15 جولائی 1947ء تا 15 اگست 1947ء کے شمارے۔

(7) گورنمنٹ مسالین، کراچی، 15 اگست 1947ء۔

(8) گورنمنٹ مسالین، کراچی، 15 اگست 1948ء۔

(9) گورنمنٹ مسالین، کراچی، 14 اگست 1949ء۔

(10) مضمون، یوم آزادی، جمعۃ المبارک 27 رمضان یا 15 اگست، ضیاء الدین لاہوری، مشمولہ جریڈ 36، (غیر مطبوعہ کتابیں نمبر) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

(11) خلیہ فائل نمبر 48/CF/360، پمشل ڈاکے سینیٹین سینٹر، کابینہ ڈائریجن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

(12) خلیہ فائل نمبر 48/CF/196، پمشل ڈاکے سینیٹین سینٹر، کابینہ ڈائریجن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

حالانکہ محلوہ بالا جتنی عزت کے مطالعے سے یہ بات پڑی حد تک طے ہو جاتی ہے کہ پاکستان کی پہلی کابینہ نے پاکستان کی تاریخ آزادی تبدیل نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہر سال پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات 15 اگست کو منایا جائے گی اور قائد اعظم نے بھی اسی فیصلے کی توثیق کی تھی۔

بھیس یقین ہے کہ ہماری اس تحقیق اور اس تحریر کی اشاعت کے باوجود پاکستان کے یوم آزادی کی تاریخ میں سرکاری طور پر کوئی فرق نہیں آئے گا مگر یہ حقیقت نہ جھٹلائی جاسکتی ہے اور نہ اسے تبدیل کیا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا یوم آزادی 15 اگست 1947ء ہے۔ اس دن جمعۃ المبارک تھا اور اسلامی تاریخ 27 رمضان المبارک 1365ھ تھی۔ اپنا یوم آزادی 15 اگست 1947ء کی بجائے 14 اگست 1947ء قرار دینے سے نہ صرف ہم اپنے یوم آزادی کی تاریخ بدلنے کے مرتکب ہوتے ہیں بلکہ جمعۃ المبارک اور 27 رمضان المبارک کے اعزاز سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اس مضمون کے تیاران میں حسب ذیل مضامین

کتاب اور دستاویزات سے مدد لی گئی ہے

(1) ڈی رائسز آف پاؤر، جلد 12، ہر میٹس پبلیشرز آفس، لندن۔

(2) جناح پیرز، مدد علی ڈاکٹر تواد حسین زیدی،

خولی شیریاں

انجم فاروقی ساحلی



عام طور پر شیر آدم خور نہیں ہوتے مگر جب کسی شیر کے منہ کو انسانی گوشت کا ذائقہ لگ جائے تو پھر وہ حد سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے مگر ریاں تو بیک وقت دو شیرنواں تھیں۔ دونوں مل کر شکار پر نکلنی تھیں۔ انہیں آدم خور ان کی ماں نے بنایا تھا۔ اپنی شیرنیوں کا شکار آسان نہیں۔



شکاریات پر ہنسنے والوں کے لیے ایک تھک

ماہنامہ اور موسم و صلوٰۃ کے پابند تھے، انہیں ان میں تو ہم پرستی
زوروں پر تھی اور خصوصاً بڑے جنگلوں میں کام کرنے والے
حور و دیوں میں تو ہمارے کام میں اس قدر شدید تھا کہ خدا کی بناء
پر شخص بیک دید جنگوں پر یقین رکھتا۔ بددعویٰ اور بھوتوں کے

یہ ذکر ہے ملایا کے شمال مشرقی جنگلوں کا۔ اس زمانے
میں بسلسلہ ملازمت میں ریاست ترنگا نو میں اقبیات تھا۔ جدید
ترہین آسانکوں سے نا آشنا اس ریاست میں زمانہ قدیم کی رہیں
رہیں تھیں۔ پاشے اگرچہ مسلمان تھے۔ اکثر قرآن کے

تھے سب کی زبان پر ہے۔ درمیان کی یہاں کثرت تھی۔ جن میں شیر اور چیتے قاتل ذکر ہیں۔ طایف کے جنگلوں میں چلنے والے شیروں کے بارے میں میں نے سن رکھا تھا کہ پیدائشی آدم خود ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے خوشتر ریاست دور میں ایک آدم خود کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جسے میں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

آدم خودوں کی نفسیات اور عادات میں جاننے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ ہماری معروضات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ دن رات کا بیشتر حصہ جنگل میں گزرتا تھا، اس لیے بہت جلد جنگل کی زندگی اور یہاں کے قانون سے واقف ہو گیا۔ تاہم اکیلے کسی خطرناک مقام پر جاتے ہوئے اب بھی ڈر لگتا تھا۔ میں نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران میں مقامی باشندوں سے خاصا ربط و ربط بڑھا لیا تھا اور ان کی زبان بھی نہ صرف بخوبی سمجھنے لگا تھا بلکہ نونے پھونے الفاظ میں اپنا ماضی انصیر بھی بیان کرنے پر قادر ہو گیا تھا۔ طایف کے شہروں میں رہنے والے لوگوں کے برعکس جو جدید تہذیب و تمدن سے آہستہ آہستہ آشنا ہوتے جا رہے تھے۔

توہمات سے قلع نظر ان لوگوں میں بچائی، بہادری، محنت اور جفاکشی، مہمان نوازی کی روایاتیں اپنی اصلی شکل میں ملتی ہیں۔ ہر شخص اپنے تہذیب کے احکامات پر چلتے رہتا تو لیکن فرض سمجھتا ہے۔ خدا اور رسول سے محبت ان کا جزو ایمان ہے۔ دم کا، قرب، حیا رسی اور دھولیں و جانوری سے قطعاً آشنا ہیں۔ یہ لوگ کسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں صدیوں سے کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ جو کام باپ دادا کے زمانے سے ہوتا چلا آ رہا ہے اس میں کسی کو ترمیم و ترمیم کا حق حاصل نہیں۔

ریاست مور میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد اچانک مجھے نینل کے علاقے میں رہنے کے جنگلوں کی گمرانی اور حردوروں سے کام لینے کے بعدے پر ایک بر ملا نوی تشکیل دہر کھنچی کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ نینل میں رہنے کے انتہائی وسیع و عریض گھنے جنگل، دلہلی زمین اور نہایت خطرناک گھانیاں تھیں۔ کہیں کہیں ان جنگلوں میں سودو سو افراد پر مشتمل آبادی کے گھارے نظر آ جاتے۔ دھن ہر جگہ درختوں کی حکومت تھی۔ غدی نالے کثرت تھے جو برسات کے موسم میں خوب چڑھ جاتے۔ ان کا پانی نہ صرف نرو گرد کی بستیوں میں جامل ہوا دیتا بلکہ درختوں کو بھی ان کی کھین کاہوں سے

قاتل کر بستیوں کی طرف دھکیل دیتا۔ درندوں کے علاوہ دوسری بڑی مصیبت سانپ، کچھو، کئی کچھوے اور اس طرح کے دوسرے حشرات الارض تھے جو خود بستیوں کی طرح راستوں پھنڈوں اور پلوں پر رہتے نظر آتے تھے۔ لوگ مویشیوں کو پالنے کے بدلے شوقین تھے کیونکہ انکی کے گوشت اور دودھ پر ان کا گزارہ تھا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ درندے دن دن ہانڈے، بستیوں میں گھس آتے اور مویشیوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ یہاں بددق کسی کسی کے پاس تھی وہ بھی پرانی جسے نزل لڑا تک کہتے ہیں اور جس میں نال کی طرف سے ہارو دھکر کر فائر کیا جاتا ہے۔ یہ بددق نہایت خطرناک ہوتی ہے اور اگر چلانے والا احتیاط سے کام نہ لے تو اس کو زخمی یا ہلاک کر دیتا ہے۔

اس تہذیب کے بعد میں اپنے قصبے کی طرف آتا ہوں۔ جڑواں آدم خود ابتدا میں مویشی اٹھالے جاتے تھے ان کا باپ کچال کے جنگلوں میں رہنے والا انتہائی خوشوار شیر تھا۔ اس کی قوت کا یہ عالم تھا کہ کسی سن دہائی بھینس کو پھنچے کی ایک ہی ضرب سے ہلاک کر دیتا اور اسے دانتوں کی عدد سے کھیت کر گئی میل دور لے جاتا۔ یہ شیر بھینسوں کا خصوصاً دشمن تھا۔ بعض اوقات وہ دورو بھینسوں کو پکڑ کر کھیت لے جاتا۔ لوگ اس کی حرکتوں پر پریشان اور مہذبلائے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ بس نہ چلا تھا۔ خیر تھی کہ ابھی اس نے کسی آدمی کے گوشت اور خون کا ذائقہ نہیں چکھا تھا وہ نہ قیامت میں برہا ہو جاتی۔ اس شیر کو میں نے کس طرح ہلاک کیا یہ داستان الگ ہے۔ اس وقت تو میں جڑواں آدم خودوں کی کہانی بیان کروں گا۔ وہ شیر جب مارا گیا تو لوگوں نے مکھ کا ساکس لیا۔ ان کے مویشی اب محفوظ ہو گئے۔ اور لوگ بھی آزادوی سے ایک دوسرے کے کام کرنے لگے تھے مگر ایک بلو بعد مجھے پتا چلا کہ شیرنی میدان میں آگئی ہے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کیونکہ طایف کی شیرنیاں عام طور پر خوشنور اور مردم آزاد نہیں ہوا کرتیں۔ دراصل قصہ یہ تھا کہ اس شیرنی کو اپنے درجہ والے بچوں کی پرورش کے لیے بہر حال گوشت کی ضرورت تھی اور چونکہ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے مویشیوں پر ہاتھ صاف کرنا اسے آسان نظر آیا۔

میں ایک دن اس شیرنی کی تلاش میں محوم رہا تھا کہ ایک جھاڑی کے اندر سے کچھ کڑی کی آواز آئی۔ میں رک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ شیرنی تو نظر نہ آئی البتہ بوردے

بھوسے رنگ کے دو ٹٹے ٹٹے سے خراب دکھائی دے۔ بچی
جڑواں بھینس تھیں۔ میری آہٹ پا کر وہ بچانے کہاں غائب
ہو گئیں۔ اس کے بعد کئی ماہ تک میں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس
دور لان میں شیری نے چار پانچ بھینسیں اور کچھ بکریاں مار ڈالی
تھیں۔ ایک دن شیرنی ایک مقامی ہاشوے کی سڑک
لوہنگ بندوں کا خانہ بن کے ڈھکی ہو گئی۔ ڈھکی ہونے کے
بعد اس کے غے مویشیوں کو ہلاک کرنا بھی ممکن نہ رہا اور پھر
ایک ایک روز وہ جنگل میں آگے نمودار ہوئی جہاں
مزدور بڑے کے درختوں پر کام کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ
دولوں بچے بھی تھے۔ جو جوال کی سرحدوں میں قدم رکھنے
عی والے تھے۔

شیرنی نے ایک مزدور کو پکڑ لیا اور تکلیف کر مہاڑوں
میں لے گئی پھر اس نے دور کھڑے درخت زدہ مزدوروں
کے سامنے لاش کو چھ اچھا اور ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔
شیرنی کا آدم خوردین جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ مزدوروں
نے نہ صرف کام پر جانا چھوڑ دیا بلکہ خوف و ہشت کی لہر نے
سراسیمگی پیدا کر دی۔ ایک ہفتے بعد شیرنی نے دوسرا انسان
فکار کیا۔ اس مرتبہ ایک بد نصیب عورت اس کے ہتھے
چڑھی۔ وہ ندی سے پانی کا گڑا بھر رہی تھی کہ گھاس میں
تھپیں ہوئی شیرنی نے عورت پر حمل کر دیا۔ عورت کی چلیں سن
کر کچھ لوگ ٹھہرے اور گواہ بن گئے۔ وہ لوگ
پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ شیرنی نے عورت کو چپے کی مانند
منہ میں دھاڑ رکھا ہے اور اس کے ساتھ دو چھوٹے شیر بھی
اچلتے کودتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شیرنی
آدم خوردین بن چکی ہے بلکہ اس نے اپنے بچوں کو بھی انسانی
گوشت اور خون کی چاٹ لگا دی ہے اور اگر ان کا مقابلہ نہ کیا
گیا تو یہ تمام ہستیوں کا مٹا کر دیں گے۔

تیسرے ہفتے شیرنی نے ایک اور شخص کو ہلاک کیا مگر
لاش کو لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ
اس وقت ہستی کے سوا بڑا سوا آدمی جنازہ اٹھائے قبرستان کی
طرف جا رہے تھے۔ انہوں نے خون میں لت پت شخص کو
دیکھا تو رک گئے۔ وہ مر چکا تھا۔ چنانچہ اسے بھی چند لوگوں
نے چادر میں لپیٹا اور ساتھ لے چلے۔ شیرنی اور اس کے
بچے قریبی مہاڑوں میں چھپے یہ تناؤ دیکھ رہے تھے۔ شیرنی
نے جب لاش کو ہاتھ سے جاتے دیکھا تو تڑپ اٹھی اور گرج
کر مہاڑوں سے باہر نکل آئی۔ لوگ اندھا دھند بھاگ
اٹھے اور انہوں نے جنازہ بھی ایک طرف دھک دیا اور درختوں

پر چڑھ گئے۔ شیرنی دیر تک مضطرب اور اُدھر بھرتی رہی۔
لیکن اسے لاش کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہوئی پھر وہ
ایک طرف کو ہٹ گئی۔

اگلے روز یہ قصہ میرے کانوں میں پہنچا۔ میں نے
فوراً چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور وہاں پہنچ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر
حیرت ہوئی کہ لاش ابھی تک اسی حالت میں پڑی تھی اور کئی
جالور نے اسے چھیلنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ وہ ایک
بوڑھا اور عبادت گزار شخص تھا جس کے بارے میں مقامی
لوگ کہتے تھے کہ وہ خدا رسیدہ اور ولی آدمی ہے۔ اس کی کئی
کرامتیں مشہور تھیں مگر شیرنی کے سامنے اس کی کوئی کرامت
کام نہ آئی۔ دراصل اس کی موت اس بہانے لکھی گئی۔ میں
ابھی اسے جانتا تھا لیکن وہ خدا رسیدہ تھا یا نہیں اس کے
بارے میں مجھے نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک پرہیزگار اور متقی شخص
ضرور تھا۔ مجھے اس کی اندھا ناک موت کا صدمہ ہوا۔ ہستی
والے بھی اس کا ماتم کر رہے تھے مگر جنگل جا کر اس کی لاش
اٹھانے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ
شیرنی نے اسے ہڑپ نہیں کیا تو مجھے بات یہ ہے کہ مجھے اس
شخص کے دلی ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ یہ کئی عجیب بات تھی
کہ اس ساری رات جنگل میں پڑی رہی اور بھوک سے بے
تاب شیرنی اور اس کے بچے قریب بھی نہ پہنچ سکے۔ میں
نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ لاش کو وہیں چھوڑ دینے دیں۔
میں ایک رات اس کے قریب ہی کسی درخت پر چھان باندھ
کر شیرنی کا انتظار کرنا چاہتا ہوں۔ سورج غروب ہونے
سے آدھا گھنٹہ دھیرے دھیرے کھٹکے سے لپس ہو کر چھان پر پانچ
گیا۔ شمال کی جانب سے آہستہ آہستہ کالی گھٹائیں فذر رہی
تھیں اور ہوا کی تیزی اور ندی میں جڑواں اضافہ ہوتا جا رہا
تھا۔ خدشہ یہ ہوا کہ اگر ہوا اس طرح چلتی رہی تو چھان کا
خدا ہی حافظ ہے۔ میرے ساتھ آنے والے سب لوگ اپنے
اپنے ٹھکانوں پر واپس جا چکے تھے۔ اب میں تھا اور جنگل کی
ہست ناک فضا جس میں میں آدم فور گھٹات لگائے بیٹھے
تھے۔ یک لخت گھٹائیں اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان
ایک ہو گیا۔ پھر بجلی کی کڑک کے ساتھ موسلا دھار بارش
شروع ہو گئی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مصیبت میں پہنچ
گیا ہوں۔ چھان سے اترا نہ تھا۔ بارش کا پانی ٹٹے ٹٹے
سنگروں کی مانند میرے چہرے پر آ کر لگ رہے تھے اور
سر دلی تھی کہ بد قسمتی جاری تھی۔ میرے سامنے کچھ فاصلے
پر بوڑھے کی لاش پڑی پانی میں بھیگ رہی تھی اور میں اپنی

اس صافقت پر غماست محسوس کر رہا تھا کہ محض اپنے شوق ہم جوں کی خاطر ایک مسلمان بزرگ کی میت کی سہرحتی کر رہا ہوں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی پادش میں خدا مجھے ہنس شیرنی کا لوالہ بنا دے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم کا رول رول فرط خوف سے کانپ گیا۔ جسم تو پہلے ہی لرز رہا تھا۔ اس ہمایا تک تصور نے میرا دل دردناغے متلوچ کر دیا۔ اب میں خدا سے اپنے اس تصور کی دل ہی دل میں معافی مانگ رہا تھا۔

پادش پھر ہوا کا شہر، الامان والحقید، ہر طرف گھب اندھیرا جسے بھی بھی بجلی کی چمک دور کر لی تھی۔ میں جس درخت پر بچا ہوا تھا وہ کھڑکوش کی مانند دیکھا بیٹھا تھا وہ کچھ زیادہ اونچا نہ تھا۔ کپڑے تر ہو چکے تھے اور کچھ کچھ میں نہ آتا تھا کہ اس حالت میں اگر شیرنی نمودار ہوگی تو میں قاتر کیسے کروں گا۔ ادھر پادش کی یہ کیفیت کے گویا نہ رہنے کی قسم کھالی تھی۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد کچھ اُسید بندگی کہ یہ قیامت خیز طوفان بادو باداں تک جائے گا۔ موسلا دھار پادش آہستہ آہستہ پھوار میں جد لئے گی۔ مطلع صاف ہونے لگا اور آسمان پر آگ کا دکانا دے نمودار ہونے لگے۔ درختوں سے گرتے ہوئے پانی کی آوازیں اب بھی کانوں میں آرہی تھیں اور میں نے غم ہی سدوشی میں دیکھا کہ پادش کا پانی میرے دائیں جانب ایک نشیب میں جمع ہو رہا تھا۔ پکا ایک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جانور درخت کے سینے سے نچے حرکت کر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شیرنی کی گرج سے جنگل کا چہرہ بیدار ہو گیا اور میرا دل یک لخت اچھل کر طلق میں آ گیا۔ میں نے بدحواس ہو کر برقی جارح روشن کر دی۔ کیا دیکھا ہوں کہ ایک تھوڑا اور شیرنی کچھنا ملے پر کٹری لپائی نظروں سے لاش کی طرف دیکھ رہی ہے۔

تاریخ روشن ہوتے ہی شیرنی نے میری طرف مگھور کر دیکھا اور پھر گرجتی ہوئی اس طرف آئی لیکن وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ غالباً اس کا داہاں پیچہ بے کار ہو چکا تھا۔ میں نے تاریخ بچاوی اور رائل سے نشانہ لیے بغیر قاتر کر دیا۔ شیرنی دھانڑتی ہوئی مچاڑیوں میں جا بچھی اور دیر تک ادھر ادھر پھرنے اور فرارنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس سونے پر میں پڑھنے والے دوستوں کو کچھ کچھ بتا دیتا چاہتا ہوں کہ میں جم کاربٹ، کیتھ اینڈرسن، ہے اسے دیکھا کرتا پتھر سن کی

طرح تجربے کار اور شہر شکاری ہرگز نہیں ہوں۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے کہ مجھے رائل سنہا لٹی پڑی اور وہ بھی اس لیے کہ جس علاقے میں میرا کام تھا وہاں رائل کے بغیر گزارہ ہی نہیں تھا۔ ابتدا میں ایک دو شیر مارنے کے بعد مجھے خوش فہمی ہو گئی تھی کہ میں اچھا شکاری بن سکتا ہوں۔ چنانچہ اس زعم میں آدم خوردوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی جرأت ہو گئی۔ لیکن اب پتا چلا کہ یہ کام کتنے جان بوجھوں کا ہے اور شکاری کی ذرا سی صافقت اسے کس طرح آدم خود کے پیٹے کا

ایہ صحن بنا سکتی ہے۔ میں جس بچان پر بیٹھا تھا، زمین سے اس کی ادھیڑاں سات آٹھ فٹ سے زیادہ نہ تھی اور اگر شیرنی کی اگلی دائیں ٹانگ ڈھکی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اتنی بلندی تک دست لگا کر مجھے پکڑ سکتی تھی اور ممکن ہے کہ اگر طوفان بادو باداں نہ آتا تو ہوتا تو وہ ایسا کر بھی گزرتی تاہم خدا نے بال بال ہمایا۔ میں نے شیرنی کو خوف زدہ کرنے کے لیے حرید و فائر کیجے اور یہ ترکیب کار گر ثابت ہوئی۔ چند منٹ گرجے اور فرارنے کے بعد وہ دور چلی گئی اور پھر رفتہ رفتہ اس کی آواز معدوم ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں یہیں بیٹھا رہوں، تو جگہ سے پہلے کوئی شخص میری خبر لینے نہیں آئے گا اور ابھی صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔

شیرنی جا چکی تھی اور خطرہ ٹل گیا تھا۔ کیا سیوا ہا دل دو بارہ جمع ہو رہے تھے۔ میں پہلے ہی پادش میں اس قدر بھیگ چکا تھا کہ حرید بھیگنے سے بیمار پڑنے کا قندش تھا۔ جوں جوں کر کے بچان سے اترا اور دائیں گاؤں کی طرف چلا۔ لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ اور انہوں نے قاتروں کی آواز میں بھی کئی نہیں لیکن جب پتا چلا کہ شیرنی ابھی مری نہیں تو خیسے اور دھڑکی سے بن کے چہرے لگ گئے۔ خسر اس بات پر کہ میری وجہ سے بچے ہوئے ایک بزرگ کی لاش ہے مگر وہ کھن جگل میں پڑی رہی اور مایوس یوں کہ شیرنی پھر بچ کر نکل گئی۔ لوگوں نے اگرچہ مجھ سے کچھ کہا تو نہیں لیکن پھر بھی میں کی ناراضگی کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔

اگلے روز ان بزرگ کو نہایت عزت و احترام سے سپرد خاک کر دیا گیا۔ جنازے میں دور نزدیک کی سبھی بستیوں کے مرد و زن شریک ہوئے۔ میری حالت چہروں کی اتنی ہی اند بلاشبہ مجھے اپنے کیے پر شرم محسوس ہو رہی تھی مگر میں مصدقہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ پانی میں بھیگے اور سردی گھٹنے کے سبب مجھے کئی روز تک ہلکا ہلکا بخار بھی رہا۔

لیکن اس دور میں بھی شیرنی کی کھوج میں برابر لگا رہا۔ آخر معلوم ہوا کہ اسے دو بچوں سمیت اس علاقے کی مشہور کچال پہاڑی کے جنوبی حصے میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ کچال پہاڑی کے بارے میں مقامی باشندے طرح طرح کی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ ایک روایت یہ تھی کہ اس پہاڑی پر صدیوں پہلے کوئی بزرگ آکر ٹھہرے تھے اور انہوں نے چلائی کی تھی۔ چلے کے دوران میں جس کی مدت چالیس روز تھی۔ ان بزرگ نے کچھ کھانا نہ پیا۔ لیکن انہیں جسمانی کمزوری یا ناقصیت مطلق نہ ہوئی، پھر لوگوں نے دیکھا کہ جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکلے اور پہاڑی کے گرد جمع ہو گئے۔ ان میں درندے، چمڑے، پرندے بھی شامل تھے۔ وہ ان بزرگ کو سلام کرنے آئے تھے لیکن بزرگ نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ جنگلی جانور خاموشی سے چلے گئے۔ پھر لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ درندے اس پہاڑی کے گرد ساری ساری رات بیٹھ دیے۔ بعد میں وہ بزرگ اچانک غائب ہو گئے۔ لیکن ان کی برکت کا اثر ابھی تک اس پہاڑی پر موجود ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو شخص پہاڑی کی چوٹی پر پناہ لے لے۔ اسے کوئی درندہ یا دوسرا جانور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

کچال پہاڑی کے گرد و خراج میں تین بستیاں بڑی مشہور اور خوب آباد تھیں۔ ایک کا نام تیلوک پنچر دوسری کا تیلوک کالوٹک تیسری کو تیلوک مینکوانگ کہتے ہیں۔ مذکورہ تین میں تیلوک کالوٹک بہت سی گاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر باشندے درختوں سے ریڑ نکالنے، کٹائی کرنے، گھاس جمع کرنے اور اس طرح کے بہت سے کام کیا کرتے تھے۔ نہایت صابروشا کرتے۔ جہل جاتا اس پر قناعت کرنے والے، غامدہ ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور اگر نقصان ہو جاتا تو خدا کی طرف سے کوئی بہتری سمجھ کر بھول جاتے۔

جنگلی درندے آئے دن ان کے جانور اٹھا کر لے جاتے مگر ان لوگوں کو مطلق پروا نہ تھی۔ میں نے کئی آدمیوں کی زبانی سنا کہ یہ درندے بھی خدا کی مخلوق ہیں اور انہیں مذق دینا بھی اللہ کا کام ہے۔ لہذا مینے دو مینے میں چند مویشی لہن کی خوباک بن جائیں تو کیا حرج ہے۔ ان لوگوں نے خود بھی جنگل درندوں سے چمکھرا پانے کی کبھی کوشش نہیں کی غالباً یہ روایت وہاں تھی ہی نہیں کہ جو نہیں

نقصان پہنچائے اسے مار ڈالنے، ہلانے کی کوشش کرو۔ اس چپ چاپ غم سہجی کی فطرت میں جگمگ تھی۔

کچال کی یہ آدم خود شیرنی نہ معلوم کہاں چھپ گئی تھی۔ بہت عرصے تک اس کا کچھ پتا نہ چلا اور اس دور میں کبھی ٹی دلدراٹ کا بھی تذکرہ سننے میں نہ آیا۔ بہر حال لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور طبیعتان سے اپنے روزمرہ کے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن میرے دل میں پچاس سی انگلی ہوئی تھی۔ میں جانچ پڑھتا تھا آخر شیرنی اور اس کے بچوں پر کیا تھی۔ کچال کے گرد و خراج میں ایک ایک چھ چھان مارا مگر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بہت بعض لوگوں نے یہ اقرار کیا کہ انہوں نے رات کے ہولناک سنالے میں پہاڑی کی طرف سے شیریں کے کد اڑنے کی آوازیں ضرور سنی ہیں۔

کچال کے چاروں طرف نہایت گھٹا اور تاریک جنگل تھا جسے ایک اور برطانوی کبھی نے خرید لیا تھا اور چند روز کے اندر اس میں کام شروع ہونے والا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے، میں اپنے دوست سے ملنے پنچور کی طرف گیا۔ جس جگہ میں رہتا تھا وہیں پنچور کا فاصلہ تقریباً بیس میل تھا اور گھوڑے کے سوا اور کوئی سفر کا ذریعہ نہ تھا۔ صبح کا وقت تھا اور منبری دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے گھوڑے پر کھوسل تھا۔ راستے میں جا بجا مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ کبھی مجھے جانتے پہچانتے تھے۔ ان سے شیرنی اور اس کے بچوں کے بارے میں پوچھتا آگے بڑھ گیا۔ کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔

جب پہاڑی کے دامن میں پہنچا تو در پہر ہو چکی تھی۔ میں نے گھوڑا ایک ٹیلے کے پاس روکا اور اسے گھاس چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر میں نے اپنا ناشتہ والی نکالا اور ایک طرف بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ میرا خیال تھا کہ خیر سے پہر تک پنچور پہنچ جاؤں گا۔

ابھی بمشکل میں نے چند ٹیلے ہی کھائے تھے کہ گھوڑا زور سے نہہانے لگا پھر دوڑ کر میرے پاس آیا۔ وہ بڑی طرح کانپ رہا تھا اور گردن ہلا ہلا کر نہہنا ڈالتا۔ میں سمجھ گیا ضرور کوئی بات ہے فوراً راتھل سنبھال اور چھکنا ہو کر اپنے ارد گرد دیکھا۔ دائیں ہاتھ پر ایک بلند ٹیلے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھائی تھی اور اس میں کسی جانور کے آہستہ آہستہ حرکت کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں بھی گھاس میں چھپ گیا۔

گھوڑا ایک بار پھر نہہنایا اور یک گھٹ ایک طرف اور دوسرا ہماگ اٹھا اور ابھی میں اسے حیرت اور خوف کی

ملی جلی غصروں سے دیکھ رہا تھا کہ کھائی میں سے دو غرائی۔
گر جتنی نہایت خوبصورت شیریاں برآمد ہوئیں اور گھوڑے
کے تعاقب میں روانہ ہوئیں چشمِ لدن میں انہوں نے
گھوڑے کو جا لیا اور اس سے خوشتر کہ میں کچھ بگھ سکوں۔ وہ
گھوڑے کو محبت کر چنگل میں غائب ہو گئیں۔

دیر تک بچہ کے بے جان بت کی مانند میں بھی گھاس
میں بے حس و حرکت پڑا رہا پھر بہت کر کے اٹھا اور کھائی کی
طرف چلا۔ شیر خوں کے قدموں کے خانات اور تازہ لید
کثرت سے پڑی تھی اور چالوروں کی ہڈیوں کے ابھر گئے
ہوئے تھے۔ غصی اور مزاحم برداشت سے باہر تھی۔ ایسا
معلوم ہوتا تھا یہ شیریاں ابھی تک مل جل کر رہتی ہیں اور غار
یہاں لاکر بیڑپ کرنے کی عادی ہیں۔ کھائی کے پرے
سرے پر مجھے ایک چالور کی لاش پڑی دکھائی دی اور یہ وہی
بورھی شیرنی تھی جس کی تلاش میں میں حیران پریشان پھر رہا
تھا۔ اس کی کھوپڑی پٹھنی ہوئی تھی۔ نامعلوم کیا حادثہ پیش آیا
کشیرفی اس بلند ٹیلے سے نیچے کھائی میں گری۔ ایک بڑے
بچہ سے اس کا سر گر آیا اور وہ وہاں مر گئی۔

گھوڑا تو ہاتھ سے جا چکا تھا مگر مجھے ان جوان
شیر خوں کے لٹکانے کا ہنا مل گیا تھا۔ اب میرے سامنے
دور اسے تھے۔ پہلا تو یہ کہ سیدھا پتھر جاؤں۔ اپنے دوست
سے مدد کروں پھر اسے ساتھ لے کر یہاں آؤں اور ان
شیر خوں کو لٹکانے لگا دوں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ چپ کر
شیر خوں کا انتظار کروں۔ دیر تک سوچتا رہا۔ پہلے کر کے کہ
ان موذیوں کا لٹکانا تو معلوم ہو چکا ہے۔ پتھر جانا چاہیے۔
میں حیرتوں سے اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ
ہو گیا۔ کجبال پہاڑی لٹی پاری عظمت اور شان شوکت
کے ساتھ میرے سامنے تھی اور جوفی میں چڑھائی طے
کر کے پل ڈھلان پر ٹھکا پتھر کی خوبصورت بستی میری
نگاہوں کے سامنے تھی۔ ان دنوں پتھر میں میرے ایک
انگریز دوست جنہیں مسٹر لسن کہہ لیتے۔ تعینات تھے اور
جنگوں کے ایڈمنسٹریٹو کی حیثیت سے کام کر رہے
تھے۔ سیدھا ان کے پٹھنے پر پہنچا۔ وہ کلڑی کے برآمدے میں
بیٹھے۔ میری جانتی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ
کھڑے ہوئے اور نہایت چاک سے ملے۔ آدم خود شیرنی
کی داستانیں ان کے کانوں تک پہنچی تھیں اور اگرچہ
انہیں بھی غار سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن تھے تیار اور آوی۔
میرا قصہ سن کر بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ "خدا کا شکر ہوا کیجئے

کہ گھوڑے پر بات مل گئی ورنہ وہ شیریاں آپ کو بھی پکڑ
کر لے جاتیں۔"

"تمی ہاں بس پتھر ہی ہو گیا۔" میں نے کہا۔ مگر یہ سمجھ
لیجئے کہ اب پھر اس علاقے پر کوئی آفت آیا ہی چاہتی ہے۔
آدم خود شیرنی تو مر چکی ہے۔ میں اس کی لاش کھائی پر پڑی
ہوئی دیکھ چکا ہوں۔ وہ بلند چٹان سے اتفاقہ طور پر گری
اور مر گئی۔ اس کے وہ بچے جوان ہو چکے ہیں اور دونوں مادہ
ہیں، انہما نے میرے گھوڑے کو پکڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے
آدم بچپن سے ہی آدمی کے خون اور گوشت کا چمکا پڑا ہوا
ہے۔ ابھی تو وہ مویشیوں کے پیچھے ہیں لیکن جلد ہی آدمیوں
کی بھی پاری آئے گی اور علاقہ بھی آپ کا ہے۔"

مسٹر لسن یہ سن کر متحیر ہو گئے۔ چند لمبے تک خاموش
بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے۔ "واقعی بات تو تشویش
کی ہے۔ آج کل کام کا زور ہے۔ اگر ان دنوں کچھ گڑبڑ
ہوئی تو خاصا نقصان ہوگا۔ ان دہروں کا ابھی سے انتظام
ہونا چاہئے۔ آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔"

"جناب، میرے علاقے میں اتنی کھلی ہوئی ہے۔
اب خدا خدا کر کے کچھ سکون ہوا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے
کہا ہے کہ یہ سکون عارضی ہے حالات تبدیل ہونے میں زبرد
ویر نہ گئے گی۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ حکومت کی طرف
سے مجھے کیا کیا سہولتیں پہنچا سکتے ہیں۔"

"سہولت تو جو آپ کہیں مل سکتی ہے۔" مسٹر لسن نے
کہا۔ "لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بڑے چپ
ہیں۔ ان سے آپ کو تعاون بمشکل ملے گا اور لوگوں کی مدد
کے بغیر کوئی قدم اٹھانا خطرناک ہوگا۔ بہر حال آپ آج
آرام کیجئے۔ صبح میں اپنے چند کارندوں کو بلاؤں گا۔ ان میں
چند لوگ طرار اور جنگلوں سے واقف ہیں۔ روپے کا لالچ کام
کر جائے گا۔ شاید ان میں سے ایک آدمی آدمی بخود ہی چلانا
بھی جانتا ہو۔"

اگلے روز علی الصبح میں بیدار ہوا۔ مسٹر لسن کے
اردلی سے معلوم ہوا کہ صاحب دورے پر چلے گئے ہیں اور
تمام تک لوٹیں گے۔ میں نے رات کو کندھے پر لٹکا لٹکا اور
گاؤں کی سیر کے لیے کل کھڑا ہوا۔ یہ گاؤں تین طرف سے
چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ آبادی مشکل سے
پانچ سو نفوس پر مشتمل ہوگی۔ مکان سب کے سب کلڑی
کے بنے ہوئے تھے۔ مرد کام پر جا چکے تھے۔ بچے گھراں
اور گلیوں میں کھیل رہے تھے اور عورتیں آہنی میں کپ شپ

میں کن تھیں۔ میری طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ کچھ بوڑھے لوگوں سے سلام دعا ضرور ہوئی۔ ایک داغ دھنسا گھوم پھر کر پچھلے کی طرف لوٹا۔ ایک پھر وہ میں آدمیوں کا ایک گروہ شمال سے گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ لوگ بے وقت واپس آ رہے تھے۔ اس لیے میں دیکھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ یقیناً کوئی حادثہ پیش آیا تھا۔ جب یہ گروہ قریب پہنچا تو میں نے دیکھا ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ چیخ کر اپنی زبان میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ان میں چند آدمی ایسے بھی تھے جنہیں میں پہچانتا تھا اور وہ میری اصل سے آشنا تھے۔ چنانچہ ہستی کی طرف جانے کی بجائے سیدھے میری طرف آئے اور آتے ہی کہنے لگے۔ "جناب، جلدی جائیے، کالونگ والی سڑک پر پھر وہ فٹ لہا اور پانچ فٹ اونچا شیر گھوم رہا ہے، اس نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر خدا نے پہلایا ہم کام پر جا رہے تھے اور وہ ہمارے انتظار میں وہاں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا اور رات نکال کر فرمایا۔"

"شیر نہیں شیرنی تھی۔" دوسرے نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے غور سے اسے دیکھا تھا وہ شیرنی تھی۔" میں سمجھ گیا کہ انہوں نے جڑواں شیرنیوں میں سے کسی ایک کو کھ لیا ہے۔ لیکن حیرت یہ تھی کہ دن نکلنے کے بعد بھی اس نے انہیں دھڑلے سے گزرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

"آؤ تم لوگ میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "داروست میرے پاس بندوٹ ہے۔ میں اس شیرنی کی تلاش میں اصرار کرتا ہوں۔" بڑی مشکل سے میں نے انہیں ساتھ لیا۔ ان سب کے پاس کھانا پانی تھیں اور جسمانی طور پر بھی سب سٹے کئے تھے۔ اگر چاہے تو شیرنی کو گھیر کر چند گھنٹوں میں تکہ بوٹی کرالے۔ اس معاملے میں یوگنڈا، کینیا اور نیروبی کے جنگلی خاتمے تیز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نیروں، برہمنوں، تیرکالوں سے ہی شیروں، چیتوں، گینگڈوں اور ہاتھیوں کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ اگرچہ ایسی کہوں میں کئی لوگ مارے بھی جاتے ہیں۔ بہر حال میں ان سب افراد کو نصیحت کرتا اور یہاں لوگوں کے قہقہے سناتا ہوا اس پگڈنڈی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ وہ لوگ آ رہے تھے۔

یہیں جنگل زیادہ گھٹنا نہ تھا۔ زمین نرم اور ولدی تھی اور ہماڑ جھنڈا کثرت سے اگا ہوا تھا۔ ان ہماڑوں کو عبور کرنا انسان کے پس میں نہ تھا۔ کیونکہ تین تین انچ لمبے اور سوئیوں کی مانند نوکیلے کانٹے تھے۔ میں نے ان آدمیوں

سے کہہ دیا تھا کہ وہ اونچی آواز میں ہاتھیں کرتے یا کوئی میت گاتے ہوئے چلیں تاکہ شیرنی اگر اب بھی ہوئی تو اپنے آرام میں غلٹ پا کر دوبارہ متوجہ ہوگی۔ تقریباً ڈھائی تین میل چلنے کے بعد چانگ ایک شخص چلا۔ "دیکھئے جناب یہ ہے اس کے بچوں کے نشان۔"

میں نے ان نشانات کو غور سے دیکھا اور دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ شیرنی ہے۔ مجھے ان لوگوں نے بتایا تھا کہ اس کا قد پندرہ فٹ لہا اور پانچ فٹ اونچا ہے۔ لیکن اس کے قد و قامت کا جائزہ زیادہ یہ تھا کہ قدم سے لے کر ناک تک سات فٹ لہا اور اونچائی تقریباً ڈھائی فٹ تھی۔ نرم زمین پر اس کے گہرے پتلوں کے نشانات بھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس کا وزن عام شیرنیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے۔ بہر حال ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ حد نظر تک خادراں ہماڑیاں بے حس و حرکت گزری تھیں۔ کئی کئی جنگلی چوہوں اور غلوں کے خول بھی پھرتے نظر آئے۔ مگر ہمارے قدموں کی آہٹ پا کر چشم زدن میں غائب ہو جاتے۔ شیرنی کے بچوں کے نشان ہماڑیوں کے ساتھ سیدھے میں شرقی کی طرف چلے گئے تھے۔

اب ہم... یہ اجاڑ اور ویران حصہ عبور کر کے ایک سرسبز و شاداب پہاڑی کے دامن میں داخل ہوئے جس کے اوپر ہی چانگ ایک گھنا اور صیبت ناک رہنے کے درختوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا اور یہ حردور اس جنگل میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے بے شمار لوگوں کے ہاتھیں کرنے اور تھپتھپانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ لوگ ایک جانب لکڑی کا چھوڑ سا مکان بنا رہے تھے۔ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہاں کام کرنے والے ایک آدمی نے اسے اس طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس شیرنی کو بچپن سے انسانی خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ بہر حال میں نے اس موقع پر یہ خبر سنا کر اظہار تقری پھیلائے کہ مناسب نہ سمجھا۔ البتہ گھرانہ کو بتا دیا کہ شیرنی کا خاص خیال رکھے کہ وہ آدم غور ہے اور کسی وقت بھی حردوروں پر حملہ کر سکتی ہے۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر وحشت کے آثار نمودار ہوئے اور بکھروشی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر یہ خوفناک خبر سارے جنگل میں پھیل چکی تھی اور حردور کام بند کر کے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ غضب یہ ہوا کہ اس خبر کی تصدیق میرے ساتھ آنے والے حردوروں نے بھی کر دی۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو

بھی یہ معلوم نہ تھا کہ جڑواں شیریاں آدم خور ہیں۔ اس جنگل سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی مزدوروں کے اچانک کام چھوڑ دینے سے مجھے تشویش ہوئی کہ جب آتے وہ لوگوں کو بچا لے گا تو وہ مجھے قصور وار ٹھہرائیں گے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مزدور دوبارہ کام شروع کر دیں مگر کوئی شخص اس سے سنا نہ ہوا۔ بلکہ سب اپنے اپنے گھروں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے سوچا ممکن ہے مزدور بس آگئے ہوں وہی اس معاملے میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ لہذا پتھر واپس چننا چاہئے۔ چنانچہ فوراً میں رہنے والے مزدوروں کی ایک جماعت کے ساتھ واپس ہوا اور سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر قبل ہستی میں پہنچ گیا۔

مزدور بس کے جنگل کے سامنے مزدوروں، عورتوں اور بچوں کا اہم تھا اور ان میں سے بعض کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ کبیں مزدور بس کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہو۔ مجمع مجھے دیکھ کر کائی کی طرح پھٹ گیا۔ مزدور بس کا اردلی دونوں ہاتھوں سے چہرہ لٹا ہے بچوں کی طرح چٹا چٹا کر رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”مزدور بس کہاں ہیں؟“

”انھیں شیر پکڑ کر لے گیا ہے۔“ اردلی نے جواب دیا اور میرا دل جیسے لچے پٹنے لگا۔ ”شیر پکڑ کر لے گیا ہے؟ کہاں؟ کس جگہ؟“ اردلی نے آہوں اور سسکیوں کے درمیان جو کہانی سنائی اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ”مزدور بس اپنی پرانی جیب گاڑی میں گئے تھے۔ ان کے پاس کوئی بندوق یا ہینول نہیں تھا۔ شام سے پہلے پتھر کی طرف واپس آ رہے تھے کہ ایک جگہ جیب خراب ہو گئی۔ انہوں نے اسے ٹھیک کرنے کی بڑی کوشش کی مگر بے سود چنانچہ جیب وہیں چھوڑ کر پیدل چلے۔ اندھیرا لوہہ بے کھوڑا جا رہا تھا۔ پتھر ابھی پانچ میل دور تھا۔ پانچ انہوں نے دیکھا ایک شیرنی اور شیر تعاقب میں چلا آتا ہے اور اس سے جھست کر وہ چھانڈ کے لیے کسی درخت پر چڑھتے شیر نے جست بھر کر انہیں دبوچ لیا اور منہ میں دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ حضور میں نے یہ منظر ایک درخت کی اوٹ سے دیکھا اور خوف سے زمین پر گر پڑا میرے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔ میں اس طرف پیٹاب کرنے گیا تھا ورنہ کم بخت دھرا شیر مجھے بھی پکڑ کر لے جاتا۔“

میری گرفت رانگل پر سخت ہو گئی وہ رات اچھائی

ڈراؤنی اور ہسپانک تھی۔ بار بار مسٹر بسن کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ گاؤں کے لوگ بھی ان کی موت پر السردہ اور خاموش خاموش تھے۔ بچے سہے ہوئے، عورتیں لرز رہی دتر ساں اور مرد حیران پریشان تھے۔

میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ گاؤں سے چند ہٹے گئے اور جی دار قسم کے لوگ جمع کیے اور مسٹر بسن کی لاش کے بچے بچے اجڑا کی تلاش میں روانہ ہوا۔ راہنمائی کے لیے اردلی کو ساتھ لے لیا۔ پتھر سے پانچ میل شمال کی جانب ایک جگہ جنگل کے عین وسط میں مسٹر بسن کی جیب کھڑی دکھائی دی۔ کچھ فاصلے پر شیرنی کے بچوں کے نشانات بھی واضح تھے۔ لیا معلوم ہوا تھا وہ کائی اور سے جیب کے تعاقب میں بھاگتی آئی تھی اور یہ حرکت شیرنی کی فطرت سے بعید ہے۔ ممکن ہے جیب خراب نہ ہوئی تو مسٹر بسن پر اسے حملہ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ جب میں نے جیب کو سمجھا کیا تو وہ فوراً اسٹاپٹ ہو گئی۔ میری حیرت کا کوئی قلم کا نہ رہا۔ شیرنی نے جس جگہ مسٹر بسن کو گرایا تھا وہاں جھا ہوا خون بڑی مقدار میں پھیلا ہوا تھا اور ان کے کپڑوں کی دھبیاں بھی جا بجا پھری نظر آئیں۔ یہ منظر اتنا دل دہشتہ تھا کہ میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔ اور اردلی کی تو دھتے دھتے ہلکیاں بندھ گئی تھیں۔ مسٹر بسن کی لاش ڈھونڈنے میں کچھ زیادہ وقت نہ ہوئی۔ ایک گھنٹی جھاڑی سے ان کی کھوپڑی ہاتھوں میں مل گئی۔ الگیاں، چند پٹلیاں، ایک ٹانگہ اور آستیں وغیرہ چڑی نظر آئیں۔ شیرنی کا کپڑا کئی دن کی بھوک تھی، اس نے جی بھر کر پیٹ بھرا تھا۔ میں نے ان اصحا کو وہیں رہنے دیا اور ادھر ادھر جا کر لے کر اندازہ کیا کہ کون سی جگہ مناسب ہے جہاں چھپ کر میں شیرنی کا انتظار کر دوں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ وہاں ادھر ضرور آئے گی۔

تقریباً پچیس فٹ کے فاصلے پر ایک ٹیلا نظر آیا جس کے ارد گرد جھاڑ جھنڈ کھڑت سے اٹکا ہوا تھا۔ یہ ٹیلا بہترین لیکن گاہ بن سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسی طرح دیکھ بھال کرنے کے بعد رات اس ٹیلے پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ممکن ہے میں ایسی طاقت آمیز جرأت نہ کرتا لیکن مسٹر بسن کی دردناک موت سے میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی اور میں ہر قیمت پر اس شیرنی کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کو واپس بھیج دیا اور خود اردلی کے ساتھ ٹیلے کے گرد حفاظتی اقدامات کرنے لگا۔ ارد گرد سے حربہ خاندان جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر

لیٹے کے چاروں طرف پھیلا لیں تاکہ شیرنی اگر اس پر چڑھنے کی کوشش کرے بھی تو ناکام رہے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے شیرنی کے بچوں کے نشانات تلاش کیے۔ معلوم ہوا کہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد وہ جنگل کے اندر دینی حصے میں چلی گئی ہے۔ بچوں کے نشان سیدھے میں چلے گئے تھے۔ بدولی نے قاتا دو تین مکے کے فاصلے پر ایک پہاڑی چشمہ ہے اور شیرنی اپنی پیاس بجھانے وہیں گئی ہوگی۔ میں نے چشمہ کھینے کا ارادہ کیا تو وہ کچھ لمبے وپیش کرنے لگا۔ غالباً زور دیا تھا لیکن صحت بندھانے پر اور مسٹرولسن کی مہربانیوں کا خیال کر کے آخر چل ہی چڑا۔ تاہم خوفزدہ فکروں سے بدحواس ہو کر دیکھا جاتا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے رانگل سنبھالے جا رہا تھا۔ شیرنی نے چشمے تک پہنچنے کے لیے نہایت چالاکی سے کام لیا تھا وہ سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے چکر کاٹ کر وہاں تک پہنچا تھی۔ بہر حال ہم نے بہت جلد وہ چشمہ تلاش کر لیا۔ چشمہ کیا تھا۔ ایک بلند اور سرسبز پہاڑی ٹیلے کے چند ننھے سوراخوں سے پانی دس دس کر ایک شیشی گڑھے میں جمع ہوتا جاتا تھا۔ اس گڑھے کے گرد شیرنی کے علاوہ لود جانوروں کے بیروں کے نشانات بھی دکھائی دیے۔ پانی پینے کے بعد شیرنی نے اپنا رخ یکا یک مشرق کی طرف کر لیا تھا۔ اب میں نے وہاں ہی کا ارادہ کیا اور مجھے پورا یقین تھا کہ شیرنی اس جنگل میں کسی جگہ موجود ہے اور راست کو لاش پر ضرور آئے گی۔ وہاں ہی پر ہم ایک اور راستے سے گزرے۔ یہاں بھی ہم نے شیرنی کے بچوں کے نشانات دیکھے۔ کچھ جگہ میں نے آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ شیرنی کو بیک وقت دو مختلف راستوں پر آنے جانے کی کیا ضرورت پیش آئی، لیکن جب غور سے ان نشانوں کو دیکھا تو حیرت کا ایک نیا اب کھل گیا۔ یہ نشان ان نشانوں سے مختلف تھے جو میں نے مسٹرولسن کی لاش اور چشمے کے ارد گرد دیکھے تھے۔ بکا یک خیال آیا کہ یہ اس کی جڑواں بہن ہوگی۔ گویا وہ دونوں شیرنیاں یہاں جمع ہو گئی تھیں۔

میں ایک بار پھر مسٹرولسن کے پیچھے اچھا کو دیکھنے پہنچا اب وہاں بھی یہ انکشاف ہوا کہ لاش کو دونوں شیرنیوں نے مل کر کھا لیا ہے۔ وہ نہ ایک شیرنی خود تھی نہ ابھو کی کیوں نہ ہو لاش کا بیشتر حصہ ہڈی نہیں کر سکتی۔

☆☆☆

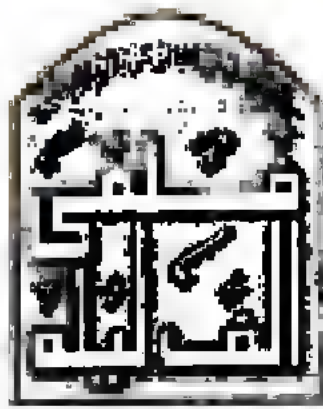
دورات ساری عمر نہ بھول سکوں گا۔ ہر یک جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اگر ان آدم خود شیرنیوں کو

کر لٹنے کا موقع مل گیا تو اس کے کتنے بھیاک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت ہر طرف ہولناک ستانا طاری تھا اور کبھی کبھی مغرب کی جانب سے سینڈکوں کے ٹرانے کی مدھم آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ درختوں کے پتے ساکن ہو کر شاخیں بے حس حرکت تھیں۔ میرے پاس رات کاٹنے کا ہوا سا ملن تھا۔ تمباکو کی قہل، پائپ، قہوے سے بھر دیا تھا، ماس، ٹکڑا کی چاقو، مارچ اور طاقتور رانگل۔ وقت کاٹنے کے لیے میں نے پائپ بھرا لیکن ماحس کی تلی جلاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ اس کا شعلہ روشن ہوتے ہی شیریاں قریب ہوئیں تو چمک کر فرار راہ اختیار کریں گی۔ چنانچہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ آسمان پر مطلع صاف تھا اور تارے جھلجھلک کر رہے تھے۔ میں نے کلائی موڑ کر گھڑی پر نظر ڈالی، چمکتی ہوئی سوئیں نے قاتا کہ باہر بج کر چھوہ منٹ ہوئے ہیں۔ لگا یک ٹھنڈی ہوا کا ایک بھولا سرسراتا ہوا میرے پاس سے گزر گیا اور پھر اسکی آہٹ ہوئی جیسے کوئی جانور۔ بے پاؤں قریبی جھاڑیوں میں حرکت کر رہا ہے۔

ابتدا میں ابھرا محسوس ہوا جیسے آوازیں بائیں جانب سے آئی ہیں پھر دائیں جانب سے۔ میرے حواس پاوری طرح بیدار تھے اور اعصاب حلق وچو بند، رانگل تختی سے تمام کر میں نے ذرا سا سر اوپر اٹھایا اور ارد گرد دیکھا۔ آواز چند لمبے تک دہری اور پھر دھکی کھڑی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکت رہا تھا۔ یک لخت میں نے تاروں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ دونوں شیرنیاں دائیں بائیں سے نکلیں اور مسٹرولسن کے اعضا کی طرف بڑھیں۔ ان کا قد قامت ایک جیسا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے ہڈیاں اٹھتے ہو کر گوشت چبانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اب میں نے مارچ کاٹن دیا یا اور اس کے ساتھ ہی میری رانگل سے یکے کے بعد دیکھے دو گولیاں نکلیں۔ خدا کی پناہ قاتر کے دھماکے، شیرنیوں کی گرج، جنگلی پرندوں اور جانوروں کی آوازوں سے گویا حشر برپا ہو گیا۔ چند لمبے دن بھیاک آوازوں سے جنگل کی فضا لڑتی رہی پھر صبر معمول خاموشی چھا گئی۔

میں نے مارچ کی روشنی مہاڑیوں پر ڈالی اور یہ دیکھ کر میری سورت کی انتہا نہ رہی کہ دونوں گولیاں نکلتے پر بیٹھی تھیں اور دونوں شیرنیوں کے پیچھے اڑ گئے تھے اور اس طرح کھال کی آدم خود شیرنیوں کا قصہ پاک ہوا جو اگر زندہ رہتی تو جانتے کتنے انسانوں کا لہو پی جاتیں۔

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!



قسط نمبر 230

ایسے بلند و روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو مختلف
صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاویل کی طرح تارہ دم بھی، ان کے لہجہ و رسا کی
پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر
آئے۔ آفاقی صاحبِ ہمارے ایسے ہی جوان نیکر و پاد جو صلہ بزرگ
ہوں وہ جس سے شغف سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں مہارت کی
ظہان اس کی بہت سی پرکھ کر دی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں
وہ سنگی کے دوران میں اشیاء اپنے عہد کی ہر قابل ذکر اہمیت
سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دہد و پند
اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طوفاں اور بہت زیادہ قابل
تذکرہ ہے آج کے ہم بھی ان سے وہ سب سے اپنے زمانہ کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
حوالہ معلوم ہوتا ہے

آداب و صحافت سے فلمی دنیا تک وراثہ ایک داستان در داستان سرگزشت

ہے عہدِ پند کی تمیں۔ باقائے زمانی داستان "ہیر رانجھا"
سب سے پہلے 1928ء میں لاہور میں بنائی گئی تھی۔ یہ
ایک خاص قسم کا فلم تھا کیونکہ اس میں ہندی فلموں کا دور شروع نہیں
ہوا تھا۔ ہیر رانجھا کلکتہ میں فلمائی گئی تھی اور اس کو بنانے

آئے آج آپ کو پنجاب کی پرانی داستانیں
سنائیں۔ کہے جاتے ہیں پنجاب کی لوگ کہانیاں ہیں لیکن سارے
برصغیر میں مشہور ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ ہیر رانجھا مرزا
صاحبان کی داستانیں سارے ہندوستان میں فلمائی گئیں اور
عہدِ پند سرگزشت

ریکارڈ ٹوڑ دیتے تھے۔ ان کا تعلق رابندر ناتھ ٹیگور کے خاندان سے تھا۔ اسی ادارے نے اچھوتے اور ایسے موضوعات پر فلمیں بنائی تھیں جنہیں کوئی فلمسٹ کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

42 سال کی عمر میں ہیما سورا نے ہارٹ ٹیکل کے باعث انتقال کر گئے۔ بمبئی ٹیکنیکل جیسے مثالی ادارے کو دیو پکا رانی بنانے چاہیے۔ اس ادارے میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی فلمیں اور فلموں میں عورت بھی جو کسی اور فلم ساز کو حاصل نہ تھی ماسوائے غنیمت کے جو کلکتہ میں فلم سازی کی نئی روایات قائم کر رہا تھا۔ معروف گلوکار کے ایل سہگل تھے تو جاندھر کے گہران کی زیادہ تر مشہور اور کامیاب فلمیں یو جی پکس نے بنائی تھیں۔

دلچسپ فلمے کا آغاز کہاں سے ہوا تھا اور بات کہاں پہنچ گئی۔ "نہیرا نہ تھا" مرزا صاحب، سوشل سینڈال وغیرہ انکا داستان ہیں جو فیئر کے زمانے سے پہلے ہی محفلوں میں زبان بانی بنائی تھیں۔ جو بالوں اور محفلوں میں رات گئے لوگ اکٹھے ہو کر داستان کو حضرات سے ساری ساری رات بے واسطہ نہیں سنا کرتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ رہا بھما کی موت اور ان کی قبروں کے بارے میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ضلع جنگ کے قریب ایک گاؤں کھیوہ میں ان دونوں کی قبریں موجود ہیں۔ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے تھے۔ کم از کم کہا جاتا ہے۔ قبریں گاؤں کے پرانے قبرستان میں ہیں لیکن ان کے حرا کی عمارت طبعاً خیر آتی ہے اور احمد نواز مانہ نے اس پر نقوش تو ضرور پھوڑے ہیں مگر مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کے بعد مقبرے کی عمارت کا ایک حصہ اور عمارتیں تو آج بھی پرانی طرز تعمیر کی یادیں چڑھ کر آتی ہیں مگر عمارت کی ٹوٹ پھوٹ اور عمارت کی اینٹیں بکھری نظر آتی ہیں۔ عمارت موسم اور طویل عرصے تک دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اپنا پرانا رنگ کھو چکی ہے۔ یہ حراہ کے درمیان میں ایک چھوٹے سے مکمل میدان میں ہے جس میں جا بجا پرانے درخت موجود ہیں۔

کھیوہ گاؤں شکت حالت میں ہے اور موسموں، ہارشل کے باعث اب یہ ایک کھنڈ بن چکا ہے۔ گاؤں میں واحد صحیح سلامت عمارت ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی گاؤں میں ایک صدیوں پرانا درخت بھی ہے جو ایک طرف کو جھک گیا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اسی درخت کے نیچے مرزا اور صاحبان کو لٹل کیا گیا تھا جس کے ٹم میں یہ درخت

والے بھی ایک پنجاب کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ کاردار صاحب کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ دراصل نو جوانی ہی سے ان کی پہلی اور آخری محبت فلم سازی اور ہدایت کاری ہی رہی۔ ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن بد قسمتی سے برصغیر کی فلمی صنعت میں انہیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ اسے آپ ہندو اکثریت کا تعصب سمجھ لیجئے یا مسلمانوں کی بے بسی اور لاعلمی، لاہور میں برصغیر کا پہلا فلم اسٹوڈیو بھی انہوں نے ہی راہی کنارے بنایا تھا۔ اسٹوڈیو کا تھا بس ایک چار دیواری تھی۔ ساؤنڈ سسٹم اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ اس اسٹوڈیو کی محبت نہیں تھی کیونکہ دن میں سورج کی روشنی میں یہاں فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

ایک اور فلموں کے دیوانے ہیما سورا نے بھی تھے جنہوں نے لاہور میں ایک اسٹوڈیو بنایا تھا مگر پھر حالات کے تقاضے کی وجہ سے بمبئی چلے گئے تھے۔ یہ ایک تعلیم یافتہ ذہین اور خوش شکل انسان تھے۔ انہوں نے فلموں میں اور کاری بھی کی تھی۔ اپنے زمانے کی حسین ترین اور ذہین اور اکابر دیو پکا رانی سے شادی کر لی تھی اور بمبئی ٹیکنیکل کو ایک یادگار فلم ساز اور راہنما بنادیا تھا۔ اشوک کمار، دیپ کمار جیسے فنکاروں کی تلاش کا سہرا بھی دیو پکا رانی کے سر ہے۔

او حسن پرست تھیں۔ جب پنجاب سے نجم الحسن اور کار اور ہیروین کر بھی گئے تو دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد باہمی دوستوں نے ہیما سورا نے اور دیو پکا رانی کی صلح کرادی۔ نجم الحسن پھر سے قائب ہو گئے، بعد میں وہ لندن کا رہنے لگے مگر عروج حاصل نہ کر سکے۔ لاہور میں ہم نے انہیں فلم کے ایک سیٹ پر دیکھا تھا۔ قدرے سولے ہو گئے تھے مگر بہت خواہشورت اور شاندار انسان تھے اور وضعداری کی مثال تھے۔ لاہور میں انہوں نے چند فلموں میں معاون کردار کیے لیکن پھر فلمی صنعت سے کنارہ کش ہو گئے۔ کھاتے پیچے خوشحال گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ پرانی طبع داری، اصولوں اور اخلاق کا نمونہ تھا۔

دیو پکا رانی قیام پاکستان سے قبل لندن میں فلم اور براکاری کی تعلیم حاصل کر کے آئی تھیں جس سے ان کی روشن خیالی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اشوک کمار کے ساتھ ہیروئن کی حیثیت سے فلم "اچھوت کنیا" میں کام کیا تھا جس نے مارے ہندوستان میں کامیابی کے تمام

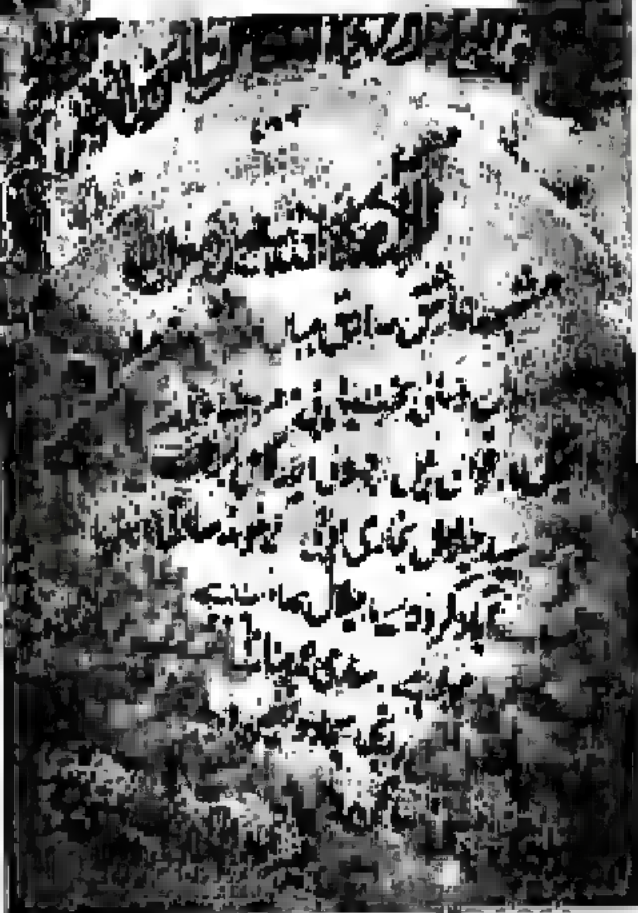
ماہنامہ سرگزشت



ہیرا انجھا کا حرار

تھی اس کی لاش کو موجودہ مقبرے تک کیسے پہنچا یا گیا یہ بھی ایک معما ہے کیونکہ وہ جس جگہ ہلاک ہوئی تھی اس کا مقبرہ اس جگہ سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس بارے میں حقائق اب تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔ بعض لوگوں کو اس بات پر بھی یقین نہیں ہے کہ مرزا اور صاحبان ایک ہی قبر میں دفن ہیں۔ ان دونوں کے پرستاروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ ایک تحقیق نے یہ بھی کہا ہے کہ مرزا صاحبان کی داستان ایک فرسی کہانی ہے قیامت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ گاؤں کھجور کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے صاحبان کے بھائیوں نے غصے میں گاؤں کو آگ لگا دی۔ برطانوی حکومت کے زمانے میں سیال نے (جس قبیلے سے صاحبان کا تعلق تھا) ریشیاں پیدا کرنا بند کر دی تھیں تاکہ کوئی اور ان کی صاحبان کی طرح قہقہے کیا جتاں اور رسوائی کا سبب نہ بن جائے۔ صاحبان کی کہانی و خباب کی روایتی لوگ کہانیوں میں آخری کہانی ہے۔ اس کے بعد ایسی کوئی اور روایتی داستان سامنے نہیں آئی۔

سوان کے علاقے میں آج
شہر کی لوہے پائیاں کے تیر چل گئی



ایک طرف کو جگ گیا ہے۔

مرزا صاحبان کی محبت کے بارے میں ایک بار یہ بھی ہے کہ ان کا مشن ملی بیٹوں اور سکا ہڈوں کی طرح یا کیتڑہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے ایک گاؤں میں پڑاؤ کیا تو صاحبان نے بھائیوں کو علم ہو گیا اور انہوں نے مرزا کو ہلاک کر دیا۔ صاحبان بھی شدید زخمی حالت میں

اہری گئی آڈ۔ اچھا جی
ایک زمانے میں یہ بھی گنگے کشمیر سے راس کداری تک ہندوستان کے طول و عرض میں بچے بچے کی زبان پر تھے۔ گل کوچوں میں جسے دیکھیے یہی گیت گاتا گھر بٹا تھا۔ شہر کی ٹوٹ پاتو اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ انگریزی حکومت کو شخص اس کا خطرہ پیدا ہو گیا اور حکومت کو اس پر پابندی لگانی پڑی۔ یہ گیت جس شخص نے ترتیب دیے تھے اس کا نام موسیقار جی اے چشتی تھا۔ آخر الذکر دونوں گانے فلم "شکر" کے تھے۔ یہ فلم 1944ء میں بنی تھی۔ اس قدر مقبولیت پایا چشتی کی موسیقی کو پہلی بار حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی ان کے نئے مقبول عام کی سند حاصل کر چکے تھے۔ گانے تو ہر ایک کے لب پر تھے مگر موسیقار کا نام بہت کم لوگ جانتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں موسیقار کے نام کو زیادہ اہمیت نہیں کیا جاتا تھا۔ بابا چشتی کے مقبول فلموں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں سے کئی گیت خود ان ہی کے تحریر کیے ہوئے تھے۔

بابا چشتی نے اپنے کیریئر کا آغاز لاہور سے کیا تھا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں گلگت چلے گئے اور کئی فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ اس سے پہلے لاہور میں انہوں نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں بھی کمپوزر کے طور پر ملازمت کی۔ ان سے پہلے یہ فرائض عظیم موسیقار استاد جھنڈے خاں کے سپرد تھے۔ جب انہوں نے ضعیف العزری کے باعث کمپنی سے اشتعلی ویا تو ان کی سفارش پر جے اے چشتی کو کمپوزر کے طور پر ملازم رکھ لیا گیا۔ بابا چشتی نے استاد جھنڈے خاں کے ساتھ محو ادے چند روز ہی کام کیا مگر ان سے بہت کچھ سیکھا۔ جھنڈے خاں جتنے بڑے موسیقار تھے اتنے ہی مذہبی اور خدا ترس انسان بھی تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ چشتی صاحب نے کولمبیا ریکارڈنگ کمپنی میں کام شروع کیا تو ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ انہوں نے ایک روز میں چھ سات گانے ریکارڈ کرائے کی جو مثال قائم کی بعد میں بھی وہ ریکارڈنگ کمپنی نہیں توڑ سکا اور یہ بلاشبہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

اس دور میں بابا چشتی نے بے شمار مقبول گیت ریکارڈ کرائے اور اس زمانے کے قریب قریب تمام بڑے گانے والوں اور گانے والیوں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ فلمی دنیا سے چشتی صاحب کا رابطہ 1937ء میں قائم ہوا اور پچاس سال تک قائم رہا۔ لاہور میں پنجابی فلم "سوانی

کہارن" کا آغاز ہوا تو موسیقار کے طور پر چشتی صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اور گلگت میں "سوانی بھٹوال" کے نام سے ایک فلم کا آغاز ہوا اور دونوں فلمیں ایک ساتھ ہی ریلیز ہوئیں۔ "سوانی بھٹوال" کے موسیقار مشہور موسیقار شیاام سندھ تھے۔ اتفاق دیکھیے کہ چشتی صاحب کی فلم کے نئے اس فلم کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوئے۔ ان کی شہرت گلگت تک پہنچ گئی تو وہیں سے ایک فلم ساز ان کو تلاش کرتے ہوئے لاہور پہنچے اور ہمراہ لے گئے۔ گلگت میں انہوں نے دو پنجابی فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ چشتی صاحب کی پہلی اردو فلم "خاموشی" تھی جو 1942ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے چار پانچ نئے بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے چھ اور اردو فلموں کی موسیقی مرتب کی۔ "شکر" کے گیتوں کا تذکرہ آپ چھ ہی چکے ہیں۔ اس کامیابی کے بعد چشتی صاحب کو ہدایت کار کیدار شرما گلگت سے بلوائے گئے۔ یہ فلم "تھپاں" تھی مگر ناکامی کے لیے چشتی ہوئی تو غلاب ہوئی۔ ان کی اگلی فلم "اسیلی" کی موسیقی بے حد مقبول ہوئی۔ مسکئی میں چند فلموں کی موسیقی بنانے کے بعد قیام پاکستان کے بعد وہ لاہور آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ہدایت کار لقمان کی "شاہدہ" تھی۔ یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی اور اس کے تین چار گانے بے حد مقبول ہوئے۔

پاکستان میں آنے کے بعد بابا چشتی کی موسیقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ پاکستان کی صنعت فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ بہت کم تعداد میں فلمیں بنائی جاتی تھیں اور فلموں کا معیار بھی زیادہ بلند نہیں تھا۔ مگر فلم ساز ہدایت کار نذیر نے "بھیرے" اور "لارے" جاکر ایک نئے دور کا ڈول ڈالا۔ بابا چشتی نے ان فلموں میں ایسی موسیقی مرتب کی جو آج بھی روزِ اول کی طرح تروتازہ ہے۔ بابا چشتی نے "بھیرے" میں ایک اور نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ انہوں نے ایک ہی دن میں چھ فلموں کی طرز میں عرب کس اور ریکارڈ کر دیں۔ طلب کی بات یہ ہے کہ یہ گانے اپنی قسم کی اور خوبصورتی کے باعث آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ پھر تو فلموں کا نیا دور بندہ گیا اور انہوں نے ایک کے بعد ایک بے شمار فلموں کی موسیقی بنائی اور ان میں سے بیشتر فلموں کی موسیقی نے ملک بھر میں دھوم مچا دی۔ ان میں سے چند فلموں کے نام یہ ہیں: "چن"۔ "انوکھی داستان"۔ "بھیرے"۔ "لارے"۔ "کچے والی"۔ "ماں منڈا"۔ "بھیرے"۔ "نحت جگر"۔ "مردہ"۔ "دل"۔ "بھٹی"۔ "مذللان"۔

ہنگام، گڈی گڈا، پٹکان، دلیر، بلو، مغل، نوکر، چکا، سورلی، سوئی ماں، جٹی، مس 56، ماما، تیرا انداز، ہن پڑا، جھ جھڑی، سستی، رانی خاں، ذیلدار، کھنڈا، رانی خاں وغیرہ۔ بابا چشتی نے جن فلموں کی موسیقی ترتیب دی ان کی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ ہے۔ ہمارے ملک میں تعداد شمار کیسے کرنے کا کوئی معیار نہیں ہے مگر ایک اندازہ سے کے مطابق بابا چشتی نے سینا ہزار کے قریب ہر دور اور پنجابی گانوں کی دھنیں بنائی ہیں جن میں سے مقبول ہونے والے فلموں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔ یہ ایک ایسی کارکردگی ہے جو کسی بھی اعتبار سے قابل فہمن و افکار ہے۔ بابا چشتی

کے ذہن ہر سا کی تپائی میں عمر گزرنے کے ساتھ کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر ہماری فلمی صنعت نے کئی سال پہلے ہی انہیں عملی طور پر ریٹائر کر دیا۔ ستم غریب یہ ہے کہ ان کی جگہ جن نئے موسیقاروں نے لی انہوں نے بابا چشتی کی دھنیں انتہائی فراخ دل سے استہیل کیں اور بعض طرز میں تو ہو سوا چاہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی مقبول دھنوں میں زیادہ تعداد بابا چشتی

سے مستعار لی ہوئی دھنوں کی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی بزرگی، تجربے اور خدایت کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ ان کے سامنے جیہ نے بڑے بڑوں کو سرب و کجا ہے مگر جب بابا چشتی نے فلمی موسیقی سے ”بے غل“ کرنے پر احتجاج کیا اور فلم سازوں سے شکوہ کیا کہ وہ انہیں موسیقی بنانے کا موقع کیوں نہیں دیتے تو کسی نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ لوگوں کے پاس یہ بہانہ تھا کہ بابا چشتی بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا چشتی کی عمر 90 سال ہے مگر ان کی ذہنی استعداد اور قوت تخلیق میں انحطاط نظر نہیں آتا۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ عمر کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں لیکن دس ہارہ سال قبل تو وہ بالکل تازہ دم تھے۔

پاکستان میں عموماً موسیقاروں کا تعلق ایسے گھرانوں سے ہوتا ہے جو پشت اپشت سے اسی گھن سے وابستہ رہے ہیں لیکن ایسی مثالیں بھی ہیں جب عام گھرانوں کے لوگوں نے موسیقی کے میدان میں قدم دکھا اور اپنی ذہانت، صلاحیت اور کارکردگی کے حوالے سے انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ خواجہ خود شہد انور، عظیم احمد، مدین کھوس، سکیل مانا، عابد بڑی وغیرہ اس گھن میں چند نام ہیں۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ

برصغیر پاک و ہند کے مابین موسیقار بابا جی اسے چشتی بھی ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں ساز و موسیقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کے والد ایک درویش صفت انسان تھے اور اپنے قصبے گونا چوہر کی بڑی مسجد کے امام تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں دعا گار گانوں اور ساز و آواز سے عداوت قائم کرنے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بابا چشتی جو موسیقی اور فلم کی دنیا میں چائے چشتی کے نام سے مشہور ہیں ان کا پورا نام غلام احمد چشتی ہے۔ مگر انہیں پورے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہ بابا جی اسے چشتی کے نام سے مشہور ہیں اور بھی نام ان کی شناخت بن چکا ہے۔ گونا چوہا تھا کہ ایک تداست پرست،



بابا چشتی

نزدیکی گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ ایک دن برصغیر کی دنیائے موسیقی میں کچھ پیادے کا اور اس کا نام ظہور موسیقار بن مست ہو جائے گا۔ غلام احمد نے اسکول میں داخلہ لیا تو حلالہ اور شعر و ادب سے بہت زیادہ دلچسپی رہی۔ والد صاحب کے اچھے چاہنے والوں نے لڑائی تعلیم بھی حاصل کی۔ خوش الحان تھے اس لیے نعت گوئی کے میدان میں قدم رکھا۔

دراصل یہ ان کے شوق موسیقی کا آغاز اور ابتدائی ذریعہ اظہار تھا۔ انہیں ذاتی طور پر بھی نعت گوئی سے دلچسپی تھی اور انہوں نے علوان شباب میں اپنی شاعری کا آغاز نعت گوئی سے کیا تھا۔ والد کی فوجی شہر میں انہیں اعلیٰ تعلیم دلائی مگر تھانے مہلت نہ دی۔ ابھی غلام احمد دسویں جماعت میں تھے کہ درویش صفت والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چند ماہ بعد ان کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی انتقال کر گئیں اور وہ دنیا میں تنہا رہ گئے۔ ان حالات میں تعلیم جاری رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ ان بے بسے مددوں نے انہیں اس قدر مایوس اور خردہ کیا کہ دنیا بھر کی کا دل اچاٹ ہو گیا۔ مگر پھر دوستوں کی محبت اور ہمدردی کی بدولت انہوں نے جینے کی طرف توجہ دی۔ تعلیم تو مکمل نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے نعت گوئی کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لیے میاں احمد بخش کی شاگردی اختیار کی۔ میاں صاحب بہت اچھے نعت گو تھے اور موسیقی کے بھی استاد مانے جاتے تھے۔ اس طرح بابا چشتی نے اپنی موسیقی کی تربیت کا آغاز کیا۔

یہاں تو یہ چاہیے تھا کہ مددوں اور تنہائی کے باعث وہ

کی جان قصود کیا جاتا ہے۔ ان کی موسیقی انتہائی سادہ اور پُر اثر ہوتی تھی۔ روزمرہ کے الفاظ اور معمولی سائروں کے خوبصورت استعمال سے وہ طرزوں کو عام فہم اور دشمنین بنا دیتے تھے۔ شاعرانہ ذوق کی بدولت غزلوں کا انتخاب بھی انہوں نے بہت اچھے انداز میں کیا۔ ایسا بھی ہوا کہ انہیں نے غزل بھی خود ہی لکھ دیے۔ بطور نظر نگار متعارف ہونے کا انہیں کوئی شوق نہیں تھا اور وہ بڑی قیاضی سے اپنے لکھے ہوئے گیت دوسروں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

بابا چشتی کو میں نے جب بھی دیکھا ہمیشہ تازہ دم اور زندہ دل ہی پایا۔ عموماً تنقید لہاس ان کا مرغوب پہنا اور ہر جگہ بار میں نے انہیں ہدایت کا نشان کی پنجابی فلم "تین" کی موسیقی ترتیب دیتے ہوئے دیکھا۔ یہ 56-1955ء کی بات ہے۔ وہ ہر موسیٰم لے کر بیٹھ جاتے اور دھنوں کا ڈھیر لگا دیا کرتے تھے۔ کئی کھڑے بھی خود ہی بنا دیتے۔ فلم "تین" میں انہوں نے ایک ہی دن میں تین گانوں کی طرز میں بے کر صدا بلند بھی کرادیا۔ میں ان کا یہ کارنامہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا مگر مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اس سے پہلے ایک ایک دن میں چھ سات گانے تحریر کر کے لار ان کی دھنیں بنا کر دیارڈ کر لے کر دیارڈ بھی قائم کر چکے ہیں۔ انہیں دھن بنانے میں کبھی مشکل پیش نہیں آتی بلکہ ان کی دھنوں کے مقابلے میں گانے کم ہن چاہا کرتے تھے۔ وہ حیران کن حد تک تیزی سے کام کرنے کے عادی تھے۔ ہوتا تھا کہ ہدایت کار نے فلم کی پہلی سٹیشن بیان کی، اب بھی شاعر نے پورا فلم بھی قلم بند نہیں کیا کہ بابا چشتی نے طرز بنا کر تیار کر دی۔ اس ضمن میں کچھ غلطی بھی مشہور ہیں۔ ایک بار فلم ساز آقا جی، اسے گانے کی چند فلموں کے لیے بابا چشتی اور ماسٹر صحت دونوں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ بابا چشتی نے ایک ہفتے کے اندر فلم کے تمام گانے ریکارڈ کرادیے۔ ماسٹر صحت اپنے انداز میں آہستہ دوی سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ وہ بیٹے گزر گئے اور ماسٹر صحت ایک گانا بھی ریکارڈ نہ کر سکے تو ایک دن بابا چشتی سے کہنے لگے۔ "بابا جی۔ دو گانے دھنیں تو ادھار دے دیں تاکہ میں بھی فلم ساز کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔ بن جائیں گی تو آپ کو دے دوں گا۔"

ایک زمانے میں فلمی حلقوں میں یہ خیال عام ہو گیا تھا کہ بابا چشتی صرف پنجابی فلموں کے موسیقار ہیں۔ بابا چشتی نے سنا تو بہت چغاض ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ موسیقی زبان کی پابند نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دانی میوزک پہلے رہے تو

وہ انہار کی خبروں کی بھی دھن بنا سکتا ہے۔ ثبوت کے طور پر انہوں نے سامنے پڑے ہوئے اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر کی دھن بنا کر دے دی۔ یہ اخبار ان کی ہنرمندی اور دسترس کا منہ بولا ثبوت ہے۔ پنجابی فلم "دلا بھٹی" ریلیز ہوئی اور بے حد کامیاب ہوئی۔ بابا چشتی پہلے ہی دن شام کے شو پر اپنے بہت سے بچوں کو لے کر پہنچ گئے۔ ہاؤس کئی ہو چکا تھا۔ باہر سیکڑوں ہزاروں کا مجمع تھا جو گیت حاصل کرنے سے محروم رہا تھا۔ مگر بابا جی کا اصرار تھا کہ ان کے ہمارے خاندان کو فلم دکھانے کا بندوبست کیا جائے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ بالکل ناممکن ہے اس وقت آپ جاسیے۔ آپ کے لیے اگلے شہر میں بندوبست کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ برہم ہو کر بولے "اچھا تو پھر فلم میں سے میری میوزک نکال دو تو میں وہاں چلا جاؤں گا۔ ورنہ نہیں" اس ہنگامے کی خبر آج بھی لمبے گرا کو بھی پہنچ گئی اور ان کی ہدایت پر سینما والوں نے کسی نہ کسی طور بابا چشتی کی خدمت پہنچ کر دی۔

انہی۔ ایم۔ آئی ریکارڈنگ کمپنی کی جانب سے مقبول موسیقاروں اور گلوکاروں کو "گولڈن ڈسک" پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو بابا چشتی اس سے محروم رہے۔ بابا کو بہت غصہ آیا۔ کمپنی کے چیفنگ ڈائریکٹر کے پاس گئے اور بولے "میں نے ایک ہی کیوٹر چھوڑا تھا جو آج تک لوٹ کر نہیں آیا ہے۔ پھر بھی آپ لوگوں کو میری قدر نہیں ہے۔" ان کا اشارہ اس مقبولی گیت کی جانب تھا جس کے بول یہ تھے۔

داستغای رب دہو جاویں دے کھو تر

اس گیت کی حیثیت کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف گونج رہا تھا اور اس کے دیارڈوں کی فردیت نے ایک دیارڈ کارڈ قائم کر دیا تھا۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں مائٹلی اور کالی رائٹ کا بھی نظام مردود نہ ہونے کی بنا پر بابا جی کے حصے میں کچھ نہ آیا۔ بابا جی ایک سادہ عراج، سادہ لوح انسان ہیں مگر انہیں یہ احساس ہمیشہ رہا ہے کہ ان کے قد و قامت کے مطابق ان کی قدر نہیں کی گئی۔ انہیں فلمی دنیا اور زمانے سے بچا شکوہ رہا جس میں وہ حق بجانب بھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کارناموں کے مقابلے میں ان کی شہرت، عزت اور پزیرائی بہت کم رہی ہے۔ غالباً اس میں ان کی سادگی، ورد میں سادگی اور کم آمیزی کا بھی دخل رہا ہے۔ ایک بار انہوں نے یہ لفظ خود سنا یا تھا کہ ان کے بیٹے نے کسی بہت مہنگی چیز کی فرمائش کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم نے تو اپنے لڑکپن میں ان چیزوں کا قصور

تک نہیں کیا تھا۔ بیٹے نے جواب دیا۔ ”لہاجی۔ میرا اور آپ کا کیا مقابلہ ہے۔ آپ ہایا چش جیسے سہیاد کے بیٹے تو نہیں ہیں۔“ ہایا کی لاجواب ہو گئے اور چپکے سے اس کی فرمائش پوری کر دی۔

”وہ تو ساری زندگی بھی کی ضرورتیں اور فرمائشیں پوری کرتے رہے مگر کوئی لڑکائی ایک مصوم خواہش تک نہیں پوری کر سکا اور وہ یہ کہ جب تک وہ موسیقی بنانے کے قائل تھے ان سے کسی نے کام نہ لیا۔ شاید یہی غم انہیں لے جیتا ہو۔ وہ ایک دل شکستہ اور مایوس انسان کی طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایسے بے بہانہ کار کی ہم نے کیا قدر کی کاش انہیں اس شوق اور خدمت سے محروم نہ کیا جاتا۔“ یہ ستم طریقہ نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ ☆ ☆

ایک وقت تھا جب فلموں میں احمد رشدی کے گانے ایک لازمی ضرورت سمجھے جاتے تھے۔ ریڈیو سے ان کی میٹھی آواز ہر وقت گوشہ نشین رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی گلوکاری کا آغاز آئینج پرغز سرہلی سے کیا تھا۔ بچپن ہی سے انہیں گانے کا شوق تھا، حالانکہ ان کے خاندان میں کوئی گانے والا یا موسیقی سے دلچسپی رکھنے والا نہیں تھا۔ یہاں تک بات ہے کہ بعد میں ان کے ایک بھائی ابرہمان بھی بطور معاون ہدایت کار اور اداکار فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا تعلق..... حیدر آباد (دکن) سے تھا۔ کم عمری تھے کہ والدین کے ہمراہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں قیام کیا۔ انہوں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اس کا ایک سبب تو معاشی حالات تھے مگر اصل بات یہ تھی کہ انہیں پڑھنے، پڑھانے کا شوق بھی نہیں تھا۔ محض گانے کا شوق تھا۔ جو گانا سننے یا دکر لیتے اور پھر اسی طرز اور ادائیگی کے ساتھ گاتے۔ پہلے ان کی اس خصوصیت کا چرچا ان کے قریبی دوستوں میں ہوا۔ پھر واقف کاروں میں ہوا اور پھر یہ بات پکچھلی چلی گئی مگر اس شوقین گلوکار کو کسی نے متنبہ نہیں کیا۔ اول تو کسی کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں تھا نہ انہوں نے ہاتھ دھکا نہ کیا تھا نہ ماگ رانگیوں سے واقف تھے اور نہ ہی ریاض کیا تھا۔ کسی نے انہیں یہ نہیں سکھا یا تھا کہ ماگ دہری کیا ہوتی ہے اور ایک ماگ میں کتنے شے ہوتے ہیں۔ بس قدرت نے انہیں خدا اور صلاحیتوں سے نوازا تھا اور دیوانگی کی حد تک گانے کا شوق تھا۔ ان کے پاس لے دے کر بس بھی ادا تھا نہیں۔

موسیقی ایک ایسا سمندر ہے جس میں جو بے جو بے مگر

ملہنا مسرگوشٹ

مجھ، چھلیاں اور حیراک غوطہ زن رہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی انجی کو اس سمندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر کسی کا تعلق گانے والوں اور موسیقاروں کے گھرانے سے ہے پھر تو کچھ آسانی ہے مگر جو محض اس برادری سے باہر کا ہے پھر موسیقی کے دھڑ دھڑ سے ہاتھ واقف اور قربت پانے بھی نہیں ہو تو اسے کون سمندر میں کودنے کی اجازت دیتا ہے مگر احمد رشدی نے اللہ کا نام لے کر موسیقی کے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ بہت غوطے کھائے۔ کبھی ڈوبے، کبھی گلے مگر سانس پور اس کا دشمن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ پہلے آئینج پر، پھر قادیان میں اور اس کے بعد ریڈیو پاکستان کراچی سے گانے لگے۔ رشدی نے ہاتھ دھکا اور ہاتھ دھکا نہیں سیکھا تھا مگر قدرت نے بے حد سرلی اور شیریں آواز عطا کی تھی۔ سوز و تاثیر روشنی پہنچانے والی چیزیں رشدی کی آواز میں نکلتی ہوئی تھیں۔ اگر گانا کانوں کو بھلا لگے تو کون پوچھتا ہے کہ گانے والے نے ہاتھ دھکا موسیقی کے سبق لیے ہیں یا نہیں چنانچہ بہت جلد رشدی کی آواز قادیان میں گونجنے لگی۔ ریڈیو پاکستان سے انہوں نے کمرشل کیت بھی گائے جو بے حد مقبول ہوئے۔ وہ ریڈیو پر بچوں کے پروگرام میں حصہ لیتے گئے اور ایسے ایسے نئے گانے جو بعد میں یادگار بن گئے۔

بند روڈ سے کیا ڈی، میری چلی ہے گھوڑا گاڑی

بابو ہر جانتا چٹھہ

یہ نغمہ اس قدر مقبول ہوا کہ بچے بچے کی زبان پر آ گیا۔ وہ جو سالوں نے کہا ہے کہ طرہ ہوتا ہے جس کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ محض عطر کی قیریوں سے تو کوئی عطر اچھا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو خود اپنے منہ سے بولتا ہے جہذا احمد رشدی کی صلاحیتوں کا چرچا بھی ان کی آواز کے ساتھ ساتھ پھیلنے لگا۔ کراچی میں فلم سازی کا ابتدائی دور تھا۔ ایک فلم ساز نے ”کامرانہ“ بنائی تو اس میں احمد رشدی کی آواز کو شامل کر لیا۔ فلم ساز کے لیے یہ سستا سودا تھا اور آواز بھی اچھی تھی۔ اس کے بعد ان کی فلم ”بڑا آدمی“ ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بہت زیادہ کامیاب ہوئی تو انہیں دہری گھر رشدی کی آواز سننے والوں کے دلوں میں اتر گئی۔ پھر تو کراچی کی اکثر فلموں میں احمد رشدی گلوکاری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اپنا پرایا سوار رہے زمانے، انصاف، دوستانہ برات، کے راہی، زمانہ کیا کہے گا، یہ دنیا، ہراز، ہر فلم میں احمد رشدی کی آواز شامل تھی۔ ان میں سے بعض فلموں کی شہنگ لاہور میں

اگست 2014ء

[92]



گلوکار گلزار احمد رشیدی

خاندان گلزار احمد رشیدی
گوری لگائے جل میں اک
آج بھی اتنی اچھا لگتا ہے جتنا 1960ء میں لگا
تھا۔ قسمت زوہدوں پر تھی۔ اس شخص کو 1961ء کے لیے
بہترین گلوکار کا نگران قرار دیا گیا اور رشیدی کی خوش نصیبی اور
مقبولیت پر میر تقی میر نے شہت ہو گئی۔ اس کے بعد احمد رشیدی
کی مصروفیات کا یہ عالم ہوا کہ کبھی لاہور میں گارہے ہیں تو
کبھی کراچی میں تھے دیکھا کر رہے ہیں۔ وجہ مراد نے
اپنی پہلی فلم "ہیرا پتھر" کا آغاز کیا تو اپنے لیے احمد رشیدی کی
آواز کا انتخاب کیا۔ اس فلم کے گانے بہت ہو گئے۔ وجہ
مراد کو احمد رشیدی کی آواز اس قدر پس آئی کہ انکریں پر
ہوں لگتا تھا جیسے وہ خود ہی گارہے ہیں۔ اس کے بعد احمد
رشیدی کی آواز اور وجہ مراد کی آواز کا یہ ایک دوسرے کے
لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی مگر رشیدی نے جب محمد علی کے
لیے پس پردہ گلوکاری کی تو ان کی آواز محمد علی کو بھی سوٹ کر
گئی۔ محمد علی نے کہا، پاکستان کا کوئی ہیرا ایسا نہیں تھا جسے احمد
رشیدی کی آواز سوٹ نہ کرتی ہو۔ یہ نہ صرف ایک حسن اتفاق
تھا بلکہ احمد رشیدی کی فنکاری اور تخلیقی صلاحیتوں کا واضح
ثبوت بھی تھا۔ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر احمد رشیدی
کی آواز گونجنے لگی۔ انہوں نے مزاج رومانی، الیہ ہر دم

ہوئی۔ صدا بندی کے لیے بھی انہیں لاہور آنا پڑا۔ ان کا
تذکرہ ان سے پہلے ہی لاہور پہنچ چکا تھا۔ اس لیے لاہور کے
فلم سازوں نے بھی احمد رشیدی کے بارے میں سوچنا شروع
کر دیا مگر لاہور والوں کے لیے مشکل طور پر کراچی میں
رہنے والے فنکاروں کی خدمات حاصل کرنا اکثر اوقات
پریشانی کا سبب بن جایا کرتی تھی مگر رشیدی تو خود پاکستان
کے فلمی ہائی وڈ میں آنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ وہ
جانتے تھے کہ جب تک وہ لاہور کی فلموں میں نہیں گائیں
تو مستحق گلوکار کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔
جب انسان کوشش اور شہید خواہش کرتا ہے تو
قدرت بھی ساتھ دیتی ہے۔ شہاب کیرالوی اپنی جدت
پسندی اور نئے نئے فنکار متعارف کرانے کے لیے مشہور
ہیں۔ احمد رشیدی کو کراچی سے لاہور بلانے کا سہرا بھی ان
ہی کے سر ہے۔ وہ بھی ابھرتے ہوئے فلم ساز اور ہدایت کار
تھے۔ نوخیز اور تروتازہ چہروں، آوازوں اور خیالوں کو ترجیح
دیتے تھے۔ انہوں نے سینئر فیلم "سیرن" کا آغاز کیا تو
لاہور کے ممتاز اور مکہ بند گلوکاروں کو چھوڑ کر احمد رشیدی کا
انتخاب کیا۔ احمد رشیدی نے "سیرن" کے لیے پہلا گانا
دیکھا دے کر پایا اور یہ گانا فلم کی نمائش سے پہلے ہی مقبول ہو گیا
اور اس مقبولیت میں آج تک کمی واقع نہیں ہوئی۔

کے گیت گائے اور ہر ایک کے ساتھ اخصاف کیا۔ اپنی آواز کی شہاس، آثار چہ حاد، تاثر اور اظہار احساس پر قدرت کے باعث وہ ہر قسم کے گیت گاتے تھے اور ہر قسم ہوتا تھا جیسے اس گیت اور ہوا کار کے لیے احمد رشیدی کی آواز ہی سب سے زیادہ موزوں ہے۔ یہ ایک قابلِ تعریف بات تھی جس کا احمد رشیدی کو بہت فائدہ پہنچا۔

احمد رشیدی نے کسی تنہا جنگ میں نغمہ سرائی کا آغاز نہیں کیا تھا یہ بھی نہیں کہ وہ پاکستان میں اکیلے ہی گلوکار تھے۔ جی تو یہ ہے کہ جب رشیدی نے اس میدان میں قدم رکھا تو وہ مستقل اور گلوکاروں کی درائی کے لحاظ سے پاکستان کی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ کیسے کیسے مبینہ گلوکاران کے ہم عصر تھے۔ مہدی حسن، سلیم رضا، خیر حسین، مسعود رانا، عجب عالم، رجب علی، اخلاق احمد جیسے گائے والے پاکستان کی فلمی صنعت کو اپنی آوازوں کے حسن سے ہلا مال کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی انفرادیت اور مخصوص انداز تھا۔ اس کے باوجود احمد رشیدی نے اپنی گلوکاری کا لوہا منوالیا۔ انہوں نے اپنی آواز کو کسی ایک انداز یا مخصوص سانچے میں نہیں ڈھالا بلکہ وہ ہر قسم کے گیت گانے پر قدرت رکھتے تھے اور اس طرح گاتے تھے کہ جتنی آواز دیتے تھے۔ ان تمام آوازوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو ہلکا ستوا کیا اور احمد رشیدی کی آواز ان سب میں ایک ممتاز اور منفرد آواز تھی۔

احمد رشیدی نے قریب قریب ہر قابلِ ذکر موسیقار کے لیے گیت گائے۔ اس زمانے میں فلم سازی کے تین مراکز تھے۔ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ، احمد رشیدی نے ان تینوں مراکز کے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور ناقابلِ فراموش نئے تخلیق کیے۔ وہ شاعر کے الفاظ کو معنی اور موسیقار کے سروں کو زندگی بخش دیتے تھے، حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے چند بنگالی نئے گیت بھی گائے اور وہ بھی مقبول ہوئے لیکن ان کے بیشتر نغمات ہر دو فلموں کے لیے ریکارڈ کیے گئے۔ انہوں نے بعض فلموں میں نامور آوازوں کے ساتھ دو گانے بھی ریکارڈ کرائے اور بعض ایسے گیت بھی ہیں جو ہیر و تن کے لیے زمانہ آواز میں اور ہیر و تن کے لیے مردانہ (احمد رشیدی کی آواز میں) ریکارڈ کیے گئے۔ ان کے مقابل گانے والوں میں بہت بڑے بڑے نام شامل ہیں مگر میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ انہوں نے اکثر گانے بھرا انداز میں گائے اور وہ مقبول بھی ہوئے۔ یہاں تک کہ جو گانے ان کی

اور میڈیم طور جہاں کی آوازوں میں ایک وقت حد بند کئے گئے ان میں بھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں کامیاب رہے جو ایک بہت بڑا کام رہا ہے۔

احمد رشیدی سے میری ذاتی ملاقات اس وقت سے تھی جب وہ کراچی میں گایا کرتے تھے۔ وہ بہت لطیف، منکسر المزاج اور خوش اخلاق انسان تھے۔ بہت جلد مکمل ہاتھ تھے۔ لیکن سنانے پر آئیں تو بھی کسی سے کم نہیں تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ حاسد نہیں تھے۔ اپنے تمام ہم عصر گلوکاروں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ میں نے ان کی زبان پر بھی کسی دوسرے گلوکار یا کسی موسیقار کی برائی نہیں سنی۔ لحاظ دہریت کا عنصر ان کے مزاج میں حد سے زیادہ تھا جس کے باعث انہوں نے مالی نقصانات بھی اٹھائے۔ مریت کے بارے میں بہت سے فلم سازوں سے کم معاوضہ لینا قبول کر لیتے تھے اور اگر کوئی وہ بھی گول کر دے تو تقاضا کرنے کی ان میں بہت نرمی جبکہ ان کے دوسرے ہم عصر گلوکار پوری ہلم وصول کرتے تھے۔ احمد رشیدی اس مقام پر تھے جہاں وہ نہ مالکا معاوضہ حاصل کر سکتے تھے مگر اخلاق کے بارے میں بولتے تھے کہ میں تھے جس سے بہت سے فلم ساز ناچائز لاندہ اٹھاتے تھے۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ احمد رشیدی کو اداکاری کا بھی شوق تھا۔ ایک دو فلموں میں انہوں نے بہت اصرار کر کے اپنے گانے خود اپنے آپ پر فلم بند بھی کرائے تھے۔ میں نے بھلور فلم ماز بلی فلم "کینز" بنائی تو اس میں کالج کے معاصر میں رشیدی کو بھی ایک طالب علم کے طور پر پیش کیا اور انہوں نے بے ساختہ اور بے تنگنا اداکاری کا مظاہرہ کیا مگر اس سے زیادہ لہو اکاری ان کے پس کی بات نہ تھی۔

رشیدی حیدر آباد (دکن) سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدر آباد کے لوگ ہرگز شہر واقعے اور ہر آنے والے واقعے کو "پرسوں" کا واقعہ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر وہیں پر س پہلے بھی کوئی واقعہ ہوا ہے تو کہتے ہیں کہ "پرسوں کی بات ہے" اس طرح آنے والے زمانے کے لیے بھی "پرسوں" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے حالانکہ اردو زبان اور قواعد کے اعتبار سے پرسوں تیسرے دن کو کہتے ہیں۔ ایک بار میں نے کسی کام کے لیے ان سے وعدہ کیا کہ آپ کا یہ کام پرسوں ہو جائے گا۔ وہ پوچھنے لگے "یہ پرسوں حیدر آباد والوں کی پرسوں تو نہیں ہے؟" حیدر آباد کے لوگ کہنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اچا اور چشتیوں کے علاوہ ہر کھانے میں کھٹائی

ایک دوسرے کو چھیڑتے رہے اور محمد علی کو "جنگجو" ہیرو کا خطاب دے دیا۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے کہ لاہور میں نوہند محمد علی کی اس دانتے کے بعد لاہور کی فلمی دنیا میں دھماکے مچ گئی۔

احمد رشیدی کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میری فلم "ہاگیر" کے ایک گانے کے لیے موسیقار نثار بڑی صاحب نے رشیدی کو ریہرسلز کرائی تھیں۔ گانے کی ریکارڈنگ کا دن آیا تو میں وقت پر معلوم ہوا کہ بے یک سرگزیبوی انشٹن نے نثار بڑی صاحب کا پانکٹ کر دیا ہے اور جب تک مصالحت نہ ہوگی ایسوی انشٹن کا کوئی رکن نثار بڑی صاحب کے لیے گانا ریکارڈ نہیں کرائے گا۔ میری شکل یہ تھی کہ گانا پھر کر کے کدو دن بعد اس کو ٹھکانا بھی تھا۔ اگر گانا ریکارڈ نہ ہو تو آرٹسٹوں کی چارٹیں خالی ہو جائیں گی۔ میں نے جنرل میجر شری مسعود رانا کو یہ صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔ رشیدی کو بھی صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ رشیدی نے چارہ تو تیار تھا مگر ایسوی انشٹن سے ڈرتا تھا۔ مسعود رانا نے کہا کہ آپ دونوں کا گانا رکھ لیں مگر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے بڑی صاحب سے کہا کہ کسی نے گانے والے کی خدمات حاصل کی جائیں اور نہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ مالگیر اس زمانے میں ممتاز ہاتھ میں لیے پھرتے تھے۔ وہ بین گھوش اور جیم کے مگر میں بھی عموماً نظر آ جاتے تھے مگر کسی نے فلم میں گانے کا موضوع نہیں دیا تھا۔ بڑی صاحب نے کہا کہ اس گانے کے لیے مالگیر بہت سوز دیا ہیں۔ چنانچہ مالگیر کو فوراً تلاش کیا گیا۔ ریہرسلز کر لی گئیں اور رات کو ریکارڈنگ کا بندوبست ہو گیا۔ رشیدی کو پتا چلا تو پھر مسعود رانا کو لے کر آ گئے۔ اب ان کا یہ کہنا تھا کہ چلیے میں ایسوی انشٹن کو سٹائوں گا مگر گانا میری دعا آواز میں ریکارڈ کریں۔

انہیں گمان بھی نہ تھا کہ ہم کسی اور جی آواز میں گانا ریکارڈ کر لیں گے۔ مگر اب اصول کا مسئلہ بن چکا تھا۔ مالگیر ایک نوا آموز اور نو اور گلوکار تھا۔ اس کی دل خلیں ہمیں منظور نہ تھی چنانچہ جو گانا مالگیر کی آواز میں ریکارڈ کر لیا گیا۔ عزم اور دیباہ اس کی فلم بندی ہوئی اور یہ بہت مقبول ہوا۔ ہم چلے تو ہمارے سنگ سنگ نگارے چلے آج بھی ایک مقبول گانا ہے۔ کئی سال پہلے میں لہور توڑ میں تھا۔ پتا چلا کہ پاکستانی فنکاروں کا ایک شرمندہ ہورہا ہے۔ ہال میں گئے تو تھا مالگیر مہناز نے اپنے اپنے

ضرور موجود ہوتی ہے۔ حیدر آبادیوں کے گھارے رنگین اور سادہ چادر ایک بے حد لذت اور مقبول ڈش ہے۔ رشیدی جب بہت مہربان ہوتے تو دوستوں کو گھر سے گھارے رنگین اور چادر ملکا کر کھاتے تھے۔ ان کا ابتدائی دور کا ایک گانا بھی کافی مشہور ہوا تھا۔ جس کے بول یہاں کھینچی گڑی میں بھی پڑی

ہائے میری اماں

در اصل یہ حیدر آبادیوں کا لوک گیت ہے۔ اصولاً تو یہ گانا کسی زمانہ آواز میں ہونا چاہیے تھا مگر رشیدی نے اپنی گانگی سے اس میں جان ڈال دی اور یہ گانا بھی ان کے ہٹ گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

رشیدی خوش اخلاق، انہیں گھارے صلح جو آدمی تھے۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتے تھے۔ مگر ایک بار انہما نے میں وہ ایک بہت خوفناک لڑائی کا سبب بن گئے تھے۔ محمد علی نے نئے کراچی سے آئے تھے۔ رات گئے میں اور احمد رشیدی مالی روڈ کے ایک ریسٹوران میں کھانا کھانے گئے جہاں اداکارہ حسد کے شوہر رشید بخشی بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ موجود تھے۔ رشیدی کی ایک بے ضروری حرکت پر ان لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ محمد علی جیسا ہیرو دھلا کیسے یہ گوارا کر لیتا۔ یہ فوراً ان کی ادا کو پہنچا اور دھواں دھار جنگ شروع ہو گئی۔ ٹپٹپٹ۔ اٹل لڑچ۔ کچے کھانے اٹھیا دیوں کے طور پر ہستمال ہونے لگے۔ ریسٹوران میں موجود لوگ اور دیگر چشم زدن میں رونچرک ہو گئے۔ بات اتنی بڑھی کہ قاف پھوٹل لے کر آ گئے۔ محمد علی نے دفاع کے لیے ہادر پتی خانے سے بھری کاسٹے والی بیس چھری اٹھالی۔ لگھڑ تو پہلے ہی بج گئی تھی۔ ہم چائین کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے اور حمایت علی شاعر کھیل گئی میں جا کر "پولیس پولیس" پکارتے رہے مگر رات کو بارہ ایک بجے کون آتا؟ آخر میں جیت ہیرو کی ہوئی۔ قاف گروپ ہسپا ہو گیا۔ پھر سے خانسا سے دو بارہ نمودار ہو گئے اور دیباہوں پر سے لٹاؤ کچھ آپ کے نشانات صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس ہنگامے سے نجات ملی تو ہم نے احمد رشیدی کو تلاش کیا جو نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اگلے دن دانتے تو سر پر معمولی سی چوٹ کا نشان تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ریسٹوران سے باہر نکلے تو ایک عکسی مل گئی۔ وہ سہمے مگر پہنچ کر سو گئے۔ انہیں کچھ پتا نہیں کہ بعد میں جو لوگ ریسٹوران میں رہ گئے تھے ان پر کیا گزری تھی؟ اس کے بعد بھی عرصے تک ہم لوگ اس جنگ کے حوالے سے

ماہنامہ سرگزشت

لمن کا مظاہرہ کیا۔ عالمگیر نے وہی نمبر سنا یا۔ وقت کے دوران میں ان سے ملاقات ہوئی۔ عالمگیر نے بتایا کہ وہ اسٹیج شو میں اپنے پروگرام کا آغاز ہی اس نئے سے کرتے ہیں جو ان کے لیے نئی ثابت ہوا اور جس نے فلمی دنیا میں ان کے لیے دروازے کھول دیئے۔

رشدی کو اس بات کا بیٹا اسوس رہا۔ عالمگیر کا گانا ہوائی قبول ہوا اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے ایک دوست کو اجازت کیا۔

رشدی نے ایک فلم سازی کا آغاز ہی کیا تھا اور محمد جاوید فاضل کو اپنی فلم "امانت" کے لیے ہدایت کا منتخب کیا تھا۔ اس فلم کی شریک بھی شروع ہو گئی تھی مگر مکمل ہی رہی۔ اپنی اداکاری کا شوق بھی وہ پورا کر رہا کرتے تھے۔ جان محمد جس کی فلم "دیکھا جائے گا" آخری فلم تھی جس میں رشدی نے اداکاری کی تھی۔ یہ 1978ء کا ذکر ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ احمد رشدی کے ستارے گردش میں آچکے تھے۔ ان کی فلموں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ فلم سازی کا تجربہ کام ہو گیا تھا اور اس میں انہیں مالی نقصان بھی ہوا تھا۔ انہوں نے چار سو کے قریب فلموں میں ہزاروں گانے گائے مگر مالی اور معاشی طور پر کسی خوشحالی سے ہمکنار نہ ہوئے۔

ماہ سینوں نے احمد رشدی کے ذہن دو عالم پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے فلموں کی تعداد کم ہو گئی تو وہ کراچی چلے گئے۔ 1978ء میں ان پہلی کا شہید دورہ چلا اور وہ تقریباً ایک سال تک یہاں رہے۔ صحت یاب تو ہو گئے مگر 1980ء میں انہوں نے گانا لکھا بند کر دیا۔ گانا ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا تھا بہت ممکن ہے کہ دل کی بیماری کے عالم میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو۔ اس زمانے میں ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں ملک سے باہر آنے جانے میں مصروف رہا۔ "ہیرہ" آخری فلم تھی جس میں احمد رشدی نے نئے گائے تھے۔ ستم ٹرٹل ہے کہ "ہیرہ" وحید مراد کی بھی آخری فلم تھی۔ جنہوں نے عائشہ کسی ایک فلم میں بھی احمد رشدی کی آواز کے بغیر کام نہیں کیا تھا۔ پہلے شہید ہارٹ ایک کے بعد رشدی مگر بھی سکھل نہیں سکے آخری دورہ انہیں گیارہ ہریل کو پڑا اور اس قدر شدید ثابت ہوا کہ اسپتال پہنچے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔ گانا ان کا شوق تھا جو انہوں نے ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ بہتر ملاقات پر دراز ہوئے تو دوستوں کی ملاقات سے بھی گئے۔ مگر مالی پریشانیوں کی لائق

رہیں۔ وہ علاج کے لیے ملک سے باہر جانا چاہتے تھے مگر پیسے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام مشکلات نے ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ ایک طویل عرصے تک پاکستان کے مقبول ترین مضمین رہے تھے کیونکہ ہر قسم کا گانا انتہائی سہولت اور خوشبودی کے ساتھ گاتے تھے۔ ان کی گلوکاری کا عرصہ 25 طویل سالوں پر محیط ہے۔

رشدی کی بد قسمتی یہ ہے کہ وہ اچھے وقتوں کا انتظار نہ کر سکے۔ آنے والے سالوں میں پاکستان میں تقارب اور کیسٹوں کے باعث گلوکاروں کی آمدنی میں بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ ایسے گلوکار بھی ہیں جو کسی ایک تقریب میں گانے کا معاوضہ میں کچھیں ہزار وصول کرتے ہیں۔ احمد رشدی نے تو کبھی محنتوں میں بھی اتنی رقم نہیں دیکھی ہوگی۔

بے جا رہ رشدی.....!

☆☆☆

آج آپ کو برصغیر کی دوسرے ہستیوں کی داستان سنائیں۔ وقت، جہاں ہے وہاں، وفاداری کے ساتھ ساتھ یہ عروج و زوال کی ایک ایسا داستان ہے جسے اب بھلائی فلمی صنعت (ہالی ووڈ) کے لوگ بھی بھول چکے ہیں۔

شروع کرتے ہیں ایک پری چہرہ ہیرون سے۔ ان کا نام گوبرائی تھا۔ اس زمانے میں انہیں کسی گوبرہ کہا جاتا تھا۔ مس گوبرہ گوبرائی لاہور میں پیدا ہوئی تھیں۔ صورت حسن ادا تھیں اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھیں۔ جب خیرین شباب میں قدم رکھا تو ایک قیامت برپا کر دی۔ سارے شہر میں ان کا چہرہ چاہا گیا۔ لاہور میں فلم کاروں کی اس وقت کی نہ تھی لیکن گوبرہ رائے نے جیسے ہی اس میدان میں قدم رکھا سارا لاہور (مطلب لاہور کے فلم کے دلداروں) نے ان کے نام کی مالا جیٹا شروع کر دیا۔ اداکاری، رقص اور گانے کی صلاحیتیں وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ لائی تھیں۔ اداکاری کا بھی کچھن سے شوق تھا۔ وہی بات تھی کہ

خدا جب حسن دیتا ہے نرا کسے ہی جاتی ہے۔

فلمی دنیا میں انہوں نے اپنا سفر خاموش فلموں سے شروع کیا تھا کیونکہ اس وقت خاموش فلمیں ہی بنا کرتی تھیں اور ان کے شہدائی انہیں دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے تھے اور انہیں یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان میں کون اس قدر ہے اور کون میرا شاہ۔



ہذا کارہ گوہر

مس گوہر کی پہلی فلم "ہذا مسئلہ عرف بھگت سہاس" تھی جس میں وہ پہلی بار پردہ اسکرین پر نمودار ہوئی تھیں۔ اس فلم نے تھلکے چار یا احمد علی ہی فلم کی نمائش کے بعد ان کے پرستاروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ یہ فلم انڈین فلم کمپنی نے بنائی تھی۔ اس زمانے میں برصغیر میں خاصوش فلم سازی کا نیا نیا آغاز ہوا تھا۔

1920ء میں مس گوہر کی دوسری فلم "راہلیا مایا" کی نمائش ہوئی۔ 1922ء میں انہوں نے دو اور

خاصوش فلموں میں کام کیا۔ ان دو فلموں کی نمائش کے بعد وہ ٹھٹھکے چھوڑ کر بمبئی چلی گئیں کیونکہ وہاں فلمی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔ وہ بمبئی کی ایک فلمی گورنر فلرز سے وابستہ ہو گئیں۔ بمبئی جانا ان کے لیے خوش قسمتی کا آغاز ثابت ہوا۔ 1925ء میں مس گوہر کی تین فلموں کی نمائش ہوئی۔ فلم "باپ کی کمائی" کرشنا کمپنی کی فلم تھی۔

اب انہوں نے بمبئی کی فلمی صنعت میں پاؤں جمالیے تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1925ء میں انہوں نے دس فلموں میں کام کیا۔ ان میں "ٹائیسٹ گرل"، "میں کیوں جیسا بنی"، "وہی کا ٹھک" و "شیریں فریاد" عظیم قرانی (اس میں انہوں نے سلو چٹا کے ساتھ کام کیا تھا) ریکارڈ، پرتموی ہترا، مندرجہ، جینا کماری، لکھو و نبارہ شامل تھیں۔ ان فلموں میں دوسرے اداکار بھی بہت مشہور تھے اس لیے زیادہ تر فلموں نے کامیابی کا منہ دیکھا۔

1927ء میں ان کی چار فلموں کی نمائش ہوئی۔ پڑھی لکھی لڑکی کے ہدایت کار چندو شاہ تھے۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورت اپنے حقوق کے لیے کس طرح جان کی بازی لگاتی ہے عورت کے لیے یہ ایک پکار تھی جس میں اس کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے لڑنے اور جنگ کرنے کا سبق دیا تھا۔ فلم پڑھی لکھی لڑکی میں بھی ہندو خواتین کو بتایا گیا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کریں اور دوسروں کی تضحیک ہو کر نہ رہ جائیں۔ پڑھی لکھی ماں ہی اولاد کو اچھی تربیت دے سکتی ہے۔ دیکھا جائے تو 1927ء میں بنائی جانے والی فلم ایک انتھابی فلم تھی کیونکہ اس زمانے میں ایسے موضوعات کوئی فلم ساز سوچ بھی نہیں سکتا۔

یہ انتھابی فلم بنانے کا سہرا فلم ساز و ہدایت کار چندو لال شاہ کے سر تھا۔ ایسے ہی انتھابی موضوعات وہ پہلے بھی فلمائے آ رہے تھے۔

جب کامیابیوں نے قدم چڑھے تو مس گوہر نے 1928ء میں اپنی اپنی فلم کمپنی قائم کر لی۔ انہوں نے ان فلموں میں مرکزی کردار بھی ادا کیے تھے۔ ایک فلم کا نام وشو منہنی تھا۔ اس فلم میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے جو کہ اس زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی سال انہوں نے بھکاری شہزادی میں کام کیا۔ یہ بھی بہت کامیاب تھی۔ چندو لال شاہ اس کے مصنف اور ہدایت کار تھے۔

ان کامیابیوں نے حائر ہو کر ان دونوں نے مل کر ایک فلم ساز ادارہ قائم کر لیا۔ جس کا نام رنجیت مووی ٹون تھا۔ اس دوران میں ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے گوہر اور چندو لال شاہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ فلمی دنیا میں ایک دن اس خبر نے کچل چا دی کہ مس گوہر اور چندو لال شاہ نے شادی کر لی ہے۔ واقعی یہ ایک حیران کن بات تھی مس گوہر ایک حسین و جمیل اداکارہ تھیں جبکہ چندو لال شاہ سیاہ رنگ کے موٹے تھے۔ گوہر کو اس وقت ہندوستان میں بڑے بڑے دولت مند بلکہ راجا مہاراجا بھی ہر قیمت پر اپنا چاہتے تھے مگر عشق نے اپنا کام کر دکھایا اور مس گوہر نے چندو لال شاہ جیسے سیاہ رنگ موٹے اور بھدے آدمی سے شادی کر لی۔ یار لوگوں نے اس پر کچھا۔

پہلے عورتیں لکھور خدا کی قدرت کا فقرہ بھی چست کیا تھا مگر ان دونوں کی شادی کامیابی سے جاری رہی۔

ماہنامہ منبر گزشت

اس فلم کبھی میں دونوں برابر کے حصے دار تھے اور مس گوہر کا حکم بھی چٹا تھا رنجیت مووی ٹیون اس اعتبار سے ایک کامیاب کبھی ثابت ہوئی۔ اس کبھی نے ہر ماہ ایک بنا کر پیش کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

مس گوہر نے بھی اس سال چھ فلموں میں کام کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد یہ شادی دونوں کے لیے بہت مہادک قرار دی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنجیت مووی ٹیون ایک بہت کامیاب ادارہ بن گیا جس نے ہر ماہ ایک فلم بنا کر بڑے بڑے نامور اداکاروں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مس گوہر اپنی پسند کے کرداروں میں اداکاری کرتی تھیں۔ دولت نور شہرت کی دیوی لنن دونوں پر بہت مہربان تھی۔ اس دوران میں مس گوہر دوسری کنبھوں کی فلموں میں بھی کام کر کے شہرت حاصل کرتی رہیں۔

1936ء میں جب ہندوستان کی پہلی بولتی فلم "عالم آرا" کی لائسنس ہوئی تو اس فلم نے دھوم مچادی۔ رنجیت مووی ٹیون کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔

1931ء میں رنجیت نے بھی بولتی فلم "دیوی دیوی پانی" بنا کر پیش کی جس نے کاسمیائی کے جینڈے گاڑ دیے۔ یہ ایک دھماکہ (ہندو مذہبی) فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار، چندو لال شاہ اور موسیقار اس زمانے کے مقبول ترین فنکار استاد جینڈے خاں تھے۔ یہ اس کبھی کی پہلی بولتی فلم تھی جو بے حد کامیاب رہی۔ اس زمانے میں چندو لال شاہ کو بھٹی کی فلم اٹھ مٹری میں بہت بلند مقام حاصل ہو گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ کسی بھی اداکار کی نگاہ سے بالا جا سکتے ہیں۔

1932ء میں مس گوہر نے تین فلموں میں کام کیا۔ یہ تینوں رنجیت مووی ٹیون کی فلمیں تھیں اور بے حد کامیاب ہوئی تھیں۔ رنجیت کی اکثر فلموں کے ہدایت کار چندو لال شاہ اور موسیقار استاد جینڈے خاں ہوا کرتے تھے۔ ان دونوں کے نام کا ڈکٹا کر رہا تھا۔ بھٹی فلمی صنعت کے باہمی جھگڑے طے کرنے کے لیے فلم ساز چندو لال شاہ کے پاس جاتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھٹی کی فلمی دنیا کے بادشاہ تھے تو غلط نہ ہوگا۔ مس گوہر کی خاموش فلم "دشا موٹی" میں مس گوہر نے بیک وقت تین کردار ادا کیے تھے۔ اس ہدایتکار نے اس نام سے اس فلم کو بولتی فلم بتایا اور وہ بھی بہت کامیاب ہوئی۔ کاسمیائی کی دیوی مس گوہر پر مہربان ہو گئی تھی۔ رنجیت مووی ٹیون سے وہ بے شمار دولت حاصل کر رہی تھیں اور فلموں میں ہواکاری کر کے بھی خوب دولت کمادی تھیں۔

چندو لال شاہ فلموں کی ہدایت کاری کرتے رہے مگر مس گوہر نے ان سے شادی کرنے کے بعد کسی اور فلم کی اور ہدایت کاری میں کام نہیں کیا۔ مس گوہر اب اداکاری کی بجائے فلمیں بنانے پر زیادہ دھیان دینے لگی تھیں۔ اس زمانے میں رنجیت مووی ٹیون ہندوستان کا سب سے بڑا فلم ساز ہو رہا تھا۔

چندو لال شاہ اب کروڑ پتی ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں کتنی کے لوگ ہی کروڑ پتی تھے۔ وہ مس گوہر کے لیے خاص طور پر کردار لکھواتے تھے اس لیے ہر فلم میں مرکزی کردار مس گوہر کا ہی ہوتا تھا۔

لیکن ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے اور فلمی صنعت میں تو لوگ راتوں رات دولت مند یا غریب ہو جاتے ہیں۔ رنجیت پر برادقت آیا تو کبھی کی فلمیں قلاب ہونے لگیں چونکہ بہت سے نئے اذہین اور اچھے ڈائریکٹر اور فلم ساز سامنے آ گئے تھے۔ ان دونوں چندو لال شاہ نے مس گوہر کے لیے خاص طور پر ایک کہانی تھوڑی اس فلم کا نام "دھموت" تھا۔ گوہر ہائی کے ساتھی موٹی لال، چارلی، منظر خان بھی اس فلم میں کام کر رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار گیلان دست تھے۔ مس گوہر کی لاجواب اداکاری نے سب کو چھلکا دیا۔ اس فلم کی موسیقی اور گانے بہت مقبول ہوئے تھے۔ چند گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

1۔ رنجیت راگھو راجا نام

2۔ اے بھٹی سے کو بیچان

3۔ دور و دوری درویش

4۔ نہیں بولوں لا کہ مٹائے۔

یہ فلم گہرائی زمان میں بھی بنائی گئی تھی۔

اس فلم کی بے پناہ کامیابی نے رنجیت فلم مووی ٹیون کو ایک نئی زندگی دے دی۔ اداکار کی حیثیت سے یہ مس گوہر کی آخری فلم تھی مگر یاد رکھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے جسم کی طرف توجہ دینا چھوڑ دیا اور مونا پال پر چڑھ گیا۔ مس گوہر اور مس سلو چٹا اپنے زمانے کی دو ہیرا پیر وکن تھیں اور لنن میں مقابلہ چاہتی رہتا تھا۔

ان کا سیلاب ٹھکری کے بعد رنجیت مووی ٹیون ایک بار مگر زوال کا شکار ہو گئی۔ چندو لال شاہ کا دیوالیہ لگ گیا اور وہ فرضوں کے بوجھ تلے دب گئے۔ حالات اتنے خراب ہوئے کہ چندو لال شاہ پیسے چھپے کو تاج ہو گئے۔ اور مس گوہر کو لوگ بھولی چکے تھے وہ لوگ جو دن رات ان کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



مقبولیت کے سائے نظر آئے تو علی اعجاز نے بہت رکھ رکھاؤ اور کچھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے ضلع داری کے ساتھ ظلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ قلموں میں نروال کے مسئلے کو انہوں نے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں بنایا نہ ہی اسے اپنی انا کا سوال بنایا۔ ایسے بڑی توازن، حقیقت پسندی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت بہت کم نوا کا مہیے ہیں۔

علی اعجاز نے شہرت تو مزاحیہ کرداروں کے طور پر حاصل کی مگر میری اداکاری رائے میں، وہ ایک بہت اچھے کیریئر اسٹار بکٹر ہیں اور ہر قسم کے کردار ادا کرنے پر قادر ہیں۔ مزاحیہ اداکاری میں وہ محض اچھے فنکاروں کے محتاج ہوتے ہیں جبکہ ان کے چہرے اور حرکات و سکنات سے مزاحیہ اداکاری کے لوازمات کے آثار نظر نہیں آتے۔ انہوں نے بعض قسموں میں کیریئر رول کیے ہیں اور بہت خوب کیے ہیں۔ دراصل ان کے پاس فنکاروں کی ہر جگہ اور وہ حاضر جوابی نہیں ہے جسے اس دور کے دوسرے مزاحیہ اداکاروں نے ایک ضرورت بنادیا تھا۔ انہیں ایک بہت اچھا اداکار کہا جاسکتا ہے۔ مزاحیہ اداکار کہا ان کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ ان دنوں ٹیلی ویژن ڈراموں میں بھی وہ مزاحیہ اداکاری کر رہے ہیں۔ بہتر ہو اگر وہ دوسرے اعزاز

خوشامد کرتے تھے اور ان کی جھلک دیکھنے کے لیے منتظر رہتے تھے اب ان سب نے منہ موڑ لیا۔

25 نومبر 1978ء کو چندوانی کا انتقال ہو تو ان کی غربت اور بے کسی کا یہ عالم تھا کہ کوئی فن کی آخری رسوم ادا کرنے والا نہ تھا ان کی لاش کو خاواہٹ قرار دے کر میونسپل کارپوریشن نے لٹکانے لگا دیا۔ اللہ اللہ ایسا عروج اور ایسا زوال خدا کسی کو نہ دکھائے۔ کسی فلم واسے کو ان کے مرنے کی خبر تک نہ ہوئی نہ کسی نے ان کی آخری رسوم میں شرکت کی۔ وہ شخص جو بھٹی کی فلمیں دنیا کا بادشاہ کہلاتا تھا تقیروں اور لادہروں کی طرح اپنی آخری منزل کو پہنچا۔ کس کو ہر بھی دنیا کی نظروں سے دور ہو چکی تھیں۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ دنیا کی چوٹاکی اور قدرت کی کرشمہ سازی کا نمونہ دیکھنا ہو تو یہ داستان پڑھیے اور صبر حاصل کیجئے۔

عروج کے بعد زوال تو دیکھ لیکن زوال کی یہ حد نہ دیکھی تھی۔

☆☆☆

اپنے عروج کے زمانے میں علی اعجاز نے اعتدال و توازن سے کام لیا اور کفایت شعاری سے آنے والے دنوں کے لیے پس انداز کرتے رہے۔ چنانچہ جب غیر

ملی نامہ سرگزشت

کے کرداروں کی طرف بھی متوجہ ہوں۔

علی اعجاز کو میں نے ابتدا سے انتہا تک (یعنی عروج و زوال) میں بھی کرکٹ کا ان کی عادت و اطوار میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ نہ سالوں سوچے نہ بھانپے ہرے ہر حال اور ہر موسم میں ایک جیسے۔ علی اعجاز نے میرے ساتھ بھی کام نہیں کیا۔ نہ میری ٹیم میں بھی کسی فلم میں ان کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن جب بھی ملے بہت اخلاق اور خوش مزاجی کے ساتھ ملے۔ ایک بار میری ایک فلم کے سلسلے میں ایک نئی کار کا ایکسیڈنٹ دکھانا مقصود تھا اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر میں نے پہلے تو ایک نئے مال کی ایکسیڈنٹ میں ٹوٹی پھوٹی کار تلاش کی جس میں شبنم اور شاہد کے ساتھ ایک منظر تھا یا گیا۔ یہ بہت ڈر لائی منظر تھا بلکہ فلم کا کانسپٹ ہی تھا۔ اب یہ تلاش ہوئی کہ اس مال کی ایک لارڈی کار کہاں سے اور کیسے حاصل کی جائے؟ ابھی ہم اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ علی اعجاز کی چٹکتی ہوئی سفید کار اندر داخل ہوئی اور وہ سفید لباس اور سفید پتلون میں ملبوس باہر نکلے۔ اسسٹنٹ نے دیکھتے ہی میرے کان میں کہا کہ اگر علی اعجاز کی کار ایک دن کے لیے مل جائے تو ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ علی اعجاز ایک سلیک اور مزاج پری کے بعد جا چکے تھے۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ان کے پاس بھیجا اور وہ یہ خبر لے کر آیا کہ علی اعجاز کی اس روز آؤٹ اور شوٹنگ ہے اور ظاہر ہے کہ انہیں بذات خود کار کی ضرورت پیش آئے گی مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ میری فلم کے لیے ان کی کار درکار ہے تو انہوں نے کار کی چابی میرے اسسٹنٹ کے حوالے کر دی اور خود سارا دن کرائے کی ٹیکسی میں گھومتے رہے۔ ان کے اس برتاؤ کی وجہ سے میں ان کے حسن اخلاق کا قائل ہو گیا اور ساری زندگی یہ واقعہ میں فراموش نہیں کر سکوں گا۔ ان کی کار مل جانے کی وجہ سے ہماری فلم کے کانسپٹ کے مناظر انتہائی پُر اثر اور حقیقت سے قریب ہو گئے۔ شبنم اور شاہد کے علاوہ تھا اور تمنا نے بھی اس فلم میں کام کیا تھا۔ فیلی ورجن کے اداکار انور اقبال کو میں نے پہلی بار اس فلم میں شاہد اور شبنم کے ساتھ ایک مرکزی کردار میں کاسٹ کیا تھا۔ گودارہ والا ٹیم کی بھائی ماشی نے بھی اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ معاشرتی اور دھماکی فلم تھی۔

بھوسوں کے ڈبوں میں بددیوانگی۔

انور اقبال تو بعد میں فلموں میں نمودار ہوئے مگر ماشی کی شادی ہو گئی اور وہ فلمی دنیا سے دور ہو گئے۔

مزاحیہ اداکاروں میں اچھے اور باصلاحیت اداکاروں کی تعداد زیادہ ہے۔ چند مزاحیہ اداکار کچھلے چند سالوں میں بھارتی فلمی صنعت میں بھی خاصے کامیاب رہے لیکن ان کی بھارتی فلمیں اپنے اسٹائل تک ہی محدود رہی۔ مثلاً جانی واکر کا ایک مخصوص انداز تھا مٹھری اور نمود کا اداکاری کا اسٹائل مختلف تھا۔ جگہ جگہ، امراتی علیحدہ انداز سے اداکاری کرتے تھے۔ آغا اور ادم پرکاش کا انداز جدا تھا۔ لیکن ان اداکاروں میں وہ لڑکتا، حاضر جوابی اور برچھنگی فلمیں تھیں جو پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کے حصے میں آئی۔ پاکستان کے مزاحیہ اداکار کسی ایک مخصوص انداز کے پابند نہیں رہے۔ تاثرات کے علاوہ فنروں کی افانگی اور فخر بازی میں بھی انہیں مہارت حاصل رہی ہے۔ جوان کے بھارتی ہم عصروں کے حصے میں نہیں آئی۔ اس اعتبار سے دیکھنا جائے تو قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کا اعتبار بھارتی اداکاروں کے مقابلے میں کھلے بہتر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی فلمی صنعت میں گزشتہ چالیس سالوں میں خالص مزاحیہ فلمیں بنانے کا رجحان بالکل ختم ہو کر رہ گیا حالانکہ کسی زمانے میں وہاں مزاحیہ اداکاروں کو مرکز کی کردار بنا کر خالص مزاحیہ بنانے کا رویہ تھا۔ چارلی فورڈی ڈکشن کی کامیاب مزاحیہ فلموں کے ہیرو رہے ہیں خصوصاً چارلی نے تو اپنے عروج کے زمانے میں کئی ایسی فلموں میں کام کیا جن میں ان کے سوا کوئی دوسرا ہیرو ہی نہیں تھا۔ یہ فلمیں اپنے طرز و مزاج اور چارلی کی اداکاری کی بنا پر بہت کامیاب رہیں لیکن گزشتہ دہائیوں کے دور ان میں یہ رویہ آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہ گیا اور مزاحیہ اداکار اپنے مخصوص گئے بندھے کرداروں تک محدود ہو کر رہ گئے اس کے برعکس پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کے نمایاں کرداروں کے باعث فلمی فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور پھر جب منور ظریف، تنہا درگیا، علی اعجاز جیسے اداکار میر آئے تو خالص مزاحیہ فلمیں بھی بنائی گئیں اور بہت کامیاب رہیں۔ شروع میں یہ گروہ شایب کیرانوی مرحوم نے کیا۔ منور ظریف اور درگیا کے کرداروں پر جی ان کی فلمیں بہت کامیاب ہوئیں اور ان کی بدیہیادگی دوسرے فلم سالوں نے جس مزاج اور سوچ پر چوکی جو ضرورت ہوتی ہے وہ ہر ایک کے حصے میں نہیں آتی تھی اس



ان کا رعلی اجار



ان کا رعلی اجار

پاکستان کے مزاحیہ اداکاروں کے بارے میں تذکرہ ہانگل نامعلوم ہوگا اگر دیکھنا کا نام نہ لیا جائے۔ مزاحیہ اداکاروں کی ہمارے کسی صنعت میں کوئی جگہ نہیں رہی لیکن دیکھنا جیسی شخصیت قدرے منفرد اور مختلف ہے۔ دیکھنا اپنی شکل و صورت اور عادت و اطوار کی طرح تکنیکی صلاحیتوں میں بھی دوسروں سے مختلف تھے۔ وہ محض کامیڈین ہی نہیں بلکہ گونا گوں صلاحیتوں کے حامل بھی تھے اور انہوں نے ان جنم شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ مثلاً کامیڈی تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بہت حوصلہ مند فلم ساز بھی رہے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہدایت کار بھی تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بعض فلمیں ہدایت کاری کے اعتبار سے نہ صرف بہت کامیاب بلکہ میا داری بھی ثابت ہوئی ہیں۔ ان کی تکنیکی صلاحیتیں صرف یہیں تک محدود نہ ہیں بلکہ انہوں نے گلوکاری کے میدان میں بھی قدم رکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بہت مقبول گیت بھی گائے۔ پھر وہ موسیقی ترتیب دینے کی طرف متوجہ ہوئے اور بہت اچھی دھنیں ترتیب دیں۔ وہ اپنی فلموں کی کہانیاں بھی لکھتے رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ہمیشہ دیکھنا کا محترم رہا ہوں حالانکہ ہمارے معاشرے میں اور خصوصاً تعلیم یافتہ اور دانشور طبقے میں دیکھنا جیسے کم تعلیم یافتہ اور غریب آدمی کی تعریف کرنا ایک آلت کو دعوت دینے کے مترادف ہے لیکن میں نے ہمیشہ ان کی صحت اور قابلیت کا اعتراف کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اگر دیکھنا کسی ترقی یافتہ مغربی ممالک میں ہوتے اور انہیں بہتر ماحولی، بہتر سماجی ماحول آتے تو ان کی دولت اور

لیے دوسرے لوگوں کے تجربے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ پھر تشدد اور قتل و غارت کی فلموں کا دور شروع ہوا تو رفتہ رفتہ ان فلموں سے مزاحیہ اداکار کا کردار بھی خارج ہو گیا۔ ایک زمانے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بھارت اور پاکستان میں مزاحیہ اداکاروں کی شمولیت کے بغیر بھی فلمیں بنائی جاسکتی ہیں کیونکہ ہمارے گانے کی طرح کامیڈی بھی ایک کامیاب قسم کا لازمی حصہ قرار دی جاتی تھی مگر کثرت و غارت کے دور و شور میں مزاح کی گردن پر چھری پھیر دی گئی اور فلموں میں سے مزاح کا عنصر بالکل قائب ہو گیا لیکن اس اثنا میں ایک ایسا دور بھی آیا جب دیکھنا اور علی اعجاز کی مزاحیہ فلمیں کامیاب ہونے لگیں اور بہت سے فلم ساز اس راستے پر چل نکلے لیکن ایک تو ان سب فلموں میں بہت زیادہ یکسانیت تھی دوسرے ہر چیز کی کثرت سے بھی کشائی آکنا جاتے ہیں اس لیے یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں رہا لیکن اس میں مزاحیہ اداکاروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لکھنے والے اور ہدایت کار اس کے ذمہ دار تھے ظاہر ہے کہ جب تک مزاحیہ فلم میں قصیم، کردار نگاری اور مناسب پکیشن نہیں ہوگی، فلم کی کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے مزاحیہ فلموں کے لیے ذہانت اور حس مزاح کی موجودگی بہت ضروری ہے جو کہ اکثر فلموں میں پایہ نہیں چنانچہ یکے بعد دیگرے کامیڈی فلمیں فلاب ہونے لگیں اور حسب معمول فلم سازوں نے اس کی ذمہ داری بھی تماشاچیوں کے گردے ہوئے ذاتی براہی دی حالانکہ بے چارے فلم بین اس معاملے میں بھی ہانگل بے قصور تھے۔

شہرت میں مزید اضافہ ہوتا اور وہ بھی قسم کی تاریخ میں چارلی چپلن کی طرح کہیں نہ کہیں اپنا نام ضرور لکھو بیچے۔ چارلی چپلن اور ریگلا میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ چارلی چپلن کا بچپن محسوس میں گزرا وہ تعلیم حاصل نہیں کر پائے۔ ان کی والدہ کیلج کی اداکارہ تھیں اور چارلی چپلن نے ان سے لوکل مری سے بہت کچھ سیکھا۔ مگر ان کی اصل درس گاہ زندگی کا اسکول تھا۔ پھر انھیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور کامیابی حاصل ہوئی تو امریکی معاشرے نے ان کی تعریف و توصیف اور بہت افزائی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ سرمایہ کاروں نے انھیں سرمایہ فراہم کرنے کے لیے کسی بل سے کام نہیں لیا اور انہوں نے بہت فراغت اور آسودگی کے عالم میں انھیں بنائیں۔ داد پائی اور اپنی لاپت اور خدا داد قابلیت کی بنا پر دنیا بھر میں ان کی تعداد منزلت کی گئی۔ بڑے بڑے دانشور سیاست دان اور حکمران ان کے مداح تھے اور ان کے ساتھ ملتا ہے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ جب ایسے سوانح ایسا ماحول اور سہولتیں میسر ہوئی تو نام صرف پرستش ممکن کیوں نہ ہوتا۔ لیکن ریگلا کو اس کے برعکس حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ آئے ذرا ریگلا کے حالات زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی کامیابیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ریگلا کا اصلی نام سعید خان ہے۔ وہ ایک پشمان تھے بچپن ہی سے انہوں نے اداکاری کے جنون میں گمراہ چھوڑ کر دیانے کا راز کار رخ کیا اور اپنی جنگ کا آغاز کر دیا۔ ریگلا صحیح معنوں میں ایک سیلف میڈ انسان تھے حقیقت یہ ہے کہ انھیں آگے بڑھانے کے لیے ان کی صلاحیتوں کا احساس کر کے انھیں مناسب موقع فراہم کرنے کے لیے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ وہ محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور جدوجہد کی بنا پر آگے بڑھے ہیں۔ حوصلہ افزائی تو ایک طرف انھیں مذہنی اور تعلیمی کا لٹ نہ بنایا جاتا تھا۔ یہ مناظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ مگر سے لاہور پہنچ کر ریگلا نے تدریس و تلمذ ہونٹوں میں کام کاج شروع کر دیا۔ گا کہوں کو چائے کھانا پینا برتن دھونا اور دات گئے وہیں کسی ٹیڑھے پر پڑ کر سو جاتا یہ ان کی زندگی کا معمول تھا ان کی فکل و صورت ہمیشہ لوگوں کے لیے ملحق کا موضوع بنی رہی لیکن یہ بھی قدردان کی ستم ظریفی ہے کہ یہی فکل و صورت فلموں میں ان کی ابتدائی کامیابیوں کا سبب رہی ہے۔

☆☆☆

شوکت رحمان ٹکک کا پٹارہ سے ایک خط اس میں

آپ کو بہت سی معلومات حاصل ہوئی گی۔

1956ء کا زمانہ تھا اس راتم اسلام آباد اسکول پٹارہ میں جماعت ہفتم کا طالب علم تھا۔ عزیز تبسم، نعمت سرحدی میرے کلاس فیلو تھے ان سے میری بہت اچھی دوستی تھی۔ ان دوستوں نے فلم انڈسٹری میں مقام پیدا کیا۔ عزیز تبسم کراچی میں وحید مراد کے فلسفہ ادارے "فلمز آرٹس" میں ملازم تھے۔ خط کے ذریعے مجھے فلم انڈسٹری کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ جب پرویز ملک "فلمز آرٹس" سے منسلک ہوئے تو وحید مراد نے فلم "ہیرا اور تھر" کا آغاز کیا۔ پرویز ملک اس فلم کے ڈائریکٹر اور عزیز تبسم ان کے اسٹنٹ مقرر ہوئے۔ بدر منیر اور نعمت سرحدی بھی اس ادارے سے منسلک تھے۔ وحید مراد کی بطور فلم ساز "انسان بدلتا ہے" "جب سے دیکھا ہے نہیں" ان دونوں فلموں میں کمال نے مرکزی کردار ادا کیے۔ سنٹوش کمار نے "دامن" اور ایس ایف یوسف نے "کولڈ" میں وحید مراد کو چھوٹے مگر اہم کرداروں کے لیے منتخب کیا۔ اس سے انھیں حوصلہ ملا اور انہوں نے اپنی اپنی فلم "ہیرا اور تھر" میں بطور ہیرا خود کو متعارف کرایا۔ وحید مراد کی پہلی فلم کامیاب رہی اور دوسری فلم "امان" نے تو انھیں مقبولیت کی بلند چوٹی پر پہنچا دیا۔

دوسری جانب عزیز تبسم، نعمت سرحدی اور بدر منیر بھی فلمی دنیا میں آگے بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عزیز تبسم سے میری خط و کتابت جاری تھی 1967ء میں عزیز تبسم نے مجھے وحید مراد کے فلمی ادارے "فلمز آرٹس" کے لیٹرینڈ پر ایک خط لکھا "میں پاکستان میں پشتو کی پہلی فلم بنانا چاہتا ہوں، میرے پاس سرمائے کی قلت ہے مگر تم اس فلم میں ساٹھ ہزار روپے کا سرمایہ لگاؤ تو بطور فلسفہ میں انڈسٹری میں متعارف ہو جاؤں گا۔ فلم کامیاب ہونے کی صورت میں وارے غار سے ہو جائیں گے مگر میں نے عزیز تبسم کی پیشکش کو قبول نہیں کیا کیونکہ میں گرم زمیں پر پاؤں نہیں رکھنا چاہتا تھا اور نقد پر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر فلم نکل ہوگی تو میرا سارا سرمایہ ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ میری جانب سے ناامید ہونے کے بعد عزیز تبسم کے دوستوں نے فلسفہ سازی کے لیے ہائی بھری جن میں عکاس، نذیر حسین، عکاس، علی مدین اور لیہا ڈیڑی و نیا راج شتیج جانی شامل تھے۔ عزیز تبسم اس فلم کے ڈائریکٹر منتخب ہوئے، وہ ایک تعلیم یافتہ، خوش اخلاق اور مہذب انسان تھے۔ موسیقار ول محمد اقبال کی یہ پہلی پشتو فلم تھی۔

کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد انہیں مذہبی تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہاں تھے۔ اسی سوچ کے تحت انہیں اپنے ایک عالم دوست کے پاس چار سو روپے کے ایک گاؤں بھیجا۔ اس شخص نے بدرخیز کی ڈیوٹی گھروں سے دہلیفہ یعنی سالن روٹی منگوانے کے لیے لگا دی۔ بدرخیز گھروں کے باہر ایک مخصوص آواز نکالتا۔ "دہلیفہ" چوتھو زبان میں امدادی کھانے کو کہتے ہیں۔

بدرخیز اس کام کو عار سمجھتا اور ایک دن صبح سویرے چار سو روپے سے بھاگ نکلا۔ چنانچہ درجہ والی بس میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے لگا کہ کٹھ پکڑنے بہت برا بھلا کیا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک سفر کر رہا تھا اس نے اپنی جیب سے اس کے ٹکٹ کی ادائیگی کی اس نے انہیں اپنے ہوٹل میں برتن دھونے کی نوکری دی۔ یہ پشاور کے قریب سڑک کے کنارے ایک پُر روٹی ہوٹل تھا۔ جہاں کھانے پینے کے لیے مسافر آتے۔ بدرخیز برتن دھونے کے ساتھ ترقی کر کے دیگر بن گیا ہوٹل میں آئے چند لوگوں سے شناسائی ہوئی جو دہلیفہ کا پروگرام بنا رہے تھے بدرخیز نے ان سے کہا۔ "میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ دہلیفہ جانا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس پیسوں کا کیا ہے۔" "او لوگ بہت رحم دل تھے۔ بدرخیز اپنے استاد سے اجازت لیے بغیر ان کے ساتھ فائز سفر ہوا۔ بدرخیز کی یہ داستان آجندہ کی نشست میں نکلے گی۔

بدرخیز نے عملی زندگی کا آغاز کراچی کی سڑکوں پر ایک رکشا ڈرائیور کی حیثیت سے کیا۔ یہ 1960ء کا عشرہ تھا۔ وحید مراد انگریزی لٹریچر میں ایم اے کرنے کے بعد اپنے والد غلام مراد کے تقسیم کار ادارے میں کام کا تجربہ حاصل کر رہے تھے۔ ان کے دوست پرویز ملک امریکا سے فلموں کا تجربہ لے کر لوٹے تو وحید مراد نے فلم "ہیرا اور تاج" بنانے کا اعلان کیا۔ وہاں سے ان کی کامیابیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ کراچی میں قیام کے دور میں بدرخیز کو فلمیں



ہیرائن کے لیے پانچھن خان کو منتخب کیا گیا جو اس زمانے میں ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں ہلورا ایکسٹرا کام کر رہی تھی، نعمت سرحدی کو فلم کا ولن منتخب کیا گیا جو اس سے پہلے فلموں میں ڈوہلیفٹ کیا کرتے تھے۔ نعمت سرحدی نے جہاں تر وہاں ہم، کے لیے بھی ڈوہلیفٹ کیا تھا۔ پشاور سے ریلوے پاکستان کے مشہور گلوکار جدایت اللہ کو گانوں کے لیے بلا دیا گیا جو گلوکار محمد رفیع کے انداز میں گاتے تھے۔ ہیرا کے لیے قمرہ نال بدرخیز کے نام لکھا جو ان دنوں کراچی میں رکشا چلاتا تھا۔ کبھی کبھار سڑکوں پر ہوائی چیل فروخت کرتا۔ وحید مراد کے دفتر میں بطور چیز اس کا نام تھا اور فلموں

میں معمولی کردار ادا کرتا تھا جن میں "روڈ نو سوٹ، جاگ اٹھا انسان، ہیرا اور تاج، میں بطور ایکسٹرا کام کیا۔" یوسف خان شیر بالو کی کامیابی کے بعد عزیز مجسم کی دوسری فلم "آدم خاں در خانی" کا ہیرا بدرخیز تھا اور فلم کی ہیروئن پانچھن خان تھیں۔ کراچی میں فلم نمائش کے لیے پیش ہوئی تو گانوں کی وجہ سے نرم چار دی گئی۔ پروگرام کے مطابق ڈائریکٹر عزیز مجسم، بدرخیز نعمت سرحدی چنانچہ آتے اور اس فلم میں "ہیرا" نے بیک سکرنگنگ ٹیم کے تین مشہور ریلوے گانوں کو فلم میں شامل کرنے کی غرض سے بول جانے کا پروگرام بنایا جہاں وہ وہاں پڑ پڑیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گیا۔ گھنار مجسم کو چوتھوں کی لڑکھالی مل گئی۔

عزیز مجسم نے پشاور اور لاہور پنجابی کی کئی مشہور فلمیں بنائیں، ان کی تعداد 35 سے زائد ہیں۔ 1971ء سے لے کر پہاڑی تک بدرخیز اکثر پشاور آتے جس ہوٹل میں ان کا قیام ہوتا، مجھے یاد ہے کہ وہاں کے اکثر ڈیپٹر ان سے میری ملاقات ہوئی، میں پرنسٹن فوٹو گرافر تھا۔ میں نے اس کے کئی انٹرویوز مقابلی اخبارات اور رسائل کے لیے کیے۔ پشاور ریلوے اسٹیشن کے لیے بدرخیز کا انٹرویو لیا جہاں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں کو ماہنامہ سرگزشت کے خصوصی ایڈیٹور کے برستادوں کے لیے سبکی سربہ پیش کر دیا ہوں۔ بدرخیز ان کا اصلی نام ہے۔ 1942ء کے لگ بھگ سوات کے سیاسی مقام مدین کے نواحی گاؤں شاگرام میں مولوی یاقوت خان

دیکھنے کی نیت چمکی تھی۔ جو بعد میں ظہیر با کے مرض کی صورت اختیار کر گئی۔ وحید مراد کے ہاں جانے کے لیے رکشا پر باندھی تھی۔ چنانچہ بدر خیر نے رکشا چھوڑ کر وحید مراد کے دفتر میں چائے لانے کے لیے چڑ اسی کے ساتھ ساتھ ڈرائیور کی ملازمت کر لی۔ 1966ء میں وحید مراد کی فلم "انسان" سپر ہٹ ہوئی تو جشن کامیابی کے بعد بدر خیر نے وحید مراد کو اپنے فلمی شوق سے آگاہ کیا۔ وحید مراد نے بدر خیر کو "جہاں تم وہاں ہم" میں چھوٹا سا کردہر دیا اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب وحید مراد کی ٹاکامیوں کا دور شروع ہوا تو بدر خیر نے اپنی فلم "پختون" پر ولایت کتبے "پنجابن ولایت میں" ایک اہم کردہر دیا جو وحید مراد نے قبول کر لیا۔

1970ء میں دولت و شہرت کا دلیلی بدر خیر پر مہربان ہو گئی۔ یاسمین خان کے ساتھ بدر خیر کی پہلی پشتو فلم "یوسف خان شیراز" منظر عام پر آئی جو دونوں کے لیے نیک قل ثابت ہوئی۔ اس معروف لوک داستان کے میں برس بعد تک بدر خیر اور یاسمین خان کی فلمی جوڑی پشتو کے باغیرین سے داد وصول کرتی رہی۔ دو دہائیوں پر مبنی عمر سے میں اس جوڑی نے ستر سے زائد فلموں میں کام کیا۔ بدر خیر کی پشتو فلموں کی ہیروئنوں میں ثریا خان، شہناز، مسرت شاہین، خانم، نجم، وحیدہ جتن، ناز، ممتاز اور فی شامل تھیں۔ اردو فلموں میں نشو، نلی، ہارمہ شریف، دیبا، چکھری اور رومی ہانو کے ساتھ بطور ہیرو اداکاری کے جوہر دکھائے۔ بدر خیر نے پشتو کے علاوہ پنجاب، کے قریب اردو فلموں میں بھی کام کیا۔ پنجابی فلموں میں اپنے لہجے کی وجہ سے کام کرنے سے گریز ان تھے لیکن اس کے باوجود کئی فلمسازوں نے انہیں پنجابی فلموں میں سائن کیا۔ بدر خیر کی یادگار فلموں میں یوسف خان شیراز، ماما، دم خاں، درختی، اور علی، کرتار، میر نے دور، لو پک، ڈاکا، لون، دو، پشتون نشان، رولنج، خانگانی بد معاش، پڑا نگ، اقرار، جشن، ہاڑی گارڈ اور مسافر کے علاوہ ٹیکڑوں، بگر فلمیں ہیں۔ ان بڑے ہونے کے باوجود بطور کہانی نویس انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ وہ ایک درویش صفت انسان تھے۔

بدر خیر کو بہترین کارکردگی پر آنرڈ ٹکڑ کر بجوٹ دلور جہان، بولان اور دیگر ایوارڈ ملے۔ بدر خیر کی پہلی پنجابی فلم "تمیں ہاڑو" قلمی فن کی مشہور اردو فلموں میں "جہاں برف گرئی ہے" لیکن ایک رات کی مددنی اور جی شامل ہے۔ پشتو فلم دیدن، میں بدر خیر نے اندھے کا کردہر بڑی خوبی سے ادا

کیا۔ بدر خیر کو فن کی زندگی میں پشتو فلموں کے ویسپ کلہر کا خطاب دیا گیا لیکن اکثر کہتے ہیں پشتو فلموں کا بدر خیر ہوں۔ بدر خیر نے مشہور کہانی نویس پولس قیاس کی پانچ فلموں میں کام کیا جن میں دیدن، ہائی، اور تاج، ہاڑو شہناز، خطرناک قیدی شامل ہیں۔ بدر خیر کا عام پرائیڈ آف پرفارمنس کے لیے سال 2008 میں منتخب ہوا۔ زندگی میں تو وہ بہ اولڈ حاصل نہ کر سکے لیکن 23 مارچ 2009ء کو حسن کارکردگی کا ایوارڈ ان کے لواحقین نے وصول کیا۔

بدر خیر کے نام سے ملک کے اکثر شہروں میں بدر خیر لیڈریشن قائم ہیں۔ بدر خیر نے جانیٹاریم خان کے ساتھ شہناز، شیر شاہ، بد معاشی نہ منم، فلم وکلا شکوف، غلام، خانگانی بد معاش، جتن خیلہ، جشن، ہاڑی گارڈ، میں کام کیا۔ بدر خیر کی فلموں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان کا نام بینشریک میں شامل ہے۔ بطور ہیرو 435 ٹیکل کردہ 160 اور 67 فلموں میں مرکزی کردہر ادا کیے۔

25 فلموں میں مہمان اداکار آئے۔ ہاون سینما اسکوپ اور 54 بلیک اینڈ وائٹ فلمیں شامل تھیں۔ 402 پشتو، 31 پنجابی اور ایک انگریزی فلم میں بھی کام کیا۔ بدر خیر نے 33 سال فلم انڈسٹری پر راج کیا۔ کچھ سنوں میں وہ پشتو فلموں کے بے حد بادشاہ تھے۔ بدر خیر نے ابتدا میں کراچی کی آٹھ فلموں میں کام کیا۔ ان کی فلم "اور علی" چار کے باز سینما میں ساڑھے تین سال ملتی رہی۔ دیگر فلموں میں کوچہ ان، دہان، نوے وی، چنے کا مہابی کے ریکارڈ ٹوڑے۔ دیدن نے پشاور میں دو مرتبہ واٹمنڈ جولی کی۔ ہاڑو شہناز نے بھی دو مرتبہ واٹمنڈ جولی جیتی۔ ان کی دیگر فلموں میں زندان، الکر، ڈوڈو، ہاڑی، چھہ الزام، بھہ، سے بدوئی کپڑا اور مکان شامل ہیں۔ لیونٹی ان کی آخری فلم ہے۔ کامیاب رہی۔ پشتو فلم مسافر میں ان کے بیٹے دلیر خیر نے ہیرو جبکہ بدر خیر نے مہمان اداکار کا کردہر ادا کیا۔ وہ اپنی فلموں میں دل دہانے والے خطرناک مناظر خود قلمارتے تھے۔ اداکار اور فلمی کے ساتھ بچہ داوے، میں ہیرو آئے اس فلم نے گولڈن جولی جیتی۔ بدر خیر چار سال سے قاتل کے مرض میں مبتلا تھے۔ مرنے سے دو روز پہلے چھاتی میں شدید درد اور کچھروں میں پانی جمع ہونے لگا۔ انہیں احق اسپتال لاہور میں داخل کیا گیا مگر بد قسمتی سے ہاتھ نہ ہو سکے۔ مرتے وقت ان کی عمر 67 سال تھی۔

جاری ہے

ہی ایک نو فخر لڑکی ڈپریشن میں جھکا ہوئی تو اس نے سناپ اور چپکلیاں پالنا شروع کر دیں۔ جب اس کے ڈپریشن میں اضافہ ہوا تو اس نے ہر سائز کے چاقو جمع کرنا شروع کر دیے۔ ایک چاقو سے اس نے اپنے چہرے کو زخمی بھی کر

ڈپریشن سے تو آپ واقف ہی ہوں گے اسے چلی پھرانگ بھی کہتے ہیں۔ اس پھسانگ میں کوئی شخص اسی وقت جھکا ہوا ہے جب وہ کسی زبردست صدمے سے دوچار ہو اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہو۔ ایسی



ڈپریشن سائونڈ

شکیل اندریس

زندگی اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن چکی تھی۔ مصائب و آلام اس کی زندگی کا حصہ بن کر اسے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ پیار کے لیے فریستی تھی مگر نہ اسے باپ کا پیار مل رہا تھا اور نہ ماں اسے پیار دے پا رہی تھی۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب اس پر قسمت کی کرم فرمائی ہوئی اور وہ پوری دنیا کی چھینی بن گئی۔ دولت گویا ہر سونے لگی، تب اس نے اپنی اس کمی کو جیسے وہ قاصر محسوس کرتی رہی پورا کرنے کے لیے انسانیت کی خدمت پر آمادہ ہو گئی اور آج وہ یو این او کی جانی مانی سفیر ہے۔

ہالی وڈ کی ایک مشہور اداکارہ کا تذکرہ

لیا۔ اپنی زندگی سے مایوسی اور دنیائے رنگ و بوسے گریز کی انتہائی کمی کہ اس نے ایک اجرتی قاتل کو معاوضہ ادا کیا کہ وہ مناسب موقع دیکھ کر اسے قتل کر دے!

وہ قاتل بدوم تھا کہ معاوضہ وصول کرنے کے بعد بھی اسے قتل نہ کر سکا۔ اس کا دل اسے موت کے منہ میں پہنچانے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ وہ اس شیر سے ہی اپنا بدویا پٹ کر فرار ہو گیا جہاں کہ وہ رہتی تھی۔

والی بستی میں جلا ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اداکار باپ نے اس کی اداکارہ ماں کو طلاق دے دی تھی۔ اسے باپ سے نفرت ہوئی۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب شہرت کی دیوی نے اس کے قدم چوم لیے اور اسے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن اور آنکھوں کی ٹھنک بٹھوایا۔

مایوسی سے اپنی زندگی کا آغاز کرنے والی اس دوشیزہ کا نام انجلیکا جولی واہٹ ہے۔ وہ 4 جون 1975 کو کیلیفورنیا، اس کیس میں پیدا ہوئی۔ جولی کا مطلب فرانسیسی میں دل کش ہے۔۔۔ وہ فلم اداکار جان واہٹ اور ہارلیٹن ہارلیٹ کی بیٹی ہے۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے جس کا نام جیمز ایون ہے۔ اس کی رگوں میں بھی اپنے ماں باپ کا سچا خون دوڑ رہا ہے اس لیے اسے بھی اداکاری اور ہدایت کاری کا شوق ہے۔ اس کا خاندان کی بڑی میوں سے امریکن ہے۔ موروثی طور پر اس کا تعلق ہروڈن نامی ایک خاتون سے ہے جو 1649ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جیمز اور ماں لرائیسی تھی۔ وہ انڈیانا چپ ٹیلر کی بیٹی ہے۔

اس کا باپ جان ہلی ووڈ کا نام دور اداکار تھا۔ جس کی شہرت چہار دہائی عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس کی فلموں میں 'لڈجٹ کا ڈیوائس' 'ڈیوڈس اور ہوم ٹنگ' 'جیسی شہرہ آفاق فلمیں شامل ہیں۔ آخر لڈکر فلم میں اسے آسکر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ویسے وہ زیادہ تر کاڈیوائس فلموں میں کام کر چکا تھا جس کا مورث اعلیٰ جان وین تھا۔ جان وین پیدا انھی اداکار تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لکی بال والے پتول کے ساتھ بیٹ لگائے پیدا ہوا تھا اور پیدائش کے وقت سے ہی گھوڑے پر ڈھٹا سیکھ گیا تھا۔

1987ء میں انجلیکا کے باپ نے جب اس کی ماں سے طلاق کا فیصلہ کر لیا تو انجلیکا اور اس کا بھائی بے سہارا ہو گئے۔ ان کے پاؤں کتے سے زمین ٹکل گئی۔ انہوں نے اپنی ماں کے ساتھ رہنے کو فوقیت دی۔ اس لیے کہ ماں کو بھی

اس سانحے کا گہرا صدمہ تھا۔ بچوں کی خاطر اس کی ماں نے ایک فلم ساز مل ڈے سے دوسری شادی کر لی۔ اس کی ماں خود بھی اداکارہ تھی لیکن اس نے بچوں کی پرورش کی خاطر اس بچے کو ترک کر دیا۔ گھریلو ماحول چرکے بھی تھا اس لیے انجلیکا بھی قدرتی طور پر اس سے متاثر ہو گئی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کمپین دیکھا کرتی تھی مگر ان فلموں سے صرف مخلوط ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا باپ اداکار تھا لیکن وہ اس کی قدر و منزلت سے متاثر نہیں تھی، نہ اس سے متاثر کہ وہ آسکر ایوارڈ یافتہ ہے۔ بلکہ اداکاری سیکھنے کا جذبہ اس کے دل میں از خود پیدا ہوا تھا۔

اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بتایا کہ جب اس کی عمر چھ برس تھی تو اس کی ماں اور سوتیلی باپ مل ڈے اپنے خاندان سمیت نیو یارک چلے گئے۔ اس کے پانچ سال بعد وہ اس کی بیس دایس آگئے۔

اسے اپنا بچپن بخوبی یاد ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے 'اسٹار ٹریک' کی فلمیں پسند تھیں۔ اسے گھریلو پالتو جانوروں سے محبت تھی۔ خاص طور پر وہ سانپ اور چھپکلیاں پالا کرتی تھی۔ اس کا پسندیدہ سانپ ہیری ڈین اسٹین اور پسندیدہ چھپکلی والٹا میری۔ (چنانچہ جب اس نے فلم 'ایکویز جیمز' کام کیا تو اسے سانپوں کے ساتھ شوٹنگ کرتے ہوئے قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔ وہ ایسا کردہ چیزوں سے مانوس جو ہو چکی تھی) اسے دوسرے بچوں کی طرح وارنٹ ڈرنی کا کارٹون کردار ڈیٹنگ ڈیو یعنی اڑنے والا ہاتھی پسند تھا۔ وہ روتی جیتی تھی کہ ہاتھی اڑتا کیوں نہیں ہے؟ اسے چھکدار اور بھڑکنے پھڑکنے پڑے پسند تھے۔ اس کے علاوہ اسے موت کی سائنس گاہ، یعنی نقش خانہ بہت پسند تھا۔ وہ ٹکٹوں وہاں وقت گزارا کرتی تھی۔ لاشوں سے اس نے کیا کچھ کتاب کیا، اس راز سے اس نے ابھی تک پردہ نہیں اٹھایا۔ لیکن ہے اس کا سبب ڈپریشن ہو۔

اس کے خاندان کے سربراہ (گالا فادر) اسے سائل کر رہے ہیں ایک گڑیا تھے میں دبا کرتے تھے۔ یہ تھوڑے انہوں نے پہلی سال گرہ سے لے کر سولہویں سال گرہ تک دیا۔ بعض اوقات یہ گڑیا ماڈرن ہوتی تھی اور کبھی کبھار بلیسٹک کی۔ کبھی گڑیا بے حد قیمتی ہوتی اور کبھی لکڑی یا پورسلین کی بنی ہوتی۔

چودہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ اس عمر میں ایک

تو کے ایجنوں سے اس کی دوستی ہو گئی۔ جیسا کہ اس عمر میں
 تعلیمی مشق سے وہ ایجنوں کے ساتھ زندگی گزارنے
 اور دنیا کے آخری کونے تک جانے کو تیار تھی۔ پانی دنیا کو اس
 نے لٹ مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ گھر چھوڑ
 دیتی۔ اس کی ماں نے کہا اس کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ
 وہ اسے ایک مکان کرائے پر لے کر دے، لہذا وہ چاہے تو
 اپنے پورے فریڈ ایجنوں کے ساتھ اسی مکان میں، اسی
 چھت کے نیچے رہ سکتی ہے۔

انجلیا کو یہ بات پسند آئی۔ وہ دوسرے کمرے میں
 اپنے پورے فریڈ کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کا کہنا ہے کہ اس
 کی حکمت عملی سے دو فائدے ہوئے کہ میں ان کی نظروں
 کے سامنے تھی اور دوسرے یہ کہ میں نے اپنے اسکول کا
 کوئی نامہ نہیں کیا۔ اسی پابندی سے اسکول جاتی رہی اور
 نصابی تعلیم حاصل کرتی رہی۔

اسکول کی تعلیم ختم ہونے پر انجلیا نے اداکارہ بننے کا
 فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے خطہ کر کے لی
 اسٹریٹ پر گ۔ اسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے لیا۔ اس اسٹی
 ٹیوٹ میں اس نے دو برس تک اداکاری کی تربیت حاصل
 کی۔ اس کے بعد اس نے ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ اس کی
 خوب صورتی دیکھ کر ہر ہدایت کار اسے کوئی چھوٹا موٹا کردار
 دے دیا کرتا تھا۔ اسکول کا ریلوے اسٹیشن والوں کے لیے قافلہ
 قبول تھا۔ ایسی لڑکیوں کے لیے ان کے دروازے ہر وقت
 کھلے رہتے ہیں جن کے جسم پر زیادہ گوشت نہ ہو۔

چودہ برس کی عمر میں جب اس نے اداکاری کی
 تربیت حاصل کر لی تو ہدایت کاری کی طرف توجہ دی۔ وہ
 ہدایت کاروں کو کٹ لیور اوکے کرتے دیکھتی تھی تو یہ خیال
 اس کے دل میں چکیاں کاٹنے لگا کہ اسے بھی ہیرا کرنا
 چاہیے۔ ہدایت کاری سب پر بھاری ہوتا ہے اور سب اس کے
 تابع ہوتے ہیں۔ ساری فلم اس کے گرد گھومتی ہے۔ بلکہ یہ
 کہنا بہتر ہوگا کہ ساری فلم اس کے دماغ میں ہوتی ہے۔

ہدایت کاری کے لیے اس کے پاس وقت نہیں
 تھا۔ اس لیے اسے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ اس کی ماں
 نے اسے پورے پڑھائی اسکول میں داخل کر دیا۔ اگر اس
 نے اداکاری کی تعلیم حاصل کر لی تھی تو نصابی تعلیم سے اسے
 مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ وہ اسکول میں دوسرے
 طالب علموں کی طرح وہی کتابوں میں سرگھبانے لگی۔

اس کی ماں کا ہاتھ بہت تنگ تھا اور وہ چاہتی تھی کہ

انجلیا اس کا ہاتھ بٹاتی لیکن محض چاہے سے کیا ہو سکتا
 تھا۔ تعلیم کا بوجھ تو اس پر نہیں چڑ رہا تھا، اس لیے کہ تعلیم تو
 حکومت کی طرف سے مفت تھی، البتہ خانگی اخراجات اسے
 بلائے دے رہے تھے۔ جب تک بائی اسکول کی تعلیم ختم نہ
 ہو جاتی وہ اداکاری کی طرف نہیں جاسکتی تھی۔

بائی اسکول کی تعلیم انجلیا کے لیے دشوار گزار ثابت
 ہوئی۔ اس لیے کہ وہ وہی تھی اور چشمہ پہنتی تھی۔ اس کے
 ساتھی طالب علم اس کا مذاق اڑا لیا کرتے تھے۔ انجلیا ان
 باتوں کے لیے خود کو مورد ہراسم ٹھہراتی ہے۔ اس لیے کہ وہ
 ڈپریشن کا شکار تھی اور اپنے مستقبل سے ناامید تھی۔ تو اس نے
 تہائی اختیار کر لی۔ وہ غیب لوگوں کا سامنا کرنے سے کتر لیتی
 تھی۔ وہ کہتی ہے کہ غالباً میرے مصائب کا یہی علاج
 تھا۔ لوگوں کے سامنا نہ دوں اس سے دل برداشتہ ہو کر اس
 نے غیبات میں بھی دل چسپی لینا شروع کر دی تھی۔ جس
 میں ہیرا شکن کاوش بھی شامل تھا۔

ڈپریشن کا سبب اس کا باپ تھا اس لیے انجلیا نے
 اس کا گہرا اثر لیا اور ذاتی طور پر اپنے باپ سے دور ہو گئی۔
 اس نے اپنے باپ سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا تھا۔ کافی عرصے
 بعد دونوں کی یکجہلی مشہور فلم "لومب رائڈرز" میں ہوئی جو
 2001ء میں بنی تھی لیکن ان کے درمیان جو سرد مہری کی
 ایک اونچی دیوار قائم تھی وہ بدستور حاصل رہی۔

جولائی 2002ء میں اس نے عدالت کو باقاعدہ
 درخواست دی کہ وہ اب اپنا خاندانی نام واہت استعمال نہیں
 کرنا چاہتی۔ عدالت نے اس کی درخواست 12 ستمبر
 2002ء کو منظور کر لی۔ یوں اس نے خاندان سے رہا سہا
 تعلق ختم بھی کر لیا اور اب وہ صرف انجلیا ہوئی تھی۔ اس کے
 باپ نے ہاسٹ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا کہ ہالی ووڈ کی
 چکاچوندی نے میری بیٹی کا دماغ الٹ دیا ہے۔ غالباً وہ
 اپنے حواس میں نہیں رہے وہ وہ کیا کوئی اپنے خاندان سے لاطعن
 ہوتا ہے؟

انجلیا نے اس کی وضاحت یوں کی کہ چونکہ اب اس
 نے ایک بچے میڈ وکس کو گود لے لیا ہے، اس لیے نہیں چاہتی
 کہ اس کا خاندانی نام اس بچے تک منتقل ہو۔ البتہ جب اس
 کی ماں کی وفات 27 جنوری 2007ء میں ہوئی تو اس نے
 اپنی مدد سے سے چھٹا مارا پانے اور اپنی تہائی کو ختم کرنے کے
 لیے ایک بار پھر باپ کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے
 ساتھ رہنے لگی۔ ان کے درمیان جدائی و مفارقت اور بے

بھری چوہرے تک حائل رہتی تھی۔

بھولی بھری باریں اس کے بھائی جیو کا بھی چھپا کرتی تھیں۔ اس کا بیان ہے کہ بچپن کے واقعات مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں ہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ میں نے اپنے بھائی پر بہت کچھ نہیں دیکھا ان کا چہرہ چمکا رہا تھا۔ مگر باپ نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا اسے میں بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں سے بچھڑی اختیار کرنے کے بعد وہ اسی قصبے میں رہتا تھا۔ گاؤں کے بچے ہاں سکول جاتے ہوئے ماؤں بھٹی میں اس سے ٹکراتے ہو جاتا تھا لیکن اس نے کبھی اپنائیت سے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ جیسے ہم کسی دوسرے سارے کی تلوں ہوں۔ یہ کچھ میں نہیں آتا کہ میں باپ میں بچھڑی کی وجہ کیا تھی؟ اس کا سلوک میں کے ساتھ اذیت ناک تھا مگر اس لیے جب وہ ہسٹرمگ پر تھی تو اس نے انجلیا کو صحت کی بھی کہ اب تم اپنے باپ سے ملنا۔

ماں کے مرنے کا انجلیا نے بہت اثر لیا۔ اس نے کھانا تقریباً ترک کر دیا۔ حالانکہ میں نے اسے سمجھا تھا کہ کھانا نہ چھوڑے ورنہ عمر کی گاڑی کیسے چلے گی؟ وہ کھاتی تو تھی لیکن بہت کم، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ روز بہ روز دلی ہوتی چلی گئی۔ قلم والے ایسے چھوٹے بدن کو پسند کرتے ہیں مگر جب قلم "پلیٹنگ" یا "پلٹ" کی قلم بندی شروع ہونے لگی تو اس کا جسم بدلتا اور ضرورت سے زیادہ چھوٹا ہو گیا۔ اس نے انجلیا سے کہا کہ وہ کپڑوں کے نیچے سوتی پڑے باغیچے لے تاکہ اس کا جسم کچھ بھاری ہو جائے۔

لوگ، خاص طور پر جوڑے اس کی ہڈی کھینچ کر اور چھوٹے بدن کے بارے میں جانتے کے لیے کوشاں رہتی تھیں۔ دوسری اداکاراؤں کی طرح اس کا ہیٹ باہر کیوں نہیں آتا یا وہ اب تک پہلوان کیوں نہیں دکھائی دیتی؟ وہ سادہ سی غذا نہیں کھاتی اور ورزش بھی کرتی ہے۔ خصوصی طور پر بھاپ سے گل ہوتی ٹیڈا پھلی اور بھاپ سے گل ہوتی میزیاں استعمال کرتی ہے۔ یہ بالکل سچی ہے۔ اس کے علاوہ یوگا ورزش کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یوگا سے اسے ڈپریشن سے چھٹکارا پانے میں مدد ملی ہے۔ وہ باقاعدہ واقعات نہیں کرتی بلکہ صبح کے وقت صرف کافی ایک پیالی پی لیتی اور دو سگریٹ پھونکتی ہے۔

اس کے جسمانی احاطے پر لوگ بحث مباحثہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ بالی ووڈ کی دوسری اداکاراؤں کی نسبت قیامت خیز اور خطرناک ہے۔ وہ سب

انہی دنوں پر عکرائی کر رہی ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اگر وہ چند پونڈ اپنا وزن بڑھالے تو صحت مند دکھائی دے گی۔ وہ سلیٹ میں دیکھ دیتے ہیں کہ انجلیا کا قد 5 فٹ 10 انچ ہے جب کہ وزن 97 پونڈ۔ قامت کے لحاظ سے یہ وزن کم ہے۔

انجلیا ایک نوازادہ قاسٹ ٹیوزر سے پرہیز کرتی ہے۔ اس کے سوا وہ پانی کھرت سے پیتی ہے اور اپنے بچوں کو بھی اس کی تلقین کرتی رہتی ہے۔ بچوں اور میزیاں پر اس کی خاص نگاہ ہے۔ وہ دن میں تین بار بھاری کھانے کی بجائے چار بار ہلکا کھانا کھاتی ہے اور کل 600 کیلو پڑ (حرارے) والی غذا نہیں کھاتی ہے۔ اس طرح سے سلم رہتی ہے اور بداعت کا ردی کو اس کا سراپا پائندہ ہے۔

ہماری ماں نے ساری بڑے دلیریاں نبھائیں۔ کھانے پینے اور چھانے میں ان کی توجہ زبردست تھی۔ اگر وہ گاڑے تھے متعلق بنانا چاہتی تھیں تو پہلے کچن سے گاڑے نکال کر لاتی تھیں اور پھر پردہ کرکے کچن میں کھا جاتی تھیں۔ اب بھی طرح پر انجلیا نے اپنے بچوں کے ساتھ بھی رکھا ہے۔

سب سے بڑا البیہ یہ تھا کہ سولہ برس کی عمر میں ہمارے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ ہمارے سارے دوستوں کے پاس کاریں تھیں اور ہم ان کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ سولہ سال کی عمر میں اس انجلیا میں کار ڈرائیو تک کا لائسنس مل جاتا تھا مگر میرے پاس کوئی کار ہی نہیں تھی۔ میں لائسنس لے کر کیا کرتا؟

میں نے اپنے باپ کے پاس جا کر کئی بار منگنی کا روٹا رو دیا لیکن اس نے روکھا سا جواب دیا کہ میں کیا کروں؟ میں اور انجلیا ہر موقع پر ایک دوسرے سے بہت قریب رہے۔ اسی لیے میں اب کسی انجلیا میں جلا ہوتا ہوں تو اس سے جا کر مشورہ ضرور کرتا ہوں۔ وہ عظیم ہے۔ اس نے اتنے دفاعی کام کیے ہیں کہ تمام مشورہ کا لہرہ اس کی عزت کرتا ہے۔ حال میں اس نے اعلان کیا ہے کہ وہ یوگیٹرا میں ایڈ کے مریضوں کے لیے بھی کام کرے گی۔ وہ کھلی معنوں میں مددگار سادوم بننا چاہتی ہے۔ اس کے دل میں فریبوں اور مظلوموں کا درد دیکھ گیا ہے۔

مجھے اس کا احترام ہے کہ اسے بام عروج تک پہنچانے میں برائے پٹ کا پورا ہاتھ ہے۔ اس سے شادی کرنے سے پہلے وہ آسودہ نہیں تھی۔ اب دل بھی سے وہ لڑائی اسودہ نثار ہے۔ رینگے پال رہی ہے اور غلوں میں کام

کر رہی ہے۔ اس کا ردِ پیادہ مٹی کے بھائے جیت ہے۔

☆☆☆

چودہ برس کی عمر میں انجلیتا مالٹک بھی کرنے لگی۔ لیکن اس میں اسے بہت محنت کرنا پڑی اس لیے کہ جب بھی کوئی اس کی طرف دیکھتا تھا تو ناگواری سے منہ مالتا تھا کیوں کہ وہ بدلی مٹی اور پڑیشن کی وجہ سے اس کا چہرہ سرمھایا رہتا تھا۔ ہائی اسکول کی تعلیم جاری نہیں رہ سکی۔ اس نے سماجی طلبہ کی وجہ سے اسکول چھوڑ دیا۔ پھر اپنے طبقے میں تہذیبی کی اور بالوں کو قرعہ کر دیا۔

مالٹک میں اس کا دائرہ کار صرف لاس انجلس تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ نیو یارک اور لندن کی اشتہاری فلموں میں بھی کام کرنے لگی تھی۔ مالٹک کے دور میں اس نے سیاہ لباس بھی پہنا جس سے اس کے حسن میں چار چاند لگ گئے، لیکن اس سلسلے میں اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی۔ کم از کم ایسا نہیں ہوا کہ میگزین، اشتہاری انکمیاں اور روزنامے اسے خاص طور پر اپنے لیے بک کرتے۔ انجلیتا نے اسکا کر مالٹک سے کنارہ کشی اختیار کر لی، کیوں کہ مالٹک اسے کچھ نہیں دے رہی تھی۔

انجلیتا نے ٹیک ہارٹسٹ کرائے پر لے لیا جو ایک کیراج کے اوپر تھا۔ یہاں ہارٹسٹ اس کی ماں کے مکان سے ہالنگ قریب ہی تھا۔ یہاں وہ اپنی ماں سے جدا نہیں ہوئی اور اس کی شہقت اور محبت کے زیرِ سایہ رہی۔ امریکا میں بچے اپنے باپوں پر کھڑے ہونا چاہتے اور اس سلسلے میں اپنے والدین سے کوئی مدد نہیں لینا چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں پر وہ جہن کر بھی نہیں رہنا چاہتے۔ اپنے خراجا خدہ خود پرے کرتے ہیں چاہے انہیں اخلاقت ہی کیوں نہ چھتا پڑیں۔

اس نے فیئر کے بارے میں دوبارہ تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کا دل ابھی تک اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا اور وہ بہت کچھ کرنا چاہتی تھی، لیکن اسے کیا کرنا چاہیے یہ اسے خود معلوم نہیں تھا اب تک وہ ثقافت کشمیری میں قدم رکھ رہی تھی اور اس کی جدوجہد کی کوئی سمت نہیں تھی۔ کبھی کبھار بھی کچھ!

فیئر میں تربیت لینے کے دوران میں اس نے مشاہدے پر زور دیا۔ ہر چیز کو غور سے دیکھنا اور اسے اپنے دماغ میں اٹھانا اس کی عادت ہو گئی تھی۔ جب وہ سات برس کی تھی تو اس نے اپنے باپ جان راہٹ کے ساتھ ایک فلم میں اکتھا کام کیا تھا جیسے باقاعدہ طور پر اس نے سولہ برس کی عمر سے

فلموں میں کام کرنا شروع کیا۔ یہ اس کے کیریئر کا آغاز تھا جاسکتا ہے۔ اس کی طرح اس کا بھائی جیمو بھی اداکار اور ہدایت کار بننا چاہتا تھا اس لیے اس نے طالب علموں کے لیے پانچ فلمیں بنوا دیں، جس میں انجلیتا نے مختلف کردار ادا کیے۔ یہ 1991ء سے لے کر 1993ء تک رہا۔

اسے معلوم تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ محض مذاق ہے، نہ تو اسے مکالمہ لانا کرنا آتا ہے اور نہ چہرے کے تاثرات دینا آتے ہیں۔ اس کے لیے اسے تربیت لینا پڑے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کے قتل قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کے باپ کا کہنا تھا کہ اداکاری مشاہدے سے آتی ہے۔ ہم اپنے کردار پیش میں چلتے پھرتے لوگوں کو خود سے دیکھیں جو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیمو کسی چیز کا کردار ادا کرنے کے لیے دیا جائے تو تم اسے محض اندازے سے کرنا کی لیکن اگر تم نے کسی نیا شخص کو دیکھ رکھا ہے تو اس شخص کی حرکات کتنا تھارے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی۔ جن لوگوں کو گودھ ہوتا ہے ہم ان کے مسائل سے اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتے جب تک کہ کچھ عرصہ ان کے پاس نہ گزاریں اور ان کا مشاہدہ نہ کریں۔ جب کسی کو سلطان ہو جاتا ہے تو اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں اور وہ کبھی کیلیت سے گزر رہا ہوتا ہے ہمیں اس سے کوئی آگاہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں کسی ایسے شخص کا کردار دے دیا جائے جو سلطان میں جلا ہے تو ہم کمرے کے سامنے کیا کریں گے تاہم ٹیکہ اس کی زندگی کا بھرپور مشاہدہ نہ کر چکے ہوں۔

ثقافت اسٹوڈیوز کے چکر کاٹنے کے بعد اسے ایک فلم ملی۔ اس کی پہلی فلم نے ہاکس آفس پر ایماء نہیں کیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے ایک برس تک کسی فلم کے لیے آڈیشن نہیں دیا۔ اپنے باپ کے سمجھانے پر اس نے دوسری فلم میں کام کرنا منظور کر لیا۔ یہ 1995ء میں بننے والی "ہاکرز" تھی۔ دوسری فلم نے بھی ہاکس آفس پر قابلِ ذکر برنس نہیں کیا۔ مگر انجلیتا کا دل نہیں ٹوٹا، اس لیے کہ روزنامہ نیو یارک ہانکس کے ایک رپورٹر نے فلم میں اس کے کردار کی تعریف نہایت اچھے الفاظ میں کی تھی۔ صرف دہائیوں بلکہ فلم انڈسٹری کے بہت سے ہدایت کار وہ تبصرہ چڑھ کر متاثر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پے در پے کئی فلمیں ملی گئیں۔

اس کی لمبی ترقی کا دور اس وقت شروع ہوا جب اسے

ٹیلی وژن کی دو تین فلموں میں اچھے اور جاندار کردار ملے جن میں 2007ء میں بننے والی دو فلمیں 'لرد' و 'مین' اور 'جارج ویلس' شامل ہیں۔ ان میں سے جارج ویلس برائے گوڈوین گلوب ایوارڈ ملا۔ جو ناقدرین نے اس کی اہلی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہوئے دیے تھے۔

1995ء میں جب وہ 'سیکرٹ ڈائی لم' میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا رہی تھی تو اس کے متعلق برطانوی اداکار جونی لی لڑکھا۔ اوائل عمری کے بعد اب یہ انجلیتا کا عقیدان شباب تھا۔ وہ لی لڑکے کے قریب آتی چلی گئی۔ وہ اسے زندگی کا پیلا رومالس قرار دیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے اور شوٹنگ کے بعد دور بھی ہو جاتے۔ کئی بار تک ان کی ملاقات نہ ہو پاتی۔ جب ان کی دوبارہ ملاقاتیں ہوئیں تو انہوں نے 28 مارچ 1996ء کو شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کہیں کہیں ایک طریقہ ہے کہ جس سے دوری کو نزدیکی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی شادی پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبارات نے لکھا تھا کہ اس نے طرے سے محض اس لیے شادی کی ہے کہ وہ زندگی میں استحکام چاہتی تھی۔ اپنے باپ کے معاونانہ رویے سے وہ ڈپریشن میں مبتلا ہو چکی تھی، اس لیے شادی کر کے اس کیفیت سے باہر آنا چاہتی تھی۔

جونی لڑکے برطانوی اداکار ہے جو 1972ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے 'سیکرٹ ڈائی لم' میں 1995ء میں کام کیا تھا جس کی بنا پر اسے شہرت حاصل ہو گئی۔ وہ چھ ماہ فلم میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا، اس لیے اس نے فلم اور ٹیلی ویژن دونوں پر کھانا بکھونا بنائے رکھا۔ پھر اسے ٹیلی وژن کی ایک سیریز مل گئی۔ اس کا چہرہ تنہا کی کامرغ ہے، اس لیے اسے ایک بار ڈرامے میں شرلاک ہو کر کی حیثیت سے بھی منتخب کیا گیا تھا۔ اسے فلموں میں کام کرنے کے علاوہ ہدایت کاری سے بھی دل بہن ہے۔ وہ مہترانہ بھی لکھ سکتا ہے۔

انجلیتا سے اس کی شادی کامیاب نہیں ہوئی اور صرف اٹھارہ ماہ تک ان کا ساتھ رہا۔ اس کے بعد اس نے اول کارہ اور ماڈل مانگی بکس سے شادی کر لی جس کے نتیجے میں اس کا بیٹا ہے۔

لارڈ ہال کلب کا ممبر ہے اور اسے میرا تین دوڑنے سے بھی دل چسپی ہے۔

شادی کا کام ہونے کی وجہ پر اس نے یہ بتاتا ہے کہ انجلیتا کا سلوک اپنے شوہر کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کے باپ نے ایک بار کہا تھا کہ اس کی بیٹی انجلیتا دماغی

طور پر صحت مند نہیں ہے۔ طرے طلاق حاصل کرنے کے بعد یہ بات پاپیہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ بچپن میں اس نے ایک بار اپنے رخسار پر چاقو سے زخم بھی لگا لیا تھا جو اس کی دماغی طاقت کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ 'اسکر ایوارڈ' کی چھ سو فیصد قرب میں وہ کمر تک کلاگون وین کر آئی۔ پھر بین اس وقت جب کہ ایوارڈ تقسیم ہونے سے تھے وہ کئی بار اس پر آئی اور اس نے اپنی ایک ٹانگ گولن سے باہر نکال لی۔ معلوم نہیں اس حرکت کا کیا مقصد تھا؟ فوٹو گرافروں نے دھڑا دھڑا اس کی تصویریں کھینچیں شروع کر دیں۔ ان کے دن کے اخبارات اس کی تصویریں سے بھرے پڑے تھے۔ کیا اس نے یہ حرکت محض تصویریں کھینچانے کے لیے کی تھی؟ اس کا دماغ اتنا چلنے لگا تھا؟

☆ ☆ ☆

اپنی شادی کی تقریب میں انجلیتا نے ربر کی چٹون اور سفید ٹی شرٹ پہنی جس پر اس نے اپنے خون سے دلہا لی طر کا ہام لکھا تھا۔ دونوں کا رومالس کافی دنوں تک چلا۔ جیسا کہ ہال وڈ کا اصول ہے تو نہیں اور سکی۔ اور نہیں اور سکی۔ محبت جب زیادہ ہو جاتی ہے تب بھی ناقابل برواشت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے ستمبر 1997ء میں علیحدگی اختیار کر لی۔ باقاعدہ طلاق 3 فروری 1999ء میں ہوئی۔ محبت روگ سن جائے تو اس کو چھوڑنا بہتر راہ بہر حال اب بھی اچھے دوست ہیں۔

انجلیتا نے بعد میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا "میں دھوک سے نہیں کہہ سکتی کہ علیحدگی کی کیا وجہ تھی، بہر حال ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کم عمر اور نا تجربے گذر تھے۔ دونوں لی طر کے بارے میں جب بھی کوئی پوچھے گا تو میں بھی کہوں گی کہ وہ ایک اچھا شوہر تھا۔ ہر نو جوان لڑکی کو یہاں شوہر نصیب ہو۔ میرا خیال ہے کہ میں اب بھی اس کی محبت میں گر کر رہوں۔"

ایک اخباری نمائندے نے اس سے استرواج کے دوران میں لی طر سے چٹ مگنی پٹ جھا اور اس کے بعد طلاق اس بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "مجھے خود بھی اس لڑکی اور طلاق پر حیرت ہے۔ اس لیے کہ چند ہی راتیں گزارنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں یکدم تبدیل ہو گئے ہوں۔ پھر چند دن اور گزرے تو ایسا لگا کہ ہم میں کوئی بات سرے سے مشترک ہی نہیں ہے۔ بات انوکھی ضرور ہے، لیکن ناقابل یقین نہیں کہ مرد و زن تیزی سے ایک دوسرے سے قریب آ کر جاتے ہیں لیکن بعد میں عقود کھتا

ہے کہ ہم جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ حقیقت میں کچھ اور تھا۔"

☆☆☆

لوم براؤڈر کی شوٹنگ پھرپ کے اہم مقامات پر ہوئی۔ جب لندن میں اس کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو انجلیتا اور لی طر ساتھ دیکھے گئے وہ قہقہے لگاتے، پارکوں میں چال قدم کرتے اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کیٹرل لائٹ ریستورانوں میں کھانا کھاتے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ ماضی کا بچھڑا، اعادہ عشق یا فساد ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنی شاموں کو گھنٹے بٹاتے؟

ہالی ووڈ حیرت، دل چھیں اور اسکینلر کی سرزمین ہے۔ 1996ء میں جب وہ "ٹوکس فائر" کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی تو ہڈیوں اور اداکارہ جینی شیوز کے ساتھ اس کا دوستانہ ہو گیا۔ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: "میں جینی شیوز سے اتنی محبت کرنے لگی ہوں کہ اسے لنگھوں میں بچاؤ نہیں کر سکتی۔ اگر میرا شوہر نہ ہوتا تو میں قاتل تھا اس سے شادی کر لیتی۔" (یہ سوچے بغیر کہ وہ بھی بھری طرح لڑکی ہے)

جینی ایک جاپانی۔ امریکن نژاد عورت ہے۔ اس نے ہارورڈ یونیورسٹی کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا اور اس کے بعد ہارٹنگ کرنے لگی۔ اس کی سب باتیں انوکھی اور حیرت انگیز ہیں۔ وہ ہارٹنگ کے مزید اصولوں پر پوری توجہ دے کر اپنے ہار جود بہت جلدی ہارٹنگ ہے اور اشتہاری انجلیتا ہر وقت اسے فون کرتی رہتی ہیں۔ وہ ہارٹنگ فاسٹ ہے نہ اس کی آنکھیں شرمیلی ہیں اور نہ اس کے جسم پر گوشت ہے۔ وہ دلی پتلی اور سینک سلائی ہے اور اس کے ہارڈ گڈے ہوئے ہیں۔ اس وقت اسے ہارٹنگ کہا جاتا ہے۔ مشہور و قاصد میڈیٹا سے بھی اس کے نظریہ تعلقات نہ بچے ہیں۔

عالمی انہی باتوں کی بنا پر انجلیتا میڈیٹا سے نفرت کرتی ہے اور رقابت میں جیتا ہے۔ وہ دونوں ایوارڈ کی ایک تقریب میں مدعو تھیں۔ صحافی برادری کا خیال تھا کہ ان میں سے ایک اس تقریب میں شریک نہیں ہوگی۔ قوی قیاس تھا کہ انجلیتا اس پروگرام کو ملتوی کر دے گی۔ حالانکہ اسے خود بھی ایوارڈ لینے کی امید تھی۔

☆☆☆

ایک فلم "ٹوکس فائر" میں انجلیتا کے ہونے کے کردار پر لاس اینجلس ناٹکس نے جان داد تھرہ لکھا تو لوگوں نے اسے اداکارہ تسلیم کر لیا۔ اس طرح اس نے 1996ء تک تقریباً

دس فلموں میں کام کیا۔ تاہم سب تک وہ اوپری سٹیج کی اداکاراؤں تک نہ پہنچ سکی تھی۔ گویا اس نے ابھی تک خود کو فلم دیکھنے والوں سے تسلیم نہیں کر لیا تھا اور بقول قہقہے کوئی تھلک نہیں چھایا تھا۔

اس کے بعد آنے والی ایک اور فلم "جیا" میں بھی اس کے رول کی تعریف اخبارات نے کی اور اس کو ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ انجلیتا نے اس فلم میں ایسا عورت کا رول ادا کیا تھا جسے ایڈز ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ فلم کا کردار اس کی شخصیت کو دیکھ کر کھٹکا گیا تھا، اس لیے فلم میں کام کرنے کا حزمہ آیا۔ اخبارات نے تبصرہ کیا کہ اس نے ایڈز کے کسی مریض کا بغور مشاہدہ کیا ہے، ورنہ اس کے بطور یہ ناممکن تھا۔ یہ فلم ایچ آئی وی کی محدود سرمایہ کاری سے ٹیلی ویژن کے لیے تیار کی گئی تھی اور ایک ہیراڈال جیا کر سکی کی زندگی پر مبنی تھی جسے 26 سال کی عمر میں ایڈز ہو گیا تھا۔

انجلیتا نے بتایا کہ اس نے شوٹنگ کے دوران میں لوگوں سے ملنا ملنا کرتی چھوڑ دی تھی اور کردار کو خود پر طاری کر لیا تھا۔ فلم کی ریلیز کے بعد اپنے شوہر سے طلاق لینے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی، اس لیے اس کا خیال ہے کہ وہ اس سے بھر اداکاری نہیں کر سکتی۔

وہ نیو یارک چلی گئی اور اس نے یونیورسٹی میں جہالت کا رول سیکھنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ وہ منظر نامہ کہنے میں بھی دل چھیں رکھتی تھی۔ یونیورسٹی سے ایک چھوٹا سا کیریئر کرنے کے بعد وہ پھر فلم انڈسٹری میں لوٹ آئی، کیونکہ اداکاری اس کا اور حنا کچھ نہیں چکا تھا۔ اب وہ کیریئر کے سامنے آئے بغیر رہ نہیں سکتی تھی۔ فلم میں واپسی کا سال 1998ء تھا۔

اس نے اس سال دو فلموں میں کام کیا۔ دوسری فلم قابل ذکر تھی جس میں شون کنری نے اس کے ساتھ کام کیا تھا۔ سان فرانسسکو کرئیکل نے اس کی اداکاری کو پسند کیا اور اس پر مثبت تبصرہ لکھا۔ نیشنل بورڈ آف ریلیف آف موٹن پکچر نے اسے حمہ کار کردگی پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ بھی دیا۔

1999ء میں نئے فلم "ڈی یون کلکٹر" جو جھری ڈیور کے کرائم ڈائل پر مبنی تھی، انجلیتا نے لیڈی پولیس آفیسر کا رول ادا کیا تھا۔ فلم ایک جنسی منظر سے شروع ہوتی تھی، اس لیے انجلیتا نے اس میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر جہالت کار کے سمجھانے پر اس نے فلم نہیں چھوڑی۔ اس فلم

نے دنیا بھر میں 151 ملین ڈالر کا بزنس کیا اور دھوم مچا دی۔ انجلیتا نے اپنے رول کے ساتھ انصاف کیا تھا، اس لیے اخبارات نے اس کی تقریروں کے ٹیپاؤں کا اضافہ کیا۔

فلم "گرل انٹریڈ" میں کام کر کے انجلیتا نے ساری دنیا کو چمکا دیا۔ اس فلم کی ریلیز کے بعد اس نے تیسری بار گولڈن گلوب ایوارڈ جیتا، اس کے علاوہ بہترین معاون اداکارہ کے طور پر اسے اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ فلمی دنیا نے اس کی اداکاری کا لوہا مان لیا تھا اور اب میڈیا نے اسے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اس پر مضامین، اس کی تصاویر اور انٹرویوز شائع ہو رہے تھے۔ وہ ہر میگزین کے سرورق کی زینت بنائی جا رہی تھی۔

2000ء میں اس نے "گون این سکسی سیکرٹری" میں گلوں کیج جیسے بڑے اداکار کے ساتھ کام کیا۔ اس کا فلمی کردار اس میں بڑا تھا مگر اسے شائقین نے پسند کیا۔ اس فلم کا دنیا بھر میں بزنس 237 ملین ڈالر تھا۔ یہ بارہوا جانے والی جرم و سزا پر مبنی ایک دل چسپ فلم تھی۔ جس میں لڑائی و لڑکھائی اور لہو کی بھرمار تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایکشن فلموں کی ہیروئن بنی جا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بھیڑ چال ہے جس سے اس کی اداکاری بھروسہ ہو سکتی ہے۔ شان کوہلی کی طرح سے وہ بھی ٹائپ ہو کر رہ جائے گی۔ اس نے کہا کہ جہاں تک ایکشن کا تعلق ہے تو ہیرسین فورڈ کی کچھ کر رہا ہے اور بہتر طریقے پر کر رہا ہے تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں بھی ایسے کردار ادا کرنے لگوں؟

2001ء سے لے کر 2005ء تک اس نے جن فلموں میں کام کیا انہوں نے اسے بین الاقوامی طور پر دنیا بھر میں بدشاس کر دیا۔ ان میں ٹومب رائڈرز وہ فلم تھی جس نے اسے عالمی شہرت پانے ہیروئن کے طور پر اداکاری کے بلند پائے پر بٹھا دیا۔ اسے سپر اسٹار کہا جانے لگا۔ فلم میں انجلیتا نے لارا کروفت کا کردار ادا کیا۔ فلم بندی سے پہلے اس نے مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کی۔ انجلیتا اس فلم میں کام کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتی تھی لیکن دوستوں کے سمجھانے پر اس نے آفر قبول کر لی۔ لارا کروفت کا کردار جیمز بونڈ اور انڈیانا جونز کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ ریلیز ہونے پر فلم انتہید گاروں کو بالکل پسند نہیں آئی۔ بہر حال پبلک نے اسے سراہا لیا۔ اس فلم نے دنیا بھر میں 257 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ انجلیتا کو لیبی ایکشن اسٹار کا خطاب دیا گیا۔ وہ لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن چکی تھی۔ ایسے میں تنقید کاروں

کوئی کی کھائی پڑی۔

فلم ٹومب رائڈرز کی شوٹنگ زیادہ تر کپڑا میں ہوئی تھی۔ انجلیتا نے وہاں کی زندگی کو بے حد قریب سے دیکھا۔ ہر طرف مطلقاً ہے چارگی اور فاقہ کشی تھی۔ وہ ان روح فرسا مناظر سے لرزہ بر اندام ہو گئی۔ یہاں کی زندگی کا حیرت انگیز سواڑ تھا۔ اس نے اقوام متحدہ کے آفس میں جا کر خود کو رجسٹر کرایا اور پھر ان کے ٹرانسپورٹ کی حیثیت سے تقریباً بیس ٹکڑوں کا دورہ کیا۔ وہ عملی طور پر مفلوک الحال لوگوں کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، کر رہی تھی۔ فلموں سے ہونے والی آمدنی سے وہ ایک تہائی بچا رہی تھی، ایک تہائی عطیے کے طور پر دے رہی تھی اور ایک تہائی سے وہ اپنے اخراجات پورے کر رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ جب میں کپڑا میں پہلے ریلیف کیپ میں تھی تو میں نے اندازاً چار لاکھ افراد کو دیکھا۔ وہ مصائب اور مجبور ہیں کا ایک بے شمار سمندر تھا۔ اسی طرح سے میں نے سیریلین میں لاکھوں افراد کو ہاتھ پاؤں کٹی حالت میں دیکھا۔ (وہشت گردوں نے ان کو اس حالت میں پہنچایا تھا) ان کے قریب جیم پیج بلک رہے تھے اور ان کی طرف توجہ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ میں ان کی حالتِ ذار دیکھ کر رونے لگی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ محض رونے سے کیا حاصل؟ مجھے ان کے دکھ درد کا مداوا کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے عطیات جمع کیے اور کپڑا اور فنانس لینڈ کی حکومت کو ایک سال بعد پچاس لاکھ ڈالر دیے۔

☆☆☆

کسی ساتھی کے بغیر زندگی تنگ اور بے حوصلہ تھی۔ بے کیف اور بھکی۔ چنانچہ اسے ملیا بوب خمرنٹون اچھا لگنے لگا۔ انجلیتا نے اسے آنکھوں کے واسطے دل میں اتار لیا۔ پھر وہ اس کی زندگی میں مکمل طور پر داخل ہو گیا۔ دو ماہ تک وہ پیار و محبت اور اقرار و دعاں کرتے رہے اس کے بعد انہوں نے 5 مئی 2000 میں لاس ویگاس میں شادی کر لی۔ ان کی ملاقات 1999ء میں "پنگ ٹن" کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ دل چسپ بات یہ کہ ملیا بوب اس سے بیس برس بڑا تھا اور انجلیتا اس کی پانچویں بیوی تھی۔

تھکن ہے ملیا بوب واقعی محبت کرنے والا شخص ہو کر اس نے جب انجلیتا سے اپنے تعلقات کو طشتِ اربابم کیا تو کسی کو اس کی باتیں پسند نہیں آئیں۔

ملی یوب امریکی تیار ہے۔ وہ ایک مفلس گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں بجلی تھی اور نہ واش ٹین۔ 1973ء میں اس نے ہائی اسکول کی پڑھائی ختم کر لی۔ تعلیم کے علاوہ اس کے مشاغل میں ہیں ہال کھیلنا شامل تھا۔ اس نے بعد میں یونیورسٹی میں انشیا کے شعبے میں داخلہ لیا مگر ایک سال بعد اس نے پڑھائی ترک کر دی۔ 1980ء میں اس انجینئرنگ چلا گیا۔ وہاں اس نے فٹنس لڑاکا رینگنے کے لیے ہمدرد شروع کر دی۔ فٹنس میں آسانی سے کام نہیں ملتا اس لیے اسے ہول دیڑھی بنانا پڑا۔ اس کے بعد اس نے ہدایت کاری سیکھی اور مہترناہ کھیلے میں دلچسپی لی۔ اس کی زندگی مصائب میں بھی گزری جس میں کم کھانا بھی شامل ہے۔ جس کی بنا پر وہ کئی بار بیمار بھی ہوا۔

پہلے اسے فٹنس میں چھوٹے موٹے کردار ملے لیکن پھر بعد میں وہ بڑے کرداروں میں آنے لگا۔ ایک فلم میں اسے آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔ اس نے گانگی میں بھی حصہ لیا اور اس کا ایک اہم کردار خست کے لیے مارکیٹ میں آیا۔

ہالی وڈ کے واک آف فیم میں اس کے نام کا تارہ بھی نصب کیا گیا ہے۔ اس نے پانچ شادیاں کیں اور ان کا ایسا نام طلاق کی صورت میں طیار ہوا۔ تین بیویوں سے اس کے چار بچے ہیں۔

انجلیبا سے شادی کے ناکام ہونے کے بعد اس نے میک اپ کرنے والی خاتون سے شادی کر لی جس سے اس کی ایک لڑکی ہوئی۔ ملی یوب کا کہنا ہے کہ اب اگر اس کی شادی ناکام ہوئی تو وہ دوبارہ شادی نہیں کرے گا۔

انجلیبا اور ملی یوب، دونوں کا شادی کرنا اور بیویاں شوہر چھیل کرنا میلہ کو بہت پسند آیا۔ ان کی تصاویر شائع کرنا اور ان کے بارے میں کہارے اور سٹین واقعات شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ ازدولتی بندھنوں میں بندھے سمجھے۔ انہوں نے سیاطان بھی کر دیا تھا کہ وہ مارچ 2002ء میں کپوچیا جا کر ایک بچے کو گود لیں گے۔ مگر نہ جانے کیا ہوا کہ تین ماہ بعد انہوں نے طبیعت کی اطلاع کر دیا۔ قانونی طور پر ان کی طبیعت کی اطلاع عدالت نے 27 مئی 2003ء کو کیا۔ اس شادی سے انجلیبا کو ایک لاکھ و ضرور ہوا کہ اس نے نشیات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور وہ ایک معزز شخص کی بیوی تھی۔

2001ء میں اس نے اقوام متحدہ کے ادارے میں

وفاقی کابینہ کی کڑتے دیو میں سنبھلیں۔ اس نے اس موقع پر کہا تھا: "جب دنیا کے کسی خطے پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے یا وہ مظلومی اور رومانہ کی کے بانوں کے بچے بنے لگتا ہے تو ہم بے حس ہو کر اس کی طرف سے مت نہیں ہونے دیتے۔ لاکھوں افراد کو ایک وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی ہے اور وہ مظلومی کی آخری سانس سے بچے کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، کہا ہمیں زیب دیتا ہے کہ ہم ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں؟ میں انٹر کنٹیننٹ گازیٹوں میں سارے ذہنی حیثیت لوگوں سے غلط ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتے پر تو آپ مجھ سے کوئی اختلاف نہیں کریں گے کہ قانون اور انصاف سب کے لیے برابر ہے اور اس کے اثرات ملکی سطح تک پہنچنا پانچیس لاکھ کی کابینہ مال کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ آخر ہم ایک دوسرے کے کام کیوں نہیں آتے؟ جب ہم کرب و انصاف میں جلا ہوتے ہیں تو دوسروں سے توجہ کرتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کریں۔ اسی طرح سے دوسرے بھی ہم سے کئی توجہ رکھتے ہیں۔"

2001ء میں جب وہ کپوچیا میں ٹومب رائڈز کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس نے اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزینوں سے رابطہ قائم کیا کہ اسے اس بارے میں معلومات دی جائیں کہ دنیا میں لوگ کہاں کہاں پسماندگی اور لاچارگی کا شکار ہیں۔ اقوام متحدہ نے اس کا تفصیلی جواب دیا۔

فروری 2001ء میں انجلیبا نے جن ممالک کا دورہ شروع کیا جو غربت میں ڈوبے ہوئے تھے اور بد وقت کی روٹی کے لیے ہاتھ پھیلاتے پر مجبور تھے۔ اس نے اٹھارہ دن سیریا لیون اور تونانیا میں گزارے۔ بعد میں اس نے اپنی مردادو المناک سے خوش ملی دنیا کے لوگوں کو آگاہ کیا۔ وہ اس وقت درخیزہ طویل تھی۔

دو ہفتوں بعد وہ کپوچیا کی لورڈی میں پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے کیمپ میں بھی اس نے وقت گزارا۔ اس نے سفر کے اخراجات خود برداشت کیے، اسٹاف کے لوگوں کے ساتھ عام لوگوں کی طرح انصاف چھٹا رکھا۔ ان خدمات کی بنا پر اقوام متحدہ نے اسے اپنے جینز ایوارڈ کوادر میں 27 اگست 2001ء کو خصوصی تمغہ سے کا ورہ دیا۔ لب وہ کسی بھی ملک میں اقوام متحدہ کے نمائندے کی حیثیت سے جاسکتی تھی اور وفاقی کام کر سکتی تھی۔ یہ بہر حال ایک بڑا اعزاز تھا۔

اس روز کے بعد سے انجلیتا خاص طور پر دنیا بھر میں پناہ گزینوں کے کہوں میں جاتی ہے ان کے دکھ درد سختی اور حتی الوسع ان کی مدد کرتی ہے۔ وہ اب تک تقریباً تیس لکھوں کا دورہ کر چکی ہے۔ ایک اخباری نمائندہ نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے؟ اس نے جواب دیا: "میں چاہتی ہوں کہ دنیا کو ایسے لوگوں کا علم ہو جائے۔ یہ ہماری دنیا کے انسان ہیں اور ہمیں ان کے لیے کچھ کرنا ہے۔ ان کی دلداری کے لیے کوئی مریخ سے تو نہیں آئے گا؟ سیریلیون کے دورے کے وقت میں نے ایک ایسا کپ بھی دیکھا جہاں نو مولود بچے فرش پر پڑے رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کس کے بچے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ ان ماؤں کے بچے ہیں جن کی آمدورہ کی جملہ آہ و فوجیوں نے کی تھی۔ میں پوچھتی ہوں کہ ان بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ ان کی پرورش کون کرے گا۔ میں نے اس مسئلے میں ایک تعمیلی رپورٹ لکھ کر اقوام متحدہ کو دی ہے۔

انسان و انسان کو اسلئے ہمدردی سے ہمہ تن سمجھنے کی ذمہ داری ہے اور اس کا خیال ہے کہ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق ہے اور باقی سب کو مر جانا چاہیے لہذا وہ حالت جنگ میں رہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے ملنے اور ان کا موقف معلوم کرنے کے لیے انجلیتا نے کئی دور دورہ علاقوں کا دورہ کیا اور اسی نتیجے پر پہنچی کہ مارنے والے کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کیوں مار رہا ہے اور مرنے والے کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کس لیے مر رہا ہے۔ ہر طرف مفادات کی جنگ جاری ہے جس میں کوئی شخص 'مؤلف' نہیں ہے۔

2002ء میں اس کی بدینہز ہونے والی فلم "لائف آف سم ٹھنک لائک لٹ" بزنس کے اعتبار سے کمزور رہی لیکن اس کے کردار کو پرنس نے سراہا اور یہ کہا کہ اس نے دل لگا کر اپنا دل جمایا ہے۔ سی ایمن ایمن نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کے لیے وہ کردار خاص طور پر لکھا گیا تھا۔

10 مارچ 2002ء میں انجلیتا نے پہلا بچہ گود لیا جس کی عمر سات برس تھی اور نام میڈوکس شیڈان تھا۔ وہ بچہ یتیم تھا اور اس کے والدین کیمبوچیا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مضامیناتی گاؤں میں 5 اگست 2001ء میں پیدا ہوا تھا اور اس کا پیدائشی نام دو تھو وائل تھا۔ انجلیتا نے اسے گود لینے کی درخواست 2001ء میں کی تھی جب وہ نو سب رائڈر کی شوٹنگ کے دوران میں دوسری بار کیمبوچیا گئی تھی۔ اس

کی درخواست فوراً قبول نہیں کی گئی اس لیے کہ امریکی حکومت نے کیمبوچیا کے بچے گود لینے پر پابندی مائد کر دی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ بچوں کو گود لینے کی آڑ میں کوئی خاص قسم کا لین دین ہو رہا ہے۔

جب اس پر سے پابندی ہٹائی گئی تو انجلیتا نے بچے کو نیپیا میں گود لے لیا، جہاں وہ 2003ء میں فلم 'بائٹ بارڈرز' کی شوٹنگ میں حصہ لے رہی تھی۔ علی بابا اور انجلیتا نے بچے کو مشترکہ گود لینے کے لیے اعلان کیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ انجلیتا نے تھا اس کی ماں بننے کے لیے کاغذات پر دستخط کیے تھے۔

2003ء اور 2006ء کے دوروں میں امریکا کے صدر مقام پر اس نے کانگریس کے ممبران سے جس کے قریب ملاقاتیں کیں اور ان کی جواب دہی مائی سٹے کی طرف مبذول کرائی۔ اس کا مطالبہ تھا کہ تیسری دنیا کے بچوں کی خاص طور پر مدد کی جائے، جو اپنے والدین کے انتقال کے بعد یتیم اور بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ وہ جن ممالک میں گئی اور اس نے لوگوں کی قیادت کے لیے جو قدم اٹھائے وہ اس نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیے۔ 2003ء میں جب اس کی فلم 'بائٹ بارڈرز' ریلیز ہو رہی تھی اور اس کی ڈائری 'میرے سفر' کے نام سے شائع ہوئی۔ 2005ء میں اس نے اپنی ڈائری پر فلم بھی بنائی، جس کا بڑا حصہ مغربی کینیا میں فلم بند کیا گیا تھا۔ 2003ء میں اس کی فلم "کریٹل آف لائف" ایک معرکتہ آکار فلم تھی جس نے اسے دنیا کی سبکی ترین ہوا کا راؤں کی سگ پر لاکھڑا کیا۔ ساری دنیا میں اس فلم نے 156 ملین ڈالر کا کاروبار کیا۔

2004ء میں اس کی فلم 'سٹیک لائف' نے بڑا بزنس نہیں کیا لیکن فلم میں اس کے کردار کو پسندیدگی کی سند ملی۔ اسی سال اس نے "الیکزینڈر دی گریٹ" نامی فلم میں کام کیا اور بولیویا میں لاکھڑا ہوا کیا۔ امریکا میں فلم کا بزنس کامیاب نہیں تھا لیکن باقی دنیا میں اس فلم نے 139 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ اس کے تاریخی کردار کو بھی فلم کے شائقین نے سراہا۔ فلم میں یکساں ایکشن کردار ادا کرتے کرتے یہ ایک نیا سوز تھا جس سے اس کی ادکاری میں ترقی پیدا ہو گیا۔

فلموں میں کام کرنا ہی اس کی زندگی کا مقصد نہیں تھا وہ اس کے متوازی دفاعی کاموں میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ 2005ء اور 2006ء میں اسے ڈیوس کے مقام پر 'ورلڈ ان کمس فورم' میں خصوصی مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا

انجلیا کی دو ہمیں جن میں اس نے اپنے کن کے جوہر دکھائے۔

1. CYBORG 2
2. GLASS SHADOW
3. HAKERS
4. FOXFIRE
5. LOVE IS ALL THERE IS
6. GEORGE WALLECE
7. PLAYING GOOD
8. CIA
9. PUSHING TIN
10. PLAYING BY HEART
11. GIRL INTERPRETED
12. BONE KILLER
13. GONE IN SIXTY SECONDS
14. TOMB RIDER
15. THE CRADLE OF LIFE
16. BEYOND BORDERS
17. TAKING LIVES
18. TOMORROW
19. ALEXANDER
20. MR & MRS SMITH
21. THE GOOD SHEPHERD
22. A MIGHTY HEART
23. THE CHANGELING
24. WANTED
25. ATLAS SHRUGGED
26. SALT
27. THE TOURIST

کی کا قتلہ قتلہ۔ نومبر 2007ء میں اخبارات میں یہ افواہ چھلنے لگی کہ لاہور کی چھٹی ماں اپنی بیٹی کو گواہیں لینا چاہتی ہے لیکن جب اس نے اس بات سے انکار کیا تو اخبارات نے جب ساوہلی۔ اس کی ماں کا کہنا تھا "میں محق ہوں کہ لاہور خوش قسمت ہے کہ اسے انجلیا نے گواہ لے لیا ہے۔"

انجلیا کی ملاقات اور پھر وہ اس پر ملاوٹی نژاد لاکر براڈ پٹ سے کیسے ہوا، یہ جاننے کے لیے ہم کچھ نیچے چلے

گیا۔ بین الاقوامی فلموں کے لیے کام کرنے کے سوا اس نے اپنے طور پر بھی 2003ء میں ایک خیراتی ملاوٹیشن بنائی جس کا نام میڈوکس جوبلی فائوٹیشن ہے۔ یہ 5 اگست 2007ء تک فعال رہی۔ یہ ملاوٹیشن اس لیے قائم کی گئی تھی کہ کچھ چیا اور اس کے ٹیل مشرقی ملاوٹوں میں ملاوٹی کام کیے جائیں۔

دہلی لوگوں کی خدمت کے سلسلے میں اس نے 2004ء میں سوڈان کے لواحق ملاوٹوں کا دورہ کیا۔ 2005ء میں اپنے بوائے فرینڈ براڈ پٹ کے ساتھ سکیم میں آنے والے زلزلے کے موقع پر گرامی حبیب اللہ کا دورہ کیا اور خواتین اور بچوں سے ملاقات کی۔ اس زلزلے پر اس نے اپنے شو پر دو گھنٹہ کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو ہر شخص کو گھر بنا کر دوں۔ اس نے ایک بچے کو نیکی کو پیڑ میں بٹھا کر آسمان کی سیر بھی کرائی۔ اس کی سیمین نیچے کھڑی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اخبارات نے انجلیا کے اس عمل کو سراہا۔

اس نے انگریزی روزنامہ ایمن کے نمائندے سے کہا کہ زلزلے سے متاثر ہونے والے افراد کے لیے سرودی کے موسم سے پہلے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے درخشاں لوگوں کو شدید مصائب گھیر لیں گے۔ اس ملاقات کے دو روزے کے بعد وہ براڈ پٹ کے ساتھ اسلام آباد گئی اور اس نے صدر پاکستان پرویز مشرف اور ذمہ داران سے بھی ملاقات کی۔

پاکستان سے واپس پر انجلیا نے اقوام متحدہ کو جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا گیا تھا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ ایک کروڑ شہری بھوک سے تڑپ رہے ہیں، اس کے لیے وزیراعظم ہا اس میں شاہی دسترخوان بچایا گیا۔ وزیراعظم کا خاندان اپنے مخصوص طیارے میں سفر کر کے اس سے ملے اور حقے دینے کے لیے آیا۔ یہ رپورٹ بیک ایسا حیران کن ہے کہ انسان کا خون سفید نہ ہو تو اس کے گالوں کی سرخی پوری قوم کو نظر آئے۔

☆☆☆

6 جولائی 2005ء کو انجلیا نے چھ ماہ کی بیٹی لاہور بارے کوادیس لایا ملاوٹوں میں گواہ لے لیا۔ زاہرہ مارا سا میں 8 جنوری 2005ء میں پیدا ہوئی تھی اسے گواہ لینے وقت اس کے بارے میں خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ بچپن ہی سے ایڈز کی مریض ہے مگر بعد میں جب اسے ٹیسٹ کیا گیا تو نتیجہ اس افواہ کے برعکس نکلا۔ انجلیا جب اسے لے کر امریکا آئی تو اسے اسپتال میں داخل کرنا ہوا اس لیے کہ بیٹی پانی اور غذا کی

ہیں۔ 2005ء میں انکیشن فلم "مسٹر ایڈمز" میں بہترین
ہٹ کے ساتھ کام کیا۔ لوگوں کو فلم بہت دل چسپ لگی، اس
لئے کہ ہیرو، ہیروئن حقیقی زندگی میں ایسے لڑنے لڑتے تھے لیکن فلم
میں ایک دوسرے کے مخالف اس لیے ایک دوسرے پر گولیاں
برساتے رہے۔ کیونکہ انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سیکرٹ
ایجنٹ ہیں اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے پر مامور
ہیں۔ ساری دنیا میں اس فلم کا بزنس 478 ملین ڈالر
تھا۔ 2005ء میں ریلیز ہونے والی فلموں میں یہ فلم بزنس
کے اعتبار سے ساتویں نمبر پر رہی۔ ہینس ب انجلیکا کا ٹولی
ہونے لگا اور وہ اداکار کی حیثیت سے بالائی سطح پر پہنچی گئی۔
فلم انڈسٹری کا طعنہ کہیں سے بھی ہو ہالی وڈ یا بالی
وڈ یا کسی اور ملک سے، اسکیڈل ضرور بنتے ہیں۔ ہالی وڈ
ان سب میں بہت آگے ہے۔ گیسر عدالت کی چکاچوند اور
تصویر میں رہنے کا جنون اداکاروں سے سب کچھ کراتا
ہے۔ 2005ء کے ٹوائس میں انجلیکا پر ایک بار پھر الزام
تراشیاں مائد ہونا شروع ہو گئیں۔ سب اس پر الگ الگ افوا
رے اور بیٹیاں بجا رہے تھے۔ پریس سب سے آگے آگے
تھا۔ انہوں نے سارے لے داؤد خبریں لگانا شروع کر دیں کہ ہمال
ہٹ جو بڑا ٹولی اداکار ہے اس نے اپنی بیوی جیلر ہر مشون
کو اس لیے طلاق دے دی ہے کہ وہ انجلیکا کی اداکار کا بیڑ
ہو چکا ہے۔ ان کے درمیان پھوٹی چمک رہی تھی اور کچھ کچھ
ہو رہا تھا۔ اخباری لہر اس سے جب چٹکیاں لینے لگے تو انجلیکا
صاف کمر کی مگر جب بات بڑھ گئی اور دونوں جتنے مسکراتے
دیکھے مجھے پھر انہیں کسی نے گلے میں بائیں ڈالنے بھی دیکھ لیا
تو انجلیکا کو اعتراض کرتے تھے "ہاں، میں ایک دوسرے
سے محبت ہو گئی ہے۔"

یہ اعتراض اس نے شوٹنگ کے دوران ایک سیٹ پر
کیا تھا۔

ولیم براڈ لے ہٹ 1983ء میں پیدا ہوا تھا۔۔۔
پیدا ہونے امریکن ہے۔ اداکار کے علاوہ فلم ساز بھی ہے۔ اسے
چار بار آکئڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا جا چکا ہے اس نے
ایک بار گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کیا ہے، لیکن پانچ بار
نامزد ہوا۔ میڈیا نے اسے "دنیا کا سب سے بڑا شیش
انسان" کا خطاب دے رکھا ہے۔ وہ اداکار، ماہر پیدا ہوا تھا
اور اس کا باپ ہالی وڈ اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کے علاوہ وہ
ایک ڈک ٹیپ کا مالک بھی تھا۔ براڈ ہٹ نے کلاچ ہائی
اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم سرگرمیوں کے علاوہ اسے

گولف، ہیراکی، ٹینس اور رسلنگ سے دل چسپی تھی۔ وہ
کمبل کے علاوہ اسکول کے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیا
کرتا تھا۔ اسے ابتدائی سے موسیقی سے بھی دل چسپی
تھی۔ ہالی وڈ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اس نے یونی
ورسٹی آف مسوری میں صحافت میں داخلہ لیا۔ اس کا ارادہ تھا
کہ وہ صحافی بنے گا اور اس کے بعد وہ اپنی تعلیم اپنی ایک
اشہقاری کبھی مکمل لے گا۔

تو اس نے بہت سے ڈراموں میں حصہ لیا۔ پھر
اچانک بیٹھے بٹھائے نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ
اس نے فلم اداکار بننے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈگری کی تعلیم مکمل ہو گئی
تھی، لیکن ڈگری ملنے میں دو دن تھے کہ وہ مسوری سے لاس
انجلس چلا گیا اور اداکاری کی تربیت حاصل کرنے لگا۔ اس
کے بعد جب وہ آکئڈمی سے باہر آیا تو اسے فلموں میں
چھوٹے چھوٹے کردار ملنے لگے۔ اس کے بعد ایک ٹیلی
ویژن کبھی نے اسے اپنے ڈرامے میں کاسٹ کر لیا۔ رفتہ
رفتہ ہدایت گذروں نے اس میں اداکاری کے جوہر دکھ کر
ہیرو کی حیثیت سے بھی فلموں میں کاسٹ کرنا شروع کر
دیا۔ مگر عرصہ تک کام کرنے اور کیمبرے کے سامنے آنے
کے باوجود اس کی فلمیں نہ تو اچھا بزنس کر رہی تھیں اور نہ
ناقدین اس کی تعریف میں غلابے مار رہے تھے۔ البتہ
چند فلمی صحافیوں نے یہ اعتراض ضرور کیا تھا کہ اس میں نیکیں
اکثر ہے اور وہ خواتین کے لیے کشش کا باعث ہے۔ قسمت
کی دیوی کو اس پر رحم آگیا۔ 1995ء میں بننے والی فلم
"سیدنا" میں اس کی اداکاری کو سراہا گیا اور اس فلم نے
ساری دنیا میں 327 ڈالر کا بزنس کیا۔ کچھ میں کئی فلموں
میں اس کی اداکاری تیسرے نمبروں کو پسند نہیں آئی لیکن جب
اس کی فلم "ہائینگ" کا کوڈ "ٹینس" کے عالمی قسمی میلے میں
پیش کی گئی تو سب نے اس کی تعریف کی اور اسے "بڑا اداکار"
تسلیم کر لیا۔ پھر اسے جولیا رابرٹ بھی بڑی اداکاراؤں
کے ساتھ کاسٹ کیا جانے لگا۔ اس کی فلم "ادھوا لہون" نے
بکس آفس پر کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس فلم نے
ساری دنیا میں 450 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ براڈ ہٹ نے
لوگوں سے اپنا لودا منوالیا اس کے بعد فلم "لڑائے" بنا
شروع ہوئی جس کے لیے اس نے چھ ماہ تک ششیر دلی کی
ترویج حاصل کی۔ یہ فلم ریلیز ہونے پر براڈ لے ہٹ کے
کیریئر کی بہترین فلم قرار دی گئی۔ اس کا بین الاقوامی بزنس
497 ملین ڈالر تھا۔

وہیہد کے لیے قائم کی گئی تھی۔ انجلینا بائاس کی کارکردگی سے
عالمی نہیں تھی، اس لیے اس نے 2007ء میں اکثریتی
ایئرنگ کے تعاون سے بچوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے ایک
فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھی جو بنگ کی بھلائیوں کے سبب تعلیم کے
میدان میں پیچھے رہ گئی تھی۔

اب تک اس نے بچوں کی تعلیم میں کام کیا تھا اس کے
تفاکر میں تنقید کاروں نے لعل کیا تھا کہ وہ درجہ لڑائی کی
بیرونی ہے۔ اسے اداکاری کرنا آتی ہے۔ چنانچہ اس
تجربے کی بدولت اس نے اسے ہالی ووڈ کے بڑے اداکاروں
کے ساتھ کاسٹ کیا جاتے گا۔ 2006ء میں اسے "گڈ
شیفرڈ" میں رابرٹ ڈی نیرو کے مقابل کاسٹ کیا گیا۔ یہ
فلم سی آئی اے کی لڑائی تاریخ سے متعلق تھی۔ اس فلم کی
کہانی سی آئی اے کی ایک افسر ایڈورڈ ڈیسن نے لکھی
تھی۔ تنقید کاروں نے انجلینا کا رول پسند کیا۔ گولڈن گلوب
نے لکھا کہ وہ یقیناً دیکھنے والوں کی ہمدردی میٹ
گی۔ فلم میں اس کا کردار حقیقت سے بالکل قریب ہے۔

اب تک اداکاری کرتے ہوئے اس نے کافی وقت
گزار لیا تھا۔ چنانچہ انجلینا نے ہدایت کاری کی طرف توجہ دی
اور 2007ء میں ایک دستوری فلم "اے ٹی ایس ان
پارٹ" بنائی، جو اس نے ایک فلمی میلے میں پیش کی۔ فلم پسند کی
گئی اور فلم سٹی نے فیصلہ کیا کہ ساری دنیا میں اس کی لڑائی
کی جائے۔ صرف سینما ہالوں میں نہیں اس کی لڑائی
اسکولوں میں بھی کی جائے۔

2007ء میں اس نے "ٹائیٹی ادا" میں اپنی
اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ فلم پاکستان میں ہونے والی
دہشت گردی سے متعلق تھی۔ وال اسٹریٹ جرنل کے رپورٹر
ڈیوئل پیل نے لکھا کہ انجلینا نے اپنا کردار بہتر طریقے سے
نمایا ہے اور فلم براس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ انجلینا کو
اس فلم میں گولڈن گلوب ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔

2008ء میں وہ ایک انکسٹن ٹیکر وولف کی بیرونی
تھی جو بڑک لڑکے بول پر مبنی تھی۔ فلم کامیابی سے منسلک
ہوئی اور اس نے ساری دنیا میں 342 ملین ڈالر کا کاروبار
کیا۔ اخبارات اس کی تعریف و توصیف سے بھر گئے۔ وہ
جدھر سے گزرتی تھی کیمروں کے پس منظر پر چمکتے گتے تھے۔

2008ء میں بننے والی ایک ایلی میڈ فلم "سنگ نو
پاڈ" میں ماسٹر نیگرس کے کردار کے لیے انجلینا نے اپنی
آواز دیکارڈ کرائی۔ اس فلم نے ٹیکس ادا کرنے کے بعد

مسٹر ایڈ مسز اسٹو میں اس کے مقابل انجلینا جولی
بیرونی تھی۔ اس کی کہانی کسی کو پسند نہیں آئی لیکن اس فلم نے
ساری دنیا میں اداکاری بڑھائی۔ اس کے بعد ہی انہوں نے
ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ 2005ء میں انجلینا نے ایک پریس
کانفرنس میں کہا "اگر میں ایک شادی شدہ مرد کی طرف
ملتفت ہوں تو یہ کوئی شرم ناک بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ
میرے باپ نے میری ماں کے ساتھ بھی حرکت کی اور
دھوکے بازی کی تھی۔ میں یہ بات کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں
اس میدان میں تنہا نہیں ہوں۔ مجھ پر بھروسہ رکھیں جو خود
صاف سترا اور پاکیزہ ہوں۔"

انجلینا جب اس بچی زلیخہ کو گود لینے استو پیا جاری
تھی تو براڈ لے پٹ اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے بعد
میں انکشاف کیا کہ صرف اسی نے نہیں بلکہ براڈ لے پٹ
نے مشترکہ طور پر اس بچی کو گود لینے کا منصوبہ بنایا
تھا۔ براڈ لے پٹ کی پیشگی سکرٹری نے ایک بیان جاری کیا
کہ براڈ لے پٹ۔ میڈکس اور زلیخہ دونوں کو گود لینا
چاہتا ہے۔ چنانچہ انجلینا نے حکومت کو درخواست دی کہ
قانونی طور پر گود لینے والی کا نام صرف انجلینا کے بجائے
انجلینا براڈ لے پٹ لکھا جائے۔ یہ درخواست 19 جنوری
2006ء کو منظور کر لی گئی۔ اس طرح سے دونوں عیا ان
بچوں کے قانونی والدین بن گئے۔

وہ دونوں ساتھ رہائش اختیار کیے ہوئے تھے لیکن
انہوں نے اپنے رشتے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ بچی کی
پیدائش کے سلسلے میں نہیں گئے۔ 27 مئی 2006ء کو انجلینا
نے ایک بچی کو جنم دیا جس کا نام اس نے شیلو ڈوڈل جیوڑ
کیا۔ یہ نام اس نے انجیل مقدس سے لیا تھا۔ براڈ لے پٹ
نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کی بچی کے پاس نیبیا کا
پاسپورٹ ہوگا۔ انہوں نے بچی کی تصاویر کسی خود نوکرانہ کو
انارنے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ جب میگزین پبلیک سے
معاہدہ ہو گیا تو انہوں نے چالیس لاکھ ڈالر کے بدلے یہ
سودا کیا کہ اس بچی کی تصویر صرف شیل امریکا کے رسالوں اور
الخبریات میں شائع کی جائے گی۔ جب کہ میگزین ایولڈ نے
اس کی حقوق اشاعت برطانیہ کے لیے ساڑھے تین لاکھ
ڈالر میں خریدے۔ یہ ساری رقم افریقا کے خیراتی اداروں
میں صلے کے طور پر خرچ کرادی۔

2008ء میں اس نے ایک اور عظیم سے اشتراک کیا
جس کا نام شیلان چلڈرن سینٹر تھا۔ جو خاص طور پر بچوں کی تلاش

632 ملین ڈالر کا کاروبار کیا تھا۔ اس طرح سے یہ فلم دنیا میں بزنس کے اعتبار سے اس سال ریلیز ہونے والی فلموں میں تیسرے نمبر پر رہی۔ 2008ء میں ہی اس نے گلف ایسٹ ویڈ کے ڈرامے "میلنگ" میں کام کیا۔ اس کی اداکاری ہے حد پسندی گئی اور ناقدین نے اسے سراہا۔ ایک تنقید نگار نے تو یہاں تک لکھا کہ یہ ڈراما ناظرین کے لیے اس طرح ضروری ہے جیسے شام کی چائے!

2009ء میں شائع طاری رہا اور وہ محسن اتارنی رہی۔ 2010ء میں اسے "سالت" نامی فلم میں کاسٹ کیا گیا۔ وہ اس فلم میں سی آئی اے کی سکرٹ ایجنٹ تھی۔ لیکن اس وقت بھاگ دوڑ اور پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی ہے جب اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ KGB کی ایجنٹ ہے اور ڈبل ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہ فلم پاکستان پر کامیاب رہی اور اس نے بین الاقوامی طور پر 294 ملین ڈالر کا بزنس کیا۔ مجموعی طور پر اس کا کردار ناقدین نے پسند کیا اور اس کی تعریف کرتے ہوئے "ٹائم" کا نام تحریر کیا۔ 2010ء میں بننے والی فلم "نورسٹ" اس کی دوسری فلم تھی جس میں نہ تو اس کے رول کی تعریف کی گئی اور نہ اس نے پاکستان آفس پر تسلی بخش کامیابی حاصل کی۔ مجموعی طور پر "نورسٹ" کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ فلم کب ریلیز ہوئی اور کب سینما ہالوں سے اتر گئی، یہ کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔

2011ء میں اس نے ایک ہمارا سفر "تیکری" کی آواز میں اس کردار میں جان ڈال دی۔ فلم کا نام "ٹنگ" فو پاٹھ اوجھڑا تھا۔ یہ 2011ء کی بزنس کے اعتبار سے چوتھی بڑی فلم تھی۔ بین الاقوامی طور پر اس فلم نے پروڈیوسر کو 666 ملین ڈالر کا کر دیے۔ ٹنگ فو پاٹھ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بچوں کے لیے بنائی جانے والی فلم تھی۔

فروری 2013ء میں اعلان کیا گیا کہ وہ دوسری جنگ عظیم کی کہانی پر فلم بنائے گی۔ کہانی لازماً چین براعظم کی تاریخی کتاب سے اخذ کی گئی ہے۔ فلم کا ہیرو بولی وڈ میمنی ہوگا۔

2007ء میں جب لیویا کے علاقے چاڈ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی تو اس نے وہاں کا دورہ بھی کیا۔ 2007ء سے 2009ء کے دوران میں جب دوسری پارکلف میں جنگ ہو رہی تھی تو اس نے عراق کا دورہ کیا۔ وہ افغانستان بھی گئی جہاں امریکی استقامت 2008ء سے 2011ء کے دوران میں ملک پر غیظ و غضب اوجھڑی تھی۔ 2011ء میں جب لیبیا میں انقلاب آیا ہوا تھا تو انجلیا وہاں بھی گئی۔

صابنا مسرگوشٹ

اسے اقوام متحدہ کے خیر خواہ نمائندے کی حیثیت سے منظور العمل خطوں کا دورہ کرتے ہوئے دس برس اور چکے تھے۔ اقوام متحدہ نے 17 اپریل 2012ء میں اس کا مجددیہ حاد دیا اور اب وہ خصوصی قاصد کہلاتی ہے۔ وہ ممالک جو حالت کرب میں چلا ہیں اور ان کا عمل تلاش کرنے کے لیے طویل منصوبہ بندی کرنا لازم ہے جن میں افغانستان اور موزامبیق شامل ہیں۔ وہ خصوصیت سے دل چسپی لیتی ہے۔ اسے کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اس لیے کہ عام لوگ اس سے واقف ہیں اور اسے اپنا مونس و غم خواہ سمجھتے ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مہینوں کی سی میں ورلڈ ریلیز دینے بھی مانتی ہے۔ کیمبری میں جٹا لوگوں کی فلاح کے لیے وہ گاے گاے اعلانات کرتی اور پروگرام بھی بناتی ہے۔ اس نے ایک براعظم کا نام کی جوائن بھیں کا قانونی طور پر دفاع کرتی تھی جو غیر قانونی طور پر امریکا کی سرحد پار کر کے وہاں سکونت اختیار کر چکے ہوں۔

اپنی اپنی مقامی سرگرمیوں کی بنا پر انجلیا ساری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے اور اسے انسانیت کا پیغام بکھاتا ہے۔ اس کی خدمات کے صلے میں اسے 2002ء میں چیمبرز ورتھ سرویس کی تنظیم نے ایوارڈ سے نوازا۔ اسی طرح سے 2003ء میں اقوام متحدہ کو اسپاٹرنٹ ایبوسی ایشن نے اسے سٹیزن آف دی ورلڈ ایوارڈ سے نوازا۔ یہ ایوارڈ پہلی بار کسی شہری کو دیا گیا تھا۔

اس کے ان تیسری کاموں اور پروگراموں کے صلے میں اسے اقوام متحدہ ہی نہیں بلکہ امریکا نے بھی ایوارڈز اور انعامات سے نوازا۔ 2005ء میں اسے گولڈن گلوب ایوارڈ اور ایوارڈ دیا گیا جو اقوام متحدہ اور امریکا کے اشتراک سے دیا گیا تھا۔ 31 جولائی 2005ء میں شانلورڈ مشاہیر نے کپو چیا کے لوگوں کے خدمات کے سلسلے میں اسے کپو چیا کی شہریت عطا کی۔

2011ء میں اقوام متحدہ نے اسے طویل عرصے تک لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے پر ایک شہری پان سے نوازا۔ اب تک اس کا سفر کاسی اور کوستق نہیں سمجھا گیا ہے۔ براڈ لے پٹ اور انجلیا نے اب تک اپنے تصانیف کی نوعیت کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ البتہ جنوری 2006ء میں "نیشنل" نامی میگزین کو اعتراف دیتے ہوئے بتایا کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے شکم میں ایک بچہ ہے۔ سات برس تک ساتھ رہنے کے بعد انہوں نے اپریل 2012ء میں صرف اپنی

اگست 2014ء

118

ملکی کا اعلان کیا۔ اسکیٹل پھیلائے والے اخبارات اور میگزینوں نے انہیں 'انجیلیٹا' (انجیلیٹا اور براڈ ہنٹ کا مرکب) کا خطاب دے دیا۔ یہ ساری دنیا کے پریس کے لیے ایک اذکھا خطاب تھا۔ ان کی شادی کے بارے میں آنے والی افواہیں الزلیہ رقی ہیں اور پریس یہ جانتے کے لیے بہ قرار رہتا ہے کہ وہ شادی کب کریں گے؟ اس بارے میں وہ اپنے قیامات کی بنا پر مختلف تاریخوں کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

15 مارچ 2007ء میں انجیلیٹا نے تین سالہ لڑکے عکس تھا نہیں کو گود لے لیا۔ یہ لڑکا قیاموں کی پرورش کرنے والے ایک ادارے سے لیا گیا تھا جس کا آئس ہو پی کن مویت نام میں تھا۔ پیدائش کے وقت اس لڑکے کا نام لیم تو انک تھا جو 29 نومبر 2003ء کو پیدا ہوا تھا اور اپنی پیدائش کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کے والدین بہرحال کے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

مئی 2008ء میں کانز کے لکسی میلے کے موقع پر انجیلیٹا نے اس کی تصدیق کی کہ وہ جڑواں بچوں کو جنم دینے والی ہے۔ وہ ہفتوں بعد اس نے انہیں ہٹرائس کے ایک سائل اسپتال میں داخلہ لیا اور 12 جولائی 2008ء کو ایک بچے اور بیٹی کو جنم دیا۔ ان کی تصاویر کچھنے کے لیے پھیل کر دیو بولو میگزین کو اشاعت کے حقوق ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر میں دیے گئے۔ بعد میں یہ ساری رقم جولا ہٹ فاؤنڈیشن میں جمع کرا دی گئی۔ ایسوی ایلیڈ پریس نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ایسا معصوم ہوتا ہے کہ یہ ظالم بیوروکریٹ کے بعد دنیا کا قیمتی ترین اور مقدس بچہ ہے۔

2010ء میں برطانیہ کے اخبار نے یہ خبر کا دی کہ براڈ ہنٹ اور انجیلیٹا اب فلیمر کی اقدار کرنے والے ہیں۔ امریکا اور یورپ میں سنسنی دور لگی اور ان کے چاہنے والوں نے فون کر کے ان کا ناخوش بند کر دیا۔ انجیلیٹا نے یہ خبر پڑھی تو غصے میں آگئی اور اس نے کہا کہ خبر میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ لہذا اخبار کو چاہیے کہ وہ معافی مانگے اور جرم ادا کرے۔ اخبار نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جرمانہ ادا کرے تو دور کی بات، اس نے معافی بھی نہیں مانگی۔ چنانچہ انجیلیٹا نے اس پر مقدمہ دائر کر دیا۔ تب اخبار کے مالکان نے نہ صرف معافی مانگی بلکہ جرمانہ بھی ادا کیا۔

16 فروری 2013ء کو جب کہ انجیلیٹا کی عمر 37 برس تھی اسے سینے کے سرطان پہلا بار پانے کے لیے

دونوں پستانوں کو سرجری کے ذریعے سے نکال دیا۔ ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے سرطان ہونے کے 87 فی صد امکانات تھے جو اب گھٹ کر پانچ فی صد رہ گئے ہیں۔ جب ڈاکٹروں نے اس کی فیکل ریپرٹ طلب کی تو معلوم ہوا کہ اس کی ادا کاروں میں مارشلائن 56 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ (اس کا انتقال 27 جنوری 2007ء میں ہوا تھا) جب کہ اس کی بیٹی بھی 45 برس کی عمر میں رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھی۔ اس کی ایک خالہ 61 برس کی عمر میں 2004ء میں موت کی نیند سو گئی تھیں، سبب رحم کا سرطان ہی تھا۔ انجیلیٹا نے سرجری کرائی تو سرطان ہونے کے امکانات کم ہو گئے۔ البتہ اس کی ماں اور خالہ رحم کے سرطان سے ہلاک ہوئی تھیں اس لیے جینیاتی طور پر اسے بھی رحم کا سرطان ہونے کے 50 فی صد امکانات تھے!

اس نے اپنے بیان میں کہا "میں نے اس بات کو دانا میں نہیں رکھا کہ میں سرطان کا شکار ہو سکتی ہوں۔ اس لیے کہ دس ملک میں نیگروں کی خواتین موجود ہیں جنہیں یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرطان کا شکار ہو سکتی ہیں۔ انہیں اس سلسلے میں ہوشیار ہونا چاہیے اور گاے گاے اپنا جینیاتی ٹیسٹ کرانا چاہیے۔ جب انہیں اس کا علم ہو جائے تو اس کا حق القدر علاج کرنا چاہیے۔ باہمی کفر ہے۔ ہمیں اس موذی مرض کے خلاف ضرور جنگ کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہیں ٹیسٹ سے بھی مدد لینا چاہیے۔" سوری طور پر اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ میں اسے بھی رحم کا سرطان نہ ہو جائے ماس لیے کہ اس کی ماں اور بیٹی بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ لہذا انجیلیٹا نے اپنا رحم بھی نکلا دیا۔ اب اس کے پاس اولاد ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔

ناظم نے اپنے ٹائٹل پر اس کی تصویر اور اندر کے صفحات پر ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں بتایا گیا کہ اس نے جننے بھی ٹیسٹ کیے وہ اس بات لائٹ میں کرائے ہوا کہ عام لوگ بھی اس مرض کو پیشہ نہ رکھیں اور اس سے آگاہی حاصل کریں۔ لوگوں نے اس کے اس اقدام کو بہت پسند کیا۔

انجیلیٹا کا کہنا ہے کہ جب اس نے اب تک پنک سے کوئی بات نہیں چھپائی تو اب کیا ہوا ہے؟ اس کو سرطان ہونے دس برس گزر چکے ہیں۔ اس نے سلسلے میں کسی نامحسوس کی خدمات حاصل نہیں کی ہیں۔ اگر کچھ کہا مقصود

ہوا تو اس نے پرٹس سے براہ راست کہہ دیا۔ مثال کے طور پر اس نے جتنے بھی عشق لڑائے وہ طشت لادہم کر دیے۔ اپنی دوہری جنسی حرکات کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ اس نے اب تک جو نظر بالائی کی اس ہارے میں بھی لوگوں کو آگاہ کر دیا۔

میڈیا اس کے خدو خال اور جسمانی خاصیت کی تعریف میں مطلب اٹھان رہا ہے اور اسکو آئر، چیل، ہیلو، ہارپر ہارڈر ایسٹائر اور ویٹنی فیئر نے اسے دنیا کی حسین ترین خاتون اور سب سے زیادہ جنسی کشش رکھنے والی خاتون قرار دیا۔

پرٹس زیادہ تر اس کے جسم پر گدھے ہوئے نشانات (TATTOOS) کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور اس بارے میں سوالات کرتا رہتا ہے۔ ایک بار انجیلیٹ نے گن کر بتایا کہ اس کے جسم پر چودہ نشانات ہیں۔ لیکن میں سوائیک تو لائٹنی کہاوت ہے، دوسرا انجیلیٹ ولیم کا قول ہے، اس کے علاوہ ایک شیر کی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اپنے جینے کی پیدائش کا نام اور اپنے منگیتیر برائے پٹ کی تصویر ہے۔ بہت سے نشانات کو اس نے لیڈر سے قلم کر دیا ہے جس میں اس کے دوسرے شوہر ملی باب کا نام شامل ہے۔

اس کے پاس پرائیویٹ پائلٹ کا لائسنس ہے اور ایک انجن کا چھوٹا طیارہ لائسنس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طیارہ اڑا سکتی ہے۔

اس وقت وہ دنیا کی پسندیدہ ترین ہستی ہے۔ جب اس نے 2006ء میں آسکر ایوارڈ حاصل کیا تو اس وقت دنیا کے 89 فی صد افراد اس سے واقف ہو چکے تھے۔ 2006ء میں ٹائم میگزین نے 100 سب سے زیادہ بااثر شخصیتوں کی فہرست بنائی تو اس فہرست میں انجیلیٹ جولی کا نام بھی شامل تھا۔ میگزین فوربس کے اعداد و شمار کی رو سے وہ ہالی ووڈ کی 2009ء سے 2011ء کی سب سے زیادہ سعادتمند پانے والی اداکارہ ہے۔ جب کہ اس کی اوسط آمدنی ٹین کروڑ ڈالرس لگانہ تھی۔

انجیلیٹا کے پسندیدہ گلوکاروں میں میڈونا، الیوس پرسلے، فریک سٹارز اور رولنگ اسٹونز شامل ہیں۔ اس نے لوگوں کی ہدایت کاری کی ہے۔ جن میں دستاویزی فلموں کی انٹرویو ہے۔

وہ ایک بڑی اداکارہ ہے اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں سے تجاوز کر چکی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ سوشل فون نہیں رکھتی۔ وہ نکائی پر گزری نہیں جاتے حتیٰ کہ اس کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں ہے۔ اس کا ایک

فیئر ضرور ہے لیکن اس نے اپنی پبلیٹی کے لیے کوئی ایجنٹ نہیں رکھا۔ شہرت خود اس کے تقاب میں رہتی ہے لہذا وہ اپنی شہرت کے اصول نہیں بننا چاہتی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں پبلک پرائیویٹ نہیں ہوں اس لیے ہر وقت گن میں نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے تنہائی بھی درکار ہے۔

ایک بڑے تنقید کار کا کہنا ہے کہ آج کل کے زمانے میں ہر شخص انجیلیٹ کی باتیں کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے 1951ء میں لوگ اڑتے ٹیر کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ اس کے فن کا عروج ہے کہ لوگوں کو اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتے ہیں۔ وہ کیا کھاتی ہے، کیا پیتی ہے اور آج اس نے کیا پہن رکھا ہے؟

اس نے اپنی ماں کے مذہب کے بارے میں بتایا کہ وہ کیتھولک تھی مگر اس نے قادر کے پاس جا کر اعتراف کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ مذہب کیا ہے لیکن اس بارے میں تبلیغی امداد اختیار نہیں کیا۔ اگر کوئی چرچ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی تو وہ دینی طور پر اسے قبول نہیں کرتی تھی۔ غالباً اسی لیے اس نے مجھ پر بھی دیا تو نہیں لایا کہ میں چرچ جاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہب دینی معاملہ ہے۔ جس کا دل جیسا چاہے کرے، بعد میں خدا تعالیٰ روز قیامت خود اس سے سوال و جواب کرے گا۔

میرا شو ہر برائے پٹ کھلی کر مس پر کتابوں کا ایک فہرست لے آیا تھا۔ اس میں ہم نے دنیا کے سارے مذہب کی کتابیں شامل ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بچوں کو سارے مذاہب کی تعلیم دیں گے۔ وہ چاہیں گے تو ان میں سے ایک کا انتخاب کر سکتے ہیں یا ہمارے مذاہب پر چل سکتے ہیں۔ مگر میں ہم سارے مذاہب کی تقریبات مناتے ہیں۔ ہم انہیں چرچ لے جاتے اور دنیا بھر میں ساری مذاہب کا مذاکرہ میں بھی لے جاتے ہیں۔

میرے بچوں کا خیال ہے کہ خد کی ہر چیز مفید ہے اور وہ بہت خوب صورت ہے۔ جہنم کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ ظلم کیسیر کی طرح ہوگی جہاں ہر طرف محبت پریت ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی جانا پسند نہیں کرتا۔

بچوں کے خیالات معلوم نہیں کیا ہوں گے اور وہ کیا بنا چاہتے ہیں لیکن ہم ان کے لیے آرٹ پسند کرتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا کوئی نہ کوئی بیٹا ہنگامہ ضرور بنائے۔ بچوں کو ہم اچھے لباس پہناتے ہیں اور سحر انگیز لطف

سج کی مٹی تھی۔ حال ہی میں انہوں نے اٹلی کے ملاتے
وینٹو میں ایک اور مکان خریدا ہے جس کا رقم چاراکھ ہے۔

☆☆☆

اس نے ایک فلم کی ہدایت کاری بھی کی جس کا نام
"ان بروکن" ہے۔ یہ "ان دی لینڈ آف بلڈ اینڈ ہنی" کے
بعد دوسری فلم ہے جو اس نے اپنے سرمائے سے بنائی ہے
اور خود ہی اس کی ہدایت بھی دے رہی ہے۔ "ان بروکن" کے
لیے پہلے شوٹنگ جزیرہ ہوائی میں کرنے کا خیال تھا، لیکن اس
کو لوگیشن پسند نہیں آئی اور اب اس نے آسٹریلیا کے کچھ
علاقوں کو شوٹنگ کے لیے چنا تھا۔

پہلی فلم میں انجلیتا کی ہدایت کاری بھروسوں کو بہت
پسند آئی تھی۔ انہوں نے تہرہ کہا تھا کہ جب اداکار کی
حیثیت سے اس کا کیریئر ختم ہو جائے گا تو وہ ایک اچھی
ہدایت کاری ثابت ہوگی۔ محبت اور جنگ کے پس منظر میں
بنائی جانے والی اس فلم نے اچھا بیس کیا تھا۔

دو انٹیلیجنٹ کی شوٹنگ میں بھی حصہ لے رہی
ہے۔ مرکزی کردار انجلیتا ہی ادا کر رہی ہے۔ یہ بھی انہوں
جنگلی ہوئی ہیں کہ ایک فلم ساز 'سالٹ-2' تیار کرنے کا
مضموعہ بنا رہا ہے جس میں وہ ہیروئن کا رول ادا کرے
گی۔ براڈ لے پتھ نے اس کی ماں پر ایک فلم بنانے کا
اعلان کیا ہے جس میں انجلیتا جونی ایلی میں کا کردار ادا
کرے گی، جو روم کے سلطان سے 2007ء میں 56 برس
کی عمر میں موت کا شکار ہوئی تھی۔

وہ بہت پہلو شخصیت کی مالک ہے۔ پرنسپل کا
ٹھکانہ، ٹورڈ کو کولم اور فٹ رکھنے کا خطہ، دوسروں کا دکھ دہانے
والی اور اس سلسلے میں خیرادوں میں کاسٹر کرنے والی، ایچ این
کی نمائندہ، علاقائی کاموں میں پیش پیش، درد مندوں کی
مسجلاہو نہالوں کی خدمت گزار فلموں میں کام کرنا یا ہدایت
کاری کرنا اس کا پیشہ ہے جس سے وہ بچتا نہیں چھڑا سکتی، اس
لیے کہ چنے ٹھکرک نہیں جانتے ہیں۔ انسان بھلے ہی بد وقت
کی دہائی نہ کھائے لیکن اپنے مسائل کو زک نہیں کر سکتا۔ اسی
طرح سے اس کا معاملہ ہے۔ گویا فلم اس کی ضرورت بھی
ہے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنا انجی خدمت گزار کی حیثیت سے
بنا چاہتی ہے۔ اس کے پیش نظر ہے کہ ٹیگ اس کی ساری
باتوں کو بھول جائیں اور صرف یہ یاد رکھیں کہ وہ بد فخریہ سادوم
ہے۔ ٹھکساری اور چارہ ساری اس کا وصف ہے۔

ساتھ ہیں تاکہ ان کی بحالیاتی مس کا دور ہے۔

2007ء میں دیے گئے ایک انٹرویو میں ریلرڈ
ڈائجسٹ کے نمائندے نے اس سے پوچھا کہ جنگلی پارک
میں نے تمہارا انٹرویو لیا تھا تو تمہارے ساتھ صرف ایک بیٹا
میڈ وکس تھا۔ لب تمہارے چار بچے ہیں۔ یہ فیصلہ تم نے
کب کیا کہ خاندان خوب بڑا ہونا چاہیے؟

انجلیتا نے اس کا جواب یہ دیا کہ براڈ لے پتھ حقیقی
معنوں میں ایک سلٹھا اور مقبول آدمی ہے۔ اس کے ساتھ
زندگی گزارتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں کسی دور
سیرے میں پہنچ گئی ہوں۔ براڈ لے پتھ اور مجھ میں ہم
آہنگی ہے۔ سداور میں گھر چلے جڑے کی طرح چاہتے ہیں کہ
ہمارے بہت سے بچے ہوں اور ہم انہیں اسکول لے جائیں
اور بعد میں ان کے کپڑے واشنگ مشین میں ڈال کر
دھوئیں۔ جب ہم ان بچوں کو ہاتھ روم میں لے جا کر غسل
دیتے ہیں تو بہت حرا آتا ہے۔ پہلے تو لکھا مگر اب یہ سب
کچھ اچھا لگتا ہے۔ ہم سارے بچوں کی تنک وقت خدمت
نہیں کر سکتے اس لیے ہم نے 25 آیاؤں کی خدمات حاصل
کر لی ہیں۔ یہ بڑی تعداد ہے لیکن بچے ان سے قابو نہیں
آتے اس لیے کہ انہیں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ بچوں کو
ڈانٹیں یا ماریں۔ بچے ہم سے خوش ہیں اس لیے کہ ہم بچوں
سے دلہانہ محبت کرتے ہیں۔ براڈ لے پتھ کی طرف سے
سب کو پیشنگ کرنے کی اجازت ہے مگر کیڑوں کی نہانے
بچے گھر کی دیواروں پر اپنے آرٹ کے نمونے بکھیرتے
ہیں۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے ہیں انگریز یا گھر میں
تبدیل ہوتا جا رہا ہے ایک نئے بچوں نے اتنا ہونم چایا کہ
وہ آیاؤں کو گھر چھوڑ کر ہی چلی گئیں۔

چھ بچوں کو پالنا آسان نہیں ہے۔ ہم ان کے اخراجات
پر معمولی طور پر ایک کروڑ ڈالر خرچ کرتے ہیں۔ جس میں ہین
کے کپڑے لئے، تعلیم، کھانا پینا، تفریحات اور پرائیویٹ
لیڈن بھی شامل ہے۔ جب وہ سچا اٹھتے ہیں پورے شے کی ہرزہ
پہنتے ہیں تو سب کا مطالعہ طبعہ طبعہ ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے
کہ اظہ افرائی چاہیے، جب کہ دوسرے کا مطالعہ یہ ہوتا ہے کہ
اسے آٹھٹ مار کر دیا جائے۔ تیسرا ایک خوشخبری کے سوا کچھ
نہیں چاہتا۔ اسے شے میں شعلہ بند ہے۔

انجلیتا اور براڈ لے پتھ کا بنیادی مکان لاس اینجلس میں
ہے۔ جب کہ دوسرا مکان قصبہ بریکول ہلر اس میں ہے جو
ایک تاریخی قصبہ ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کی تعمیر 121 قبل



LOUISE L. HAY
YOU CAN HEAL YOUR LIFE

امید پرست

مصائب اقبال

اس نے عصرت بھری دوستی ہوش زندگی گز اری تھی، مصائب اس کے ہمرکاب تھے، غم و آلام نے اس کی مسابراہ زندگی پہ کاغذی بچہ مار کے تھے مگر وہ حوصلہ مند تھی، دکھ درد کے غریب کو وہ ہم ہارنا جانتی تھی، اس نے بسا کر دکھایا، ہر قسم کے مصائب کو چٹ کرتے ہوئے وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

دنیا میں سب سے زیادہ بکے والی کتاب کی سند کا احوال

جاسکتا تھا۔ عرصے سے ہاتھ میں ٹنگ تھا۔ صحت بخیر سے گر رہی تھی۔ سرور، بیٹے میں تکلیف دہ مڑکن میں بخیر کے عارضے نے گھیر لیا تھا۔ اس کے ازدواجی تعلقات شدید کشیدگی کی زد میں تھے، پورے واروہ خودی۔ لیکن احساس

مجبیل کنارے چری کے بخیر کی قنار تھی۔ درشتوں پر گلابی رنگ چھاپا تھا۔ لہنیاں بھول رہی تھیں۔ برقی سر جھکائے شکار پر بھیگ گئی۔ ذہن مصائب میں الجھا ہوا تھا۔ کسی بھی وقت اسے ملازمت سے برخواست کیا

اگست 2014ء

122

ملہنا مسرگزشت

جیسا کہ اسے کھارہ تھا۔ کچ تو یہ ہے کہ وہ دعویٰ سے باز رہی تھی۔

"آؤ۔ کتنا حسین دن ہے۔" اچانک کانوں سے ایک شیریں آواز گرائی۔

وہ چمکی۔ پہلو میں سفید لباس میں بیویں ایک ہیڑھی عورت بیٹھی تھی۔ بال سفید، چہرے پر تھریاں مگر ہنسنے پر چمکنے لگتا تھا۔

"ارادہ کھو تو؟" وہ چمکی۔ "جھیل پر بھی پہلوں کا رنگ اتر آیا ہے۔"

"ہاں۔" ہنسی کی انداز میں مسکرائی اور دل میں کہا۔ محترمہ خود کو میری جگہ نہ کر دیکھیں، پھر پتھروں کی کد نکلنا حسین ہے۔

"بچی گیت گار ہے ہیں۔" عورت نے آسمان کی سمت اشارہ کیا۔ "وہ نگرہات سے آزاد ہیں۔ خط آج میں لندہ ہیں۔"

"کیوں کہ وہ انسان نہیں۔" جولیا نے استہزاء میں کہا۔ "مستقبل کی منصوبہ سازی ہی انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔"

"نہری بیماری بنی۔" عورت کے لیے میں شفقت تھی۔ "نروشن مستقبل کے لیے لمحہ حال کی زمین میں خوش خلقی کا بیج بویا جاتا ہے۔"

جولیا سنبھلی۔ یہ اتفاق وہ پہلے بھی سن چکی تھی۔ شاید اپنی دادی سے سنے تھے یا شاید کسی مذہبی کتاب میں پڑھے تھے۔

"مگر میرے لیے تو لمحہ حال پر بیٹانوں سے بڑے ہے۔" اس نے آہ بھری۔

"نہیں میری بیماری۔" اس نے برقی کے کاغذ پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تو موجودہ لمحے سے مسلسل فرہنگ کا عمل ہے، جو تمہیں دکھ سے بڑا ہے۔ تمہارا جسم تو یہاں ہے مگر ذہن نہیں اور الجھا ہے۔ اگر تم گہرا سانس لو۔ اس بل پر توجہ مرکوز کرو تو یہ گلابی جنت تمہارے سامنے آشکار ہو جائے گی۔"

عورت کا لہجہ جاوڑی تھا۔ برقی نے آنکھیں بند کر لیں۔ گہرا سانس لیا۔ فرحت کے احساس نے یہ عمل دہرانے کی تحریک دی۔ دیر سے آنکھیں کھولیں۔

ہوا کا لطیف جھونکا چہرے سے گھرایا۔ درختوں پر پرندے کی جھار ہے تھے۔ جھیل سے منعکس ہونے والی کرنیں شیفٹ تھیں۔ ایک نٹانے پر جھٹکے۔ پانی کے قطرے موتیوں کی

خروج اس کے پردوں سے بھرے۔ ایک گلابی پھول اس کی گود میں آن کر۔ اس نے پھول ڈال دیا۔ وہ قدرت کا شاہکار تھا۔

"یہ لمحہ۔ خوبصورت ہے۔" اس نے دیر سے کہا۔ آنکھوں میں نمی تھی۔ "آپ کا شکر ہے۔ آپ نے۔" وہ عورت کی سمت مڑی، مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اب وہ وہاں نہیں ہے۔ وہ جا چکی تھی۔

اچانک برقی کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ اس صورت کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ شاید کسی اخبار میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ دوڑی دوڑی مگر سچی۔ آج کا اخبار سامنے بچھا لیا۔ ایک کونے پر اشتہار تھا:

"زندگی آپ کی ہلکے ہے۔" عورت کی تصویر کے ساتھ اس کا نام درج تھا۔ "لوچ ڈالئے۔" آج ابراہام گھن ہاؤس میں اس کا سیمینار تھا۔

"لوچ ڈالئے۔" اس نے نام دہرایا۔ آپ وہ کچھ بڑے کے سامنے بیٹھی تھی۔ انٹرویو پر عورت کا نام ٹائپ کرتے ہی کئی صفحات کھل چکے۔

وہ ایک راج تھی۔ ایک روحانی راہنما۔ ایک زندگی باہر۔ اس کے ذکر کے ساتھ ایک کتاب You Can Heal Your Life کا بھی تذکرہ تھا۔ برقی نے اس کے بارے میں پڑھا تو بھول چکی۔

تیسرا ٹکڑوں نے کتاب کو شیٹن دارالفاظ میں خراج حسین پیش کیا تھا۔ ان کا دعویٰ تھا یہ کتاب ہن گنت انسانوں کی زندگی بدل چکی ہے مگر ان باتوں نے جولیا کو حیران نہیں کیا۔ آخر خیر امر یہ تھا کہ اس کتاب کی اب تک چار کروڑ کاپیاں فروخت ہو چکی تھیں۔ اور یہ ایک ریکارڈ تھا۔ آج سے قبل کوئی سیلف ہیلپ کتاب اس تعداد میں فروخت نہیں ہوئی تھی۔ وہ بوڑھی عورت دنیا کی مقبول ترین لکھاری تھی۔

جولیا نے اخبار کی سمت دیکھا۔ لوچ ڈال کی مسکراتی ہوئی تصویر۔ پہلو میں اس کا بیانیہ "زندگی آپ کی ہلکے ہے۔"

☆☆☆

جوشی وہ اسٹیج پر نمودار ہوئی، ہل تالینوں سے کوچ تھا۔

اس شام ابراہام گھن بل میں جل دھرنے کو جگہ تھی۔ وہ کچا کچا بھرا ہوا تھا۔ برقی اگلی صف میں تھی۔ پہلو میں ایک ضعیف انصریہ قائم عورت بیٹھی تھی۔ زینے پر اُن دونوں کی

ملاکت ہوئی۔ برٹی یوڈی صہرت کو سہارا دیے ساتھ لے آئی۔

”خوش آمدید۔“ لوہڑا کی شیریں آواز ہال میں گونجی۔ ”میں آپ کی آمد کی شکر گزار ہوں۔“

برٹی بھرتن گوش خمی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ آج کچھ الٹا ہونے کو ہے۔

لوہڑا نے پچھرا کا آغاز انتہائی پڑا اثر لفظ سے کیا۔ ”یوڈی بہت سادہ ہے، ہم جو ہوتے ہیں، وہی کاتے ہیں۔“

انگلے سر ملے میں اس نے زندگی بدل دینے والی سادہ مگر اثر انگیز جھنجھکیوں کا تذکرہ کیا۔ غصہ کے متحرک اثرات پر روشنی ڈالی۔ خود سے محبت کرنے، دشمنوں کو محال کرنے کا پیغام دیا۔ آئینہ جی کی مشق کا طریقہ بیان کیا۔ دلائل کے ساتھ مثبت خیالات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ تھی یادوں کے بد اثرات بیان کیے۔ جوں جوں پچھرا کے پڑھ رہا تھا، لوگوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سامعین کے چہرے دکھ رہے تھے۔ وہ سر دھتے۔

”میں اب 87 برس کی ہو گئی ہوں۔“ لوہڑا نے کہا۔ ”میرے آج خود کو پہلے سے زیادہ تروتازہ اور خوش محسوس کر رہی ہوں۔ جانتے ہیں کیوں؟“ اس نے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ”کیوں کہ میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ ہر نیا دن، میری زندگی کا بہترین دن ہوگا۔ آپ بھی خود سے یہ عہد کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیں، ہر ایک خیال ہمارا مستقبل تعمیر کرتا ہے، اس لیے لازم ہے کہ ہم مثبت خیالات کا چاند کریں۔ آمیں، عہد کریں کہ آج سے آپ خوش رہیں گے۔“

اس نے ہاتھ بلند کر لیے۔ ”کیا آپ عہد کرتے ہیں؟“

”ہم عہد کرتے ہیں۔“ لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

”اوہ میں شاید یوڈی ہو گئی ہوں، من نہیں سکی۔“ اس نے تہنید لگایا۔ ”آپ ذرا بھر سے کھلیں گے۔“

”ہم عہد کرتے ہیں۔“ ہال گونج اٹھا۔ ”تو کتا مرکز کچھ موجود ہے۔ ہم اس لیے میں

رہتے ہوئے خود سے محبت کریں گے۔“ لوہڑا نے کہا۔ ہزاروں لوگوں نے ان الفاظ کو دہرایا۔ وہ اپنی نشستوں سے

کھڑے ہو گئے تھے۔ سرت ان کی روح میں دوڑ رہی تھی۔

برٹی پر لوہڑا کے جادوئی الفاظ نے گہرا اثر چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں ایک سسکی

سنائی دی۔ وہ ہنسی۔ یوڈی سیاہ قلم عورت اپنے آنسو پر فحش رہی تھی۔ برٹی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ عورت مسکرائی۔

کچھ دیر بعد برٹی بک اسٹال پر کھڑی تھی۔ سامنے لوہڑا کی مشہور زمانہ جھنجھکی

You Can Heal Your Life لکھی تھی۔ اس پر 40 ویں ایڈیشن کا ٹیک مسکرا رہا تھا۔ اس نے انتہائی تجسس کے ساتھ وہ کتاب اٹھائی۔

”اچھی کتاب ہے۔“ ایک ہائوس آواز کانوں سے گھرائی۔ سیاہ قلم عورت پہلو میں کھڑی تھی۔ ”طریقہ لو،

کھالے میں نہیں رہو گی۔“

”تو آپ نے یہ کتاب پڑھ رکھی ہے؟“ برٹی نے سوال کیا۔

”ہاں۔ شائع ہونے سے قبل اس کا مسودہ پڑھا تھا۔“

”کیا؟“ وہ برٹی طرح چوکی۔ ”مگر۔“

”لوہڑا نے میرے ہی اپارٹمنٹ میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھی تھی۔“ وہ ہنسی۔ ”کچھ لو کہ ہم دونوں بہنیں ہیں۔ فرق بس رنگت کا ہے۔“

”اوہ تو آپ انہیں تب سے جانتی ہیں؟“

”اس سے بھی پہلے سے پیار کی۔“ عورت نے گردن ہلائی۔ ”اس وقت سے جب غلوں نے میری پیار کی لوہڑا کو کچھ رکھا تھا۔“

”دیکھ کر لگا تو نہیں کہ انہیں کبھی غم نے چھوا بھی ہوگا۔“ برٹی کے لیے میں قہر تھا۔

”اوہ۔ تو تم اس کی کہانی سے واقف نہیں۔“ عورت چوکی۔ ”جب تو ہمیں یہ سنی جا رہی ہے۔ یہ الپ ہے۔ کیوں

ہاں ہم ہیرلان میں چل کر نہیں۔“

”ضرور کیوں نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے برٹی نے ایک خاص نوع کا تجسس محسوس کیا۔

☆☆☆

اُسے بد قسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جس رات وہ پیدا ہوئی، چاند کو گرہن لگا۔ اگلے روز اس انجیل میں گرد کا طوفان آیا۔ چار روز بعد اس کے

باپ کو ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ مگر میں قاتل

اس کی وجہ سے بھرا۔۔۔ پورا گھر اتلا سڑب بھہ رہا ہے۔“
 جیٹ ایک کونے میں خاموش اور اداس بیٹھی تھی۔
 میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”اوه بھری بیٹی۔ مجھے دکھ ہے۔“ تومرہی عورت نے
 آہ بھری۔

”آپ کو دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے
 دھیرے سے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں
 ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

☆☆☆

”یہ نہیں تو بہت زیادہ ہے۔ کچھ تو رعایت کیجیے۔“
 ”اس کا تو امکان نہیں۔ آپ کی اور ڈے کیئر سینٹر کا
 رونا کر رہی۔ شکریہ۔“ استقبال پر بھی عورت نے منہ پٹایا۔
 دوسرے جنائے سینٹر سے باہر آئی۔ لویج اگور میں تھی اور
 اپنی ماں کی پریشانی سے علائق اٹھوٹا چس رہی تھی۔

اس نے کچھ اور سینٹرز سے بھی رابطہ کیا مگر ان کی
 فیس میں تکراریں ہوں پر اس پر عمل نہ ہو سکی۔ پھر خوش قسمتی سے اس
 میں سفر کرنے والے اس کی ایک ایسی عورت سے ملاقات
 ہوئی جو اپنے گھر میں ڈے کیئر سینٹر چلاتی تھی۔ اس نے جو
 فیس بتائی وہ نہایت مناسب تھی۔

میں اس کے ساتھ ہوئی مگر جب وہ اس کے گھر پہنچی تو
 اسے شدید دھچکا لگا۔ وہ ایک غریب بستی کی تنگ گلی میں واقع
 چھوٹا سا مکان تھا۔ بچوں کے لیے کوئی بلچہ کمر نہیں
 تھا۔ بس ایک کونے میں چند بھولے کرسیاں اور کھلونے
 رکھے تھے۔

عورت نے اس کی آنکھیں پڑھ لیں۔ ”میں جانتی
 ہوں کہ یہ کوئی اچھا انتظام نہیں، مگر میں تمہیں یقین دلاتی
 ہوں کہ تمہاری بیٹی کا بھرپور خیال رکھا جائے گا۔“
 میں کا دلی تو نہیں مان رہا تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ
 نہیں تھا۔

اس روز وہ دن بھر خاصی بے چین رہی۔ بھٹی کے
 بعد ریٹائرمنٹ سے گولی کی طرح ٹپکی اور اس بستی میں پہنچ
 گئی۔

وہاں ایک حیرت اس کی شکر تھی۔ لویج اس عورت کی
 نگاہ میں کھیل رہی تھی۔

”بہروٹی تو نہیں؟“ اس نے سوال کیا۔
 ”تھوڑی بہت روٹی تھی لیکن پھر کھیل میں لگ گئی۔“
 عورت مسکرائی۔ ”میں نے کافی بتائی ہے بیٹی کر جائے۔“

رہ گئے۔
 لویج کی پیدائش کے ٹھیک اٹھارہ ماہ بعد اس کے
 ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی۔ اس کی ماں بھی ایک
 چھوٹے سے تاریک اپارٹمنٹ میں غفل ہو گئی۔ اس کا اپنا
 کوئی نہیں تھا اور ایسے میں اس کے سر پر ایک بیٹی کی ذمہ
 دہی تھی۔

میں کو ملازمت کی تلاش میں باہر نکلتا پڑا مگر یہاں
 نہیں تھا۔ اس پر دھیرے دھیرے دوسری جنگ عظیم کی
 جانب بڑھ رہا تھا۔ مالیاتی بحران کی ابتدائی علامات ظاہر
 ہو گئی تھیں۔

اسے مشکل ایک ریٹائرمنٹ میں دیکھ لیں کی
 ملازمت ملی۔ تنخواہ معمولی تھی، مگر گزیرے کا امکان پیدا
 ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھی لویج کو کس کے پاس
 بھروسے۔ اس نے پڑوسیوں سے مدد مانگی۔ تمام لوگوں
 نے معذرت کر لی۔ وہ پہلے ہی اپنے مسائل میں الجھے
 ہوئے تھے۔ ایسے میں ایک سیاہ فام عورت جیٹ اس کی
 مدد کے لیے آگے آئی۔ ”تم بے فکر رہو، میں اسے سنبھال
 لوں گی۔“

ملازمت کا پہلا دن دھاڑ سے بھر پور تھا۔ جونہی بھٹی
 ہوئی، وہ اپنی بھانجی اس عورت کے گھر گئی۔ دروازے پر
 لویج کے رونے کی آواز سن لی۔ عورت نے اداس
 مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

”تمہاری بیٹی تو بہت ہی شریر ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”خیر، شریر تو نہیں۔“ جیٹ کی بھو نے منہ پٹایا۔
 ”بس روٹی بہت ہے۔“

جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہی
 تھی، تو بھٹی عورت نے آواز لگائی۔ ”میں کل صبح تمہارا
 انتظار کروں گی۔“

اگلے دن جب وہ ریٹائرمنٹ پہنچی، تو پتا چلا کہ آج
 شام خصوصی دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے، تمام ملازمین کو
 اضافی کام کرنا ہوگا۔

برطانیہ میں حال میں رات نو بجے ہی مہربان جیٹ کے
 گھر پہنچ گئی۔ لویج اس وقت بھی بری طرح رو رہی تھی۔ بیٹی
 کو سنبھالنا سیاہ فام گھرانے کے لیے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

چند روز تو یہ سلسلہ جاری رہا، مگر میں اپنے بعد جیٹ کی
 بھو نے معذرت کر لی۔ ”مما مت بڑا، مگر تمہاری بیٹی روٹی
 بہت ہے۔ میری ماس نے اخلاقیات دتے داری تو لے لی مگر

☆ ☆ ☆

لوہیہ اب بڑی ہو رہی تھی۔

گودہ خاصی خوبصورت تھی، مگر ماں کی توجہ سے عمر دینی کے اثرات اس پر عیاں تھے۔ رنگت زرد۔ جسم تنگی۔ گال ہلکے ہوئے۔

یہی کو بھی اس بات کا ادراک تھا، مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اگر ملازمت چھوڑ دیتی، تو چند روز میں ماں میں شی فالتوں سے مر جاتے۔ 1930 کا قہرناک مالیاتی بحران امریکا پر نازل ہو چکا تھا جس نے کاروبار جہد کر دیا۔ ملازمتوں کا دیسے بھی کال تھا۔

ایسے میں بیسی کی ملازمت مشرقی جرمنی کے ایک نوجوان پولش لڑکی سے ہوئی۔ وہ کسرتی بدن و لالہ ایک لالہ لالی نوجوان تھا۔ لڑکیوں کو بھانا اسے خوب آتا تھا۔ اس نے اپنی چٹکی چڑنی باتوں سے بیسی کو محبت کے دام میں پھانس لیا۔ مصائب میں گہری شریکی اس کی شادی کی پیشکش مد نہیں کر سکی۔ ذہن میں کہیں یہ خیال تھا کہ اس طرح اس کی بیٹی کو ایک باپ مل جائے گا۔ پھر مضامعات میں لڑکے کا راتلی اپارٹمنٹ بھی ہے۔ محبت بھی مل جائے گی۔

بیکاری کے ایک مٹے بعد ہی اسے اشارہ ہو گیا کہ یہ ایک لالہ فیصلہ تھا۔ وہ ایک سخت گیر شخص تھا، جس کے مزاج پر خاگی زندگی کوئی خاص با اثرات مرتب نہیں کر سکی۔ لوہیہ اس کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جب وہ فیصلے میں بے قابو ہو جاتا تو چیخا، چلاتا۔ چیزیں توڑ دیتا۔ اپنی عیالی پر تلخ دیکرتا۔

یہی حالت تھی۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی۔ اب وہ کلی طور پر اپنے شوہر کی محتاج تھی۔ لوہا بعد وہ ایک کارڈ شریکی کی ماں بن گئی۔

یہ واقعہ بھی پولش لڑکی کو بدل نہیں سکا۔ اس میں احساس دے تے وہ اپنی پیدائش ہوا۔ خاندان کی کفالت میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

مالیاتی بحران شدت اختیار کر گیا۔ کھانے کے لالے پڑ گئے۔ مجبوراً بیسی کو بھر ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اب اسے اپنی اور اپنی دلوں غیبوں کی کفالت کرنی تھی۔ پولش لڑکی جو کچھ کھاتا، وہ تو شراب اور جوئے میں الزام تھا۔ لوہیہ اس کے لیے بہ سب بہت جیت ناک تھا۔ زندگی بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی مگر اصل سائل تو ابھی بدتر ہونا تھا۔

☆ ☆ ☆

چونکہ وہ اس تاریک کمرے میں داخل ہوئی، دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ اس کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ مڑی۔ ایک مغربت سامنے کھڑا تھا۔ چہرے پر حیرانیت رکھاں تھی۔

سرمایہ کی اس مخوں شام سات سالہ لوہیہ گھر کے قریب ایک پارک میں کھیل رہی تھی۔ اچانک جیک سامنے آن کھڑا ہوا۔

"کیسی ہو لڑکی۔ میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہارے ڈیڑی بلا رہے ہیں؟" ہونٹوں پر شاعرانہ سنسنی تھی۔ اس کی عمر پندرہ تالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ چہرے پر چٹک کے داغ اور بالاد پر بیٹوئے۔ وہ ایک سول میکانک تھا۔ "کون سا؟" بیسی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔ تمہارے گھر والے آج میرے گھر ہو رہے۔ کیا انہوں نے تمہیں نہیں بتایا؟" چہرے پر مسکونی حیرت تھی۔ "جانے لگ چکا ہے۔ سب تمہارے ہی شکریہ ہیں۔ چلو۔"

مصوم لوہیہ اچپک کے ساتھ ہوئی۔ آگے جو کچھ ہوا، وہ ایک ڈراؤنے خواب کی صورت میں با بریں اس کا تعاقب کرتا رہا۔

اس درمیان۔۔۔ بیسی کو اپنی ہونٹ کا ٹکڑا بتایا۔ اس کی دوج کو چھید ڈالا۔ ایسا زخم دیا، جو برسوں دستار ہا۔ لوہیہ اگر کرتی پڑتی گھر چٹکی۔ دروازے پر دستک دینے کے بعد اسے ہوش نکل رہا۔ بیسی اسے دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اسے گود میں بھر لیا۔ وہ ڈیڑی ڈیڑی لالہ لڑکی کے پاس گئی۔

اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ معائنہ کے بعد اس نے بیسی کو یہ قاتلہ صفت میں جتا کر دیا کہ کسی نے اس کی مصوم بیٹی کی آمدور پڑی کی ہے۔

عورت کو لہجے کاٹوں پر یقین نہیں آیا۔ "مگر یہ کس طرح ممکن..." الفاظ ساتھ ٹھنک دے سکے۔

"ہمیں پالیس میں رپورٹ کرنے ہوگی۔" ڈاکٹر نے بات کاٹ دی۔

جب بیسی کو ہوش آیا، وہ اسپتال کے بستر پر تھی۔ ماں سرانے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بستر کے دائیں جانب دو پالیس ال کار کھڑے تھے۔

پالیس کے سولائز اسے ماضی میں لے گئے۔ اسے وہ اذیت ناک لمحے یاد آئے۔ بیسی رونے لگی۔ اس نے پورا واقعہ منہ دمن بیان کر دیا۔

”جیک... ٹائٹن۔“ پوڈنگل پھر گیا۔ ”وہ میرا دوست ہے۔“

”ایسے معاملات میں قریبی رشتے اور ہی ملوث ہوتے ہیں۔“ تجربہ کار افسر نے کہا۔ ”محترمہ کیا آپ کیس وریج کروانا چاہئیں گی؟“

”ہاں۔ میں اس آدمی کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ عورت نے سر ہلایا۔

اسی رات جیک کو گرفتار کر لیا گیا۔ معاملہ عدالت میں گیا۔ یہ چاہنے کے لیے کہ کیا واقعی بیٹی کی آمدورفتی ہوئی ہے اس کا میڈیکل ٹیسٹ ہوا۔ یہ بیٹی لوہڑا کے لیے ایک انتہائی اذیت ناک عمل تھا، اس دوران بیٹی کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اس پورے معاملے میں پوڈنگل کا کردار خاصا حتمی رہا۔ میڈیکل جانچ والے روز گھر لوٹنے کے بعد جب بھی بیٹی گئی تو دلالتے ہوئے بیٹی کی بدوشی دہرا۔ ”یہ سب اس کا تصور ہے یہ اس کے ساتھ کی کیوں؟“

”کیا؟“ بیٹی پر کھلائی۔ ”لہرے... یہ بیٹی ہے اور وہ درد مند۔“

”کوئی بیٹی نہیں۔ یہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ الفاظ عورت کے دل پر گھونسنے کی طرح گئے۔ لوہڑا بھی سمجھنے میں تھی۔

”پوڈنگل تمہیں شرم۔“ عورت نے کچھ بولنے کی کوشش کی۔ وہی نے اس کے منہ پر پتھر رسید کیا۔

”چپ ہو جاؤ۔ میرے سامنے زبان چلانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ چلا۔ ”یہ اس کا تصور ہے۔ اسے ساتھ جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بے شرم۔“

اس رات لاس اینجلس میں طوفانی ہمارش ہوئی۔ لوہڑا بستر پر پڑی روئی رہی۔ اس کی روح لڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک ڈری ہوئی، اعتماد سے محروم، ٹائٹن لڑکی تھی، جسے کوئی استثنیٰ پسند نہیں کرتی تھی۔

پوڈنگل تو اسے پڑھنے کے تحت خلاف تھا مگر میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ حوصلے طبع کے نہایت بہتر اسکول میں داخل کروایا مگر اسکول کا ماحول اس کے کچھ کام نہیں آیا۔

وہ اندر سے سکھ ہوئی تھی۔ غربت اور بے چارگی اس کے لباس و چال و حال اور اطوار سے عیاں تھی۔ لباس خست ہوتا۔ ہاتھوں کا انداز بھونٹا۔ جوتے پٹھے ہوئے۔ دیگر بچے

ماہنامہ سرگزشت

اس سے دور ہی رہے۔

اسکول سے لوٹنے کے بعد وہ پڑوسی میں ایک بوڑھی عورت کا ہاتھ ٹاپا کرتی۔ اس کے حوص اسے ہر لمحے دس سینٹ ملتے۔ بوڑھی عورت سالگرہ اور کرسمس والے روز اسے ایک ڈالر دیا کرتی۔ ہفت وار ملنے والے دس سینٹ تو گھر کے بجٹ کی تذر ہو جاتے۔ سالگرہ اور کرسمس پر ملنے والے بیسوں سے اس کے کپڑے خرید لیے جاتے۔ اب وہ ڈالر میں اچھی پوشاک کہاں آتی ہے۔

جب لوہڑا چھٹی جماعت میں تھی، اس کے اسکول میں ایک بڑی وجہ کا اہتمام کیا گیا۔ بہت سے بچے گھروں سے ٹیک لے آتے۔ لوہڑا نے بھی ٹیک نہیں چکھا تھا۔ وہ اس کے ذائقہ سے نا آشنا تھی۔ ہیش بیکری کے اندر بچے ٹیک اور میٹریوں کو حسرت سے دیکھا کرتی تھی۔

گوہریت میں خاصا ٹیک تھا مگر اس کا اندرون پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ وہ آج بھی اس خوش شکل شے کو چکھنے سے محروم رہے گا۔

جب استانی ٹیک کے ٹکڑے لیے آئی، تو بچے فستری پر جم پڑے۔ کسی نے وہ ٹکڑے اٹھائے، کسی نے تین۔ لوہڑا اقطار میں آخری تھی۔ جب استانی اس تک پہنچی، ٹیک ختم ہو چکا تھا۔

”لوہڑا، تم رہ گئیں۔ میں دیکھتی ہوں، شاید اور ٹیک ہو۔“ یہ کہہ کر استانی اندر دوڑی۔ کچھ دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ ”سوئی لوہڑا۔ ٹیک ختم ہو گیا۔“

”جی کوئی بات نہیں۔“ آنسوؤں سے اس کی آواز رنہ گئی۔

☆☆☆

زندگی کیا تھی، کنبیل کی زندگی تھی۔ غربت گھر میں پھارنے لگی۔ یہی جہ کچھ کہانی، اس سے پہلے گزرا ہوا ہوتا۔ لوہڑا نے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ ہر معاملے میں چھوٹی بہن کو ترجیح دی جاتی۔ اس کا بچا ہوا کھانا لڑکی کے سامنے رکھا جاتا۔ اسے اسکول سے بھی اٹھایا گیا تھا۔

دو دیر سے دیر سے اس کا سوتا ہوا ایک حیوان میں تبدیل ہو گیا۔ وہ رات گئے شراب کے نشے میں دھت مگر لوٹا اس پر تشدد کرتا۔

اس دور سے لوہڑا کو دھکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان کھولی تو وہ بھی کو طلاق دے ڈالے گا۔ بے چارگی نے

لوہڑا کو اس بڑی طرح گھیر لیا تھا کہ وہ اس فلم کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکی۔ چپ چاپ طرہ سہی رہی، یہاں تک کہ اس کی ہر جڑ پر اس ہوئی۔ اور تب اس کی ہمت جواب دے گئی۔

اس نے روتے ہوئے اپنی دوست جو لیا کو تمام عورتوں سے آگاہ کیا۔ جو لیا ایک نچا اٹھا لڑکی تھی۔ لوہڑا کی آنے والی زندگی میں وہ اہم کردار ادا کرنے والی تھی۔ جو لیا اسے اپنی دہلی کے پاس لے گئی۔ یہ وہی عورت تھی، جس نے کئی برس قبل۔۔۔ کچھ روز قبل لوہڑا کی دلچسپی رکھ لی تھی۔

گو جیٹ خاصا بڑھی ہوئی تھی، مگر اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ "تم تو یہی کیڑی ہو۔" اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "خدا یا۔ کئی بڑی ہو گئیں۔ اس وقت تو تم بہت بڑی کرتی تھیں۔ اب تو نہیں رہیں ہیں؟" عورت کی شفقت کسی مرام کے ماتحت تھی۔ لوہڑا نے اسے اپنے کرب سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے سنی رہی۔ جب وہ کہہ چکی تو عورت گویا ہوئی۔ "تمہاری زندگی سچ ہے میری بچی۔ مگر مرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہے۔ یا تو اس زندگی کو قبول کر لو، یا اسے تبدیل کرنے کے لیے کچھ کرو۔"

"میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیوں نہیں کر سکتیں۔" اس نے جیڑی سے کہا۔ "تم جوان ہو۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا اختیار رکھتی ہو۔ بس تھوڑا ہمت کرنی ہوگی۔ ہائی سب اوپر دلا سنبھال لے گا۔" یہ کہتے ہوئے بڑھیا نے آنکھ ماری۔

لوہڑا بات سمجھ گئی۔ ایک صبح اس نے جیک میں کچھ کپڑے ڈالے اور گھر چھوڑ دیا۔ سیدھی جو لیا کے گھر چلی آئی۔ کچھ روز وہ جیٹ کے درمیان رہی۔ پھر ایک ہفتہ میں ٹھہر گئی۔

اس کی نئی زندگی شروع ہونے لگی۔

☆ ☆ ☆

حالات بیکر تبدیل تو نہیں ہوئے مگر ان میں بہتری ضرور آگئی۔

لوہڑا کو ایک ہفتہ میں دیگر بس کی ملازمت مل گئی تھی۔ دن بھر وہاں کام کرتی۔ رات میں ہائی اسکول کے اجتماعات کی تیاری کرتی۔ احتیاطی بیماری میں ابھی خاصا وقت

تھا۔ وہ اب بھی ایک لڑکی ہوئی، سہی ہوئی لڑکی تھی۔ کوئی آہٹ ہوئی تو اچھل پڑتی۔ کوئی لڑائی تو قہر کھانچے لگتی۔ کوئی محبت کے وہ بول کہہ دیتا تو اس کے سامنے اجیر ہو جاتی۔

بہت سے بد معاشوں نے اسے محبت کے دام میں پھنسا لیا۔ رات بھر کی اور پھر چھوڑ دیا۔ پھر بہت حال تکلیف دہ ضرور تھی مگر ماضی کے برعکس آزادی اور خود مختاری کا ایک احساس تھا۔ مگر یہ احساس اس وقت چمکا چڑھ گیا، جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ حاملہ ہے۔

لوہڑا کے پیروں تلے سے زمین ٹھل گئی۔ اس نے ڈاکڑوں سے مدد مانگ کر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

یہ جو لیا ہی تھی، جو اس موقع پر کام آئی۔ اس نے ایک بے ہولادہ جواز الا عطا کیا، جو بچہ گورنمنٹ کے لیے تیار تھا۔ وہ بچے کی پیدائش تک لوہڑا کو اپنے گھر رکھنے پر بھی راضی ہو گئے مگر شرط یہ تھی کہ لوہڑا اپنے کو جنم دینے کے بعد پھر اس سے کبھی نہیں ملے گی۔

یہ ایک کڑی شرط تھی۔ اسے سخت جکڑے ہوئے ہوا ہوا کوئی ماں کیسے گوارا کر سکتی ہے مگر بچے کے بہتر مستقبل کے لیے لوہڑا کو اس کرب سے گزرنا تھا۔

اپنی سولہویں سالگرہ سے تین روز قبل اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس کے بعد اپنی ماں کی طرح بڑے اور چلے گئے۔

وہ بہت بڑی۔ "آؤ تمہاری بد قسمت ماں تمہیں محبت اور وقت دینے کے قابل نہیں۔ مجھے صاف کر دینا۔" بچہ کے رخسار پر الوہائی بوسہ دے کر اسے جو لیا کے حوالے کر دیا۔

ساتھ قلم لڑکی کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ "میں کے اچھے مستقبل کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔" وہ چار روز ہسپتال میں رہی اور اس دوران میں اس نے چھ ماہ فیصلے کیے۔ ہسپتال سے وہ سیدھی اپنی ماں کے پاس پہنچی۔ کسی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں میری بچی؟" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "تمہاری جدائی میں مجھ پر کتنے ہی عذاب گز رہے۔"

"اب خداؤں کو بھول جاؤ میری چاری، میں۔" اس نے عورت کے آنسو پونچھے۔ "چلو میرے ساتھ۔ اس جہنم میں رہنے کی اب ضرورت نہیں۔"

"مگر... میرا کمر۔ میرا شوہر۔" صہمت منہ بذب تھی۔
 "کون سا کمر؟ کون سا شوہر؟" اس نے تیزی سے کہا۔ "یہ ایک جنم ہے۔ تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔"
 اس نے اپنی چھٹی ہاتھ کو مخاطب کیا۔ "تم بھی میرے ساتھ چلو۔"
 "نہیں۔ میں اپنے گھر کے ساتھ رہوں گی۔" بچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی سمت بڑھی۔ اس اثنا میں نشے میں دھت پڑ چکی گھر میں داخل ہوا۔ کچھ دیر تو کچھ کچھ ہی سا کمر جیسے ہی موجود حال کا اندازہ ہوا، وہ کلب لڑاٹا ہوا اس کی سمت بڑھا۔

لوہے کا کمر تھی۔ اس نے فرار میں اپنی اٹھا کر اس کے سر پر سے مارا۔ پڑ چکی پکڑا کر گرا اس نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ اور اپنی ماں کا ہاتھ تھامے باہر نکل گئی۔

اس نے ایک دوست کے ہونٹوں میں اپنی ماں کے لیے ملازمت کا انتظام کروا دیا۔ ایک اپارٹمنٹ کرایے پر لے دیا۔ کچھ آزادی اور سکون ملا، تو میس کی بے بسی ٹوٹ آئی۔ وہ جتنے سکرانے لگی۔ بڑھی صہمت سے بھی ملنے لگی۔

"بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی لڑکی۔" صہمت ہنس کر۔ "آج تو جشن ہونا چاہیے۔"

ماں کی لڑنے والی سے سبک دہاں ہو کر وہ اپنے اگلے بچے کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نے سامان سمیٹا، اس کے رخصت پر پیرس لیا اور فلا گورڈ لہوئی۔

"میں ہلدوٹ آؤں گی۔" جاتے ہوئے اس نے کہا۔
 "زیادہ سے زیادہ تمہیں ملے۔"

وہ غلط تھی۔ لوہے کا کمر نے 30 برس بعد ہی لاس اینجلس لوٹی۔

☆☆☆

جب اس نے فلا کو میں قدم رکھا، دوسری جنگ عظیم اپنے اختتام کی سمت بڑھ رہی تھی۔

جیسا کہ نئے نئے دہائے جنگی زندگی۔ مگر ماضی اتنی آرام سے کہاں بھیجا چھوڑتا ہے۔ لوہے کا کمر نے ایک عجیب زندگی گزار دی تھی، جس نے اس میں احساس ہے چارگی کا سچا ہو دیا۔ اس کا وہی کی تو بچپن سے تھی۔ کم میں گزرتا کرتے کی

ماہنامہ سرگوشٹ

عادت رائج۔ گواراؤنے خواب دم پڑ گئے تھے، مگر قسم نہیں ہوئے تھے۔ ماضی میں ہونے والے جسمانی درد جانی تکید کا طریت کبھی کبھار سرد راتوں میں پھٹتا، تو وہ ڈر جاتی۔ اکثر بیٹہ کراہتے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر کڑھا کرتی۔

فلا کو میں وہ چھٹی مونی ملازمت کرتی رہی۔ کچھ ایسے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ ایسے نوجوان بھی ملے جو اس سے محبت کے دوسرے تھے۔ جلد کے ساتھ معاملہ آگے بھی بڑھا، مگر جلد ہی لوہے کا احساس ہو گیا کہ انہیں خط اس کے حسن سے سرد کا رہا ہے۔ وہ بھی اس کی طرح غیبیاتی طور پر ٹوٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک ڈراؤنا بچپن گزارا ہے اور اس کے موجودہ رویے ان کے ماضی کے حواس ہیں۔

کتابوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، مگر ہر چندہ صفحات پر بھی ایک طویل مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ جگر کی موت سے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے۔ اس روز بارش ہو رہی تھی۔ بارش رکھتے تک لوہے کا کوئی شہرنا چلا۔ وقت گزری کے لیے ایک رسالے کی دقت گردانی شروع کر دی۔ اس میں ایک معروف مذہبی مبلغ نور من دست بچپن کا مضمون چھپا تھا۔

نور من دلچسپ تھی۔ نور من نے عام پادریوں کی مانند مذہبی مباحث نہیں سمجھنے، بلکہ زندگی میں بہتری کے لیے مثبت سوچ اپنالے اور خود پر یقین رکھنے کا پیغام دیا تھا۔ مصائب اور بری باتوں سے نہات کے لیے اس نے دعا کی تحریک پیش کی۔

اس مضمون نے اس پر گہرے اثرات چھوڑے۔ پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے مصائب شاید اس کے کرب ناک خیالات کا پر تو ہیں۔ اگر اس نے اپنے خیالات نہیں بدلے، احساسِ عراست اور خود الہی سے جان نہیں چھڑائی تو اس کا اختتام کسی ناگہانے میں ہوگا۔

لوہے کا کمر زندگی میں دیر سے دیر سے سدھار آئے۔ فلا کی خیالات کے حامل افراد سے اس نے قائل پیدا کیا۔ رجائیت پسندی میں اٹھتے بیٹھتے لگی۔ اور ان ہی میں سے ایک شخص نے اسے شعلہ وار مٹھو دیا۔

وہ نئی آنکھوں والا ایک بیٹہ مرآدی تھا جو بات بات پر چکا کرتا۔ لوہے کا کمر کچھ کراہنے لگا۔ "لوہے کا کمر کی جینے

اگست 2014ء

129

روز تک خاموش رہنے کے بعد ایک روز پھر... یا سیت لوٹ آئی۔

ابن علی دنوں اس کی ملاقات ایک انگریز بزنس مین ایڈریج ہائے سے ہوئی۔ وہ ایک بااخلاق اور خوش مزاج آدمی تھا۔ اس سے مل کر ایڈریج نے خود سے کہا اصل تہذیب تو انگریزوں میں ہے۔ ہم تو بالکل ہی ناچار اور گنوار ہیں۔

ملاقاتوں میں جلد ہی مسلسل آگیا۔ 1954 میں ایڈریج نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔ اس نے اتنے اچھے ڈھب پر میرے کی انگوٹھی پیش کی کہ لڑکی ششدر ہو گئی۔

شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں شادی کی تقریب کا انتظام کیا گیا۔ ملک کی نامور سیاسی و سماجی اور فلمی ہستیوں نے اس میں شرکت کی۔ جو لیا اور اس کی ماں بھی بھی لاس انجلس سے تقریب میں شرکت کرنے آگئیں۔ جوڑے کو بے شمار تحائف سے نوازا گیا۔

وہ ایک یادگار ایونٹ تھا۔ اگلے کی روز تک میڈیا میں اس کا چرچا رہا۔ شادی کے بعد دونوں کا سلسلہ چل نکلا۔ نیو یارک کی تمام جہلی ملنی ہستیوں نے اس سے ملنے جوڑے کو مدعو کیا۔ عزائم میں کی تقریبات ہوئیں۔

ان تقریبات میں شرکت ایک حیران کن تجربہ رہا۔ میڈیاں اتنی محبت سے پیش آتے کہ وہ نہال ہو جاتی۔ مگر بھی کبھی دل میں احساس کسری کا ناگ سراخانا۔ وہ اس طبقے کے آداب نہیں جانتی تھی۔ اپنی کی طرح دنیا بھر کے موضوعات پر بے لاگ تبصرہ نہیں کر سکتی تھی۔ سیاست کا علم نہیں رکھتی تھی۔ وہ تو ایک عام سی لڑکی تھی جس نے رگ بھین گزانا جو مصائب کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کر سکی، جسے شدید روحانی اور جسمانی تشدد برداشت کرنا پڑا تھا۔

احساس کسری اسے اداسی میں ڈھکیل دیتی۔ بھڑ میں بھی وہ تنہا ہو جاتی۔ لیڈین ایڈریج کو اس بات کا ادراک تھا، وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا مگر برسوں کے زخم چند ماہ میں تو مندلی نہیں ہوتے۔

ایک دن... ایک انوکھا بلوا موصول ہوا۔ انیس دسٹ ہاؤس میں مدعو کیا گیا تھا۔ ڈنروالے روز ہنگی ہنگی بارش ہو رہی تھی۔ صدر امریکا سے ملاقات یادگار رہی۔ قانون اول اتنی سادہ مزاج اور شفیق تھیں کہ ایڈریج کو کسی نوع کی دقت پیش نہیں آئی۔ اس دعوت کے بعد اس نے خود کو بہت ہلکا محسوس کیا۔

”صدر صاحب تو شاندار آدمی ہیں۔“ واپسی میں

”شکریہ میں پہلے بھی یہ سن چکی ہوں۔“ اس نے سر دھری سے جواب دیا۔ یہ سر دھری بلا سبب نہیں تھی۔ لوگ اس کی تعریف کر کے اس کا قرب ہی تو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آدمی لیپن تھا۔ اس نے برا نہیں منایا۔ ”نہیں ہے کہ تم پہلے بھی یہ سن چکی ہو مگر کسی نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ میں اپنے حسن کو مالنگ کی دنیا میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔“

”مالنگ کیا دلایا؟“ وہ چٹکی۔

”ہاں پیاری لڑکی۔“ وہ مسکرایا۔ ”یہ بے کار کی ملازمتیں چھوڑ دو۔ شکاگو سے رشتہ سرفراہ ہو۔ نیو یارک تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

کیا ایڈریج نے شکاگو چھوڑ دیا۔ اس کا جواب اثبات میں ہے۔

☆☆☆

وہاں اردو شاعری، رنگ تھے خوشیاں تھیں۔

ایڈریج کی کمروں کی قہقہہ کار مگر تھی۔ اس نے سرکش لاس ڈیپ تن کر رکھا تھا۔ چہرے پر روشن مسکراہٹ تھی۔ وہ ہلا کی حسین نگ رہی تھی۔

نیو یارک آتے ہی زندگی بکسر بدل گئی۔ پہلے ہی آڈیشن میں اسے منتخب کر لیا گیا۔ اوائل میں نہایت چھوٹے براؤز کے لیے مالنگ کی، مگر جلد ہی اس نے جلد اس میرے کو پہچان لیا۔

کچھ روز بعد وہ کیمبرے کے سامنے کھڑی لوگوں کو ایک مشہور شہید استعمال کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ تیسری بار وہ ایک کاسٹک کپنی کے اشتہار میں نظر آئی۔ پھر تو ایک سلسلہ سا چل نکلا۔ اس نے کل بڑے براؤز کے لیے مالنگ کی۔ اشتہارات میں اس کی تصاویر نظر آنے لگیں۔ مل ہورڈ پر اس کی مسکراہٹ ہلوے بکسیر نے لگے۔

مالنگ کے عوض اسے ٹھیک ٹھاک پیسے ملے۔ اس نے اپنی ماں اور جو لیا کے نام کی تحائف روانہ کیے۔ زندگی اچھی ڈگر پر آگئی تھی مگر اب بھی کسی چیز سے کی کی تھی۔ کبھی کبھار وہ اداس ہو جاتی۔ سچ یا دیں لوٹ آئیں۔ یا دیں لہجہ کے ماتحت ہوتی ہیں۔ ایک ننھی یاد... دوسرے کریمہ منظر کو جنم دیتی ہیں۔ دوسرے منظر سے تیسری تہی جنم لیتی اور اس پر ڈراماٹک طعنی ہو جاتا۔

اپنی قوس ادا دی کے ذریعہ وہ خود کو سنبھال لیتی مگر کی

وقت ختم گیا۔
اس رات خوابان آیا۔ طوں کا طوفان۔ ماضی کے زخم
پھر رسنے لگے۔ بھیا تک خواب لوٹ آئے۔ آہیں
چکھاڑنے لگے۔

ایڈریج دو ماہ کے لیے یورپ کے دورے پر گیا تھا۔
بس اس کے لوٹنے کی دیر تھی، لوہڑا ہر سہولت سے محروم
ہو جاتی۔ پُر آسائش زندگی چھن جاتی۔ پہلا لوٹ جاتا۔

کیا وہ پھر سے شوہر کی دنیا میں لوٹ سکتی تھی؟ انہیں۔
بچوں کے بچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔ اُس کا صحن ماند
پڑ رہا تھا۔

”مجھ سے کہاں غلطی ہوئی؟“ اس نے خود سے سوال
کیا۔ ”کیا میں ایڈریج کی محبت کا جواب نہیں دے سکی؟ کیا
میں نے اُس کا خیال نہیں رکھا؟ میری زندگی کب تک
مصائب بھگتی رہے گی؟“

وہ درہنہ پڑی۔ صدمے سے دل کی دھڑکن رک گئی۔
بہت جھڑک رہی ہو چکا تھا۔ درختوں کی شاخیں ویران
ہو گئیں۔ ہر سہارا ہی گئی۔ ایسے میں لوہڑا کی زندگی میں ایک
عجیب واقعہ ہوا۔

اس نے شوہر سے کہا۔
”ہاں لکل، جب ہی تم لوگوں نے انہیں روٹ دی۔“
ایڈریج نے کہا۔ ”ہم انگریز تو بھئی ملک کے وقار دار ہیں۔“
گاری میں ایک تہہ بند ہوا۔

☆☆☆

وقت کو پیسے پر لگ گئے۔ موسم بدلے۔ ماہ و سال بیتتے
رہے۔

زندگی اپنی ڈگر پر آ گئی تھی۔ کچھ برس بعد لوہڑا نے
ماڈلنگ کی دنیا چھوڑ دی۔ اب وہ ایک خوشگوار ازدواجی
زندگی گزار رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ غم مٹ گئے، مصائب
اُسے بھول گئے ہیں، خوشی وادگی ہے۔ مگر وہ غلط تھی۔ ایک
بھیا تک موڑ آنے والا تھا۔

شادی کے چودہ برس بعد، جب وہ یقین کر چکی تھی کہ
ہر شے درست سمت پر جا رہی ہے، اس کے شوہر نے ایک
کرب ناک انکشاف کیا۔ ”میں کسی اور سے محبت کرتا
ہوں۔“

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ان لگتے ہوئے۔
”مجھے نہیں چھوڑنا پڑے گا۔ آپ کی ایم سو رہی۔“ یہ کہہ
کر وہ چلا گیا۔ اور لوہڑا کو لگا کہ خوشی چلی گئی۔ مسرت کھو گئی۔

طاہر جاوید محسن

ستاروں پر کمند

چاہتوں کو دردِ بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں
کہ انہو نیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں..... مرد و نون کو
کریہ نے دلے لپٹے حوصلے سے انہیں ادا نہ پڑا دیتے ہیں
حسن و عشق اور راتِ بہت و راتِ کثرت کی چاشنی لیے ایک دل ربا داستان

ماہنامہ
سپر سٹارز

کے نئی سہ ماہی جولائی 2014 سے ماحظ فرمائیں



غدا پرک مٹی کی 48 اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے اس کی نظر قدیم طرز کی ایک عمارت پر پڑی۔ دروازے پر Church of Religious Science لکھا تھا۔ لوہے کی عمارت تھی مگر اس وقت وہاں قدر معلوم تھی کہ کسی سہارے کی تلاش اسے عمارت کے اندر لے گئی۔ وہاں حیرت اس کی منتظر تھی۔

وہ کوئی گرجا نہیں تھا۔ لڑکی بیانات کی بجائے وہاں سائنسی اصول زیر بحث تھے۔ فکری حیرانے میں بات اور ہی تھی۔ بادی کی جگہ دستاویز حراج کے حامل اساتذہ تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر شادابی تھی۔ ہر کوئی مسرور تھا۔ لوہے کے عمارتوں نے کہا۔ ”ذرا توجہ دو۔ یہاں کچھ الگ کھڑا ہونا دیکھو۔“

اور پھر ایسا ہوا۔ ایک پیغام اس کے کانوں سے گزرا۔ ”فقط اپنے خیالات تبدیل کر کے انسان اپنی زندگی بدل سکتا ہے۔“

”کیا ممکن ہے؟“ وہ چونکی۔ ایک گہرا سانس لیا۔ توجہ سلائے مرکز کی جو کسی کالج کا پروفیسر معلوم ہوتا تھا۔

”ہمارے نظریات اشیاء کے مانند ٹھوس ہوتے ہیں، وہ نہ صرف ہمارے جسم بلکہ ہمارے ماحول، ہمارے ارد گرد بسنے والوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔“

یہ الفاظ سن کر وہ شیشا گئی۔ ٹھکی پاران خیالات سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ ذہن میں نورمن ونسٹ خلیل کا مضمون گھوم رہا تھا۔

پھر کے اہتمام پر وہ خود کو نسبتاً بہتر محسوس کر رہی تھی۔

وہاں موجود لوگوں سے بات کر کے اسے اندازہ ہوا کہ وہ

لوگ New Thought تحریک کے پیروکار تھے۔ 19

ویں صدی میں شروع ہونے والی اس تحریک میں مذہب کے

روحانی عناصر کو نفیاتی، سائنسی اور فلسفیانہ اصولوں میں

گنبدہ کرپش کیا گیا تھا۔ معرک فلسفی فیکس کس نے اس

تحریک کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ولیم میئر اور ایمرسن کی

تحقیقات نے اسے آگے بڑھایا تھا۔

تحریک کا بنیادی فلسفہ کچھ یوں تھا: ”لاتناقی آفاقی

قوت کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ روح حقیقی اشیاء کے

مانند ہے۔ خیالات روح سے جنم لیتے ہیں، جو ہماری دنیا

میں واقعات کی صورت میں ظہور کر لیتے ہیں۔ مثبت

اور نیک خیالات نہ صرف جسمانی اور نفسی امراض کا علاج

کر سکتے ہیں، بلکہ ہماری دنیا کو بہت سے بہتر کر سکتے ہیں۔“

یہ تحریک پھلتی گئی۔ لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہو گئے۔ تلف ممالک میں اس کے چرچ کھلنے لگے۔ اور بہت جلد ہی اس شام لوہے کی ایسی ہی ایک چرچ میں موجود تھی جس کے پیروکار فلورنس سکول بورڈ ایسٹ ہوجر کے افکار سے استفادہ کر رہے تھے۔ فلورنس کا نظریہ تھا کہ پختہ خیالات انسانوں کی زندگی میں حقیقی واقعات کو جنم دے سکتے ہیں۔ دوسری طرف Religious Science نامی مکتب فکر کی داغ بیل ڈالنے والے اریسٹ کو یقین تھا کہ پاکیزہ خیالات امراض کا علاج کر سکتے ہیں، مذہم بھر سکتے ہیں۔

لوہے کے لیے یہ نظریات جتنے اٹوٹے تھے، اتنے ہی دلچسپ۔ وہ باقاعدگی سے ان اجتماعات میں شرکت کرنے لگی۔ وہ ابھی شاکر و ثابت ہوئی۔ ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ تین ہفتے بعد اس کی حالت خاص تسخیل ہو گئی تھی۔

جلد ہی وہ یہ سمجھ گئی کہ اس کے مصائب کا ڈھنچکا اڑا کر لی اور نہیں، وہ خود ہے۔ وہ اپنی نئی تجربات سے دامن چھڑانے کی بجائے انکی جنت میں منت کر رہی تھی۔ ان کی پھولیں کھڑی رہی۔ سارا گھر ماحول میں ان خوش یادوں نے اٹھ بے، جس سے مزید مصائب نے جنم لیا۔

وہ عمارت اس کا نیا گھر بن گیا۔ زیادہ وقت وہیں

گزرتا۔ جب اینڈریو نے پورب سے لوٹ کر اسے طلاق

دی، وہ ذرا نہیں روئی، بلکہ کھڑی سرکاتی رہی۔ جب اپنے

سابق شوہر کو مضمون پایا، تو آگے بڑھ کر اس کا کامدھا

چھپتا ہوا۔

”میں تمہاری شکر گزار ہوں اینڈریو، تمہارے ساتھ

بہت اچھا وقت گزرا۔ آج ہم جدا ہو رہے ہیں تو میں تمہیں

ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“

اینڈریو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”لوہے کا کل ہی

تھی۔ آج سے کل تو وہ اچھا سے محرم ایک گھبراہٹی ہوئی

عورت ہوا کرتی تھی۔

لوہے نے بات جاری رکھی۔ ”تم ایک ہی زندگی

شروع کرنے والے ہو، اس میں ماضی کی ہر چھائیں نہیں

ہونی چاہیے۔ اسے محبت سے بھرنا۔ غموں سے دور رہنا۔ آج

سے ہم اچھے دوست ہیں اینڈریو۔ اچھا الوداع۔“

یہ کہہ کر وہ اس پر آرائش گل سے گل گئی۔ قہر دور

اینڈریو سے ہاتے ہوئے دیکھا ہوا۔

لوہے نے کی نئی زندگی کا آغاز ہونے کو تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا کرا تھا۔ جام سا بہتر۔ سادہ کی میز۔
الہامی میں چھ دی کپڑے مگر لوح اخوش تھی۔ شاہانہ و برگی
چھوڑنے کا ذرا بہرہ نہ کھینچا تھا۔

وہ تحریک کی سرگرم کارکن بن چکی تھی۔ اس نے دیگر
طالب علموں سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ فصل تین سال
بعد اس نے ان سے انکار کی سیلنگ بننے کے لیے اپلائی کر دیا۔
اس کا ہاتھ قاعدہ نمیبٹ ہوا۔ اعتدال یوز ہوئے۔ جن میں وہ سرخرو
ظہری۔ سب وہ چرچ کی کونسلر تھی۔

یہ ایک نیا سفر تھا۔ ایک نیا آغاز۔ وہ حریت تعلیم حاصل
کرنا چاہتی تھی، سو ریاست آئیووا کی ایک یونیورسٹی کا حصہ
بن گئی۔ وہاں کھدو تھے، جن کے پیش نظر اس نے اپنا
ضروریات کو سیکھ لیا۔ جو کچھ میسر تھا، اس پر قناعت کرنا سیکھ
لیا۔ جتنا کڑھنا ترک کر دیا۔

یونیورسٹی کا تجربہ یادگار رہا۔ وہاں ہر سو پھولوں
خاموشی تھی۔ مرا تھے اور غور و فکر کے لیے بہت وقت میسر تھا۔
شراب نوشی، دھواں اور رقص کی محافل بھی خرافات سے
جان بھوٹ گئی۔

وہ روحانی افکار سے پڑھتی تھی۔ کیمیا، طبیعیات اور
حیاتیات جیسے مضامین ان کے انکشافات کر رہے
تھے۔ روحانی تجربات کے وسیلے قانون کشش اس پر نئے
نئے سنی آشکار کر رہا تھا۔

آئیووا میں حاصل ہونے والا روحانی تجربہ بے یارک
لوتے کے بعد بھی قائم رہا۔ غریب کا بے پناہ شور، بھانت
بھانت کی پولیاں اور سستی گہما گہما اس سکون کو توڑ نہیں
سکتیں۔

وہ ماضی والی لوہا نہیں تھی، جو لوگوں کے سامنے
بات کرتے ہوئے گھبرا جاتی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی
تھی۔ اس نے کونسلنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دیگر افراد کے
برعکس وہ اپنے سے زیادہ سننے پر یقین رکھتی تھی۔ مریض اس
کے سامنے خود کو آرام دہ محسوس کرتے۔ اس کے مشورے ان
پر مثبت اثرات مرتب کرتے۔

اب اس نے عوامی اجتماعات میں بیچھوڑنے شروع
کیے۔ اس کا شیریں انداز، سلجھا ہوا بیان لوگوں کو بہت بھلا
لگتا۔

کچھ عرصے احساس پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔
وہ کرکس کی شام تھا۔ لوہا اکثر کی میں کھڑی تھی۔

ہم ہر طرف گریہ تھی۔ ایک ایک اکٹھا کا ہوا۔ ایک خیال
ذہن میں کوئلہ۔ وہ قلم لے کر بیٹھتی۔ لائبریری کے سفید ورق
پر سیاہ الفاظ ابھرنے لگے۔ اس نے لکھا:

”کئی افراد کا حساب طبعی علاج کے باوجود پائیدار
نہ ہو سکتا ہے۔ صحت حساب ہونے کے باوجود بیماریاں جیسے
حالات بنائے رکھتے ہیں۔ نتیجتاً طبعی علاج بے اثر ثابت
ہوتا۔ کئی کبھار تو مرض لوٹا آتا ہے اور ان کی زندگی جہنم بن
جاتی ہے۔“

لوہا کو پہلی بار اس کا بات کا احساس ایک ایسی
محنت سے مل کر ہوا تھا جو چہرے کی پلاسٹک سرجری سے
گزرتی تھی۔

بچپن میں ہونے والے خوفناک حادثے میں لمبری
اپنے حسین چہرے سے محروم ہو گئی تھی۔ برسوں وہ احساس
کٹری کا شکار رہی۔ وہ تھا اور اس رہتی تھی۔ پھر وہ
پلاسٹک سرجری سے گزری۔ اس کا چہرہ اسے واپس مل گیا مگر
حیرت انگیز طور پر پائیدار کے آسیب سے جان نہیں بھولی۔
احساس کٹری کا مرض اب بھی ساتھ تھا۔

اس محنت سے ہونے والی خوبی گنگو کے بعد ہی
لوہا کو اور پاک ہوا کہ اگر بیماری کا نفسیاتی اور روحانی علاج
نہ کیا جائے تو طبعی علاج و پیر پائیدار نہیں ہوتا۔ پھر اس کا
سامنا ایک لوہا ان سے ہوا، جو کینسر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا
آپریشن ہوا، باسورٹائل دیا گیا مگر وہ ہنوز خود کو بیمار محسوس
کر رہی تھی اور ابھی سٹائپس تھیں۔

بہت غور و فکر کے بعد لوہا نے اس نفسیاتی کیفیت کو
(انگریزی میں برتے جانے والے لفظ Disease کے
وزن پر) ”Dis-ease“ کا نام دیا۔ یعنی ایسی کیفیت جس
میں انسان خود کو بے آرام محسوس کرتا ہے۔

دھیرے دھیرے اس کے مشورے کی قدرتی
ہونے لگی۔ مریضوں کے ذہنی علاج پر توجہ مرکوز کی۔ انہیں
احساس کٹری اور احساس عداوت سے نجات حاصل کرنے
اور خود سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ ان ہی مریضوں کے
علاج کے دوران میں ہی پر آئینہ بنی کی اہمیت آشکار ہوئی۔
مثبت الفاظ مسلسل دہرانے کے عمل کے چاروں اثرات کا
اعجاز ہوا۔

لگ بھگ دو برس وہ مریضوں پر اپنی تکنیک استعمال
کرتی رہی۔ سماج حیران کن رہے۔ اس کا چہرہ ہونے لگا۔
لوگ شفا کی تلاش میں اس کے پاس آنے لگے۔

ان ہی طرح ہے چہرگی کے مرض سے نہات حاصل کرنے والے بھری نے اسے ایک مشورہ دیا۔

"لوہیز، تمہارے الفاظ میں شک ہے۔ خدا نے تمہیں ایک عظیم نعمت سے نوازا ہے مگر یہ بھروسہ ہے۔ ہر کوئی تم تک پہنچ نہیں پاتا، اسے عام کرنا چاہیے۔ کیوں نہیں تم ایک کتاب لکھو۔"

"کتاب۔" وہ زبردست یو یو الی۔ اور ایک منصوبہ بنوانے لگا۔

اگلے عین صبح اس نے اپنے مریضوں کی کیمسٹری کے تفصیلی جائزے میں صرف کیے۔ اندازہ لگایا کہ کچھ خاص نوع کی پریشانیوں، کچھ خاص قسم کے امراض کو ختم دیتی ہیں۔ احساسی راتوں سے سرور قائم لیتا ہے، انتظامی جذبات سے امراض قلب۔ فیصے سے چٹائی متاثر ہوتی ہے اور نفرت سے یادداشت۔

"جب ایک مخصوص فنی خیال ایک خاص قسم کے مرض کو ختم دینے کی قوت رکھتا ہے تو اس بات کا بھی امکان ہے کہ ایک مخصوص مثبت خیال ایک خاص مرض کا علاج کر سکے۔"

اس نے امراض کی فہرست مرتب کی اور ان الفاظ کا تعین کیا۔ جنہیں آئینے کے سامنے کڑے ہو کر دہرائے سو رہا ہے۔ یوں اس کی پہلی کتاب "Heal your Body" مکمل ہوئی۔ یہ کتاب 1976 میں شائع ہوئی۔

اس کاوش کو بہت پسند کیا گیا۔ قارئین کے ساتھ ساتھ ماہرین نے بھی بہت تحریف کی۔ اوتھ چند نے شکایت کی کہ یہ بہت مختصر ہے۔ مثبت الفاظ کا استعمال سو رہا ہے مگر کچھ اور تکنیکوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ کیوں ناں اگلے ایڈیشن میں کچھ اضافے کیے جائیں۔

خیال اس کے دل کو لگا۔ اس نے تیاری بھی شروع کر دی مگر پھر ایک سانحہ ہوا۔ ایک امتحان اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ایک عفریت نے اس پر حملہ کر دیا۔

اس عفریت کا نام تھا کیتھرا

☆☆☆

ادوی کا موسم تھا۔ شام زرد پڑ گئی۔ بیلوں کے پتے ہلچلے تھے۔

وہ ایک طاق پانہ عورت تھی، جس کی کم عمری میں آمدوریزی کی گئی، جس کی مدد پر زخم لگے اور جسمانی

احتمال برداشت کیا، کبھی میں زندگی گزار رہی۔ اور آج وہ ایک نئی شکل کے روبرو تھی جو ماضی کی ہر شکل سے بڑی تھی۔

کینسر کا سودی مرض سامنے تھا۔ تھیں سے چاہا کہ مرض خاصہ بگڑ گیا ہے۔

طالع بہت سہکا تھا اور کامیابی کا امکان خاص کم۔ اسے زندگی کا چراغ بجھتا ہوا محسوس ہوا۔

ریپرٹس میگزین پر بکھری پڑی تھیں۔ وہ اپنے دفتر میں سر خاصے بیٹھی تھی۔

اچانک فون بجا۔ اس نے بے دلی سے ریسیور اٹھا لیا دوسری طرف اس کی ایک کلائنٹ تھی۔

"لوہیز، بیماری لوہیز۔ میں جیسا بول رہی ہوں۔" لوہیز کو یاد آیا کہ جیسا اس کے پاس عورتوں کے درد کی شکایت لے کر آئی تھی۔

"میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "تمہاری کتاب نے میری زندگی بدل دی۔ اب میں کچھ سکتی ہوں کہ میری بیماری کا سبب میرے ماضی کے کچھ تجربات اور فنی خیالات تھے۔ وہ تو شکر ہے کہ تم سے ملاقات ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ میری بیماری، بیماری سے زیادہ بے آراہی ہے۔ وہ تم کیا کہتی ہو اُسے۔" وہ یاد آیا۔ "Disease"۔ کیا خوب نام دیا۔ خیر تو میں اب بالکل صحت یاب ہوں۔ نہ صرف چل، بلکہ دوڑ سکتی ہوں۔ شکریہ لوہیز۔"

"تمہارا شکر جیسا۔" ریسیور دک کر اس نے ایک نظر میز پر پڑی میڈیکل رپورٹس کو دیکھا۔ کھڑکی سے آنے والی کرنیں چہرے پر چڑ رہی تھیں۔

دیر سے مسکرائی۔ خود کو مخاطب کیا۔ "جن نظریات پر تم یقین رکھتی ہو، جن کا پرچار کرتی ہو، انہیں ثابت کرنے کا دلت آن پہنچا ہے۔ جنہیں اس مرض میں جلا تو ہونا ہی تھا۔ تم برسوں ماضی کا یہ جو ڈھولتی رہیں۔ ٹھیک ہے، سچ بولیں، اس درد میں تھی۔ تو اب ان کا مقابلہ کرو۔ چلو کام پر لگ جاؤ۔"

طالع کے پیسے تو اس کے پاس تھے نہیں۔ پھر آپریشن کی کامیابی کا امکان بھی کم تھا، تاہم اس کے پاس مثبت سوچ تھی، جو مایوسی سے کمال کر لے امکانات کی سمت لے آئی۔ اس نے ریسیور شروع کی، تو اندازہ ہوا کہ کینسر کے علاج کے کی فیکری کا یا غیر سائنسی طریقے بھی رائج ہیں۔ کچھ

سے شراب اور اپنے بستر پر پڑی تھی۔ اس نے ایک خوف ناک پیدا دیکھا تھا۔

اس نے تباہی جلا نہیں۔ ٹھنڈا پانی یا مگر مانت میں سرد چار نہیں آیا۔ دھڑکنی چیز تھی۔ جسم کے ہر مسام سے جھینا بہہ رہا تھا۔

اچانک چرچ کی گھنٹی بجی۔ آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا ہوا کتاب مقدس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔
"جب تم اپنے دشمن کو معاف کر دو گے، تو خدا بھی تمہیں معاف کر دے گا۔"

اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ کون سے اصول بھول چکی تھی۔

"اگر تم اپنے دشمن کو معاف نہیں کر دے گے۔" اس نے کتاب مقدس کے الفاظ دہرائے۔ "تو خدا بھی تمہیں معاف نہیں کرے گا۔"

اس نے سر جھٹکا۔ "مجھے نہیں معاف کرنا ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس مرض سے نہایت چاہتی ہوں، بلکہ اس لیے کہ اب میں چاہتی ہوں کہ دونوں بیمار تھے۔ دونوں کی طرح نچ پادوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ انہیں وحشی بنا دیا تھا۔ حیوان کے قلب میں داخل دیا تھا۔ ان کے زلوں کو پتھر کر دیا تھا۔ ورنہ وہ بھی انسان تھے۔"

وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ آسمان پر ستارے دکھ رہے تھے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔

کینسر کی تشخیص کے چوبیس برس بعد اس کا دوبارہ ٹیسٹ ہوا۔ ڈاکٹر سناج دیکھ کر حیران رہ گئے، مگر لوہو اکوٹھلی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ مسکراتی رہی۔

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" ڈاکٹر ہلکا ہلکا۔

"یہ ممکن ہے۔" اس نے کانٹے اچکائے۔ "ذاتی احتیاط سے پیدا ہوئے امراض کا ثبت خیالات سے علاج کیا جاسکتا ہے۔"

ڈاکٹر کھڑا ہلکی جھپٹکا رہا۔ لوہو انے بات جاری رکھی۔ "عادات میں سستی پوشیدہ ہوتا ہے ڈاکٹر۔ اس سائے نے بھی مجھے ایک سستی دیا ہے، ہمیں زندگی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔"

وہ کھینک سے نکل کر سیدھی اپنے اپارٹمنٹ پہنچی۔ بیک تیار کیا۔ اپنے کائنات کے ہم ایک مسٹر کہہ تمام تیار کیا۔
"دوستو، میں کیلینفورڈ گیا جارہی ہوں۔ بے فکر رہیں۔ میں آپ سے رابطہ میں رہوں گی۔ آپ کسی بھی وقت مجھے

ماہرین مخصوص قسم کی غذا کا استعمال مفید خیال کرتے ہیں۔ کچھ رنگوں سے علاج کی حمایت کرتے ہیں۔ کچھ چینی طرح سے علاج کو معاون خیال کرتے ہیں۔

لوہو انے ہر طریقے سے مدد لی۔ غم زدہ رہنے، اپنی قسمت پر رونے، دھونے کی بجائے خود سے ٹوٹ کر محبت کی۔ ہر وقت کے لیے قدرت کا شکر یہ ادا کیا۔ ساتھ اودیہ بھی لیتی رہی۔

ذاتی طور پر وہ خاصا اتفاق محسوس کر رہی تھی مگر جب اگلے میڈیکل ٹیسٹ کی رپورٹ آئی، تو اندازہ ہوا کہ اس کی حالت میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔ تاہم اسے کھارہا تھا۔

یہ خبر ایک دھچکا ثابت ہوئی۔ ذہن حشر ہو گیا۔
"کیا جن نظریات پر میں یقین رکھتی ہوں، وہ بے معنی ہیں، جھوٹ ہیں؟" دل میں ایک اندیشے نے جنم لیا۔
"کوئی بات میں بھول رہی ہوں۔ کوئی بیماری کلیہ، کوئی اہم اصول مجھ سے نظر انداز ہو گیا۔"

کیا لوہو ہوا کسی بکھ بھول گئی تھی۔

وہ تاریک اور سرد رات تھی۔ شام تاریک رہا تھا۔ قبرستان پر گہرا چھایا تھا۔

اچانک کمرے کے درمیان ایک چمک زدہ طریت ظاہر ہوا۔ وہ جیک تھا۔ وہی شخص جس نے انہیں میں لوہو اکوٹھلی نکالتے بنایا تھا۔

وہ اس کی سمت بڑھا۔ خوف زدہ لوہو اتفاقاً مست میں دوڑ پڑی۔ اس کا پاؤں ایک قبر سے ٹکرایا۔ وہ زمین پر آ رہی۔ جب اٹھنے لگی، تو ایک ہلکا آگ۔ کسی نے اس کا پیچہ پکڑ لیا تھا۔ وہ مڑی۔

قبر سے لٹکا ہوا ایک کمروہ ہاتھ سامنے تھا۔ اچانک قبر شق ہو گئی۔ ایک جیت ناک شخص اس سے ابھرا۔
یہ پوچھ گیا تھا۔ اس کا سوتا باپ۔

اس کے سینے پیچھے جیک کھڑا تھا۔ دونوں کے چہروں پر کمروہ مسکراہٹ تھی۔ وہ تیزی سے چلی۔ کچھ دیر دوڑتی رہی۔ پھر ہانپنے لگی۔ ٹانگوں سے جیسے جان نکل گئی تھی۔ وہ ایک درخت سے ٹک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک کمروہ بھی سنائی دی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ جیک شاخوں پر بھول رہا تھا۔ اس نے جست لگائی...

لوہو ادر سے چلائی۔ اس کی آنکھ کھلی گئی۔ وہ پسینے

فون کر سکتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ میرا یوں اچانک جانا آپ کو ناگوار گزرے گا مگر میں معذرت چاہتی ہوں۔ مجھے جانا ہوا۔ آپاں! وطن مجھے یاد ہے۔“

ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے اسے قطعی علم نہیں تھا کہ یہ سفر اسے دنیا کی قبول ترین مصنفہ بنانے والا ہے۔

☆☆☆

اس انجلس سرد تھا۔ بریلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دیر حرکت خطہ انجماد سے گر گیا۔

یہ اس کا آپاں! وطن تھا مگر وہ یہاں تختہ بین افرار کو جانتی تھی۔ ایک اس کی ماں، دوسری بہن اور تیسری چھوٹی۔

اس کی ماں اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ مصافحات میں متعمم تھی۔ بس چھوٹے سے مکان میں اجنبیت چھائی تھی۔

بہن سرد چھری سے ٹل اور ماں سے وہ تو اسے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ یوزمی بھی تیزی سے اپنی بیٹی کی کھور ہی تھی۔ وہ انتہائی خستہ حال تھی۔

وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ دونوں گھٹنوں ہاتھیں کرتی رہیں۔ بائیں کی جھین پادریں کھانگیں۔ بری پادریں سے

انتخاب برتا۔ لوجہ نے اسے یقین دلایا کہ اب وہ آگلی ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بھر وہ چولہا سے ملنے لگی، جو وسطی ملک کے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے خاندان کے ساتھ متعمم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر پھولی نہ سالی۔ دونوں سہیلیوں کی چہرہ ہاتھیں کرتی

رہیں۔ جب جانے کے لیے اٹھی، سیاہ جام عورت نے کہا۔ ”کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک کمرہ خالی پڑا

ہے۔ تمہارا دستر وہیں لگ جائے گا۔“

”تم کیوں زحمت کرو گی۔ میں کرایے پر اپارٹمنٹ لے لوں گی۔“ اس نے تھوڑی مزاحمت کی۔

”جو کر لیں مالک مکان کو درد کی، وہ مجھے دے دیتا۔“ عورت کے لہجے میں شوخی تھی۔ ”نور ہر شام دکان میں

بھاڑا دے دیتا۔“

وہ اپنی دوست کے گنگے لگ گئی۔ واقعی انہیں دوست بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔

لوجہ کے پاس اپنی کتاب کی چند کاپیاں تھیں اور ایک واضح منصوبہ تھا۔ اس نے ہم خیال لوگوں کی کھوج شروع کی۔ وہ ان کے سینما راز اور روک شاہیں میں شرکت کرنے لگی۔ وہ لوگوں سے مدد خیال کرتی۔ اپنے نظریات

اور حیران کن تجربات سے انہیں آگاہ کرتی۔ اپنی کتاب پیش

کرتی۔

اس عرصے میں وہ خوب کھوی پھری۔ روزی سائل کی سمت جاتی۔ لہروں کو کنارے سے گھراتے، پردوں کو

پرواز کرتے دیکھتی۔ اس نے مرکزی علاقے میں ایک چھوٹا سا دفتر لے لیا تھا۔ دیر سے دیر سے لوگ مشورہاں کے لیے

اس کے پاس آتے گئے۔ خریدارک میں جہاں سے پرکھش کا سلسلہ منتقل ہوا تھا وہ یہاں سے دوبارہ شروع ہو گیا۔

وہ حقیقی تجربات سے لیس گئی۔ روحانی احساس الفاظ میں موجزن تھے۔ اس کے افکار کی رسائی بڑھنے لگی۔ اسے

سینما راز میں بہ طور اہمیت رکھنا جانے لگا۔

اسی طرح وہ برس گزر گئے۔ پھر اسے ایک غیر حوالہ فون کا موصول ہوئی۔ دوسری طرف اس کی بہن

تھی اور اس کے پاس ایک لڑکی تھی۔ ”معاذ جیوں سے گر گئی ہیں۔ ان کی کمر کی ہڈی ٹوٹ...“ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ ”وہ شدید تکلیف میں

ہیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا کہ میں کیا کروں۔“

”تم خود کو سنبھالو یوزمی، بہن۔“ اس نے دیر سے کہا۔ ”میں آ رہی ہوں۔“

اپنی ماں سے ملنے سے قبل لوجہ نے اپنی چھوٹی بہن کو گلے لگایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ خود

بھی خاصی بیمار تھی مگر اپنی پریشانوں کا کسی سے تذکرہ نہیں کرتی تھی۔

لوجہ نے اسے حوصلہ دیا۔ بھر وہ اپنی ماں سے ملی۔ اس نے یوزمی عورت کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اس نے دیر سے کہا۔

”کیا تم جی کہہ رہی ہو؟“ عورت کے لہجے میں بے چینی تھی۔

”ہاں، میں جی کہہ رہی ہوں۔“

اس کی کوششیں کارگر رہیں۔ اُمید سے لبریز الفاظ، سادہ سی جھینگوں نے یوزمی عورت پر چادری اثر کیا۔ وہ تیزی سے صحت یاب ہونے لگی۔ ایک ماہ بعد اسے اسپتال سے

فارج کر دیا گیا۔ وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ لے آئی۔ کسی بیمار کی حادہ داری ایک بھاری لاتے داری ہے۔

لوجہ کے پاس ان کا دور یقین کی قوت تھی، مگر معاشی طور پر ابھی وہ مستحکم نہیں ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے کام کے سلسلے میں

اکثر گھر سے باہر ہونا پڑتا تھا۔ ایسے میں ماں کی دیکھ دیکھ کون کرتا۔

ہمارے کامکان ہی نہیں تھا اس نے سر جھکا کر دعا کی۔

قدرت نے ساتھ دیا۔ دورانِ اہداسے سان فرانسسکو میں ہونے والی ایک بڑی ورگ شاپ میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ ایک بڑا موقع تھا، جسے وہ ضائع نہیں کر سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں ماں کا کون خیال رکھے گا؟

ٹیک دلی جو لپانے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ ”تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں یہاں موجود ہوں۔“

یہ سن دینا وہی الفاظ تھے جو اس کی دادی جیو نے برسوں پہلے لویزا کی ماں سے کہے تھے۔

سان فرانسسکو میں اس کی بہت پر برائی ہوئی۔ ایک نئی کتاب کا خاکہ ذہن میں بننے لگا۔

لوئے نے وہ نظم لے کر پیش کی۔ اس نے سلیو کاغذ پر پہلی سطر لکھی۔

”زندگی بہت سادہ ہے جو ہم کائنات کو دیتے ہیں، کائنات ہمیں وہی لوٹا دیتی ہے۔“

یہ اس کتاب کی پہلی سطر تھی... جو لویزا ہمارے کو امر کرنے والی تھی۔

کتاب کی تکمیل میں ایک برس لگا۔

وہ کرائے کا اپارٹمنٹ چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ جاپا کے گھر منتقل ہو گئی۔ دفتر میں بیٹھنے کا دورانیہ مختصر کر دیا۔ اپنی کئی توجہ اور صلاحیت نظم کو سوپ دئی۔ اس دوران میں کئی رکاوٹیں آئی۔ ایک بار اس کی ماں شدید طبل چڑھی، اسے اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ معاشی مسائل بھی تھے۔ پھر لویزا خود بھی ایک ٹریک حادثے کا شکار ہوئی۔ الطرخس کتاب لکھتے ہوئے وہ طرح طرح کے مسائل سے گزری مگر اس نے کسی بھی مرحلے پر لکھنا ترک نہیں کیا۔

کوئی کالوں میں سرگوشیاں کرتا رہا۔ ”یہ کتاب ہر صورت مکمل ہونی چاہیے۔ دنیا کو اس کی ضرورت ہے۔“

1984 میں لویزا اپنے کی دہری کتاب You Can Heal Your Life کا مسودہ مکمل ہو گیا۔ جو سادہ مگر بڑے اثر انگیزیوں پر مشتمل ایک عملی پروگرام تھا۔

کتاب تو لکھی، مگر اسے شائع کروانا ایک بڑا مسئلہ تھا۔ آج کے برعکس اس وقت سلیو ہسپتال میں آتی تھیں لیکن نہیں۔ پھر اس شیعہ پر مرد چھائے ہوئے تھے۔

ملہنا مصغر گزشت

لویزا ہمارے کی تعلیمات

”خود سے محبت کریں۔“ یہی دنیا کی مقبول ترین مصنفہ کا بنیادی پیغام ہے۔ یہ پیغام کو تم بدھ کی تعلیمات کے بے حد قریب ہے، جن میں خدا ان کے لیے اپنی ذات سے محبت کو لازم قرار دیا گیا ہے۔

وہ آئینہ غی کی مشق کا مشورہ دیتی ہے، تاکہ ہم خود کا سامنا کریں۔ اپنی ذات سے فائدہ حاصل کرنے کی بجائے خود کو قبول کرنا سیکھیں۔

وہ عمارت اور احساسِ گناہ سے نجات حاصل کرنے پر زور دیتی ہے۔ خوف، طمع اور انسانی جذبات کو مکمل طور پر روک دیتی ہے، کیوں کہ اسے یقین ہے کہ ان عوامل سے نہ صرف وہ حالی ہو رہی ہے بلکہ ان سے جسمانی امراض بھی جنم لیتے ہیں۔

وہ مثبت خیالات پر یقین رکھتی ہے۔ انہیں دیکھا تو قیادہ برائے کی نصیحت کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کمال انسان بننے کے لیے نہ صرف ہمیں اپنے دشمن کو معاف کرنا پڑے گا، بلکہ اپنی خود مٹائیں بھی معاف کرنی ہوں گی۔ یعنی انہیں بھولنا ہوگا۔

اس کے نزدیک بیماری یعنی Disease وہ حقیقت ہے آرائی کی ہی شکل ہے۔ ہم بے آرائی کے اسباب و محرکات کو ان کا تذکرہ کر سکتے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ جن باتوں پر ہم اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے ہمیں مثبت عوامل پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ وہ برتر قوت پر یقین رکھتی ہے مگر معاف کے نجات کے لیے عملی کوششوں کو اہمیت دیتی ہے۔

خواتین کا اس مسئلے کا تصور ملتا تھا۔

تمام ناشروں نے مصنفہ کر لی۔ ایک نے حضور دیا کہ وہ کتاب سے سادگی نکال دے، سلیو خبری کا تذکرہ لکھے۔ طبعی کہانیاں بیان کرے۔

کیا لویزا ماچس ہو گئی؟ قطعی نہیں۔ کیئر کو شکست دینے کے بعد اب وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ قدرت کوئی نہ کوئی ماہر درکار لے گی۔

اگست 2014ء

137

کئی قلم نگاروں نے اپنی جاتی تھیں۔ مریضوں کا سماجی بائیکاٹ کر دیا جاتا اور یہی وہ اپنی طبی موت سے کل نفسی طور پر مر جاتا۔

جیسے کا خیال تھا کہ لوہڑا اپنے پُر اثر پیغام کے ذریعے نہ صرف ایڈز کے مریضوں میں جینے کی اسٹیم پیدا کر سکتا ہے بلکہ معاشرے میں اس حوالے سے سماجی شعور بھی بیدار کر سکتی ہے۔

خیر خواہوں کا مشورہ تھا کہ لوہڑا کو اس معاملے میں نہیں چڑنا چاہیے۔ ایڈز کے مریضوں سے واسطی اُس کی شہرت کو نقصان پہنچا سکتی ہے مگر اس نے ناسمج کی باتوں پر کان نہیں دھرا۔

اگست کی ایک خاموش شام وہ اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں ایڈز کے مریضوں کے دورِ مہمان ٹیلی تھی۔ اُن کی تعداد چھ تھی۔ چہرہ پر رونا ہی چھائی تھی۔

”ہم نے ستر پر رونا نہ ہونے کو چاہا دوستو۔“ اُس نے ہاتھ دھڑکاتے ہوئے کہا اور ایسے میں اداسی کچھ مناسب نہیں لگتی۔

وہ اُن سے ہاتھ نکلتی رہی۔ انہیں بائیکاٹ کی کھائی سے لگلا۔ جینے کی آس پیدا کی۔ رخصت ہوتے وقت وہ سب خاصا بہتر محسوس کر رہے تھے۔

اگلے ہفتے چھ کی بجائے گیارہ افراد اُس کے اپارٹمنٹ میں بیٹھے تھے۔ تیسرے ہفتے اُن کی تعداد اکیس ہو گئی۔ جبکہ کم ہونے لگی۔ وہ ایک سماجی تنظیم کے ہال میں اکٹھے ہونے لگے۔ پھر ایسا وقت بھی آیا جب اس مرض میں جملہ 800 افراد کو لوہڑا ہانے نے اُسید سے لیریز پیچھے دیا۔

یہ کیسے ہو گیا کی تاریخ کا ایک حیران کن واقعہ تھا۔ اُس گروہ کو ”ہائیر اینڈ سپورٹ گروپ“ کا نام دیا گیا۔ لوہڑا کی خلائی کوششوں نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ ہر جگہ اُس کا جچا ہونے لگا۔ اخبارات میں مضامین شائع ہوئے۔ اور پھر ایک روز... اسے ایک خیر خواہ فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف اوپر ڈھری تھی۔ امریکا کی سب سے بڑی ٹیلی ویژن میوزیاں۔

وہ لوہڑا کو اپنے شو میں مدعو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بہ خوشی ہائی بھر لی۔

اس نے اپنے گروپ کے چند ستر ارکان کے ساتھ شو میں شرکت کی۔ ایک گھنٹے کے اسی پروگرام میں جہاں

اور ایسا ہی ہوا۔ سربا کی ایک ذات اُسے ایک اشارہ ملا۔ وہ ایک خواب تھا جس میں وہ ایک پیشک اُس کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ عمارت کے ماتھے پر لکھا تھا ”ہائے ہائوس“

اگلے صبح وہ نشر و اشاعت کے مجھے پہنچ گئی اور یہ نام رجسٹرڈ کر دیا۔ ہنگ میں کچھ پیسے تھے جنہوں نے خریدا اور پھر کی سست روانہ ہو گئی۔

ماہ دسمبر میں یہ کتاب مارکیٹ میں آئی۔ آگے جو کچھ ہوا... وہ تاریخ کا حصہ ہے۔

کتاب کو حیران کن چہرائی ملی۔ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ”نیو یارک ٹائمز“ کی بیسٹ سلیسٹ میں یہ لگا کر 4 ہفتے پہلے نمبر پر رہا۔

چھ ماہ میں پہلا ایڈیشن مارکیٹ سے غائب ہو گیا۔ ”ہائے ہائوس“ کو بھاری تعداد میں آرڈرز ملے۔ خریدہ ہونے کی دلچسپی دیکھتے ہوئے تمام بڑے بک اسٹورز نے لوہڑا کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے تمام نمائندے انٹرویوز کے لیے دوڑے چلے آئے۔

جلدی ہی اس کتاب کی شہرت ریاست کیلیفورنیا کی سرحدیں عبور کر گئی۔ دیگر ریاستوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

لوہڑا شہر کی مقبول ترین ٹیلی ویژن کی تھی۔ شہرت اور دولت کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی، مگر وہ اپنا اصل فریضہ نہیں بھولی۔ اُس کا مقصد خواتین انسانیت کے کام آتا تھا۔ اس لیے جب جیسٹن اُس کی مدد مانگتے آیا، تو اس نے ایک لمحے کا بھی توقف نہیں کیا۔ فورا ہاں کہہ دی۔ یہ ایک پُر خطر فیصلہ تھا۔

☆☆☆

80 کی دہائی دنیا کے لیے ایک صیبت لے کر آئی۔ ایک نئی وبا کا انکشاف ہوا۔ ایک مرض جس کا کوئی علاج نہیں تھا... ماسوائے موت کے۔

آج تو حالات تھوڑے بدل گئے ہیں مگر اس زمانے میں امریکا میں جب کوئی ایڈز کا نام سننا تھا تو قہر قہر کا پیچ لگتا۔ مریض سے دور بھاگنے کی کوشش کی جاتی۔ ساتھ بیٹنا تو درکنار ایڈز میں مبتلا شخص سے بات کرنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا تھا۔ اسے گناہ گار خیال کیا جاتا۔ اور جیسٹن... اسی موذی مرض میں مبتلا تھا۔

اُس وقت یہ بیماری نئی تھی تھی۔ اس کے حوالے سے

اشاعت کا اہتمام کیا۔ وہ پہلی کتاب سے بھی زیادہ کامیابی
 نصیبی۔ خوب دلوں کو اپنی "طفرہ" "ہائے داس" کا تجربہ
 رجحان ساز ثابت ہوا۔

☆☆☆

کچھ ہی برس میں لوچ ادا نے لے سیلف ہیپ
 انڈسٹری کی صورت بدل دی۔

You Can Heal Your Life کی
 اشاعت سے قبل جب اسٹورڈ میں کشش، تاریخ اور شاعری
 کے قوی کشش ہوتے تھے، مگر سیلف ہیپ کتابوں کا کوئی
 کشش نہیں تھا۔ اس کتاب کو پختہ دلی تا قابل یقین پذیرائی
 کے بعد ہی جب اسٹورڈ مالکان نے یہ کشش قائم کیا۔ کئی بڑی
 دکانوں میں ان سیکھو کا اختراع لوچ ادا نے ہی کیا۔
 سیلف ہیپ رائٹنگ کے میدان میں سے سے لوگ آنے
 لگے تھے۔

اس مرحلے میں لوچ ادا کی دیگر کتب بھی شائع ہوئیں،
 مگر **You Can Heal Your Life** کی شہرت
 ماحول میں بڑی۔ کسی نیا سراوقوت کے سہارے اس کی رسائی
 بڑھتی اور کشش جاری تھی۔ ایک کے بعد ایک ایڈیشن شائع
 ہوتا تھا۔ اس کی شہرت یورپ سے ہوتی ہوئی، ایشیا اور
 لاطینی امریکا میں پھیل چکی تھی۔ کئی بڑی زبانوں میں اس کا
 ترجمہ ہو گیا۔ اس نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں بدل
 دیں۔ دنیا بھر سے لوچ ادا کو احساسی تھکر سے لبریز خطوط آنے
 لگے۔

لوگ اسے اپنی کہانیاں لکھ کر بھیجتے۔ بتایا کرتے کہ
 کیسے ان کی زندگیوں کو برباد اور مصائب میں ابھی تھیں
 اور اس کی کتاب نے انہیں بھرپور بدل دیا۔

سات برس تک وہ ایڈز کے مریضوں کی ملازمہ بہبود
 کے لیے کام کرتی تھی۔ اسی کوششوں کے فیل ان دھکارے
 ہوئے انسانوں کو ساج نے قبول کیا۔ ان کے سلب شدہ
 حقوق انہیں واپس ملے۔ لوچ ادا کو ملٹی ٹیلیوین کی جانب
 سے کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

اس نے جانوروں کی حفاظت اور علاج و بہبود کے
 لیے بھی ایک منصوبہ شروع کیا۔ یہ اس کے کرشماتی پیغام ہی کا
 اثر تھا کہ امریکا کی کئی قدر اور شخصیات اس مہم میں شامل
 ہو گئیں۔ جانوروں کے حقوق سے متعلق قوانین پاس ہوئے۔
 ادارے قائم کیے گئے۔ سماجی شعور بلند ہوا۔

سیلف ہیپ کتب کی تاریخ میں، لروخت کے لحاظ

اگست 2014ء

ایڈز کے مریضوں کے مسائل پر روشنی ڈالی، اور جی ان افکار
 اور تکنیکوں کا بھی ذکر کیا، جو مریضوں کے لیے معاون ثابت
 ہوتے ہیں۔ اس کی کتاب کا بھی تذکرہ آیا۔

شو کے اگلے روز اسے اطلاع ملی کہ جب اسٹورڈ سے
 اس کی کتاب قایم ہوگی ہے۔ لوگ لوٹ پڑے تھے۔
 اس کا شکم ہو گیا۔ "ہائے داس" کو سبے آرڈر موصول
 ہوئے۔ نہ صرف یورپ بلکہ لاطینی امریکا اور ایشیا کے بھی
 چھوٹے پبلشرز نے اس سے رابطہ کیا۔

شہرت نے لوچ ادا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اگلے پختہ اسے
 ڈاکٹر برنی سہگل نے اپنے پروگرام Donahue میں مدعو
 کیا۔ وہیں بھی بہت پذیرائی ہوئی۔ مزید ٹی وی شو سے بھی
 زیادہ آئے۔

اس انجیل کے ایک غریب گھرانے میں آنکھ
 کھولنے والی لوچ ادا کو ہی روز میں ایک سنگ گیر شخصیت بن
 گئی۔ اسے انیکا استادہ قصور کیا جانے لگا۔

کتاب کی شہرت تیزی سے پھیلی۔ فرانس، جرمنی اور
 دیگر یورپی ممالک سے اسے حیران کن کالز موصول ہونے
 لگیں۔ کچھ لوگ ان کا مقامی رہالوں میں ترجمہ کرنا چاہتے
 تھے۔

"خوشی سے کیجیے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس کا پبلشنگ ہاؤس، جسے قائم کرنے کے لیے اس
 نے قرضہ لیا تھا، تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ خط ایک کتاب کی
 اشاعت نے اسے سال میں سب سے زیادہ منافع کمانے
 والے پبلشنگ ہاؤس کی فہرست میں لاکھڑا کیا۔

پھر ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ سیلف ہیپ کے
 موضوع پر کلمہ لکھانے والے سے لکھاری اپنی کتابوں کی
 اشاعت کے لیے اس سے رابطہ کرنے لگے۔ ابتدا میں تو
 وہ تھوڑی حذبذب تھی۔ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اس
 فیصلے کا کیا نتیجہ نکلے گا مگر پھر خیال آیا کہ اگر وہ بھی ان سے
 رائٹرز کا ہاتھ نہیں تھامے گی، تو کون تھامے گا؟ قدرت
 نے اس کی مدد کی، اب اسے اوروں کی مدد کرنی ہوگی۔

پس بھی سوچ کر اس نے اپنے پبلشنگ ہاؤس سے ایک
 نوجوان مصنف کی کتاب چھاپنے پر رضامندی ظاہر کر
 دی۔ پیش لفظ خود لکھا۔ نتائج مثبت رہے۔ لوگوں نے اس
 نوجوان کی فکر کو سراہا۔

ثبت قبول دیکھتے ہوئے اس نے وہ اور کتابوں کی

ماہنامہ سرگشت

[39]

سے لوہیز اپنے لبر پرائیویٹ کی تھی۔ اس نے بچپن میں اور لودھرا
وادی میں جیسے سٹڈی ریزنگار لکھاریوں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیا
تھا۔ 2006 میں اسے ایک الونکھا اعزاز ملا۔ دنیا میں سب
سے زیادہ پڑھی جانے والے خاتون لکھاری کا تاج اس کے
سر رکھ دیا گیا۔

کمیونٹی کے آل ورلڈ ریکارڈ نے تسلیم کر لیا کہ آج
سے قبل کسی ادیبہ کی کتابیں اس تعداد میں فروخت نہیں
ہوئیں۔

اسکے ہی میں ایک دلچسپ معاملہ ہوا۔ دونو جوان
اس سے ملنے آئے۔ ایک ہدایت کار تھا اور دوسرا مصنف۔ وہ
اس کی زندگی کو فلم کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے۔
ان کی ٹیلیویشن سن کر لوہیز اس پڑی۔ "میرے
بچے، یہاں 35 برس کی خواتین کو فلم میں کام نہیں ملتا۔ اور تم مجھ
89 سالہ بڑھیا کو کاسٹ کرنا چاہتے ہو۔"

دونوں لو جوان مسکرائے۔ "جی ہاں، کیوں کہ اس
بڑھیا نے لاکھوں بڑھیاں بدل دی ہیں۔"

2008 میں فلم You Can Heal Your
Life ریلیز ہوئی، جو لوہیز کی کتاب پر مبنی نہیں تھی، اس
کی کہانی اور مصائب کا بھی اعلاہ کیا گیا تھا۔

فلم نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ اثر پر مبنی کے
معاملے میں اس نے کتاب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ لاکھوں
انسانوں کی زندگی بدل دی۔ نیپال کے بیہاڑی طاقتوں
سے جاپان کے بیگار کیمپوں سے، آخری لکھنؤ سے لوہیز کو
شکرے کے پیغامات موصول ہونے لگے۔

فلم کی حیران کن مقبولیت دیکھتے ہوئے لوہیز دلفری
نے اسے دو مشروں بعد پھر اپنے پروگرام میں مدعو کیا۔ اور پھر
اب لوہیز اپنے کی طرح بین الاقوامی شخصیت بن چکی
تھی۔

وہ دونوں بھی دوستوں کی طرح ہیں۔ پروگرام کے
شرکانے ٹکڑے ہو رہے ہیں کا استقبال کیا۔

پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوا، لوہیز کی کتاب میں نئی مدد
آئی۔ وہ مشروں میں وہ نڈیادک، ٹائٹلرک بیسٹ سٹریٹ میں
14 تھے نمبر ون رہی تھیں۔ اس بار وہ اس اہم ٹیسٹ میں
22 تھے اول لبر پرائیویٹ۔ میگزین میں شائع ہونے
والے آرٹیکل میں کتاب کو شان وندہ الفاظ میں خراج تحسین
پیش کرتے ہوئے کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ جب کوئی کتاب
22 سال کے طویل عرصے بعد دہائی ٹیسٹ میں پھر پہلے نمبر

پر آئی۔ لوہیز اسے پیغام میں چاڑھ ہے۔"
2013 کے ایلوہ شہد کے مطابق یہ کتاب 132
ممالک میں فروخت کے ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ 42 بڑی
زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس کی 4 گریڈ کاپیاں
فروخت ہو چکی ہیں۔

سب سے مقبول مصنفہ کار ریکارڈ کی برسوں بعد مہری
پروڈکٹ کی مصنفہ کے دو رنگ نے توڑا مگر اس نے اعتراف
کیا کہ وہ خود لوہیز کی مداح ہے۔ اس نے کہا "بے شک
مہری کتابیں فروخت کے معاملے میں ان کی کتب سے
آگے نکل گئی ہیں، مگر ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ میرے فلم نے
کسی کی زندگی نہیں بدلی، دوسری جانب لوہیز کے فلم نے
کروڑوں انسانوں کو یکسر بدل دیا جن میں شاید بے کے
دو رنگ بھی شامل ہے۔"

☆☆☆

طر کی لہنیاں ہوا کے دوش پر چھو رہی تھیں۔ ان پر
گلابی پھول ٹپٹے تھے آسمان میں پھرا جاتا تھا۔
کہانی ختم ہو چکی تھی۔ برقی کی آنکھوں میں نمی تھی۔
لوہیز نے لپٹنے کی پشت سے لپک لگائے بیٹھی تھی۔ بڑھیا
خاموش تھی۔ چاندنی میں قدرت کے کرشمے دکھ رہے
تھے۔

"آپ کی دوست کی کہانی تو... الونکی ہے۔" برقی
نے خاموشی توڑی۔

"جس میں پسند آئی؟" لوہیز نے گردن موڑی۔
لوہیز نے سر ہلا۔ عورت مسکرائی۔ "پھر ایک وعدہ کرو
کہ تم کم از کم دو آدمیوں کو خبر دو یہ کہانی سناؤ گی۔ یہ تمہاری
کہانی ہے۔ اور اسے جام کرنا ہم پر فرض ہے۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔" اس نے عورت کا ہاتھ تھام
لیا۔ "اور یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ میں نہ صرف لوہیز کی کتاب
پڑھوں گی بلکہ اپنے جیسے اور دکھیاڑوں کو بھی اسے پڑھنے کا
مشورہ دوں گا۔"

لوہیز عورت کی فطری شرمیلی ٹوٹ آئی۔ "واہ، یعنی اس
برس بھی اپنے پیشکش ہاؤس میں رہنے والا ہے۔"
دونوں نے قہقہہ لگایا۔ چاند انہیں دیکھ کر مسکرایا۔
لہنیاں برقی کرنے لگیں۔ پھر اس نے کہا "مجھے پچھانا" میں
اس کی آنکھوں کو دوسرے ہوں جس کی مدد نے اسے بچپن
میں اپنے پاس رکھا تھا۔"

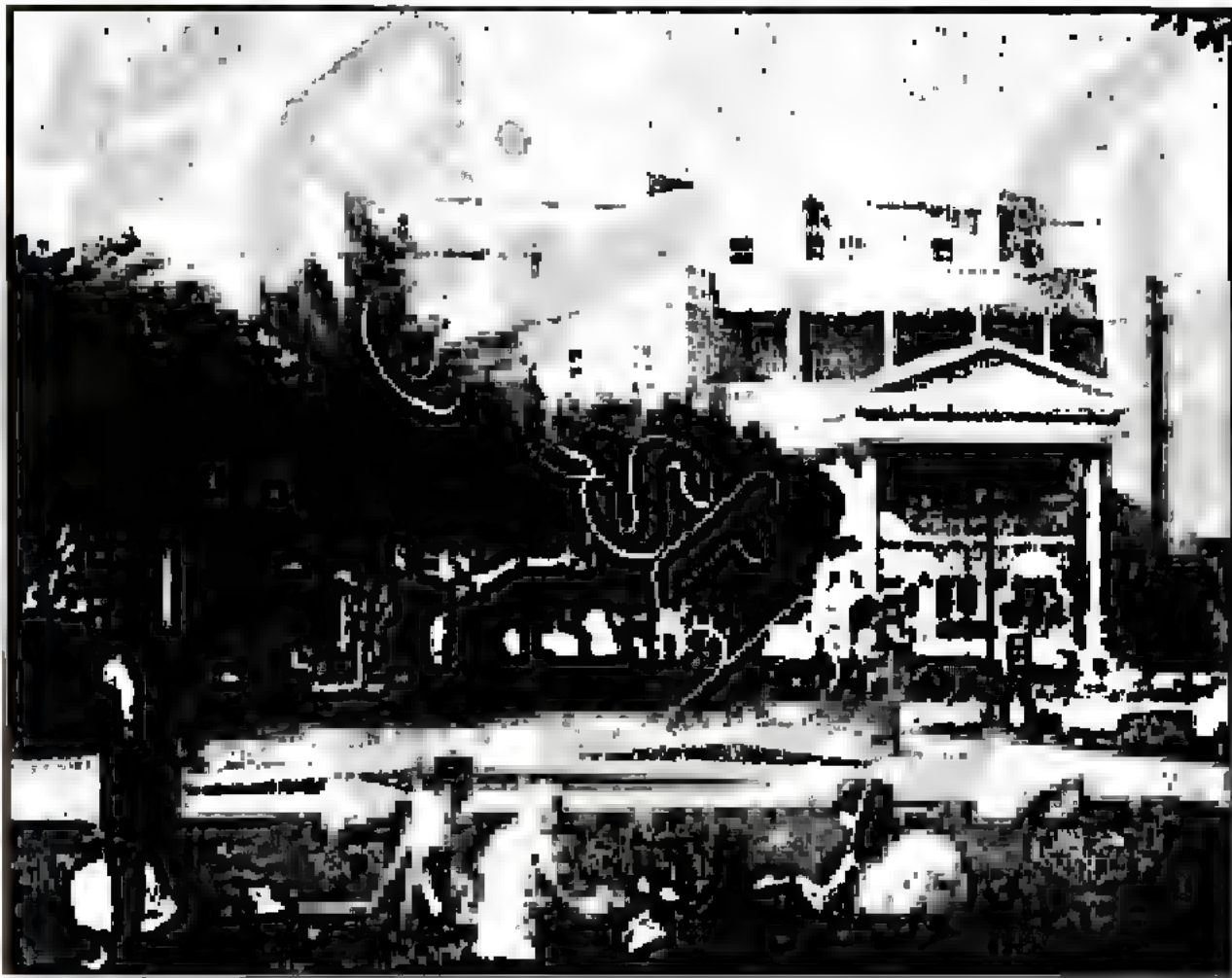
۔۔۔

الوداع

حسرت رزاقی

اپنی ٹومر ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شعبہ ویزا کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

دل و زمین کے لیے تو کبھی خاص جگہیں ہوتی ہیں



”جانا لاہیں آنا“ ہمارے خاندان کی ایک ذلتی اصطلاح ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پاکستان میں بی ٹی ٹی ٹی کر رہا تھا۔ میرے بہنوئی ڈاکٹر اشق الدین نور زخمیستہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عمرہ کرتے ہوئے براستہ جدہ پاکستان واپس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ میری بہن اور ان کا بیٹا کمال بھی تھے۔ کمال جب ٹورڈو لے گئے تو شیر خوار تھے مگر اب ماشا اللہ ”چار سال کے گھرو جوان“ ہو چکے تھے اور ٹورڈو ٹیم کے غیر مالوس ماحول میں رہنے کی وجہ

سے گوراشی اردو پڑھتے تھے۔ وہ اپنی نانی یعنی میری والدہ کو اپنے عمر کی تفصیل بتانا چاہتے تھے۔ پہلے خانہ کعبہ کی بابت بتاؤ۔ "ای! اہم لوگ" اللہ پاؤں" مجھے تھے۔ "پھر ملنا دھوا کے درمیان سنی کی تفصیل بتائی۔ "ای وہاں کچھ نہیں بس جانا ہی آنا پھر جانا پھر لایا آنا۔ اس دن کے بعد سے جب بھی کسی ایسی جگہ کا ذکر ہو جہاں بار بار یا گیا ہوا جانا ہو تو ہمارے گھر میں اس جگہ کے لیے جانا لایا آنا کی اصطلاح استعمال ہونے لگی۔

برہمن کو الوداع کہنے کے بعد مجھے انگلستان پاکستان اور کینیڈا کے درمیان کئی دلدھ جانا لایا آنا چاہا۔

برہمن سے ٹورونٹو کا سفر، ٹورونٹو سے برہمن کا الوداع پھر اٹھائیں برہمن لندن، ڈور، اسٹڈ، برسلو، موٹر پائل، ٹورونٹو اس سفر کے ابتدائی ٹکڑے برہمن سے لندن کا قاسم غلبت کے ساتھ اس کی گاڑی میں طے کرنا تھا۔ میں اپنا تمام مال و متاع اپنے واحد سوت کیس میں بند کرنے کے بعد محبت کا انتظار کرنا تھا۔ گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بیوان خسرو شاہی کو سامنے کھڑا پایا۔ ہم دونوں باورچی خانے میں میز کے اطراف آکر بیٹھ گئے کہ فلیٹ کا بی باورچی خانہ پائس کھالے کا کمرہ بیٹھ کا کام بھی دیتا تھا۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ محبت آچکا تھا۔ اب باورچی خانہ پائس بیٹھ میں RCD کا کورم پہرا ہو چکا تھا۔ یعنی ترکی پاکستان اور ایران کا ایک ایک ٹماٹھ باورچی خانے میں موجود تھا۔ میں نے اس باورچی خانے میں آخری دلدھ چائے پائی۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ روز لین آگئیں مٹی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی۔

"تم ابھی سے جا رہے ہو؟ تمہاری لائبریری تو رات میں ہے۔"

"ہاں رات میں ہے۔ مگر برسلو سے ہے۔ وہاں پہنچنے کے لیے مجھے اسی وقت نکلنا پڑے گا۔"

"اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ حیران سے غائب ہوئی۔ "سب تمہارے کمرے پر میرا قبضہ ہے تم وہاں داخل نہیں ہو سکتے۔" اس نے جیتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں تم سے کرائے کا قاضہ نہیں کروں گا تم میری مہمان ہو۔"

روز لین نے جھائی لیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "ہائی ہائی" اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئی۔ پھر اس کو کچھ یاد آگیا۔ "رات ٹوٹی تم کو ہائی ہائی کرنے آیا تھا مگر تم سوچے

تھے ٹوٹی روز لین کا منگیتر تھا۔

"ہائی ہائی۔ لب تم جا کر دوبارہ سو جاؤ مگر ٹوٹی کے خواب مت دیکھنا۔"

چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اپنی اسلین مٹی کی چابی بیوان کے حوالے کی کہ وہ یہ گاڑی مجھ سے ستمبر 1986 پاؤں مکہ راج الوقت حکومت برطانیہ میں خرید چکا تھا۔ اور محبت کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہو گیا۔ برسلو تک کا سفر لیا تھا۔ میں بین وقت پر برسلو اتر پھرٹ پہنچا۔ کچھ دیر اور ہوئی تو قلعہ چھوٹ چلی۔ آج میرے لیے اس ٹکٹ کو استعمال کرنے کا آخری دن تھا۔ انٹرنیٹ کے جہاز میں داخل ہوا تو ایک انجانی سی اپنائیت کا احساس ہوا جیسے اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت ہوتا ہے۔ سارے دن کے سفر نے تھا دیا تھا۔ جیسے ہی کھانا ختم ہوا اور جہاز کے کپتان کی لائسنس دیکھنی کی ٹکٹیں میں تے کھل لڑھا اور لمبی جان کر سو گیا۔ خواہوں میں خدا جانے کہاں کہاں کی سیر کرتا رہا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ بیوان نے مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑا "جلدی اٹھو آج تمہارے امتحان کا پرچہ ہے۔ کیا پرچہ ہے؟ نہیں جاؤ گے؟"

آکھ مٹی تو اتر ہوٹس مجھے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہی تھی۔ "اپنی سیٹ کی پشت سیدھی کر لیں۔ ہم جلد ہی موٹر پائل کے اتر پھرٹ پر اترنے والے ہیں۔"

میں نے کرسی کی پشت سیدھی کر لی۔ تھوڑی دیر بعد جہاز موٹر پائل کے ہوائی آلے پر اتر چکا تھا۔ سات آٹھ گھنٹے کا سفر گزر چکا تھا مگر موٹر پائل میں ابھی اندھیرے کا راج تھا۔ رات کا ایک پاؤں چڑھ بھا تھا۔

جہاز سے اتر کر ایئر ٹین ال کا لندہ کھانا مگر ٹین کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہاں ایک نئی مصیبت پائیں پھیلانے مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

کینیڈا کا یہ قانون تھا کہ اگر کسی شخص کے پاس کینیڈا کا ایئر ٹین دینا ہے اور وہ کینیڈا سے باہر جاتا ہے تو اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایک سال کا وقت گزرنے سے پہلے اپنے کینیڈا میں واپس داخل ہو جائے ورنہ اس کا ایئر ٹین ویزا کینسل ہو جاتا ہے۔ وہ دوبارہ کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتا۔

میں موٹر پائل سے 23 ستمبر کو برسلو کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میرے لیے لازم تھا کہ میں 22 یا اس سے پہلے کینیڈا کے کسی شہر میں داخل ہو جاؤں ورنہ میرا ویزا کینسل ہو جائے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کا۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کی بھی یہی پابندی تھی۔ اسی لیے میں 22 ستمبر کو یہ سطر سے کینیڈا واپسی کے لیے روانہ ہو چکا تھا مگر جس وقت ہمارا ہوائی جہاز مونٹریال کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ قانونی طور پر 23 ستمبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ ایئر لائن آفیسر نے میری توجہ اس طرف دلائی "قانونی طور پر وہ وقت گزر چکا ہے جس وقت کے اندر اندر تم کو کینیڈا واپس آ جانا چاہئے تھا۔ وقت پر نہ آنے کی سزا۔ اب تم کینیڈا میں داخل نہیں ہو سکتے"۔

"پھر اب کیا ہوگا؟" میں نے پریشان ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں انتظار کرو۔ میں اپنے سپروائزر کو بلا کر لاتا ہوں۔" وہ اپنے سپروائزر کو بلا نے چلا گیا۔

برقوم کا ایسا ایتنا حراج ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اگر آپ کسی سرکاری یا نیم سرکاری دفتر میں کسی کام کی فہرست سے جائیں تو وہاں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپ کا کام آج نہ ہو سکے۔ کوئی نہ کوئی خالی ٹائل کر یا بہانہ تلاش کر کے آپ کو کل آنے کا حکم دے دیتا ہے۔ کینیڈا امریکا اور برطانیہ میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ میرا اپنی تجربہ ہے۔ ان ملکوں میں کام کرنے والوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی طرح سے آپ کا کام آج ہو سکا ہے تو ہو جائے، آپ کو دوبارہ آنے کی دھمکت نہ کرنا پڑے۔

ایئر لائن افسر واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کا سپروائزر بھی تھا۔ سپروائزر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گویا ہوا "پڑھائی ایک نیک کام ہے۔ تم ایک نیک مقصد کے لیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ صرف ایک یاد دہانی کی بات ہے۔ ان حالات کے پیش نظر یہ حکومت موجود ہے کہ تم کینیڈا میں داخل ہو سکتے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے میرے پاسپورٹ پر لکھا لکھ دیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

یہ صورت حال اگر مجھے اس وقت پیش آئی ہوتی کہ جب میں پہلی دفعہ کینیڈا میں داخل ہوا تھا تو میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے لیکن اب معاملہ کچھ اور تھا۔ مجھے میرا کینیڈا آنے کا اصل مقصد یعنی اپنی تعلیم مکمل کرنا، حاصل ہو چکا تھا۔ میرا مستقل طور پر پاکستان چھوڑنے کا اور کسی دوسرے ملک میں مستقل طور پر بس جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس وقت اگر ایئر لائن افسر مجھے کینیڈا میں داخل ہونے

سے روک دیتا تو میرے اوپر اس کا کوئی تھیٹرائز نہ پڑتا۔ مجھے چنداں السوس نہ ہوتا۔ میں اپنا چیچا سوٹ کیس اٹھا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پاکستان واپس آ جاتا۔ وقت وقت کی بات ہے السوس کا کیا حاتم!

السوس تو صرف اس بات کا تھا کہ اس دفعہ بھی مجھے اتر پورٹ پر اتر کینیڈا کا جلوس نہیں دکھائی دیا جو مجھے پھولوں کے بار پہنا کر کانٹھوں پر اٹھا کر ڈنگر لے جا کر مجھ سے استفادہ کرنا کہ میں اپنی خدمات سے اتر کینیڈا کو مستفید کروں حالانکہ اب کی دفعہ تو میرے پاس مغربی ملک کی ڈگری کا امکان بھی موجود تھا بشرطیکہ ڈاکٹر کوکس اپنی ٹانگ جگ میں نہ اڑائے۔ خیال ہوا کہ رات کے تین بجے دوائے میں شاید امر کینیڈا دوائے سو گئے ہوں گے ورنہ وہ اس طرح سے اس ڈور موقع کو ضائع نہ ہونے دیتے جیسا انہوں نے میرے استقبال کا بعد و سب تو یہ نظر کے اتر پورٹ پر کر رکھا ہوگا لیکن وہاں بھی ڈاکٹر کوکس۔

حسب سابق میں نے ایک دفعہ پھر اتر کینیڈا کو ان کی کوتاہی پر معاف کر دیا اور سوچا کہ میں خود نہیں نہیں ان کے دفتر جا کر ان عدالتوں کو ان کی غلطی اور کوتاہی کا احساس دلاؤں گا کہ وہ ایک دفعہ پھر میری صلاحیتوں سے مستفیض ہونے کا جیسا بھروسہ کرتا ہے ہیں۔ میں ان کی خطاؤں کو درگزر کرتا ہوں کمال مہربانی سے ان کے دفتر پہنچ گیا۔

اس دفعہ گوکہ کا ڈکٹر پڑھا جیڑاوی بھی دوسری تھیں اور سپروائزر بھی نیا تھا لیکن ان کا جواب وہی پرانا اور گھسا پٹا تھا۔

"آج کل کینیڈا کی معیشت بہت خراب اور سے گزر رہی ہے۔"

جب وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے ایک دفعہ پھر اپنے ہی پاؤں پر کھڑی مارتے چاہتے تھے تو میں ان کو کیسے روک سکتا تھا۔ اپنے کیسے پر ایک دن خود ہی بچتا تھا گے، میرا کیا۔

میں نے طے کر لیا کہ اب میں دوسرے اداروں کو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی دوز میں حریف رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ آخر ان کا بھی میرے اوپر کوئی حق نہ تھا۔ وہ بھی درخورد تھا۔ ابھی میں کینیڈا کی دوسری کمپنیوں کو اپنی کینیڈا واپسی کی خوش خبری سے مطلع کرنے کا ارادہ مصمم کر رہا تھا کہ مجھے میری ماں کا بھلا ملک لگا دیا تھا۔ "تین سال ہو گئے ہیں آکر شل دکھا جاؤ۔"

ایک اور عجیب بات ہوئی۔ جس شہر پر منظم کو اور اس کی پونڈی کو چھوڑنے کے لیے میں بے چین اور بے تاب ہو رہا تھا۔ اسی شہر اور اسی پونڈی کی یادیں مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں حالانکہ برہمن سے جدا ہوئے مجھے ایک ہفتہ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ میں نے ٹریول ایجنسی جا کر ٹکٹ خرید لیا۔ کراچی براستہ لندن۔

برٹش ایرویز کا جہاز لندن ایئر پورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ ایئر ٹین سے فارغ ہو کر میں نے بس اسٹاپ کا رخ کیا اور اسے دن اور بس چکر کر لندن شہر میں وکٹوریہ اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ کراچی صرف پچاس منٹ۔ 1995ء میں یہ کراچی بڑھ کر پانچ گنا پاؤنڈ ہو چکا تھا۔ آج کل یہ کراچی کتنا ہے معلوم نہیں۔

مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچ کر میں اسی بیڑا چڑھ کر ایک ٹاسٹ ہوٹل پہنچ گیا جہاں ایک سال پہلے مجھے ایک پاؤنڈ کا حیدر آبادی اسکاؤٹ ملا تھا۔ یہ اسکاؤٹ آج بھی میرا اختر تھا۔ ہوٹل کے مالک نے شکوہ کیا۔

"اوپاٹار آپ تو ایسا غامیب ہوئے جیسے گھڑے (گندھے) کے سر سے سینگ (سینگ)۔ کیا پلٹ کر پوچھنا چاہتے؟" (کیا آپ کو پلٹ کر پوچھنا نہیں چاہیے تھا) میں نے جواب دیا۔ "سینگ۔ تو میں آج بھی بھول آیا ہوں۔ گدھا حاضر ہے۔"

وہ چنے لگے۔ میرا حیدر آبادی اسکاؤٹ بکا ہو چکا تھا۔ ہاشتا پیش کی طرح ٹھنکا تھا۔ ہاشتا غم کرنے کے بعد میں برہمن جانے کے لیے ایسٹن اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

برہمن کے نیو اسٹریٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو ایک انہانی سی ٹوٹی ٹھوس ہوئی۔ لگتا تھا جیسے برسوں بعد چھڑے ہوؤں سے ملاقات ہوئی ہے حالانکہ اسٹیشن پر میرا ایک بھی جاننے والا نہیں تھا۔ محمد میرے کینیڈا امداد ہونے کے قریب، چار دن بعد اسٹینول کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر میں نے جیسی پکڑی اور عطران کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا کرا میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں کچھ کر میں نے دروازہ کھٹکنا یا۔ دروازے کے ساتھ ساتھ عطران کا تہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"تم تو چلے گئے تھے پھر کہاں سے آ گئے؟"

"تہا رہی بہت مجھے گھنچ لائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

جب میں اور عطران ایک ساتھ گرین کھوز کے قریب میں رہتے تھے تو بڑھائی کے وقت کے علاوہ طارا زیادہ تر وقت ساتھ گزارا کرتا تھا۔ میں اور عطران اس وقت کو یاد کرتے رہے پھر میں نے عطران سے اس کی گاڑی کی چابی لی اور گرین کھوز روانہ ہو گیا۔ یہ گاڑی میں نے پچھلے ہفتے گرین کھوز میں ہی عطران کے حوالے کی تھی۔ میری دوسرا پاؤنڈ کی خریدی ہوئی گاڑی کے عطران نے 1986 پاؤنڈ دیے تھے۔ تین سیتے میں صرف چار پاؤنڈ کا گھما۔

اپنے پرانے فلیٹ پر پہنچ کر میں نے تھکی بجالی۔ میں چیری سے ملنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک فلیٹ میں ہوگا لیکن دروازہ چیری کی بجائے روز لین نے کھولا۔ وہ شاید ابھی تک دوسرے فلیٹ میں محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں بہت ہو کر روز لین کو دیکھا رہ گیا۔

روز لین کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ میں اس کو کل دیکھ کر چکا تھا بل چکا تھا۔ پچھلے ہفتے اس نے مجھے ٹورنٹو کے لیے رخصت بھی کیا تھا لیکن اس وقت وہ کچھ اور علی چیز لگ رہی تھی۔ ٹھکڑے بال، لالہ لالہ، اس نے سر سے ہر رنگ ایک گاڑی پہن رکھا تھا۔ دروازے کے ایک طرف اندھا چرا تھا، روشنی بائیں طرف کی کڑکی سے چمن چمن کر رہی تھی اور اس کے اوپر دھوپ چھاؤں کی طرح ٹھکڑی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں اس وقت ایک ہی خیال آ رہا تھا۔ شاید جنت میں جن حوروں کا ذکر ہے وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

روز لین مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر ہنستا مگی کہنے لگی۔ "مگر تم حسن سے ملنے آئے ہو تو وہ کینیڈا جا چکا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ہی حسن ہوں کیا تم نے مجھے پہچان نہیں؟"

وہ بھڑکی۔ کہنے لگی۔ "پہچان کیوں نہیں مگر تم کو اپنے آپ کو اس طرح گھورتے دیکھ کر میں بھی کہ کوئی اور ہے۔ کیا تم نے مجھے اس سے پہلے بھی دیکھا نہیں جو مجھے اس بد تمیزی سے گھورتے تھے؟"

"میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر اپنی معافی پیش کی۔ "میں جیسا تم کو پہلے دیکھ چکا ہوں۔ اسی فلیٹ کے بارہائی خانے میں ہم ایک آدھ بار کھانا بھی کھا چکے ہیں۔ تصویر بہت نہیں مگی ہاں تک چکے ہیں۔ چند دن پہلے تم نے مجھے ٹورنٹو کے لیے ہائی ہائی بھی کہا تھا لیکن آج کی بات ہی کچھ اور ہے۔" پھر میں نے اس کی تعریف

جس کے بعد اس کا دیرالہ ہونے لگا تو اس کو 1982ء میں ایک امریکن کمپنی نے خریدا۔

میں نے ڈاکٹر کوٹس کو مخاطب کیا۔ ”ڈاکٹر کوٹس، مجھے کمپنی کی پسند یا ناپسند سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیجیے کہ کیا آپ نے میری رپورٹ کو پاس کر دیا ہے؟“

وہ اپنی گھونٹنے والی کرسی پر بیٹھ گئے مگر وہ دوسری باتوں کی انگلیاں پھیلا کر کہیں میں ملائیں اور کمال ہے یا اڑکی سے گویا ہوئے۔ ”پاس کیوں نہ کرنا مانجی خاصی رپورٹ تھی۔“

میرا دماغ ہلکے سے اڑ گیا۔ جسراپے عروج پر تھا مگر اسے حراج کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ استاد کے سامنے کوئی بے لوثی نہ ہو جائے میں نے دھیرے سے ڈاکٹر کوٹس کو مخاطب کیا۔

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے آپ نے میرا خون خشک کر رکھا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محض اس رپورٹ کی وجہ سے شاید میں وہ پہلا امیدوار بنوں اس ڈیپارٹمنٹ کا کہ جس کو پروجیکٹ رپورٹ کی خاطر لیل ہونے والے پہلے امیدوار کا اعزاز حاصل ہوا۔“

کہنے لگے۔ ”ہاں تو پھر کیا ہو اس طرح تم رپورٹ لکھ کر سیکہ جاؤ گے۔“

میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کچھ بھی تو آپ کے شکوے بھانپتے تھے بے شک سم جناب کے سب دوستانتھے میں نے ڈاکٹر کوٹس سے ہاتھ ملایا۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور دروازے سے باہر نکل کر حلال کی طرف چل دیا۔

سہ پہر کو میں نے لندن جانے والی ٹرین پکڑی۔ وکٹوریہ اسٹیشن پہنچی کر اتر پورٹ جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ ان دنوں لندن کی اطر گراؤ ٹرینیں خوب اتر پورٹ تک نہیں جاتی تھیں گوکہ بعد میں جانتے لگی تھی۔ اتر بس بستیرو کی منزل تین پر پہنچی تو میں وہیں اتر گیا۔ کراچی کے لیے پی آئی اے کا جہاز تین سے روانہ ہوتا تھا۔

ان دنوں پی آئی اے کی ٹورنٹو کے لیے براہ راست پرواز کا آغاز ابھی نہیں ہوا تھا۔ یا تو نیو یارک سے پرواز پکڑنی پڑتی تھی یا یورپ کے کسی شہر سے۔ میں نے بدھتم جانتے کی خاطر لندن کو ترجیح دی تھی۔ لندن سے کراچی جانے والی پرواز کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں پی آئی اے کے طیارے میں داخل ہوا تو اچانک ہیٹ کا احساس ہوا۔ اندوڑ بان

سننے کوئی۔ طیارہ اٹھائیں بلند ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد ٹوائلٹ جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ ٹوائلٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو خیال ہوا کہ یہ وہی بوئنگ B707 جہاز ہے جس میں میں نے کیوں کام کر چکا تھا اور شاید یہ وہی ٹوائلٹ ہو جس کی ٹوائلٹ مونر میں تبدیل کر چکا تھا اور یہ مونر تبدیل کرتے وقت میں ایسے چوڑے میں رہا ہوں گا کہ

دنیا کسی کا ساغر نہ یاد ہے نظام نہ پھیر کر ادھر کو ادھر کو بڑھانے ہاتھ واپس آ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کراچی صرف چند گھنٹے دور تھا۔

کراچی اتر پورٹ پر اتر کر جہاز نے جیسے ہی رن وے کو چھو لوگوں نے اپنے سیٹ بلیٹ کھول کر اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ اٹھ کر چل دی غلٹی۔۔۔ اپنا سامان اوپر کے خالوں سے لٹکانا شروع کر دیا۔ اتر ہوئیں بے چاری اعلان کرتی ہی رہی کہ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں اور جہاز کے رکنے کا انتظار کریں۔ مگر کسی ایک بھی شخص نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں اپنے ملک پہنچ چکا ہوں کیونکہ یہ صرف میری ہی قوم ہے جو اس قدر نظم و ضبط اور صبر جمیل کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔

جہاز سے اتر کر امیگریشن کی لائن میں کھڑا ہونا تھا۔ مگر یہاں بھی لوگ بھاگ دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نائن میں گھسنے کی سعی میں مصروف تھے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اگر وہ جلد سے جلد امیگریشن سے فارغ ہو سکیں گے تو ان کو اپنے سامان کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔

میں امیگریشن کی لائن میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ حزر کر دیکھا تو حسن انگل کھڑے تھے۔ حسن انگل کنسم میں ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ لے کر امیگریشن کو چھوا دیا۔ امیگریشن کا مرحلہ فوراً طے ہو گیا۔ وی آئی پی گھر۔ ہمارے یہاں جان بیکان یا اتر در سوخ زمین کی گاہر مرحلہ آسان بناتی ہے۔ میرے خان باب کو حسن انگل کی ضرورت ہوا محسوس ہوئی تھی کہ ان کا بیٹا تین سال امریکا کینیڈا اور لندن میں گزرا کر آ رہا تھا۔ کم از کم آدھا جہاز تو ضرور اس کے سامان سے بھرا ہوا ہونا چاہئے مگر حقیقت ان کی توقعات کے برخلاف تھی۔ میرے ساتھ صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ وہ بھی بڑا والا نہیں بلکہ درمیانے سائز کا۔

حسن انگل بہت مایوس ہوئے۔ باہر جا کر انہوں نے میرے ماں باپ کو بتا دیا کہ ان کا بیٹا کینیڈا، امریکا اور لندن سے نہیں بلکہ علم آباد سے آیا ہے۔

سکسٹم سے فارغ ہو کر گاڑی میں بیٹھ کر جسے ہی اسٹار کیٹ سے کل کر شہرہ افضل پر داخل ہوئے تو ٹریفک کے ایک طوفان بے تیزی نے خوش آمدید کہا۔ ٹریفک کے اس بے ضبط اور بے اصول سیلاب کو دیکھ کر ایک دفعہ اور یقین ہو گیا کہ "لوٹ کے دھوکہ کھڑا آئے۔"

میں نے پچھلے تھیں... سال کینیڈا اور برطانیہ میں گزارے تھے۔ ٹورونٹو اور لندن کی ٹریفک کا شور و جہا کی بہترین اور فائدہ دالی ٹریفک میں ہوتا ہے۔ اس قسم کی ٹریفک کا عادی ہو جانے کے بعد کراچی کی بے حکم ٹریفک کا مجھ پر گہرا اثر ہوا۔ میں ایک قسم کا ٹکڑا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس ٹکڑا کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ چند دن بعد جب کسی نے مجھ سے کینیڈا کے بارے میں جانا چاہا تو بجائے اس کے کہ میں اپنی کینیڈا کی زندگی اور تہذیب کے بارے میں کچھ کہتا میں نے جواب دیا۔ "ٹورونٹو کی ٹریفک بہت سنسنیک ہے۔" میرے اس بے عمل اور بے سنجے جواب کا اور میرے انگریزی کے لہجہ کا مذاق کافی دنوں تک اڑتا رہا۔ مگر میں پاکستان "لاہیں" آچکا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد میری خواہش تھی کہ میں دوبارہ لی آئی اے میں ملازمت کروں۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال قبل پڑھائی کی غرض سے امریکا گیا تھا تو میری کلاس شروع ہو چکی تھی۔ مجھے فوراً سے وائٹر پرنسپل سینکھا تھا اس لیے میں اپنا اسٹوڈنٹ انڈسٹری سے وائٹری امریکا کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ چیز لی آئی اے کے ضابطے کے خلاف تھی۔ لیکن میری مجبوری تھی۔ لی آئی اے میں میری واپسی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن میرے ذہن پر ہوائی جہاز سوار تھا۔

ان ہی دنوں مجھے کراچی میں واقع فیصل موڈل چاہنے کا اتفاق ہوا۔ وہ لوگ ان دنوں ایک نیا شعبہ "ورک اسٹڈی" کے نام سے کھولنا چاہ رہے تھے۔ میری برہمگی کی تعلیم اس سے مطابقت رکھتی تھی۔ انہوں نے مجھے اس شعبہ کو چلانے کی پیشکش کی جسے میں نے منظور کر لیا۔ اس شعبہ کی ابتدا کے لیے مجھے ایک دفتر اور ایک سیکرٹری سہا کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے ساتھ ایک دم چھٹا بھی لگا دیا گیا جس کا "ورک اسٹڈی" سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ایک انٹرکٹر

صاحب تھے جو ملکیت کو عملی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک ہفتہ بعد میرے سیکرٹری نے میرے سامنے ان کا اسٹوڈنٹ رکنہ جس کو میں نے منظور کر لیا۔ اس پر میرے سیکرٹری نے پوچھا۔ "آپ نے اس کا اسٹوڈنٹ انڈسٹری سے بات کیے ہی منظور کر لیا؟"

میں نے لائقیت سے جواب دیا "اگر وہ یہاں نوکری نہیں کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے۔ میں کیوں اس کا اسٹوڈنٹ ہاں منظور کروں؟"

"میرا مقصد ہے آپ سے جا کر بات کر لیں۔ اس کے بعد فیصلہ کریں۔"

"اچھا اس کو بلاؤ۔ لی الال یہ اسٹوڈنٹ ایک طرف رکھو۔" میں نے جب ان سے بات کی تو معلوم ہوا کہ ان کے کچھ دیر پہلے حقیقی مسائل تھے جس کی بنا پر انہوں نے اسٹوڈنٹ دیا تھا۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ان کا کسی شعبہ سے مستقل تعلق نہیں تھا۔ ادارہ جب چاہتا ان کا شعبہ تبدیل کر دیتا۔ وہ بیاداری طور پر اپنے آپ کو کیمپل مونیٹر کی سوتیلی ادا دیکھتے تھے۔ میں نے حلقہ لائبریری وغیرہ سے یا ہی حضور کے بعد ان کے مسائل حل کروا دیے جس کے بعد انہوں نے اپنا اسٹوڈنٹ واپس لے لیا۔

اس واقعہ نے میری سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ جھنٹ میں MSC کی نوکری میرے پاس تھی۔ لیکن جب جھنٹ کا عملی مسئلہ درپیش ہوا تو میں نے اس کو بہت سرسری طور پر اور سطحی طور پر دیکھا جبکہ میرے سیکرٹری نے جس کی تعلیم صرف انٹرمیڈیٹ تھی۔ اس مسئلہ کی گہرائی میں جا کر اس کی اہلیت کو جاننا۔ کتابوں میں چند اصول پڑھ لینا الگ بات ہے اور ان کا عملی اطلاق بالکل ہی جدا چیز ہے۔ کتابیں ایک مشعل کی مانند ہیں کہ یہ اپنے اطراف نور پھیلاتی ہیں مگر جب تک اس نور سے مستفید ہونے کے لیے عملی جہد نہ ہو تو رے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے سیکرٹری نے مجھے وہ سبق پڑھا یا تھا جو پرنسپل نے پڑھا کی تھی۔

چند ماہ بعد میں نے یہ نوکری چھوڑ دی یہ میرا گہرے مقصد نہ تھا۔ مجھے دریا سو پر پاکستان میں پاکیزہ اور ہوائی جہاز کی نوکری چاہئے تھی۔ میں کینیڈا "لاہیں" آ گیا۔

لیکن انٹرنیڈا کی بدقسمتی کی کوئی حد نہیں وہ اس دلہ بھی میری خدمات سے استفادہ کرنے سے محروم ہو گئی۔ اس نے لگاتار تیسری دلہ اپنے پاؤں پر کھلائی ماری تھی۔ میں ان کی قسمت پر صرف انہیں کر سکتا تھا۔ جو میں نے کیا۔

کینیڈا اور امریکا اور ہمارے ملک میں نوکریاں حاصل کرنے کے حوالے مختلف ہیں۔ پاکستان میں سب سے پہلے سٹارٹ اپ پوزیشن ہوتا ہے۔ اگر وہاں کامیابی تو کم نہ ہوے تو پھر دوسرے حربے آزمائے جاتے ہیں۔ کینیڈا میں اس دور میں ہم سے بہت پیچھے ہے۔

اس سے سرف نظر ابھی تک ان کے یہاں ہمارے اور ان پارتیوں کی طرح جملہ ڈگریاں مل سکتی ہیں۔ کاروبار بھی نہیں ہے۔ جملہ ڈگریوں کے لئے ان کا یہ ناقابل یقین ضیاع ہے کہ آج تک میں نے کینیڈا میں جتنے بھی انٹرویو دیے اس میں سے کسی ایک میں بھی ایک دفعہ بھی کسی نے میری ڈگریوں پر ایک نظر بھی نہیں ڈالی۔ ان کی سوچ بہت سادہ ہے۔

نوکری جس وقت ملتی ہے اس وقت وہ یہی نہیں ہوتی ہے۔ وہ سے چار پانچ تک کا آرہائی دورانیہ ہوتا ہے۔ اس دوران میں مکمل کر اس بات کا پتا چل جاتا ہے کہ آپ کے دعوؤں میں کس قدر سچائی ہے۔ آپ کتنے پائل میں ہیں۔ آپ میں اپنا کام کرنے کا علم اور صلاحیت ہے یا نہیں۔ اگر آپ کے دعوے سچ ہیں تو نوکری آپ کا رونا ہمارے جانے کا اور لاہور سامنے نکلا ہوتا ہے۔

کینیڈا میں نوکری حاصل کرنے کے لیے جو ایک بہت زیادہ اہم چیز ہے وہ ہے ان سابقہ اداروں کا حوالہ جہاں پر آپ پہلے کام کر چکے ہیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نیلر حوالہ دینا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں اپنے سابقہ پاس لم بڑے کو آگاہ کروں کہ میں نوکری کی تلاش میں ہوں اور اس کمپنی میں اس کا حوالہ استعمال کروں گا۔ وہ کسی قسم کی جھوٹی معلومات میرے پیچھے کاروباروں کے بارے میں نہ دے مگر غیر ضروری معلومات سے ضرور گریز کر سکتا تھا۔ ان کا فروں میں بھی ایک خرابی ہے۔

ان میں سے اسی بچا ہی لوگ ہے اور ایماء اور ہوتے ہیں۔ ہم ان کی بہتری کے لیے ان کو مسلمان بنا کر اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ باقی اللہ کے ہاتھ ہے۔ یہ تو عام آدمیوں کا معاملہ ہے حکومت اور اسی کے اداروں میں کام کرنے والے اس سچائی اور ایماء اور سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ حکومتی لوگ ہمارے حکمرانوں کے ہم قبیلہ ہیں۔ لیکن اُمید کی کرن یہاں بھی موجود ہے۔ وہ لوگ ابھی حوام کا بیسا اور دولت لوٹنے کے اس درجہ کمال کو نہیں پہنچے ہیں کہ جس درجہ کمال پر ہمارے حکمران اور ان کی لڑائی دین قاتل ہیں۔

ان کو ابھی تک اس سے اسٹی حاصل ہے۔ لیکن اس کے لیے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

میں فریڈ سے برٹھم سے ملا ہیں "آ" نے اور پاکستان "لاہور" جانے سے پہلے مل چکا تھا اور اس سے اس ملاقات کی فرض و قیامت سے بھی آگاہ کر چکا تھا مگر یہ اب سے تقریباً ایک سال پہلے کی بات تھی۔ میں چاہتا تھا کہ فریڈ سے دوبارہ مل کر اس کی یاد دہانی کروا دوں۔ اس مقصد کی خاطر میں ورکو انڈسٹریز کے دفاتر میں پہنچ کر فریڈ کے کمرے میں داخل ہوا۔ پھر برٹھم بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے فریڈ سے اپنا مدعا بیان کیا۔ ہر برٹھم نے سن کر کہا "مجھے پہلے ہی اتحادیوں کے سپارٹسٹیم سے شہادت تھی۔ اب اس کی تصدیق ہوگی۔ اگر کچھ مسخوں میں پڑ جائے گا تو کسی جرمن یونینڈ میں جا کر پڑ جائے گا۔"

جرمن یونینڈ میں جانا تو اب ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں نے ہر برٹھم کو بتایا کہ NED کارڈ جانے سے پہلے میرا جرمنی جانے کا طویل تھا۔ میں نے وہ سب سے جرمن زبان بھی سیکھی تھی۔ اب بھی جرمن زبان میں گفتی کن سکتا ہوں۔

اس نے اتحاد کی پہلی پر سیدھے ہاتھ سے دروازے سے نکال دیتے ہوئے ہر برٹھم نے اپنے لیے کا اظہار کیا۔ "یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ تم نے جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا سنہری موقع ضائع کر دیا۔"

ہر برٹھم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اگر جرمنی اتنا ہی اعلیٰ اور ہر حق ملک تھا تو وہ جرمنی کو چھوڑ کر کینیڈا میں کیا کر رہا ہے۔ میں نے تو جرمنی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ضائع کر دیا تھا۔ لیکن ہر برٹھم کے لیے تو اب بھی سنہری موقع موجود تھا۔ وہ کینیڈا کو خیر باد کہہ کر اب بھی جرمنی واپس جاسکتا تھا۔ لیکن جرمنی واپس جانے کی بجائے ہر برٹھم نے کینیڈا میں ایک کھوٹا اور گاڑ لیا تھا۔ کہنے لگا "تم نے جرمنی میں پڑھنے کا موقع تو ضائع کر دیا مگر میں تم کو جرمنی داخلے سے لطف اندوز ہونے کا ایک بڑا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ ہفتہ کی رات تم میرے گھر گرنے کی پارٹی میں شرکت کر سکتے ہو۔" یہ تھا ہر برٹھم کا کینیڈا میں لیا کھوٹا۔ اس نے نوادہ نٹو کے مصافحات میں نیا گھر خرید لیا تھا۔

ہر برٹھم کا پارٹی میں شمولیت کا دعوت نامہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ "ہاں شراب کی بوتل لانا مت بھولنا۔ تم فریڈ کی پارٹی میں تقریروں کی طرح خالی ہاتھ چلے آئے تھے۔" میں اگر پارٹی میں گیا تب بھی میرا شراب کی بوتل

معاوضہ

ایک دوپہر کو ایک بہت ہی پرانی پتھری کا ایک دستور ان کے سامنے آ کر رکھا گیا۔ کار چلانے والا اتر کر قریب کھڑے ہوئے ایک شخص سے بولا۔

"بھائی! دروازہ کھول دیکھا، میں بھی ٹیلی فون کر کے دیکھ آیا ہوں۔"

کار کا مالک ٹیلی فون کر کے دیکھ آیا تو اس نے کار کا خیال رکھنے والے شخص کے ہاتھ پر دوسرے ہاتھ کے انگوٹھ کے طور پر دیکھا۔ اس آدمی نے گڑ گڑایا۔

"نہیں وہ پیسے جب؟"

کار کے مالک نے حیران ہو کر کہا۔

"اس دپے۔۔۔ ایسے سراسر ڈیال ہے۔ میں نے تو دستور میں پانچ سوٹ بھی نہیں لگائے۔"

اس شخص نے جواب دیا۔ "جواب میں وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس شرمندگی کا سوا قہر طلب کر رہا ہوں جو مجھے اس کار کے پاس کھڑے ہونے کی اجازت دے رہا ہے۔ دوسرے گزرنے والے لوگ بھی کچھ چہرے کہہ چکے ہیں۔"

ساتھ بچنے کی فرمائش کی۔ میرے شانے سے لگ کر اس نے مجھے اس زور سے پیچھا کرنا شروع کیا کہ اگر کچھ اور طاقت لگائی تو میری پسلیوں کی فیر نہیں تھی۔ میوزک ختم ہوا تو میں نے اپنا کاسکریپ اور کیا لود ہاتھ آگیا۔ سامنے پانی کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ہینرک کہاں ہے؟"

پال نے جواب دیا۔ "ابھی یہیں تھا کہ وہ ہاتھ کر میری بیوی حسن کے۔۔۔" پھر پال کو ایک دم خیال آیا کہ وہ تو حسن سے ہی مخاطب ہے۔ اس نے فوراً پلٹ پلٹ دی۔

"میرا مطلب ہے ہر برٹ کے ساتھ باقی رہی ہے۔ اس کو رجمانے کی کوشش کر رہی ہے۔" مجھے یہ سن کر سخت غصہ محسوس ہوئی۔ اگر یہ واقعہ پاکستان کے کسی اندرونی گاؤں میں ہوتا تو وہاں خونِ شراب ہو چکا ہوتا۔ ایک وکیل ہو چکے ہوتے کہ کسی کی بیوی کسی طیر آدمی کو رجمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ہینرک اس بات کو پال کے سامنے غریب انداز میں بتا رہا تھا۔ مجھے حاکم کا وہ دکھ چلا جانے والا یاد آیا کہ جس کی بیوی خود بھروسہ تھی، جو انھی اور وہ اپنی عزت کو پانچ روپے کے عوض فروخت کرنے کو تیار تھا۔ غریب اس کی بھید کی تھی۔ لیکن ہینرک کا اپنی بیوی کا اس طرح سے ذکر کرنا اس کی بے حسی اور بیوی کے مقدس رشتے کی توہین تھی۔ یہ مغرب کے سماج اور ماحول کا بدترین رخ تھا۔ ان کی سچائی، ایمان داری، محنت اور احساسِ ذمہ داری قابلِ ستائش خوبیاں ہیں کہ ہم ان خوبیوں سے محروم ہیں لیکن زندگی کے سماجی کے ساتھ یہ بے حس نا قابلِ معافی ہے۔ یہ اور لکسیاں چند اور خرابیاں مغرب کے ماحول میں ہیں جن کی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا کہ جتنی جلد ہو سکے اس ماحول سے فاصلہ پاؤں گا۔

لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسکیڈی ٹیویں پارٹی کا لطف تو میں فریڈ کے گھر کرانے کی پارٹی میں دو سال پہلے اٹھا چکا تھا مگر مجھے خبر نہ تھی پارٹی میں اس سے پہلے بھی جانے کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ اب موقع تھا، ہفتے کی رات کو میں تیار ہو کر ہر برٹ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہر برٹ مجھے حیرت دہانے پر ہی مل گیا۔ مجھے دیکھا۔ میرے ہاتھوں کو دیکھا پھر کہنے لگا۔ "آگئے ہیں تم پھر خالی ہاتھ اسی لیے میں نے تم کو فریڈ کے گھر سے ہی یاد دلایا تھا کہ شراب کی بوتل لانا مت بھولنا۔" ہم دونوں فٹے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔

گھر کے اندر وہی شور غوغا اور وہی شراب کی بو اور سگریٹ کا دھواں تھا جو فریڈ کی پارٹی میں تھا لیکن یہاں پر ایک حدت تھی۔ عام لاشوں کی بجائے اور سے رنگ کی خوب لاشیں جل رہی تھیں جن کی روشنی کے اثر سے لوگوں کے چہرے اور کپڑے عجیب سے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

یہاں پر فریڈ کے علاوہ میرے چائے والوں میں پال، ہینرک اور ہینرک کی بیوی ایسا شامل تھی۔ فریڈ کی پارٹی میں جو لباس و ٹیبل نے پہنا ہوا تھا بالکل وہی لباس اس وقت ایسا نے پہنا ہوا تھا۔ ہاتھ و ٹیبل سے لیا ہو گا یا شاید یہ پارٹی ڈانسن تھا جو کراپ پر ملتا ہو گا۔ کچھ اور ٹیبل مجھے نہیں لکھی دکھائی دے رہے تھے۔

دروازہ مٹری میں ملازمت کے دوران میں، میں اپنا سے دو ہاتھ ل چکا تھا۔ میوزک شروع ہوا تو ایسا نے میرے

باری فتم ہو چکی تھی۔ میں گمراہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

لوکری کی تلاش باری تھی۔ میں نے کئی جگہ درخواستیں بھیج رکھی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے دیکھ لیا تھا۔ فون کرنے والے نے اپنا تعارف کروایا۔ "میں معرکینڈا سے بات کر رہا ہوں۔ میرا نام مرے ہوف میں ہے۔ آپ نے ہماری کچھٹی میں لوکری کے لیے درخواست بھیجی تھی۔"

میں نے اقبال جرم کیا کہ جی ہاں، یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ کہنے لگے "کل رات آٹھ بجے آپ مجھ سے کلاں کلاں ہوئی میں ملاقات کریں۔" "پتا ڈاؤن ویو کے ایک ہوٹل کو تھا۔ ڈاؤن ویو لورڈز کا ایک محلہ ہے۔"

بات فتم کرنے سے پہلے مسز ہوف میں نے اپنی شناخت بتائی۔ "میں برساتی پہنے ہوئے ہوں گا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ ہوگا اور ہاں میرے منہ میں تمہا کوکا پائپ ہوگا۔" جواہر میں نے ان کو اپنے محلے سے آگاہ کر دیا۔

مجھے وقت کی یاد دہانی کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے کینیڈا جا کر اس کو اور زیادہ تقویت مل چکی تھی۔ میں ٹھیک آٹھ بجے ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی ساتھ ایک اور صاحب بھی اسی دروازے سے ہوٹل میں داخل ہو رہے تھے۔ برساتی پہنے ہوئے تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ بھی اور منہ میں تمہا کوکا پائپ۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور ایک ساتھ ہوٹل میں داخل ہو کر ایک خالی میز پر بیٹھ بیٹھا۔ مرے نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پینے کے دو ماہن میں وہ مجھ سے سوال جواب کرتے رہے۔ چائے فتم ہوئی تو مجھ سے گویا ہوئے۔ "مجھے اُمید ہے آپ ہمارے ساتھ کام کر کے خوش ہوں گے۔"

اندریچ فتم ہو چکا تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ معرکا ہیٹ آفس پرنسٹن شہر میں تھا۔ میں نے لورڈز شہر کو خیر باد کہا اور پرنسٹن شہر منتقل ہو گیا۔ یہ نہایت بڑا شہر تھا اور پرنسٹن سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ صبح اٹھنے کے بعد میں سب سے پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اپنے بیلڈرم کی کٹری کا پردہ سر کا کر یہ دیکھ لوں کہ کتنی رات میں برف نے وحاداً تو کتنی بولی دیا۔ کسی کسی رات..... رات بھر میں ایک فٹ سے بھی زیادہ برف گر چکی ہوتی تھی۔ ہائی وے تو جلد صاف کر دی جاتی تھی مگر چھوٹی

سڑکیں یہ گاڑی چکاٹا اصحاب کی آرائش ہوا کرتی تھی۔ معرکا کا نیا اسٹور کھل رہا تھا۔ میرے دن اس کا افتتاح تھا۔ آج اتوار تھا۔ نئے اسٹور کا زیادہ تر سامان چاچکا تھا لیکن کچھ سامان ابھی باقی رہ گیا تھا۔ باب کو فارغ کرنے کے بعد وہ ہاؤس کی سامی ڈسٹے داری میرے سر آ پڑی تھی۔ اگر سامان وقت پر اسٹور نہ پہنچا تو اس کی جواہری میرے اندر تھی۔

معرکینڈا کا کاروبار مرے کے بھائی ڈیوڈ ہوف میں رہنے بہت ہی ادنیٰ پیمانہ پر اپنے گھر سے شروع کیا تھا۔ پھر جب کاروبار نے ترقی کی تو ڈیوڈ نے باب کو بحیثیت وہ ہاؤس منیجر ملازم رکھ لیا۔ ڈیوڈ اور مرے کی دن رات کی محنت نے کاروبار کو نکلیں سے نکلیں پہنچا دیا۔ کینیڈا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں اس کے اسٹور کھل گئے۔ اسنے بڑے کاروبار کو سنبھالنا باب کی صلاحیتوں سے ماسوا تھا۔ اس کی کمزوریوں کی بنا پر کینی کے منافع میں کمی واقع ہوتی جاری تھی۔ ڈیوڈ کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ منافع کی سطح کو برقرار رکھنے کے لیے باب کی جگہ دوسرا منیجر ملازم رکھا جائے۔ ڈیوڈ اور مرے نے باب کو فارغ کرنے کا فیصلہ میرے سفر میں شمولیت اختیار کرنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ میری ملازمت شروع ہونے کے ایک ہفتہ بعد مرے نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ "تمہیں باب کو ملازمت سے فارغ کرنا ہے۔ اس کو نوٹس کی بجائے دو ہفتہ کی نوٹس دے دینا۔ یہ کام آج ہی کر لینا اور کئی سے تم کو باب کے نوٹس بھی انجام دینے ہوں گے۔"

"لیکن میں باب کو کس بنا پر فارغ کر دوں۔ میرے پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔ "تم کو جواز تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ڈیوڈ کا فیصلہ ہے۔ وہ تم سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کو یہ کاروبار کیسے چلانا ہے۔ باب اسنے بڑے کاروبار کو چلانے کی اہلیت نہیں دکھاتا ہے۔ اس کو جانا ہوگا۔"

باب چلا گیا۔ لیکن آنے والے ڈیوڈ سال کے اندر احمق ڈیوڈ ہوف میں کو بھی منافع کی کمی اور نقصان کا اندیشہ ہی راستہ دکھانے کا جولوڈ ہوف میں نے باب کو دکھایا تھا قطع نظر اس حقیقت کے کہ ڈیوڈ ہوف میں نے ہی معرکا کو ختم دیا تھا اور اس ہاؤس کو اپنے ٹوین بکر سے بچا تھا۔ یہ قدرت کی قسم تھی۔ لیکن سرمایہ داری نظام کسی کے خون کی ہڈیاں نہیں کرے وہ صرف منافع پر چلتا ہے۔ جب معرکا کو نقصان کا

اگست 2014ء

150

ماہنامہ سرگزشت

سامنا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اپنا ہاتھ من کو فارغ کر دیا کہ اب وہ کبھی کو سو مندر طریق سے نہیں چلا رہا تھا۔

ہاتھ کی پھٹل ہو چکی تھی۔ نیا اسٹور کل کھلنا تھا۔ اسٹور کا پانی ماحول سامان پہنچانا میری ذمہ داری تھی۔ میں نے سامان دین میں لود والا اور نئے اسٹور جانے کے لیے ہائی دے 401 کا رخ کیا۔ سب سے پہلے برف پڑ چکی تھی لیکن ہائی دے صاف کر دی گئی تھی۔ میں آرام سے اسٹور پہنچ گیا۔ اسٹور پر سامان اتر جانے کے بعد میں واپس ہائی دے پر آ گیا۔ اب میں برقیٹن دیکھنے جا رہا تھا۔ سامان اتر جانے کے بعد دین بالکل خالی ہو چکی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کوئی وزن نہیں تھا۔ انجن سامنے ہونے کی وجہ سے دین کا سامان وزن آگے کی طرف تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے نظام نقل کا مرکز (مینٹر آف گرپول) بالکل آگے کی طرف آ چکا تھا۔

ہائی دے 401 کینیڈا کی معروف ترین ہائی دے ہے۔ تین لین آنے والی ٹریک کے لیے اس کے بعد تین کی کمانی جس کے بعد جانے والی ٹریک کے لیے تین لین 401 غیر رفتار ہائی دے ہے لیکن برلہاری کے سبب میں دین کو جس پچیس میل سے زیادہ کی رفتار سے نہیں چلا سکتا تھا۔ میں آرام آرام سے دین چلا رہا تھا کہ ٹکا ایک سڑک پر سنبھلے جی ہوئی برف کا ایک ٹکڑا آ گیا۔ جیسے ہی دین کا انگا پھینا برف پر سے گزرا۔ دین گھوم گئی۔ اس نے جانے والی تینوں لین کراس کیں۔ اس کے بعد درمیانی کمانی کو پار کر کے آنے والی تینوں لین کراس کیں پھر مخالف سمت میں گھوم کر آنے والی تینوں لین دوبارہ کراس کیں پھر آخر کار درمیانی کمانی میں آ کر اور دین کا انجن بند ہو گیا۔ یہ سب کچھ صرف چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

ہائی دے 401 اتنی معروف شاہرہ ہے کہ اس پر اگر خدا خواستہ کوئی گاڑی ایک لین بھی کراس کر جائے تو وہ اسٹی سڑک گزریں گا گھراؤ ہو جائے گا کوئی انسانی بات نہیں ہے۔ یہاں تو چھ کی چھ لین کراس ہو چکی تھیں۔ زعمہ بچنے کا کوئی امکان نہ تھا اگر 401 کی معمول کی ٹریک ہوتی۔ اس وقت اگر ہر گاڑیوں کا بھی آئینہ میں گھراؤ ہو جاتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ تو میرا ہر برف ہاری کے باعث میرے آس پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔ کسی گاڑی کا ہائی دے 401 پر نہ ہونا بھی ایک غیر معمولی بات تھی کہ اس پر ہر وقت گاڑیوں کا تاننا بندھا رہا ہے۔

چندہ میں صحت تک میں دین میں ساکت و صامت

کم صم ہیشا رہا۔ ہری کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا۔ کوئی آدمی کھینچے بعد اس ٹھکانے آئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا گاڑی کو کمانی سے باہر نکالا اور برقیٹن کا رخ کیا۔ اللہ نے آج بخیر کرم کیا تھا۔

کینیڈا میں سردی برف ہاری میں سڑکوں کے حادثات بہت واقعات ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اسوائی خطرناک نہیں ہوتی ہے جتنی محمد ہارٹس ہوتی ہے۔ یاد اسٹور جو پچھلے کے بعد دوبارہ جم جاتی ہے۔ دوبارہ جمی ہوئی اسٹور برف کی بالکی سی تھیں جن جاتی ہے جس کی پمپلاہٹ انتہائی خطرناک ہو سکتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے اس صورت حال سے بھی گزرنے کا اتفاق ہوا۔

نورڈن کے مضافات سے نورڈن ٹاؤن جانے کے لیے ایک ہائی دے ہے جس کا نام ہے گارڈز انکمپرس دے۔ نورڈن ٹاؤن سے چند میل پہلے اس پر ایک گھماؤ آتا ہے جو تقریباً دو کورنٹر لیا ہے۔ ایک شام میں اس گھماؤ سے گزر رہا تھا۔ اسٹور پھٹل کر دوبارہ جم چکی تھی۔ گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے کوئی چار پانچ کلومیٹر فی گھنٹہ گئی تھی۔ اس وقت اس سڑک پر ہر ڈراما ہورہے تھے دیکھائی دے رہا تھا۔ گاڑیوں کو گھماؤ کے مطابق موڑنا بھی تھا لیکن اگر اسٹیرنگ پر ڈراما بھی لیا تو وہاؤ ڈالا تو گاڑی پھسل کر آس پاس کی گاڑیوں سے جا ٹکرائے۔ برف کا موت کو دعوت دینا تھا کہ گاڑی اس زور سے پھسل کر ڈراما ہورہے گاڑی دھوکا کا پچھا مشکل ہو جاتا۔ ہر ڈراما ہورہے آس پاس کے ڈراما ہورہے کسی سے بد کہ رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ صرف اُمید تھی۔ خدا خدا کر کے یہ موڑ کٹا۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ قیامت کے کڑا ہڑ گھنٹے تھے۔

نئے اسٹور کا سامان چھوڑ کر میں گھر واپس آ چکا تھا۔ لیکن آج کی مشکلات کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ میں سو رہا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "آپ کے وہ ہاؤس میں چور کھس آیا ہے۔ فوراً پہنچیں۔" یہ ٹیلی فون سکیورٹی کی طرف سے آیا تھا۔

میں نے منہ پر گرم پانی کے پھینٹے مارے۔ کوٹ پہنا۔ اس کے اوپر ہارڈ کوٹ پہنا۔ سر پر ایسی ٹوپی پہنی جو کانوں کو بھی چھپاتی تھی اور ہاتھ میں دستانے۔

ویٹر ہاؤس پہنچا تو وہاں پر دو گاڑیاں پولیس والوں کی ہور ایک گاڑی سکیورٹی کی کھنٹی کی کھڑی تھیں۔ میرا انتظار ہورہا

مجھے خیال آیا کہ اگر یہ پونٹ پاکستان میں ہونے لویہ
سارے کے سارے پونٹ مرمت کر لیے جاتے۔ شاید ان
میں سے کوئی ایک تک بھی ضائع نہ جاتا۔ ہمارے ملک میں
بہترین وراثہ موجود ہے۔ صرف اعلیٰ سطح اور تعلیم میں ہی
نہیں بلکہ کم ترین سطح پر بھی۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہماری
ذہانت قحطی راہوں پر لگن پڑی ہے۔ دولت کی جہوں نے
ہمارے ہر جذبہ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

ہم طالب "دولت" ہیں ہمیں تنگ سے کیا کام
ہم ہمارے ہوں گے تو کیا نام نہ ہوں گے
(اصل معرکہ ہم طالب شہرت ہیں۔۔۔۔۔)

پچھلے دو سال سے سڑکوں میں ٹریفک جھگڑا تھا۔ کبھی
مسئلہ کھانے میں جاری تھا۔ یہ بات کبھی کے اسٹیک
ہولڈرز کے لیے ناقابل قبول تھی۔ انہوں نے لیوڈ ہاف
میں کوئی راستہ پر بھیج دیا جس رات پر لیوڈ نے باب کو بھیجا
تھا۔ اس بات کو کوئی اہمیت دیے ہوئے کہ لیوڈ نے ہی اس
کبھی کی وارنٹ ٹیل ڈالی تھی۔ اس کو ختم دیا تھا۔ اس کو اپنے
خون سے بچ کر پروان چڑھایا تھا۔ اگر لیوڈ اس کبھی سے
منازع نہیں کما سکتا ہے تو اس کی جگہ کسی اور کو لگا جا سکتا تھا۔
کبھی کا نیا پینڈیٹ جہاں گرین۔ جان سے ہلکی ملاقات
کے دوران میں ہی ہم دونوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کی
ایک دوسرے کے ساتھ کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دونوں کی
سوچ کا انداز مختلف تھا۔ چند دن بعد میں نے اپنا استعفیٰ جان
کے ہاتھ میں پکڑا لیا اور عارضی طور پر پاکستان "لاہور"
آ گیا۔ چند مہینے کے لیے۔ پاکستان میں کچھ وقت گزارنے
کے بعد جب میں پاکستان سے کینیڈا "لاہور" آیا تو اس
کے چند مہینے بعد میری کینیڈا میں قیام کی وہ مدت پوری
ہو چکی تھی جب میں وہاں کی شہریت کے لیے درخواست
دے سکتا تھا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اب صرف
شہریت کے لیے انتظار اور شہریت کی طرف برداری کا مرحلہ
باقی رہ گیا تھا۔

جب وہ مہینے انتظار کے بعد بھی انتظار کی کوئی سن گن
نہیں ملی تو میں نے اپنا سامان پانی کے جہاز سے پاکستان
رہا نہ کیا اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر جدہ کے لیے روانہ
ہو گیا۔ جہاز تھا میں بلند ہو چکا تھا۔ نیچے ٹورنٹو شہر کی
راستیاں جھلک رہی تھیں۔ میں نے ہنر و نشینوں پر آخری
نظر ڈالی۔ کینیڈا۔۔۔۔۔ انورا۔

(جاری ہے)

تھا۔ وہ ہاؤس کی چابیاں میرے پاس تھیں۔
وہ ہاؤس میں جو سکھائی ہوئی تھی اس میں
آواز جیسے چاہے۔ باتیں وغیرہ محسوس کرنے کے آئے۔
(سٹر) بھی موجود تھے۔ کوئی کٹر بڑا ہو یا چاہے کی آواز ہو تو وہ
بھی پکڑ میں آ جاتی تھی۔ انہیں صوتی سٹر کے مسئلے سے معلوم
ہوا تھا کہ وہ ہاؤس کے اندر کوئی موجود ہے۔
پولیس والے اسلحہ کے ساتھ وہ ہاؤس کے اندر داخل
ہوئے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ ٹھہرنا رہا۔ چند منٹ کے بعد
ایک پولیس والا باہر نکلا اس نے لکل کر مجھے آواز
دی۔ "آجائیں چور پکڑا گیا۔"

میں اندر گیا تو دیکھا کہ چور پولیس والے کی گود میں
بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے کہہ کر اس نے اقبال جرم کیا۔ "میرا ڈالو"
ایک ملی تھی جو کسی طرح وہ ہاؤس کے اندر رہ گئی تھی
اور باہر نکلنے کی جدوجہد میں بھر پور بھاگ رہی تھی۔ اس
کی اس بھاگ دوڑ سے صوتی سٹر کے مسئلے نے سکھائی کہ کبھی
کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس چور کو کھڑکی لگانا بے سود تھا۔ میری
نیند خراب ہو چکی تھی۔

چند دن بعد میں کسی کام سے دھڑکنا شروع کیا۔ دھڑکنا
شاپ کے باہر میں چار اسکڈ رکھے ہوئے تھے جو ہارڈ ویئر
سے لہے ہوئے تھے۔ اس میں کارڈ بڈ، شپ، پلیٹر،
کیسٹ پلیٹر وغیرہ شامل تھے۔ میں نے معلوم کرنا چاہا کہ
آخر اتنی بڑی تعداد میں یہ ہارڈ ویئر کے پونٹ کیوں رکھے
ہوئے ہیں تو مجھے بتایا گیا کہ یہ تمام کے تمام پونٹ کھالوں کو
دینے کے لیے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آخر یہ تمام کا
تمام مال کہاں میں کیوں بچا جا رہا ہے کیونکہ ان میں سے
تقریباً تین چوتھائی تک ایسے تھے جو دیکھنے میں بالکل نئے
لگ رہے تھے۔ مجھے کہاؤں میں بیچنے کی وجہ بتائی گئی۔
"یہ تمام کے تمام تک پونٹ دارائی کے تحت مرمت
کے لیے آئے تھے۔"

"تو پھر ان کی مرمت کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔"
"اس لیے کہ مینٹا فرج مرمت کرنے میں آئے گا۔
اس سے کم قیمتوں میں ہم ان کو نیا پونٹ دے سکتے ہیں اور
کہاؤں سے جو پیسے ہمیں گے وہ اس کے علاوہ ہیں۔"
مستوی زیادہ تر ہارڈ ویئر چاہن سے بن کر آتی تھی اور
بہت سستی پڑتی تھی۔ اس کے برعکس کینیڈا میں ہارڈ ویئر اتنی
مہنگی تھی کہ نیا پونٹ دارائی میں دے دینا سستا چلتا تھا۔
لہذا اس کی مرمت کرنے کے۔



منتظر امام

عہد سوی سن کا یہ مہینا کئی معنوں میں اہم ہے۔ ہمارے لیے تو بطور خاص اہم ہے کہ اس مہینے کی چودہ کو ہم نے دو سو سالہ غلامی کی زنجیر کو کاٹ کر اپنا ملک آزاد کرایا تھا، اس مہینے میں نور کتبے اہم واقعات رونما ہوئے اس کا مختصر سا جائزہ۔

تسلیمات و سبکدوشی کے بعد ان کے لیے گھر

یہ صدی سال کا آٹھواں مہینا ہے۔ لاطینی میں اس مہینے کو Sextilis کہتے ہیں کیونکہ کسی زمانے میں رومی کیلنڈر کے مطابق یہ سال کا چھٹا مہینا ہوتا تھا۔ 753 BC تک یہ سال کا چھٹا ہی مہینا رہا۔ جبکہ اس زمانے میں مارچ سال کا پہلا مہینا ہوتا تھا۔ پھر 700 BC میں یہ سال کا آٹھواں مہینا ہو گیا۔ اس کے دنوں کی تعداد میں بھی الٹ پھیر ہوئی رہی ہے۔ یہ پہلے اٹھائیس دنوں کا ہوا کرتا تھا۔ پھر جو لیس بڑھنے اس میں اسی وقت توسیع کر دی۔ جب

وہ جو لیکن کیئرڈر ترتیب دے رہا تھا۔

جب سے پیدائشی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مونا خالی
منما ہو جب انسانی تہذیب نے انقلابات نہ دیکھے ہوں۔
دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا ہے۔

اسی مئی 14 اگست کو دنیا کے نقشے پر ایک جھلک کا
اضافہ ہوا۔ وہ ہے میرا اور آپ کا پاکستان۔ جسے لاکھوں
جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا۔ چودہ اگست
پاکستان کا یوم آزادی ہے، جبکہ چودہ اگست ہندوستان کا۔
اسی مئیے ایڈن ہوگ اسکاٹ لینڈ میں مشہور آرٹ فیسٹیول
بھی ہوا کرتا ہے۔ اس فیسٹیول میں دنیا بھر سے آرٹ کے
ولداوہ اور پرفارمر شامل ہوا کرتے ہیں۔ موسیقی، پینٹنگ،
بھروسہ سازی، اسٹیج اور اسٹیرپٹ قہیر، مشاعری، کیا نہیں ہوتا۔
شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا فیسٹیول ہوتا ہو جہاں ادب اور
آرٹ کے علاوہ اتنی پیاس بجائیں۔ یہ میٹا ثقافت
تیار ہوں کے خلاف کچے لگانے کی مہم سے آگاہی کا سہا
ہے۔ فلپائن میں یہ میٹا ان کی اپنی زبان لکھان سے آگاہی کا
ہوا کرتا ہے۔ (چونکہ اس میں تاریخ کی کوئی قید نہیں ہے۔
اس لیے میں نے تاریخ نہیں لکھی)

اویجہ میں اس مئیے ایک بہت دلہنپ جشن ہوا کرتا
ہے اور وہ ہے بڑاں بچوں کا جشن۔ ملک بھر سے جڑواں
خاص طور پر اس جشن میں شریک ہوا کرتے ہیں۔ لیکن میں
بھی ایک فیسٹیول ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت قدیم وادی
ہے۔ اس میں پورا خاندان ایک ساتھ ہو کر خوشیاں منا
ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے حالات سے باخبر کرتا ہے۔
اگست کے اس مختصر سے تعارف کے بعد آئیں اگست
کی تاریخوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی اگست

Francis Scott Key کی پیدائش۔

1779ء

یہ امریکی وکیل جارج ٹاؤن میں پیدا ہوا۔ ایک اچھا
مصنف اور شاعر بھی تھا۔ اس نے امریکا کے لیے ایک ترانہ
لکھا تھا Thoster-spongeed Benner۔
امریکی تاریخ میں اس لحاظ سے اس کی بہت اہمیت
ہے۔

پہلی اگست 1949ء کو کینیڈا کے سائنس دان جارج
ڈاؤسن کی پیدائش ہوئی۔

1984ء میں جان مایون کی پیدائش ہوئی۔ اس نے

امراض میں باسلیں کا استعمال شروع کیا۔

1939ء میں فرانس کے مشہور فیشن ڈیزائنر اور ہند
کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا
فیشن ڈیزائنر کہا جاتا ہے۔

پہلی اگست 1981ء کو دنیا کا سب سے مشہور اور
مقبول ٹی وی میوزک چینل MTV شروع ہوا۔ اس کی
ابتداء نیو یارک شہر سے ہوئی۔ ایک ادارہ تھا Vlocum
Media Network جس نے یہ چینل شروع کیا۔
دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اس کی نشریات دیکھی اور پسند کی
جاتی ہیں۔ میوزک کے شائقین کے لیے اس سے بہتر اور
مستند کوئی میوزک چینل نہیں ہے۔ ایک مکمل میوزک چینل کا
تصور بہت پرانا ہے۔ 1960ء کی میں کچھ اداروں نے
اس پر سوچنا اور کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

مشہور گروپ Beatles کے غلاموں سے مختصر
خانے پر ایک ٹیبلٹ کی ابتداء ہوئی۔ چلو نے اپنے مشہور گانے
A hard سے پردہ اٹھ کرے جیسے Cant buy me
Days Night اور Love وغیرہ۔

ایک میوزک چینل MTV سے پہلے بھی آپکا تھا۔
مشہور فلم ساز اور سے وارنر برادرز نے میوزک ٹی وی
شروع کیا تھا۔ MTV سے دکھایا جانے والا پہلا ویڈیو
Video killed the Bugles
the radiostar تھا۔

پہلی اگست کو Respect
Parents Day یعنی اپنے والدین کی عزت کرنے
کا دن منایا جاتا ہے (ہم خدا کے فضل سے کسی دن کے تکلف
کے بغیر والدین کی عزت کرتے ہیں)

پہلی اگست 1291ء میں سوئٹزر لینڈ کا قیام عمل میں
آیا تھا۔

سوئٹزر لینڈ کو دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ ملک اپنی
ہے پناہ فطری خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہے۔ 1291ء
میں تین ریلوے لائنیں اس میں شامل ہوئی تھیں۔

یہ ایک بہت چمکدار اور غیر جانبدار ملک ہے۔ یہ
اب تک کسی جنگ میں شریک نہیں ہوا۔ چھوٹا ہونے کے
وجود اس کی اکالوی بہت مضبوط اور با اثر ہے۔

اس کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے۔ مشکل سے ایک
کروڑ کے قریب ہوگی۔ اس کے باوجود صرف اپنی مضبوط

اکادمی کی وجہ سے اسے اقوام عالم میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

یہاں جرمنی، فرنگی، اٹالین اور سوئس زبانیں بولی جاتی ہیں۔

پہلی اگست کو The wonder Ful Wizard of oz فرنگی ہم نے رجسٹرڈ کروایا تھا۔ 1941ء میں رلیز ٹک کنوے نے پہلی جیب سامنے لائی تھی۔ پاکستان میں 1960ء میں حکومت پاکستان کا مرکز اسلام آباد قرار پایا۔

1834ء کو مشہور فرانسیسی مجسمہ ساز اسٹینی برتھ ہوڈی کی پیدائش ہوئی تھی، اس نے امریکا کا مشہور مجسمہ آزادی Statue of Liberty تیار کیا تھا۔ 1835ء میں ایشیا گرسے کی پیدائش ہوئی۔ اسی نے ابتدائی فون کا تجربہ کیا تھا۔ 1928ء میں ایک کامیاب برٹش بین Betsy Blooming کی پیدائش ہوئی۔ اس نے امریکا کا مشہور ایپل فیکٹری اسٹور قائم کیا۔ 1904ء میں ہانگ کانگ اور ہون نے شیشہ سازی کی صنعت کی ترقی کے لیے شیشے کو ڈھالنے کا فریم بنایا۔ اس کے بعد شیشہ سازی کی صنعت کو ترقی ہوئی۔ اسی تاریخ کو بھری ہون کی پیدائش ہوئی تھی۔

1492ء۔ 3 اگست یہ وہ تاریخ ہے جب مشہور جہاز دان کوکس اپنے پہلے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

3 اگست 1897ء کو ولیم پرائور وائلڈ ٹامٹ نے امریکا کا کنٹرولر متعارف کرایا تھا۔

1981ء میں 4 اگست کو امریکی موجودہ صدر باراک اوباما کی پیدائش ہوئی۔ اسی تاریخ کو 1755ء میں گولیس چیک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے چٹل ایپا کی تھی۔

1857ء میں ناروے کے ادیب تھ ہانسن کی پیدائش ہوئی۔ اپنے بے مثال کاموں پر ہانسن نے 1920ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

پانچ اگست 1930ء میں ادیب میں ٹیل آرم اسٹورنگ کی پیدائش ہوئی وہی چاند پر جانے والا مشہور خلا باز۔

1902ء میں رابرٹ برائنٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ رابرٹ برائنٹ امریکی مصنف اور تصویر نگار۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے اس کو مانا جاتا ہے اس نے 40 سال میں 20 کتابیں لکھیں اور وہ سب کی سب مقبول

ہیں۔

1944ء میں اس نے "جارج" لکھا تھا۔ اس کتاب کا شمار بچوں کے کلاسیک میں کیا جاتا ہے۔ یہ ایک بچے اور ایک شرمیلے بھوت کی دل چسپ کہانی ہے۔ اس کی دوسری کتابیں Travel of Ching اور The Olivars دلیور ہیں۔

5 اگست 1540ء میں جوزف ہشٹن کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے جو لین لینڈ کو تیار نہیں دیں۔ 1802ء میں ٹیل آکل کی پیدائش ہوئی۔ یہ ناروے کا مشہور ریاضی دان تھا۔

5 اگست 1904ء کو مشہور ماہر حاجات Kauneth thi man کی پیدائش ہوئی۔ جرمنی بولیں پر اس نے بے مثال کام کیا تھا۔

1906ء میں ماہر محاشیت ولس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1973ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

5 اگست 1987ء کو ٹیکنی ہاسکن نے اپنی ایجاد Talking Patti تیار کر دی تھی۔

6 اگست 1917ء میں باربرا کوئی کی پیدائش ہوئی تھی۔

باربرا کوئی۔ بچوں کے ادب پر کام کرنے والی امریکی مصنفہ باربرا کوئی پارک میں پیدا ہوئی تھی۔ انتقال 10 مارچ 2000ء کو ہوا۔ اس کی کتابوں نے اسے دو بار ہیریٹین مصنفہ کا اعزاز دلویا۔

اس کی مشہور کتابوں میں Dx-Cort man, Miss Ranm Ptlus وغیرہ ہیں۔ اس تاریخ کو نوڈی کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔ بچوں کا پسندیدہ کارٹون کردار گارلیڈ کی دوست ٹی وی دیکھنے والا ہریچ گارلیڈ کو جانتا ہے۔

1809ء کو الفریڈ لارڈ ٹینیسن کی پیدائش ہوئی۔ بہت اچھا شاعر، ماحولیات پر اس کی شاعری کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔

6 اگست 1859ء میں جے آر تھر کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ ایک مشہور میگزین ایڈیٹر تھا۔ اس نے ایمپون یاد کرنے کے لیے گرم ہوا کا مظاہرہ بنایا تھا۔

19 اگست 1976ء میں ڈو القادر علی بھٹو نے پورٹ نام کا سبب بنایا رکھا تھا۔

1928ء میں Betsy Byars کی پیدائش

اگست 2014ء

155

ماہنامہ سرگزشت

ہوئی تھی۔

ہو ایک مشہور امریکی مصنف ہے۔ اس نے بچوں کے ادب پر بہت کام کیا ہے (گاہر ہوتا ہے کہ طرب میں بچوں کے ادب پر ہاتھ لگنے سے کام ہو رہا ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں بچوں کے لیے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے)

Summer of The Betsy کا دل 1971 Swan کی بہترین کتاب قرار پائی تھی۔

7 اگست 1779ء میں Carl Ritter کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم جغرافیہ کو جدید نظریات دیے۔

1783ء میں جان ایچہ گات کی پیدائش ہوئی۔ اس نے لیس بنانے کی مشین بنائی تھی۔

سات اگست 1880ء میں گناؤ بیپ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے انسانی جسم میں ایک خاص قسم کے جنسی ہارمون کا پتہ چلایا تھا۔

1886ء میں لیوس بزل ٹائن کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایک سرکٹ بنایا جو ٹینڈن ڈائن سرکٹ تھا۔ اس کی وجہ سے آگے جا کر ڈیڑھ لکھ ایجادیں ہو گئی۔

1903ء میں ایک مشہور انگریز پلو جسٹ لیوس کی پیدائش ہوئی۔

7 اگست 1935ء میں ولیم کونج نے Cal Hose Ray Tube ایجاد کر دیا۔ یہ آلہ نئی وی اور دیگر برقی مصنوعات میں استعمال ہوتا ہے۔

7 اگست 1944ء میں پیٹ ہڈو گرام بکسٹونڈ کیلکولیٹر سامنے آیا۔ اسے ہر دہائی میں نے مشہور ادارے IBM کے تعاون سے بنایا تھا۔

17 اگست 1955ء میں اس وقت کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے استعفیٰ دیا تھا۔

7 اگست کو (یعنی 2014ء) کے حساب سے اسلامی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ جنگ حنین پیش آیا تھا۔ (بہ مطابق اس سوال)

8 اگست 1861ء میں ایک برطانوی باپولوجسٹ ولیم ہیٹ سن کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے نیلی بارو لیا کو جنگ کی اصطلاح دی۔

1901ء میں ایک مشہور سائنس دان ارنسٹ رڈرفورڈ پیدا ہوا۔ اس نے 1939ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

1902ء میں مشہور برطانوی فوسٹ (ماہر فوسٹ) ارنسٹ لارنس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کوانٹم میکینکس بنایا اور 1933ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔

8 اگست 1922ء میں مشہور فیشن ڈیزائنر دوڈی گرینچ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے پیٹ تیرا کی کالہاس اور مٹی اسکرٹ بنایا۔

8 اگست 1911ء میں فرانکس برٹن نے گاڑیوں کے لیے ایک نیا سڑک چھانک کر دیا۔

1819ء میں ولیم تھامس گرین کی پیدائش۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دندان سازی میں سب سے پہلے ایسٹر کا استعمال کیا۔

9 اگست 1898ء میں رڈلف ڈریل نے ڈریل ایجاد کیا تھا۔

1910ء میں آسٹرو پوسٹ ولیم ڈور کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1983ء میں نوبل انعام حاصل کیا تھا۔

1927ء میں مارون سٹسکی کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کیپور کے لیے Artificial Intelligence بنایا تھا۔

دس اگست 1908ء میں مشہور زمانہ فورڈ موٹر کار پوریشن نے ٹریڈ مارک فورڈ موٹر ڈکریا۔

اس پندرہویں اگست کو ماحولیات حسین کا عرس لاہور میں ہوگا۔ ماحولیات حسین اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے۔ ان کا طرار چھرا لاہور میں ہے۔ آپ اپنے حال میں مست رہے دالے صوفی بزرگ تھے۔ ان کی شاعری رعبانہ تصوف کی شاعری ہے۔

آپ ایک کہہ فرماتے ہیں۔ تمہا میرے حال داعرم تو۔

اندوتوں ہیں ہاتھوں میں روم روم وچ توں۔ توں ہی اتھوڑی پاتا سب کہہ پیداتوں۔

دس اگست 1921ء میں مشہور مصنف ایٹکس پیٹ پیدا ہوا تھا۔

ایٹکس پیٹ کی کئی کتابیں بیٹ سکر کی لہرست میں دی ہیں۔

گیارہ اگست 1958ء میں کرشن سنگھ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور انگریز پلو جسٹ تھا۔ اس نے 1929ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

1926ء میں برٹ ڈیٹلے کی پیدائش۔ فیشن ڈیزائنر

۱۶	۱۶۸۳-۱۷۱۹ء	۱۶
۱۷	شہنشاہ عظیم الشان کا بیٹا، شاہ عالم کا	۱۷
۱۸	پوتا۔ لاہ آباد کے صوبیدر عبداللہ خان بارہ	۱۸
۱۹	اور اس کے بھائی سید حسین علی خان کی مدد	۱۹
۲۰	سے فوج تیار کر کے اپنے باپ کے خون کا	۲۰
۲۱	بدلہ لینے کے لیے جہاندار شاہ امین شاہ عالم	۲۱
۲۲	بہادر شاہ اول سے بھڑائی لڑا۔ فتح پالی، پھر	۲۲
۲۳	آگرہ میں دوسری مرتبہ اسے شکست دے کر	۲۳
۲۴	قتل کیا۔ ۱۷۲۳ء میں بادشاہ بن گیا لیکن	۲۴
۲۵	تمام اختیارات سید برادران کے ہاتھ میں	۲۵
۲۶	تھے جنہیں لوگ "بادشاہ مگر" کہتے تھے	۲۶
۲۷	تھے۔ لوگوں کے بھڑکاوے میں آکر بادشاہ	۲۷
۲۸	نے ان سید بھائیوں سے دشمنی پیدا کر لی جبکہ	۲۸
۲۹	انہی کی مدد سے بادشاہ بنا تھا۔ حسین علی	۲۹
۳۰	خان دکن سے مرہٹوں کو چڑھایا اور انہیں	۳۰
۳۱	دکن میں چڑھ دھول کرنے کا حق دے دیا۔	۳۱
۳۲	مرہٹوں کی مدد سے سید بھائیوں نے فرنگی	۳۲
۳۳	کو قید کر کے قتل کر دیا۔ رنج لہر جات اور	۳۳
۳۴	رنج لہر کو بکے بعد دنگرے تخت پر بٹھایا وہ	۳۴
۳۵	تین تین مہینے میں فوت ہو گئے۔ پھر سیدوں	۳۵
۳۶	نے شاہ عالم بہادر شاہ کے ایک چوتھے روٹن	۳۶
۳۷	آخر کو شاہ کے قب سے بادشاہ بنا دیا۔	۳۷
۳۸	مرسلہ بلوچان اختر مراد پوری	۳۸

میں حصہ لینا شروع کیا اور کامیاب ہوتی چلی گئی۔ مشہور شو
Wils West شو کی میزبان بن گئی تھیں۔
۱۳ اگست ۱۹۵۵ء میں جوہان کرستوف کی
پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک مشہور سازگار سید بنایا تھا۔
اسی تاریخ کو ۱۸۱۹ء میں ہاروی کھول کی
پیدائش۔ اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھتے والا یہ شخص فزسٹ اور
ریاضی دان تھا جبکہ ۱۸۸۸ء میں اسکاٹ لینڈ میں جان
لاگ بیرو کی پیدائش۔ اس نے فزکس کا ایک سسٹم بنایا۔ اسی
تاریخ کو ۱۹۰۲ء میں جرمنی کے فزکس دان کل کی پیدائش۔
اس شخص نے وائٹل پروٹری اسٹین سسٹم بنایا۔
۱۹۱۸ء میں برطانوی ہائی کمیسٹ فریڈرک مائیک

مشہور براڈ "لارڈ شیلے" کا خالق۔
گیارہ اگست ۱۹۵۳ء میں مشہور ریسلر بلک ہوگن
کی پیدائش ہوئی۔

یہ ریسلر جارجیا میں پیدا ہوئے۔ اس کا پورا نام ٹیری
جیمز جولیہ ہے۔ لیکن شہرت بلک ہوگن سے پائی۔ اس کے
بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کبھی فائل پے نہیں کیا۔ یعنی
ریسلنگ میں غلط طریقے نہیں اپناتے۔ بلک ہوگن ریسلر
ہونے کے علاوہ سنگر اور گیت ڈرنگی رہا ہے۔ اس کے ٹریٹر کا
نام Itoro تھا۔ بلک ہوگن نے دوبارہ ۱۹۹۰ء اور
۱۹۹۱ء میں راکر سیل جیت کر ریکارڈ بنایا تھا۔

گیارہ اگست ۱۹۹۹ء میں مکمل سورج گرہن ہوا
تھا جبکہ پچھلا سورج گرہن ۳ نومبر ۲۰۱۳ء کو دیکھا گیا
تھا۔ یہ گرہن بحریہ کے کچھ حصوں، شمالی امریکا ایشیا اور
افریقہ کے کچھ علاقوں میں دیکھا گیا تھا۔

گیارہ اگست ۱۹۷۳ء کو چوہدری فضل الحق
پاکستان کے صدر قرار پائے تھے۔

گیارہ اگست ۱۹۵۰ء میں پیدا ہونے والے
Stove wozniak نے اپیل کیپچر حریف کرالین
تھا۔

بارہ اگست ۱۹۳۰ء کو کلیئر لن برڈ نے خوراک کو پیچیدہ
کر کے ان کی پیچیدگی کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح ہم
ڈبوں میں بند خوراک کو مینوں بعد بھی استعمال کر سکتے ہیں۔
بارہ اگست ۱۹۸۱ء میں IBM کے PC کا اعلان
ہوا۔

یہ مقامی پھل چٹانوں کی اور کلسٹنگ کا بہت بڑا ادارہ
ہے۔ اور تقریباً پوری دنیا کا اپنی سرورس فراہم کرتا ہے۔ اس کا
پورا نام International Business
Mactinas ہے۔ IBM کا پہلا کارپوریٹ پارک میں
ہے۔ اس کا قیام ۱۹۱۱ء میں ہوا تھا۔

پہلے اس کا نام Computer Tabulating
Recording Compny تھا۔ پھر یہ IBM ہو گیا۔
۱۳ اگست ۱۸۶۰ء میں Annie oaklery
کی پیدائش ہوئی تھی۔ اپنی اولاد کے نو بھروسے پیدا ہوئی۔

اس کی شہرت عام ہوائے فکس تھی۔ اپیل کور،
مکڑ سواری، نشانہ بازی اس کے مشاغل تھے۔ بلا کی مہم
جو تھی۔ اس نے اپنی حرکتوں سے ایک دنیا کو دیوانہ بنا رکھا
تھا۔ اس نے اسکول کے زمانے ہی سے شوٹنگ کے مقابلوں

کی پیدائش برنی اس نے دو سالہ لڑکی پرانے حاصل کیا تھا۔ ایک بار 1958ء میں اور دوسری بار 1980ء میں۔

1512ء Aztec کا خاتمہ ہوا تھا۔ یہ تہذیب ہے جو مہوگی۔ یہ تہذیب وسط میکسیکو کی تھی۔ چودھویں سے سولہویں پختہ ہو چکی تھی۔

اس لفظ کا مطلب ہے وہ لوگ جو Azilian سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی زبان لوہانی کہلاتی تھی جو لب محدود ہو چکی ہے۔ یہ سرخ ہندی Red Indian کہلاتے تھے۔ شمالی امریکا کی ساتھ تہذیبوں میں سے ایک یہ قوم بہت ذہین تھی۔ اس نے اپنی ذہانت کے کئی ثبوت دیے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی درست تقویم کا استعمال کرتے تھے جو 365 دنوں پر مشتمل ہوتا تھا جبکہ ایک مذہبی تقویم بھی تھا جو 260 دنوں کا ہوتا تھا۔ آرکیک کا صدر مقام "تینوں جیلانا" تھا۔

یہ شہر ایک بڑے بڑے پرانا گیا تھا۔ اس وقت یہ شہر دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہوا کرتا تھا۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے اہرام آج بھی میکسیکو میں موجود ہیں اور دیکھنے والوں کو حیران کرتے رہتے ہیں۔ اس تاریخ کو پیش کریم اسے بھی ستایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1917ء میں Alica Provencan کی پیدائش ہوئی۔ آؤکس شکار گھر پیدا ہوئی۔ اس کے شوہر کا نام مارٹن پردون سمجھا جاتا تھا۔ دونوں سیڑیاں بیوی کے درمیان بے انتہا مودت تھیں۔ دونوں برسوں تک مل کر کام کرتے رہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے چالیس کے قریب کتابیں لکھیں اور تصویروں بھی بنائیں۔ دونوں اپنے آپ کو ایک جان اور دو قالب نہ صرف کہا کرتے بلکہ اس کا ثبوت بھی دیا ہے۔

چودہ اگست 1945ء دوسری جنگ عظیم میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

اتحادی افواج جاپان کی کامیابیوں سے بہت پریشان ہو گئی تھیں لہذا انہوں نے جاپان کے خلاف ایک ایسا بے رحمانہ قدم اٹھایا کہ انسانی تاریخ میں خون ریزی کی اس سے بڑی مثال نہیں ملتی۔ جاپان نے اس وقت ہتھیار ڈالے جب 8 اگست 1945ء کو امریکا نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا۔ جس میں اتنی بڑی ہولی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ صرف اس پرکتا نہیں کیا۔ 8 اگست 1945ء کو دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا۔ اس کے بعد جاپان کے پاس سرحد رک جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کیونکہ کہا یہ

جا رہا تھا کہ اس طرح ہر شہر پر بم گر گیا جائے گا۔ اس خوف سے بالآخر 14 اگست 1945ء کو اس نے کل طور پر سرحد رک کر دیا۔

چودہ اگست 1777ء Hens Crieians کی پیدائش۔ ڈنمارک کا فزسٹ اور کیسٹ۔ اس نے دیو آف نیکیکل لکھا اور الیکٹرو میگنٹوم پر کئی تجربات کیے۔

1883ء ہرنس جسٹ کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور بایولوجسٹ تھا۔

1903ء میں سرکس ڈائریکٹر جان رنگلنگ کی پیدائش۔ یہ شخص رنگلنگ برادرز میں سے ایک تھا۔ ایجادات کے شعبہ میں IBM نے MS.DOS روڈن متعارف کرایا۔

چودہ اگست 1947ء۔ پاکستان کا ایم آر بوی۔ اسی تاریخ کو 1991ء میں نواز شریف نے وائس پرہاب پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور 2000ء میں پردیہ شرف نے نرگس گورنمنٹ آرٹس ٹرسٹ بنادیا۔

15 اگست 1812ء میں جولیا جائلنگ کی پیدائش۔ یہ خاتون اپنے زمانے میں پورے امریکا کی خواتین کی پسندیدہ تھیں۔ یہ کیلی فورنیا میں پیدا ہوئی۔ یہ بہترین مصنفہ تھیں۔

جولیا نے قرآنی لہجہ لکھانوں کو امریکا میں نہ صرف متعارف کروایا بلکہ ان کو بنانے کے طریقے بھی بتا دیے۔

15 اگست 1744ء میں مشہور سائنس ماہر ہابٹس الین فریڈ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے Mycolglcum سسٹم ایجاد کیا۔

16 اگست 1892ء میں فرانسیسی فزسٹ ولس وکٹر کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے 1929ء میں نوٹل پرانے حاصل کیا تھا۔

1896ء میں Leon Therawin کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس نے ایک ساز ایجاد کیا تھا اس ساز کا نام اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔

16 اگست 1845ء میں گبرائل ہپ نیمن کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک فرانسیسی فزسٹ تھا۔ (فزکس کے علم کا ماہر) اس نے نوٹو گرنی کے لیے پہلی نوٹو گراک پیٹ بنائی۔ فزکس کے شعبے میں اپنی خدمات پر 1908ء میں نوٹل

انعام بھی حاصل کیا۔
1848ء میں فرانسیسی لادین کی پیدائش ہوئی۔

پوری دنیا کا ممتاز ترین دانشور۔ اس کی تصوری آف ریولوشن نے ایک ہنگامہ پا کر کے رکھ دیا تھا اور آج تک اس پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کے کام کو اس کے بیٹے چارلس لادین نے آگے بڑھایا۔

18 اگست 1882ء کو ایک ایسے شخص کی پیدائش ہوئی جس کو کھیلوں کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ اس کا نام بیس بلیٹرز اسٹاک تھا۔ پینٹ بال کے باغوں میں سے تھا۔

18 اگست 1904ء کو Wandopp stanlay کی پیدائش ہوئی۔ مشہور بالی کیسٹ۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے دائرہ میں کو کر سٹار کیا۔ 1848ء میں نوٹل پرائز حاصل کیا۔ 16 اگست 1961ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا انتقال ہوا۔

اسی تاریخ کو 1991ء میں چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ ریٹائر ہوئے۔ ان کے بعد یہ عہدہ جنرل آصف نواز نے سنبھالا۔

18 اگست 1997ء میں گلوکار، موسیقار استاد نصرت علی خان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 48 سال کی تھی۔

17 اگست 1870ء کو فریڈرک رسل کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایمپرائیڈ کا موٹو نکلایا تھا۔

17 اگست 1908ء میں ہارلی شپ کی پیدائش ہوئی۔ یہ ایک مشہور کیسٹ اور کاسٹنگس بنانے والا تھا۔

17 اگست 1993ء میں تھامس ریلش نے اسکینڈلورڈ پینٹنگ کیا۔

1938ء میں مشہور فلم Wizard of Oz کا ریٹریو ہوا۔

17 اگست 1888ء کو ضیاء الحق کے طیارے کو بدترین حادثہ پیش آیا تھا جس میں وہ خالقِ حق سے جا ملے۔

18 اگست 1934ء میں مارشل لیڈ کی پیدائش ہوئی اس نے مارشل لیڈ، ہارٹس باسٹورڈ قائم کیا تھا۔

1904ء میکس لیگنر جوئیئر کی پیدائش۔ جو میکس لیگنر کا سینکس کا Cool اور میکس لیگنر سینٹر کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا کی خواتین اس ادارے کی بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔

18 اگست 1947ء میں پاکستان UN کا ممبر ہوا۔

18 اگست شراب نے صدارت چھوڑی تھی اور مہماں سمر صدر رہے تھے۔

19 اگست 1871ء میں ہرولڈ رابنٹ کی پیدائش ہوئی تھی (رابنٹ برادران میں سے ایک) اسی تاریخ کو

1948ء میں امریکا کے صدر ہری ٹریمن کی پیدائش ہوئی تھی

اور 1785ء میں ایسٹ تھامس کی پیدائش۔ جس نے آگے چل کر گھڑی ساز ادارہ قائم کیا اور بڑی تعداد میں گھڑیاں

بنانی شروع کیں۔ اسی تاریخ کو 1918ء میں باگم فوربس کی پیدائش۔ یہ ایک مشہور، پبلشر تھا جس نے مشہور فوربس

میگزین شروع کیا۔ 1888ء میں یلیم میں ایک ایسی رسم کی ابتدا ہوئی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ

میں لے لیا اور ہر سال اس رسم کا انعقاد در و درختوں سے کیا جاتا ہے اور وہ یہ مقابلہ حسن۔ اس کی ابتدا بہت تھوڑے عرصے

پہ ہوئی تھی۔ اس لیے مقابلے میں ویسٹ انڈیز کی 18 سالہ جینیٹ نے کامیابی حاصل کی تھی اور اب تو یہ مقابلہ ایک بہت

بڑا کرشل ایونٹ بن چکا ہے۔

20 اگست 1741ء کو Tue Baring.... نے آلاسکا اور یانٹ کہا تھا۔ اسی تاریخ کو 1830ء میں ٹائکو فرس اور تھو نے ایک لی وی پیٹنٹ کروایا تھا۔

21 اگست 1888ء کو ولیم ہاروے نے دنیا کا پہلا کیمیکل لیٹر خایا تھا۔ اسی تاریخ کو 1952ء میں پاکستان اور

ہندوستان ویسٹ بنگال اور ویسٹ بنگال کی سرحدوں پر شعل ہوئے تھے۔

بائیس اگست 1782ء میں این فرینکس کی پیدائش ہوئی۔ پیدائش کسی بھی اخبار کی پہلی خاتون ایڈیٹر تھی۔ اسی

تاریخ کو 1860ء میں ہال پپ کی پیدائش ہوئی جو بی بی کا موجد کہلاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1820ء میں ڈیوڈ کو لے

ہارٹ سرجن کی پیدائش۔ اس نے پہلی بار مصنوعی دل کی ٹرانسپلانٹیشن کی۔

22 اگست 1932ء میں BBC نے تجرباتی نشریات کا آغاز کیا۔ 22 اگست 1952ء میں پاکستان اور

ہندوستان کے درمیان فون کا رابطہ شروع ہوا تھا۔ اسی تاریخ کو 1966ء میں لوسٹر نے چاند سے زمین کی پہلی

تصویر اتاری۔ (اور اس دن چاند کا کہ عوامی زمین چاند سے کھینچا جا رہا ہو رہا ہے)

23 اگست 1826ء میں مشہور ایٹور پولو جیٹ کلورڈ گیز کی پیدائش ہوئی۔ 1933ء میں مین فریڈ

ڈوناٹک کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے دواؤں کی جانچ کا
سistem ایجاد کیا تھا۔

23 اگست 1904ء میں آٹو سویاگل ہارلمین
پینٹ ہوا تھا۔

24 اگست کو روم کا مشہور فہر پانچویں آتش فشاں کے
غضب کا شکار ہو کر جاہ ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ 78 لے ڈی میں
پیش آیا تھا۔ آگ کے بڑے بڑے گولے پھاڑ کے دالوں
سے نکل کر ہیں ہیں تھیں تھیں گولیوں تک برس گئے تھے کہا جاتا
ہے کہ ہیرہ شہیا پر گرائے جانے والے انیم بم سے سوگنا
زیادہ طاقت ور اور جاہ کن مواد اس پھاڑ سے نکل کر شہر والوں
پر نازل ہوا تھا۔ اس کی آبادی میں واکیں ہزار کی رہی
ہوئی۔ جس میں سے سولہ سترہ ہزار افراد اس وقت مر گئے
تھے جبکہ پورا شہر کھنڈر بن کر رہ گیا تھا۔ آج بھی اس پھاڑ کے
گرد تھیں لاکھ کی آبادی کا ایک بڑا شہر آباد ہے۔ یہ آتش
فشاں فی الحال تو سویا ہوا ہے لیکن بھی بھی جاگ اٹھے گا مگر
کب یہ کوئی نہیں جانتا۔

جوہیں اگست 1880ء میں جوشوا کی پیدائش ہوئی۔
اس نے نقش لاعت بنانے میں تعاون کے علاوہ اپنے خود پر
پولی کھلونا الیکٹرک لارین بنائی تھی۔

چوہیں اگست 1898ء میں بلیکیم کے سائنس دان
البرٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے خلیات کی ساخت اور
کارکردگی کا جائزہ لیا۔ 1974ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔
1918ء میں کیمیکل انجینئر رے کی پیدائش ہوئی۔
اس نے Styro foam ایجاد کیا۔

24 اگست 1893ء کو منسے ہبل نے رائی گزیا
رجسٹر ہوئی۔

24 اگست 1967ء میں پاکستان کے پہلے اسٹیشن
کا چٹا گانگ میں افتتاح ہوا تھا (اب یہ شہر ہنگویش میں
شامل ہے۔)

24 اگست 2002ء میں جنرل پرویز مشرف نے
لیگ فریم ورک آرادر جاری کیا۔

25 اگست 1841ء میں تھیوڈور کوشرکی پیدائش
ہوئی۔ یہ ایک سوکس سرجن تھا۔ اس نے 1909ء میں نوبل
حاصل کیا تھا۔

1916ء میں امریکی ماہر حشرات فریڈک راہن کی
پیدائش ہوئی۔ اس نے 1954ء میں نوبل انعام حاصل کیا۔
26 اگست 1740ء میں جوزف سوشوئیر کی پیدائش

ہوئی تھی۔ اس شخص نے کرم خدے کو فضا میں پھرانے کا
تجربہ کیا تھا۔

1743ء میں مشہور فرانسیسی سائنس دان ایتونی
لودرو کی پیدائش ہوئی۔ اس شخص نے پہلی بار آکسیجن کے
لیے آکسیجن کی اصطلاح استعمال کی۔ ویسے سائنس دانوں کو
تو معلوم کر چکے تھے کہ فضا میں آکسیجن موجود ہے جو زندگی
کے لیے بہت ضروری ہے لیکن اسے کوئی نام نہیں دیا گیا تھا۔

26 اگست 1950ء میں چارلس ریچٹ کی پیدائش
ہوئی۔ یہ فرانسیسی فزکس لو جسٹ تھا۔ اس نے 1913ء میں
نوبل پر انعام حاصل کیا۔

1906ء میں البرٹ سائمن کی پیدائش ہوئی۔ یہ
ایک امریکی ماہر بیالوجسٹ تھا اس شخص نے پہری دنیا
کے بچوں کے لیے ایک بہت بڑا کام انجام دیا۔ وہ ہے پولیو
کے قطرے۔ اس نے پولیو کے قطرے بنائے تھے۔

1951ء میں لیڈروڈ واکمن کی پیدائش۔ یہ ایک
امریکی ریاضی دان تھا۔

28 اگست کو آرتھر سیکرائی نے فوٹو گرافی کے لیے
ایک ایسا سب بنا یا جس میں ان کی روشنی میں عیالیم کے رول
دھلی سکتے تھے۔

(اب تو خیر کیمروں سے رول دھیرہ ختم ہو چکے ہیں
کیونکہ دوسرا سسٹم آگیا ہے۔ لیکن پہلے کیمروں میں
تصویریں کھینچنے کے لیے رول ڈالے جاتے تھے اور ایک
اندھیرے کمرے میں اس رول کو خاص کیمیکل سے دھویا
جاتا تھا جس سے تصویریں واضح ہو جاتی تھیں پھر ان
تصویروں کو اسی اندھیرے کمرے میں نکھایا جاتا تھا)

26 اگست 2006ء میں اکبر بگٹی کی ہلاکت ہوئی۔

27 اگست 1910ء میں مدرسیا کی پیدائش
ہوئی۔ خود کو خدمت خلق کے لیے وقف کر دینے والی عیسائی
ماہرہ نے اپنی زندگی غریبوں اور بے کسوں کی خدمت کے
لیے وقف کر دی تھی۔ ہندوستان کے شہر کلکتہ میں ساٹھ
بوسوں تک غریبوں دنادر چاروں کی دیکھ بھال کرتی
رہیں۔ مدرسیا مقدونیہ بلقان کے شہر اسکوپجیا میں پیدا
ہوئی تھیں۔ تاہم ان پر الیالوی اور مقدونیائی باشندوں کا
یکساں دھوکا ہے۔ کیونکہ اس وقت مقدونیہ کے نام سے کسا
تک کا وجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ شہر سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا۔
انہوں نے اپنے ادارے کی بنیاد انیس سو پچاس میں شخص
بارہ راہباؤں کے ہمرہہ رکھی تھی۔ جن کی تعداد بعد میں بڑھ

ساتھ کی۔ اس گروپ کا نام جیکسن قائم تھا۔ مانگیل ابتدا میں کانگو بجا کر تھا پھر جب اس کی صلاحیتیں سامنے آنے لگیں تو گروپ کا سربراہ ہو گیا۔ اس کے البم Life On The Wall thriller- وغیرہ پوری دنیا میں سنے جاتے ہیں۔ 750 ملین کا بیجوں کی فروخت کا ریکارڈ قائم کیا اس کی موت پر پوری دنیا کے غمگینوں کے ہارے میں جاتے رہے تھے۔

1971ء میں راشد منہاس شہید کو نشانِ حیدر دیا گیا۔

30 اگست 1952ء میں ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کیسٹ جیکب جیریکس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1901ء میں توئل انعام حاصل کیا تھا۔

اسی چرن کو 1884ء میں سوڈن کے کیسٹ تھیوڈور کی پیدائش۔ جسے 1936ء میں توئل انعام سے نوازا گیا۔

30 اگست 1827ء میں مشہور فیشن ڈیزائنر جیمز جین کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 8 ہارکون ایوارڈ حاصل کیا۔ فیشن کی دنیا کا ایک مستحضر پارہ ہے۔

30 اگست 1984ء میں IBM نے اطلاع کیا کہ اسے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ مائیکروسوفٹ ونڈوز کی اصطلاح استعمال کر رہا ہے۔ یہ دو بڑی کمپنیوں کے درمیان مطابقت کا معاہدہ تھا۔

1870ء میں ہارپا سوئی سوڈی کی پیدائش ہوئی۔ ہارپا کی پیدائش اتنی میں ہوئی۔ اور انتقال بالینڈ میں ہوا تھا۔ ہارپا نے یونیورسٹی آف روم میں تعلیم حاصل کی۔ آپ فزیشن بھی تھے۔ ایک عرصے تک ڈیٹیل طور پر کٹرود بچوں کے لیے کام کرتی رہیں۔ آپ نے ایک چھوٹا سا اسکول "کاسا ڈی بام لینا" کے نام سے شروع کیا تھا۔

پہلے 6 سال جنوری 1907ء میں مکرو گیا۔ جس میں بچا اس ساتھ بچے تھے۔ ان کی تعلیم دینے کا طریقہ دارا مختلف تھا۔ یہ بچے کے احصاء اور حواس کو فعال کرتے۔ پھر اس میں دلالت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ آپ کے غلوں اور لکھن کی وجہ سے یہ طریقہ تعلیم مقبول ہوتا چلا گیا اور اس وقت دنیا کے ہر حصے میں کاسا ڈی بام لینا اور سوئی سوڈی اسکول موجود ہیں۔

کرساڑھے چار سو تک اور دائرہ کار ایک سو پچیس ممالک تک جا پہنچا۔ مدرٹریسا کو ان کی خدمات کے صلے میں 1979ء میں توئل انعام دیا گیا۔ ہندوستان نے انہیں بھارت رتن دیا۔ پاپائے روم نے ہارکت شخصیت قرار دیا ہے۔ یہ سعادت بحث قرار دیے جاتے یا حیصہایت کے تحت ولایت کا مرتبہ حاصل کر لینے کے برابر ہے۔ مدرٹریسا کا انتقال 1997ء میں گلگت میں ہی ہوا تھا۔

27 اگست 1874ء کو جرمن کیسٹ گارلی جوش کی پیدائش۔ اس نے وواڈن کی مشہور کمپنی BASF بنائی۔ حالیہ 1931ء میں توئل پر انعام حاصل کیا۔

1877ء کو چارلس اسٹیوارٹ وولس کی پیدائش۔ برطانوی کارساز، اس نے مشہور گاڑی رولز راس بنائی۔ جو دنیا کی سب سے تیز گاڑیوں میں سے ہے۔

1890ء امریکی آرٹسٹ اور نوکر افریمن رے کی پیدائش۔ اس نے ڈیجیٹل مونت ایجاد کیا۔

28 اگست 885ء میں عالم اسلام کے ایک بہت بڑے انسان رازی کی پیدائش ہوئی تھی۔ آپ کا پورا نام ابو بکر محمد ابن زکریا رازی تھا۔ آپ ایک نامور مسلمان عالم، طبیب، فلسفی، ماہر علم نجوم اور کیمیا دان تھے۔ آپ جالیئوس العرب کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی والدہ امیران کے شہر رے میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ قرطوب نے طب ایجاد کی، جالیئوس نے طب کا سائلیا کیا، رازی نے مختلف مسئلہ اپنے طب کو جمع کیا اور ان سے نیا نسخہ تخیل تک پہنچایا۔

29 اگست 1581ء میں جرمن ریاضی دان PilsCua کی پیدائش ہوئی۔ اس نے علم الحساب میں ریکارڈ میٹر 10 اضافہ کیا۔

1904ء میں جرمنی پیرولوسٹ وور کی پیدائش ہوئی۔ 1956ء میں توئل پر انعام حاصل کیا۔

29 اگست 1958ء میں امریکا کے مکاتے اٹریاٹا میں مشہور شو بڑ کی شخصیت مانگیل جیکسن کی پیدائش ہوئی۔ اس کا پورا نام مانگیل جوزف جیکسن تھا۔ اٹریاٹا میں 29 اگست 1953ء میں پیدا ہوا اور 25 جون 2008ء میں لاس اینجلس میں انتقال ہوا۔ یہ مشہور منگر ماپ، وراک، ڈسکو ہریم کے گانے گائے تھا۔ یہ بہترین میوزیسن منگر، گیت نگار اور ڈانسر ہونے کے علاوہ بہترین ایجوٹ آرگنائزر بھی تھا۔ اس نے اپنے کیریئر کی ابتدا اپنے بھائیوں کے گروپ کے



سراپ

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

162

وہ پردہ اپنی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف بوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کسی بلندیاں اسے پاری نہیں۔ اسے ان میں ایک کنش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور عمارتِ سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراپ جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو چھٹکانا ہے۔ جذبوں کو جھپٹ دینا ہے مگر مصودگی اور اطمینان چھین لینا ہے۔ سراپا ایسی لمحوں کے حاصل پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحا حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دالروں میں گزرتی اور گزرتی رہتی۔ ولت کہے گرداب میں ڈوبتے ہوئے فوجواں کی سنسنی حیز اور ولتہ انگیز داستانِ حیات۔

بلند دراصلوں اور بے مثال دلوں سے گندمی ایک تہلک خیز کہانی

اگست 2004ء

162

ملینا مسرگزشت



[illegible]

امرت نگہ سامنے آگیا۔ اس کے اچھ میں سر جھلٹا نکلتی تھی۔ اس نے چونک کر بچا آپ بچاں کیا کر رہے ہیں۔ اسے میں نے کھڑ کر لیا۔ اس نے بتایا کہ اس میں راج کھور کوٹھالی نے کہا ہے۔ میں نے فوراً پانچاں دھلیا کر تلی کا پڑ سے راج کھور کا چھپا کر دیں گا اور اسے خود کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کھور کوٹھالی کے کمرے میں جا کر گیا۔ مگر جب اپنی سرخ میں ہی ہر جہت غیری کی کہ سہ پہ کوٹھور کر لیا گیا ہے اور اسے وہیں نظر لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے وہاں کے لیے تلی کا پڑ لائے کوٹھور سٹاری جب تلی کا پڑ راہیں لا رہا تھا کہ میری پست گیا اور وہ راج کھور کوٹھالی کے کمرے میں گیا۔ وہاں کے لیے تلی کا پڑ پائی پر مگر اچھا مگر ہم سب مٹھو رہے ہیں۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک لڑک کوٹھور کا دھار میں پر سوار ہو کر چھوڑی لکھیں ایل کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو لٹکانے کا کرم آگے بڑھے اور ایک غلام کر دیہ پر لے کر سڑک پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کھور کے گل کی ناکا بندی کرنے پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سہ پہ کوٹھور کا پڑ لے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد پائی دے پر ایک گاڑی کی پہلو لٹکس چلی جتے سڑک پر نہ گئی تھیں بچا دی تھیں۔ گاڑی توڑیک پہنچے ہی دھکا کا سا جوا۔ گاڑی سے فائر بھرا جوتے کے ٹائٹے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوت کر دیا۔ گاڑی کی مٹائی کی گھر وہاں سڑی کی پہلے کھور تھا۔ ہم کی طرف بڑے کر ایک تیلی کا پڑ اڑ رہا تھا۔ اس سے سڑی اتری اور ایل چلی گئی۔ میں جوتے کوٹھور لٹکانے کے پاس پہنچا۔ اس نے تیلی اور دھارے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بھی بیٹا کے گھر بھیج دیا۔ سیا کاٹھور اور ان اسے حرم میں کر دیا تھا اسے میں نے صحت کی گور میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ حارلی گاڑی کو روک کر طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہاں حارلی تھا اس نے لپٹا شاکے اٹھارے پر دھکے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ لپٹا شاکے کے پاس پہنچا۔ لپٹا شاکے نے اسے ہر کام میں لایا ہے گا دھکے کیا۔ سہ پہ کوٹھور تھیں سے اور ان کوٹھور کی بات کی گوی اور اس نے بھرے رو رو دیتے کا دھکے کیا۔ حارلی غلام کے لیے یہ جان لی تو کرانی کا سڑ کر گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے بائیر دونوں سے تھکی دلی مٹی کی آدھ خالی دی "شالی شیا ڈنگ کس عورت کو پھرنے آیا ہے۔" لپٹا شاکہ کا جواب میں نہیں پلا کچھ نہ پھلے ہائے ناٹک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوہا کی لڑائی میں عورتوں کی تھی۔ میں ایک دوسری نوکرانی دی گئی۔ ہم ملے کی دیر میں بھی کھور ہے جتے کر خیر آئی "فوراً کھیں اور فصل ہو پڑ۔ ہم شالی خانی کے ساتھ ایک دوسری جگہ فصل ہو گئے۔ وہاں سے ملنے کے لیے لٹھ اور ایک جھادی کی آڑ میں چھ کر سوار ہو گئے۔ ہمیں کرنے کا بھی کسی نے کچھ سے اور کر کے بے حوش کر دیا۔ حوش آ کر میں کمرے سے بندھا ہوا تھا۔ ہمارے سامنے تھا۔ وہ تھیں کر دیا تھا کہ کھور تھیں پر حمل ہو اور دھارے سے میرے حوش میں تم ہو سکے۔ جب حوش آ تو میں نے خود کو کر کے بندھا ہوا پایا پھر موقع پا کر آندھ ہو گیا اور ناٹک کی لٹکس شاکہ لگا کر لٹکانے کا پڑ اور کمرے سے سڑک میں آ گیا۔ جتے بھی مل گیا تھی ہمارے اور تھیں ملنے میں گھیر لیا۔ پتہ چلا کہ ساری اور بڑا کھور اب تک محفوظ ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ پوری سڑک میں لٹکے فانون لگا ہے اور یہاں کی باتیں بڑا کھور میں راج گا۔ بھی لٹکے کی آدھ خالی دی گور میں لے چھ کر کہا "کھور شیا راج ساری کوٹھور کر رہے۔" مگر میرا جھنڈا اور دھار دھکے سے بدست خاٹک شرواع ہو گئی پھر ساری کی جتے خالی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

جیتے کو زخم کا پتہ نہیں تھا لیکن اس نے میرے تاثرات سے جان لیا اور سر کوٹھالی میں بولا۔ "شوہلی ہم بچے کا نہیں۔" "نہیں... نہیں۔" میں نے پھر کہا۔ "جیتے کچھ نہیں ہو گا۔ ابھی نہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ "شوہلی ڈاکٹر بہت دور ہے۔ ہم نہیں چا سکتے۔ پر آپ ادھر ہے دیدی نوٹھر ہے۔ ادھر سے لیے یہ کافی ہے۔"

سادوی خود پر قابو رکھ رہی تھی۔ مگر اس کے آنسو اس کے قابو میں نہیں تھے۔ شاید میرے بھی نہیں تھے۔ کیونکہ جیتے مجھے وحشت لظہر آ رہا تھا۔ سادوی نے گھیر لیا میں کہا۔ "جیتے ایسی بات نہ کر۔"

میں نے جیتے کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے روک دیا۔ "نہیں شوہلی... وقت کم ہے... آپ ہم سے بات کر۔"

اب تک میں خود کو جھلا رہا تھا کہ جیتے کی جانے گا۔

اس سے پہلے بارہا میں نے صحت کو پاس سے دیکھا۔ بے شمار لوگ میرے ہاتھوں پر میرے سامنے پرے۔ گزشتہ بارہ گھنٹے میں آتی تھیں و غارت دیکھ لی تھی۔ میں اس معاملے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ زخم کی کنڈیشن اور زخمی کی صورت دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ بچے کا یا نہیں اور جیتے کا زخم دیکھ کر میرے اندر سے کسی نے کہا وہ نہیں بچے گا۔ مگر میں اپنے اندر کے آری کو جھلا رہا تھا۔ میں جیتے کو سنبھال رہا تھا۔ سادوی نے اپنی شال اچھ کر اس کی گدی بنا کر جیتے کے زخم پر رکھا۔ جب کٹڑ کی لوٹنے کا چھنا کا ستائی دیا تب بھی میں نے جیتے سے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ مجھے معلوم تھا فتح خان فرار ہو گیا ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کی بجائے مجھے شوت کر دیتا تب بھی مجھے یہاں نہیں ہوتی۔ اس وقت مجھے جیتے کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ گولی ہلت ہر وقت سے صرف نصف اچھا اور گئی تھی اگر یہاں رہے ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ آدھے اچھا کا فرق زندگی اور موت کا فرق بن جاتا ہے۔ میں نے خم لپٹے میں کہا۔ "جیتے یہ کیا کیا؟"

اسے کچھ نہیں ہوگا۔ پہلے بھی وہ کی ہار ڈٹی ہوا تھا۔ ہم میں سب سے زیادہ لڑخم خوردہ وہی تھا۔ اس کا پورا خاندان اس کی آنکھوں کے سامنے مارا گیا تھا۔ اس کے قبیلے کے بیشتر افراد مارے گئے تھے اور باقی پانچ نہیں کہاں تھے۔ دنیا میں اس کا اب کوئی نہیں تھا سوائے ہمارے۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ وہ میرے خاندان کا ایک حصہ ہوگا۔ ہم اس کی شادی کریں گے پھر اس کا بھی ایک خاندان ہوگا۔ مگر جو سوچا تھا وہ سوچ میں رہ گیا اور حقیقت جیت کی رنگوں سے ٹکرا کر قہر کر کے رہی رہی تھی۔ جب جیت نے مجھ سے بات کرنے کو کہا تو مجھے لگے کہ ہاں اب وقت نہیں ہے۔ جیت جانے والا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا دھم دھم دھم خون ٹپک دینک لٹکا دیا۔ وہی ہی ہو پر زندہ رہتا۔

"جیت میں بات کر دو ہاں میرے بیٹے۔"

اس کا چہرہ ایک لمحے کو چمکا تھا۔ "ہم آپ کا بیٹا بنے۔"

"تم میرے بیٹے ہو، بھائی ہو، دوست ہو۔"

"ہم جانتا ہے شولی۔" اس نے کسی اندر وقت سے کہا۔ "آپ سمجھتا ہوں گا کہ میں سے محبت کیا۔" نہیں شولی ہم بس آپ لوگ سے محبت کیا۔ کامی اچھا لگا تھا اور نہیں۔"

"میں جانتا ہوں اگر تمہیں کامی سے محبت ہوتی تو تم اس کے ساتھ جاتے۔" آدمی اس کے ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔ اگر تم اس سے محبت کرتے تو میں اسے لٹکا دیتا۔"

"ہم کو مظلوم ہے، پر ہم نے کبھی نہیں چاہا۔"

سادہ بڑے کھوکھ کے بیڑے کے ساتھ موجود دواؤں کی میز سے جیت کی کاساں لے آئی تھی۔ اس نے ایک بڑی پٹی نکالی۔ میں نے شال بٹا کر پہن لی اور اس کے ساتھ روٹی کا بٹرل رکھا۔ خون اسی روٹی سے بہ رہا تھا اور اسے یوں پیتے دیکھ کر میری رہی کسی اسید بھی ختم ہو گئی تھی۔ جیت کا چہرہ ہرگز نہ لے لے کر رہا تھا اور اس پر تکلیف لپایاں ہو رہی تھی۔ اس نے رک رک کر کہا۔ "شولی۔" ہم کو سفیر۔۔۔ بھائی یاد آ رہا ہے۔۔۔ ہم اس سے بہت لڑا۔۔۔ بدھیزی بھی کیا۔۔۔"

"جیت میری جان یہ محبت تھی۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔"

"ہم جانتا ہے۔۔۔ وہ ہم سے بولا کہ جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو وہ ہم کو اپنے پاس رکھے گا کیونکہ وہ جیسے مونا

ویدی کے بغیر نہیں رہ سکا اسی طرح ہمارے بغیر بھی نہیں رہ سکا۔" جیت کا لہجہ بھر صاف ہو گیا۔ اس کی کتکت فتم ہو گئی تھی۔ جیسے اس کے اندر قوت آئی ہو۔ جیسے چرلخ بھنے سے پہلے بھڑکا ہے۔ اس نے سادی کی طرف دیکھا۔ "ویدی ہم کو صاف کر دیتا۔ ہم آپ کو ویدی بولا اور آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"تم نے میرے لیے سب کیا جو ایک بھائی اپنی بہن کے لیے کر سکتا ہے اس سے زیادہ کیا۔۔۔ یہ میرے بھائی ہیں۔" سادی نے راج اور بڑے کھوکھ کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ "لہذا کی قسم مجھے ان کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا ہے لیکن جیت تمہارا لڑخم بھٹا ہے دل پر لگ رہا ہے۔"

"ویدی آپ ہم سے محبت کرتا ہے۔"

"ہاں میرے بھائی۔۔۔" سادی رونے لگی تھی۔

"شولی آپ بھی کرتا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے اس کا ہاتھ چوم لیا جس پر پینا آ گیا تھا اور یہ موت کا پینا تھا۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا۔ لیکن چہرہ پُر سکون تھا۔ "شولی میرا آخری خواہش پوری کرے گا۔"

اس وقت مجھے خود پر قابو پانے میں بہت جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ "جیت میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا۔"

"شولی تمہارا ارٹھی کو آپ آگ دکھانا۔۔۔ پر لیسا ضروری نہیں ہے مگر خطرہ ہو تو آپ ہم کو ادھر ہی بھڑ جانا۔"

"میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔" میں نے کہا تو مجھے اپنی آواز اچھی لگی تھی۔ سادی اوپٹے سے مسرہ ہار رہی تھی کہ اس کی آواز نہ گئے۔

"نہیں آپ یہاں سے جاؤ۔۔۔ یہاں قہر ہے۔"

جیت نے کہا۔ "ہم پاگل ہے جو آپ کو ایسا بولا۔۔۔ آپ دیوی کو دیکھو۔۔۔ یہاں سے۔۔۔"

"تم جیسا کہو گے میں دینا کروں گا۔" میں نے اسے یقین دلایا۔ اس وقت وہ میری جان بھی مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ اس کی آنکھیں بھڑ رہی تھیں۔ اس نے رک رک کر کہا۔

"شولی۔۔۔ ہانا ماں ایک ہار۔۔۔ ہم سے بولا۔۔۔ آدی مرنا ہے تو۔۔۔ اس دقت۔۔۔ وہ بھگوان سے۔۔۔ جو مانگتا۔۔۔ بھگوان اسے۔۔۔ ضرور دیتا ہے۔۔۔ شولی ہم مانگتا۔۔۔ بھگوان آپ کو کامیاب کرے۔۔۔ آپ کا دشمن نا کام

ہو۔

"جہ میری خواہش ہے تم میرے ساتھ رہو۔"

"شوہن اب ایسا نہیں ہو سکتا۔" جہ نے کہا اور بولنے

ہوئے اچانک اسے جھٹکا اور اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ پھر اس کی آنکھوں کی چمک بجھنے لگی تھی۔ جس جہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آواز دے رہا تھا مگر وہ میری آواز کی حد سے دور جا چکا تھا۔ آوازیں دیتے ہوئے میں نے اسے جھٹک دیا تو جہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ سادی دھاڑیں مار کر رونے لگی وہ سمجھ گئی تھی۔ مگر میں نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"بے وقوف راکیوں رہی ہو، جہ بے ہوش ہوا ہے ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔"

سادی نے میرے شانے پر سر مارا۔ "شوہن جہ مر گیا ہے۔"

جب میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی ہنسی چمک کی۔ وہ ساکت تھی۔ جہ کی سانس اور دل دونوں ٹھہر گئے تھے۔ وہ مر گیا تھا۔ شاید میں بھی مارنے لگا تھا۔ مجھے لگا جیسے میرا دایاں بازو میرے جسم سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے۔ یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں نے بے ساختہ اپنا بازو ٹٹولا مگر وہ اپنی جگہ تھا۔ ہاں ٹٹلی ہو گیا تھا۔ میں بنی کیلیت میں تھا۔ جہ کی موت نے میرے حواس چھین لیے تھے۔ مگر اس موقع پر سادی نے حواس بحال رکھے۔ حالانکہ اس نے کدو بھائی اس کے سامنے پارے گئے اور جہ تو بھاٹیوں سے بڑھ کر تھا۔ اس نے میرا بازو ہلا دیا۔ "شوہن... نہیں یہاں سے جانا ہے۔"

میں چمکا۔ "جہ کو پھوڑ کر؟"

"اگر نہ لے جاؤں گے تو پھوڑ کر جانا ہوگا۔" سادی کھڑی ہو گئی۔ "شوہن وقت کم ہے کوئی بھی آسکتا ہے۔ ابھی یہاں کچھ لوگ اور ہوں گے۔"

"کون لوگ؟" میں نے راسن، ٹٹلی، سراج اور بڑے کنوڑ کی لاشوں کی طرف دیکھا۔ "لب بچا ہی کون ہے۔"

"ان کے آوی ہوں گے۔ ٹٹلی ہے ٹٹلی کے بچہ آوی باہر بھی ہوں۔ یا جھنوکے آوی بنے ہوں۔"

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ لیکن میں جہ کو یوں پھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ میں ہر صورت اس کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جہ کا سرا احتیاط سے لیے رکھا جیسے وہ سوراہے اور اس کی خند نہ لوٹ جائے۔ میں نے راسن کا

پستول اٹھا لیا کیونکہ اچھا پستول تو میں نے راج کنوڑ پر خالی کر دیا تھا۔ جہ اس کی گولی کا نشانہ بن چکا تھا لیکن اس کا اصل قصور سادی پر تھا یا راجا تھا۔ میں نے اس کا پستول بھی اٹھا لیا جو اس کے پاس جہ تھا۔ پھر میں باہر آیا جہاں جہ خان کے آدمیوں کی لاشیں، جھنوکہ اور اس کے آدمیوں کی لاشوں کے ساتھ پڑی تھیں۔ کنوڑ ٹٹلی میں اندر باہر لاشیں ہی لاشیں بکھری تھیں۔ ان میں وہ بھی تھے جو دوسروں کو مارنے آئے تھے اور وہ بھی تھے جن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی انہیں مارنے آ رہا ہے۔ وہ بھی مارے گئے تھے جن کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ کنوڑ ٹٹلی میں کام کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے تو یہاں غلام کی حیثیت سے تھے۔ انہیں صرف زخمی رہنے کا سامان مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ انجنا رہنے کے باوجود تھے مگر ان کی تابعداری بھی ان کو موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔

ان میں میرے بہت سے دشمن تھے اور بہت سے ایسے تھے جن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور جہ جو میرا ساتھی تھا میرے وجود کا ایک حصہ اب وہ یہاں لاشوں کا ایک حصہ تھا۔ راسن اور راج کنوڑ نے ہاں میں موجود جہ خان کے آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں سے آئے اور راج کنوڑ یہاں تک کیسے پہنچا۔ جیسا کہ راج خان کا دعویٰ تھا کہ یہاں جہنم راستے سامنے تھے اس سے کہیں زیادہ خفیہ راستے تھے۔ وہ دونوں بھی کسی ایسے ہی راستے سے آئے ہوں گے۔ راج کنوڑ کے پارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اب ڈیڑھا شا کے قبضے میں نہیں ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اچانک یہاں پہنچ جائے گا۔ یہ تو واضح تھا کہ راسن اب تک اس کے ساتھ تھا اور وہ اسی کے ہمراہ آیا تھا۔ ٹٹلی سمجھ رہا تھا کہ اس نے راسن کو بے وقوف بنا دیا ہے لیکن حالات قاتر ہے جہ کہ راسن نے راج کنوڑ کے ہمراہی کرنا ہے بے وقوف بنایا تھا۔ ان سب نے میرے اور ڈیڑھا شا کے کنوڑوں پر دھوکہ بھرتی چلائی مگر آخر میں خود نشانہ بن گئے۔

میں گیلری کی طرف آیا تھا کہ مجھے کسی کی جھلک دکھائی دی اور میں تیزی سے واپس آ گیا۔ آنے والے نے میری جھلک بھی دیکھ لی تھی اور مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے بلر آواز سے کہا۔ "شہباز یہاں ہیں۔"

میں چمکا تھا۔ وہ کرنل جہو تھا جس کے پارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا تھا۔

میں نے سر ٹال کر جھانکا۔ وہ سر سے پاؤں تک گرد و مٹی میں اچا ہوا تھا۔ گرد و کرل جھوٹی تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ کرل کے ہاتھ میں راتھل مٹی۔ اس کے ہاتھیں بازو اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔ "کرل تم ذبح ہو۔" میں نے سر د لہجے میں کہا۔ "میرا خیال تھا تم بھی مر چکے ہو؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" اس نے سر ہلایا۔ "اتفاق سے میرا کل اسے پی سی کے سامنے لگا تھا اور میں بھی صے میں تھا۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے اور میں اڑ کر باہر جا کر اتفاقاً کم سے کم دس گز دور اس کے باوجود جا گیا شاید اس لیے کہ نرم گھاس پر گرا تھا۔"

"تمہارا انتقام منسوبہ پوری طرح ناکام رہا۔"
"نہیں پوری طرح ناکام نہیں ہوا میں ذبح ہوں تم ذبح ہو۔"

میں نے اسے دیکھ کر دھچک سے لگا یا اور اس کی گردن پر کبھی رکھ کر چلا یا۔ "ہاں لیکن میرا ساتھی ذبح نہیں ہے۔ وہ مارا گیا ہے تمہارے اس منصوبے کی بیخست چڑھ گیا ہے۔"

"کون؟" وہ چلا۔ "وہ لڑکا۔۔۔؟"
"ہاں وہی۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "کرل نے حراست نہیں کی تھی اس لیے میری گرفت خود نرم ہو گئی۔" تم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ میرے لیے کیا تھا؟"
"میں سمجھ رہا ہوں۔" کرل نے نرمی سے کہا۔ "لیکن اس کی موت اسی طرح اور اسی جگہ لکھی تھی۔ یہ میرا اور تمہارا ایمان ہے۔"

اس کے الفاظ نے مجھ پر اثر کیا تھا میرا ہاتھ اس کی گردن سے ہٹ گیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ لیکن میں کیا کروں۔"

"وہ لڑکی کہاں ہے؟ جسے ہم لینے آئے ہیں۔"
"مذہر ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ تم اب تک کہاں تھے۔ اسے پی سیز کو الے بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔" میں نے اپنی نظر گڑی پر ڈالی جس میں تین نگارے تھے۔
"میں سمجھ گیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے کاش کہ میں پہلے ہی تمہاری بات مان جاتا۔ یہ سارا کیا دھڑائی کا تھا۔ مجھے تمہارے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے تھے صرف یہی کاہنر سے اترنے والی عیم محفوظ تھی۔ لیکن باہر اسٹائڈ کی سوجھ بوجھ میں وہ بھی محفوظ نہیں تھے اس لیے میں نے ان کے خاتمے کا فیصلہ

کیا۔ میں رات کی تاریکی میں باہر نہیں نکل سکتا تھا اس لیے دن طلوع ہونے تک ایک جگہ چھپا رہا سکتے ہی نہیں گا رڈز میرے سامنے مارے گئے۔ جسے ہی دن طلوع ہوا میں نہیں سے نکل گیا۔ مجھے حتمی صے سے اترنا پڑا تھا اس کے بعد میں ایک ایک جگہ جا کر فٹنی کے آدمیوں کا خاتمہ کرتا رہا۔ یہ کام لپٹا کر میں اُردہ آیا۔ یہاں کوئی فرد ذبح نہیں ہے۔ میں اس امید میں یہاں آیا تھا کہ شاید یہ لڑکی زندہ ہو اور میں اسے ساتھ لے کر نکل سکوں۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی یہاں تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"اُمید تو مجھے بھی نہیں تھی۔" میں نے اُردہ جاتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟"
"ہاں ہیلی کاپٹر ہے۔" کرل نے کہا۔ "میری پائلٹ سے مدد یو پر بات کر لی ہے وہ دس منٹ میں یہاں آ سکتا ہے۔"

ہم گھرے میں آئے تو سادی جو بیٹو کے پاس بیٹھی تھی کرل کو کچھ کرچنگی اور ہم گئی۔ "شوہل یہ کون ہے؟"
"کرل جھوٹا۔" میں نے کہا۔ "یہ ہم ہی نے ترتیب دی تھی۔"

"ہم یا تھل عام۔" سادی نے تکی سے کہا۔ "اسے معلوم ہے یہاں کتنے لوگ مارے گئے ہیں۔"
"بے بی ایسے کاموں میں یہ سب ہوتا ہے۔" کرل نے نرمی سے کہا۔ "فی الحال ہمیں کسی بحث میں پڑنے بظہر یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔" اس نے میری طرف دیکھا۔ "میں یہی کاپٹر کے لیے کال کر رہا ہوں۔"

اب تک میں سوچ رہا تھا کہ بیٹو کو کیسے لے کر جاؤں۔ مجھے گاڑی کا خیال آیا تھا مگر یہی کاپٹر کہیں بہتر تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے کال کرو۔"

اس کے پاس کسی قدر بڑے سا ترکاڑیہ ہوا تھا۔ یہ اس کی پشت پر بندھے جگ میں موجود تھا۔ اس نے ریڈیو نکالا اور یہی کاپٹر پائلٹ کو کال کرنے لگا۔ "ریڈیو بڑا۔۔۔ ریڈیو بڑا ڈوب رہا ہے؟"

اس نے کئی بار پکھڑا لیکن ریڈیو سے کوئی جواب برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "شاید مجھے چھت پر جانا پڑے۔۔۔ یہاں ریڈیو کام نہیں کر رہا ہے۔"

چھت پر جانے کا سیدھا راستہ تھا وہ گیا ہے۔ لیکن ایک راستہ اور ہے۔"

"کہاں ہے اس پر بتاؤ۔" کرل نے ڈیجیٹل مپس

۱۷۰۔ میں نے اسے ابھر چکی میڑھیوں والا ٹھیکہ راستہ سمجھایا۔ وہ تھکنے میں نہیں تھا مگر کمرل سمجھ گیا۔

”لیکن یہ ادھر سے بند ہو گا اور اسے کھولنا پڑے گا۔“
”فکر مت کرو میں اسے کھول لوں گا۔“ کمرل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے ہی سادی بولی۔

”شوہن کیا ہم اس کے ساتھ جائیں گے۔“
”مجھ پر یہ بھیاں میں خود سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ڈیوڈ شا کی مدد سے ہم ہا آسانی واپس جاسکتے ہیں۔“

”آپ اس شخص پر بھروسہ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ بیڑہ مارا گیا۔“ سادی جذباتی لہجے میں بولی۔ ”کیا ضمانت ہے کہ یہ آپ کے کام آئے گا۔ میں جانتی ہوں وہ آپ کے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ اگر میں اور آپ اس کے پاس چلے گئے تو کیا وہ میری مدد سے آپ کو مجبور نہیں کرے گا۔“

جج کی ایک موت نے مجھ سے جیسے سوچنے رکھنے کی صلاحیت چھین لی تھی اور میں الفاظ میں نہیں جتا سکتا کہ اس جنت میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ میں جو سب بیان کر رہا ہوں اگر وہ کلیتہً ہوتی تو میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ پاتا۔ سادی نے توجہ دلائی تو مجھے خیال آیا۔ یہ سامنے کی بات تھی۔ اگر میں سادی سمیت ڈیوڈ شا کے پاس نکلی جاتا تو اس جیسے عیار کے لیے ذرا بھی دشوار نہیں تھا کہ وہ سادی کی مدد سے مجھے ہلکے پل کرے۔ یہ کہیں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوتی۔ مجھے لگا جیسے جج کی موت کے بعد مجھے پہلی بار ہوش آیا ہے۔ میں نے جج کی طرف دیکھا اور پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر دانت پر پیار کیا۔ میرے آنسو اس کے چہرے پر گرے تھے۔ جج چلا گیا تھا لیکن سادی تھی اور وہ میری دتے داری تھی۔ مجھے اپنی چوری توجہ اس دتے داری پر دینی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”سادی تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے اپنا سامان اور اگر دم ہے تو وہ بھی لے لو۔ اگر ہم نے اپنا راستہ الگ کیا تو اس کی ضرورت پڑے گی۔“

سادی نے سر ہلایا اور بولی۔ ”میرے ساتھ چلیں مجھے کچلے جاتے ہوئے ڈرنگ ہا ہے۔“
میرا بیڑہ کو چھوڑ کر جانے کو دلی نہیں مان رہا تھا اس لیے خود پر جبر کر کے گیا۔ سادی کا کمر صاف ستھرا اور چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی بلیں کا ایک

حصہ ہے جس کا حشر ہو چکا ہے۔ اس نے الماری کھولی اور اس سے اپنے کچھ کپڑے لال کر ایک چھوٹے جینز کیری میں ڈالے۔ پھر اس نے اندر سے رقم کی گڈیاں نکالیں۔ یہ بھارتی روپے تھے۔ بڑا اور پانچ سو کے نوٹوں کی چار گڈیاں تھیں۔ یہ نین لاکھ کی رقم تھی جو عام حالات میں ہمارے لیے کافی ہوتی۔ سادی نے شلوہر میں پہنی ہوئی تھی میں نے پوچھا۔ ”ٹراڈر شرٹ ہے تو وہ لیکن لو اور بیروں میں جو کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے بھاگ دوڑ کرنی پڑے۔ اپنی دوائیاں بھی ساتھ رکھتا۔“

”میں نے سب رکھ لی ہیں۔“ اس نے کہا اور بیگ کی لپ بٹھکی۔ میں نے دھاٹھا لیا۔ سادی نے الماری سے ایک چٹون اور شرٹ نکالی تو میں باہر نکل آیا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے ایک مافیل افٹالی تھی۔ مگر کسی نے راستہ نہیں روکا۔ سادی چند منٹ میں باہر آئی اور اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”شوہن آپ نے کیا سوچا؟“

”وہ یقینی رہا۔“ میں نے کہا اور ہم واپس بڑے کھور والے جیسے میں پہنچے۔ کمرل وہاں آچکا تھا اس نے بے چینی سے کہا۔

”کہاں چلے گئے تھے ہمیں یہاں سے لانا ہے۔“
”کچھ سامان لے رہا تھا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کیسا سامان؟“
”اس کی دوائیاں ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے نیلی کا پٹر کے لیے کال کر لی؟“
”ہاں اور پر ہا آسانی بات ہو گئی۔“ اس نے جواب دیا اور گھڑی دیکھی۔ ”نیلی کا پٹر پانچ منٹ میں آئے والا ہو گا۔“

”تب چلو اوپر۔“ میں نے کہا اور بیگ سادی کو تھا کر بیڑہ کو اٹھا کر شانے پر ڈال لیا۔ میرا دل ایک بار پھر لرزا۔ آدھے گھنٹے پہلے جج ہیتا جاگتا انسان تھا لوہا ب میں اس کی لاش لے جا رہا تھا۔ کمرل جھٹکا۔

”اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“
”یہ میرا سامان ہے میں اس کی لاش یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ہمارے ساتھ جاتے گا۔“ میں نے حتیٰ لہجے میں کہا۔ کمرل ہنسنے لگا۔ ”میرا سامان لے کر چلاؤ۔“
”اوکے ہری لپ وقت کم ہے۔ لیکن ہے مقامی پولیس یہاں آنے والی ہو۔“

”ہم میڑھیوں سے اوپر آئے۔ سب سے آگے کمرل

تھا۔ اس کے پیچھے سادی اور سب سے پیچھے میں بیٹھ کر لیے ہوئے تھا۔ لیکن بے زندگی میں بیٹھ کر دلی ہوئی تھی اس وقت مجھے کسی بچے کی طرح ہلکا سا لگ رہا تھا۔ ہم جیت پر آئے۔ میں نے بیٹھ کر ایک طرف لگا دیا۔ کرل جمہور آسان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمیں یاد آئے میں چھ منٹ گئے تھے اور اتنی دیر میں نیلی کا ہر وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ کسی نقشے کی طرح نمودار ہوا جو ہندو تاج پر اٹھ گیا۔ کرل نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور نیلی کا ہر جیت پر بے نیلی بیٹھ پر اتر گیا۔ اس کے پیچھے گردش کر رہے تھے۔ انہیں کی آواز دیکھی ہوئی تھی لیکن وہ بند نہیں ہوا تھا۔ کرل نے ہمیں اشارہ کیا اور چلا کر بولا۔ "جلدی کرو۔"

میں نے سادی کو سہارا دیا اور نیلی کا ہر کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے اندر بٹھایا۔ پھر میں نے حوکر کرل کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ کر اٹھا کر لائے۔ اسے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کام اسے کہوں گا۔ اس لیے وہ جھپکا اور پھر یاد دلانا خواستہ بیٹھ کی طرف بڑھا اس نے بیٹھ کر اٹھا کر شانے پر لڑا اور نیلی کا ہر کی طرف آیا۔ جیسے ہی اس نے بیٹھ کر اٹھا کر لایا میں نے عقب سے اس کی گولی پر پستول کا دست مارا۔ وہ لڑکھڑایا اور دوسری ضرب پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس دور میں میں سادی اپنا پستول دونوں پانٹ پر تان چکی تھی۔ جو میری کارروائی سے چو گئے تھے۔ میں نے کرل کے پیچ سے منی نکال کر اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھے۔ ہاتھ کسی کر ہاتھ سے تھے اور پاؤں اس طرح باندھے کہ وہ چھوٹے قدموں سے چل سکتا تھا۔ یہ کام نکال کر میں نے اسے نیلی کا ہر میں ڈالا۔ پھر خود بھی سہارا ہو گیا۔ وہ اتر بیٹھ گیا تو شور کسی قدر کم ہوا تھا۔ میں نے پانٹ سے کہا۔ "اسی نیلے پر چلو جہاں سے آئے ہو۔"

"ہمیں وہاں شلہ جانا ہے۔" پانٹ بولا۔ وہ محتای لیکن خوش شکل جوان آ رہی تھا اس کا کو پانٹ سیاہ رد اور چہ صورت تھا۔

"گن ہے تمہیں جہنم جانا ہے۔" میں نے اس کے سر سے پستول ہٹا کر وہ جلدی سے بولا۔

"اوکے اوکے... جہاں تم کہو۔"

"ریڈیو بند ہوں اور نیلی کا ہر کا کوئی ریڈیو کی سسٹم کام نہ کرے۔"

"ریڈیو کام کر رہا ہے ہائی سسٹم بند ہیں۔"

"ریڈیو بھی بند کر دو۔"

"اس صورت میں ہم کسی ممکنہ وارننگ سے بے خبر رہیں گے یہ علاقہ حساس ہے چانکا کی سرحد یہاں سے لپا رہ دور نہیں ہے۔"

"ریڈیو بند کر دو۔" میں نے پھر حکم دیا تو اس نے قبیل کی جی۔ اس نے قرآن پڑھنا تو انہیں کی آواز بدلی اور نیلی کا ہر ایک ہلکے سے دھچکے سے بلند ہوا تھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ مگر ابھی غروب ہونے میں کئی گھنٹے باقی تھے۔ نیلی کا ہر دس منٹ سے بجی پہلے اس نیلے تک پہنچ گیا تھا۔ وہاں نیلی بیٹھ کے لیے بنائے گئے نشانات اور دوسرا سامان جس سے یہ جگہ صاف کی گئی تھی۔ اپنی جگہ موجود تھے۔ پانٹ نے نیلی کا ہر مجھے اتارا اور پھر انہیں بند کر دیا۔ میں مانتے میں کرل کو چپک کر چکا تھا اس کی بغل سست لیکن ہاتھ نہ تھے۔ وہ بے ہوش تھا لیکن اس کی جان کو کوئی غم نہ تھا۔ انہیں بند ہونے پر سکون ہو گیا۔ اس کے گردش کرتے دیکھوں کی رفتار سست ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں پانٹس سے کہا۔ "مجھے اتر دو؟"

"کیوں؟" چیف پانٹ نے کسی قدر بے یقینی سے کہا۔

"یہ ہم کو مارنا چاہتا ہے۔" سیاہ رو کو پانٹ نے....

مطلع کیا۔

"احتمالاً باتیں مت کرو۔... میں بلاوجہ کسی کو نہیں مارتا ہاں اگر تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ لب نیلے اتر دو۔... مجھے ایک بات دو بار کہنے کی حاجت نہیں ہے۔ یہ بات ذہن میں بٹھا لو۔"

وہ دونوں نیچے اترے تو میں نے کرل کو سمجھا کر نیلے اتارا اور اس کا ایک الگ کر دیا پھر اس کی مکمل تلاشی لی تو اس کے پاس سے کئی ہتھیار نکلے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی سکا تھا۔ اسے مکمل طور پر نہتا کر کے میں نے سادی سے کہا۔ "اس کی گھرائی کرنا۔... میرا ذرا ان سے کام لے رہا ہوں۔"

"شوقی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"بیٹہ... کی آخری خواہش پوری کرنے۔" میں نے

کہا اور ایک طرف رکھے سامان کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کپڑاؤں اور آرمیاں بھی تھیں۔ لیکن قینچیاں جن سے شاخیں کاٹی جاسکتی تھیں۔ کام کی چیز کپڑاؤں تھیں۔ میں نے دو کپڑاؤں اٹھائیں اور پانٹوں کے پاس آیا۔ کپڑاؤں ان کے سامنے پھینکیں اور ایک طرف گرے بہت

پرانے خشک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "اس سے لکڑی کاٹو۔"

"ہم لکڑی کاٹیں؟" سیاہ رو نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں لکل کاٹو گے اگر مرنا نہیں چاہتے ہو۔" میں نے رائفل کا رخ ان کی طرف کیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ "تمہارے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے اگر اس دوران میں تم اتنی لکڑی نہیں کاٹ سکتے جتنی ایک چٹا کے لیے درکار ہوتی ہے تو میں تم دونوں کو پھانسی کر دوں گا۔"

"ہمیں مار دیا تو اسے تم اڑاؤ گے؟" پائلٹ نے ہلکی کاہلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں اسے اڑا لوں گا۔ تم دونوں ابھی تک شروع نہیں ہوئے۔ دلت آدھا منٹ کم ہو گیا ہے۔"

وہ حرکت میں آئے۔ یہ بڑا اتنا تھا مگر اس کا اندرونی حصہ کھوکھلا ہو گیا تھا اور یہ بالکل خشک ہو چکا تھا اس لیے آسانی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے خاصی لکڑی نکال لی تھی۔ اس دوران میں میں نے سامان سے پانی نکال کر پیا تھا۔ پاس سے طلق خشک ہو گیا تھا۔ میں نے لکڑی کا جائزہ لیا اور انہیں روک کر کئی لکڑی چٹا کے اعداد میں دیکھنے کو کہا۔ انہوں نے اس حکم کی تعمیل بھی کی۔ ایک گھنٹے میں وہ ساری لکڑی کاٹ چکے تھے اور ان کا حشر ہو گیا تھا۔ وہ اس مشقت کے عادی نہیں تھے اور پھر یہاں دھوپ بھی تیز تھی۔ وہ بانپ رہے تھے اور پیٹے میں شراب پیتے۔ یہ لکڑی کافی تھی۔ اس لیے میں نے ان سے کہا ہاں لے لیں۔ میں ہوشیار رہا تھا کیونکہ یہ خطرناک ہتھیار بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ ایک کین میں نیلی کا پلر کے ٹینک سے اس کا ایندھن نکلا۔ یہ بہت تیز حرارت پیدا کرتا ہے جو ایک نرغہ جیٹ انجن چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ تقریباً ایک گیلن تیل لکڑیوں پر ابھری طرح ڈالا۔

وہ سرط آگیا جس کے پارے میں میں سوچنے سے گریز کر رہا تھا۔ مگر مجھے اس سے گزرنا ہی تھا۔ میں نیلی کا پلر کی طرف آیا تو سادی نے ردنا شروع کر دیا۔ یہاں سنانے میں اس کی آواز عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ سب چھوڑ کر جتھ کو یہاں سے لے جاؤں اسے آگ کی تڑپ نہ کروں۔ مگر دل پر جبر کر کے میں نیلی کا پلر میں آیا۔ جتھ کے جسم سے ہلت پروف اور دوسری چیزیں الگ کیں۔ اس کے جوئے اتارے۔ اب اس کے جسم پر صرف شرٹ اور پتلون تھی۔ اسے اٹھا کر اس کی چٹا تک ڈالا۔ اس پر لاکر

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے کیے۔ اس کی شرٹ سامنے سے خون سے بھیگ گئی تھی۔ یہ وہ خون تھا جو جسم میں تھا تو زندگی تھا اور جسم سے نکل گیا تو موت بن گیا۔ اس کے ماتھے پر آخری بوسہ دے کر میں پیچھے ہٹا تو سادی آگے آئی۔ وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ وہ مجھیں مار رہی تھی اور میں نے بڑی مشکل سے اسے جتھ سے الگ کیا۔

"شوبلی... جتھ... جتھ..." وہ کہتے ہوئے اچانک ڈھیل ہو کر پیچھے گرنے لگی۔ میں نے اسے سنبھال لیا اور اٹھا کر ہلکی کاہلی میں لاکر لٹا دیا۔ پھر اپنی آنکھیں صاف کیں اور پائلٹ سے کہا۔

"تمہارے پاس باجس یا کاسٹر ہے۔"

اس نے خاموشی سے ٹائمر نکال کر میرے حوالے کیا اور میں چٹا نکال آیا۔ ٹائمر چلا یا تو میرا ہاتھ لرز گیا تھا۔ اس روز مجھے پتا چلا کہ اپنے پیادوں کو اپنے ہاتھ سے آگ دکھانا کتنا مشکل کام ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور اپنے مردے زمین کے سپرد کرتے ہیں جو سب سے احسن طریقہ ہے۔ مگر یاد میرا ہاتھ بڑھتے بڑھتے رکا۔ پھر میں نے ہت کر کے لکڑیوں کو آگ دکھا دی۔ پانی ٹینک آئل کی وجہ سے لکڑیوں نے بہت جلدی سے آگ پکڑ لی تھی۔ جب تک میں ڈرا پیچھے ہوا آگ نے لکڑیوں پر اور جتھ کے بے جان وجود کو پوری طرح گھیر لیا تھا۔ میں نے چٹا کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا لیکن جب آگ نے جتھ کے جسم کو چاٹنا شروع کیا تو اس کی بخود گھٹ تک آگئی تھی۔ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا اس لیے میں کرل کے پاس آیا وہ کھلا رہا تھا۔ میں نے کچھ پانی اس کے منہ پر اور کچھ منہ میں ڈالا تو اسے ہوش آگیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے سر جھٹک کر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"شہباز یہ کیا... تم نے..."

"میں واپس ڈیڑھا شا کے پاس نہیں جاؤں گا اور یہ حفظ ماتقدم کے طور پر کیا ہے۔ میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مجھ پر یہ حربہ استعمال کیا۔ ورنہ تم آسانی سے قابو میں نہ آتے۔"

وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ بیٹھا اس نے چٹا کی طرف دیکھا۔ "اوہ ہم وہیں ہیں... پر یہ..."

"میرے سامنے کی چٹا ہے اس کی خواہش تھی کہ اس کی چٹا کو میں آگ لگاؤں۔"

کرل کچھ دیر سوچتا رہا۔ "تو تم واپس نہیں جانا

ہا ہے۔ جیسا تم نے سوچ لیا ہو گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ اب تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟

”کچھ نہیں اگر کچھ کرنا ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ ابلی کا ہنر مجھے اور سادی کو کہیں اتار کر تمہیں واپس لے جائے گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”ویسے میں تمہیں بتا دوں تم یہاں محفوظ نہیں ہو۔۔۔ ڈیوڈ شا تمہارے لیے بہت آسانیاں مہیا کر سکتا ہے۔ ویسے تم نے اس سے وعدہ کیا تھا۔“

”میں اس وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔ جیسے ہی سادی واپس پاکستان پہنچے گی۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ میں اس کی کم میں شامل ہوں گا لیکن اپنے طریقے سے۔ میں مکمل طور پر اس پر انحصار نہیں کر سکتا۔“

”تم جانتے ہو۔۔۔ جو کام وہ بہت آسانی سے کر سکتا ہے۔ تمہارے لیے وہ بہت مشکل ہو گا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”اس کے باوجود میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر اس نے سادی کو اپنے قبضے میں کر لیا تو میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

”وہ تم پر بالکل جبر نہیں کرے گا۔“ کرل نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی۔ مگر میں نے اس کی ہمت پر توجہ نہیں دی تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھکتے ہوئے چنے کی پتا کے دوسری طرف چلا گیا تھا اور اس کی سرخی شعلوں کی سرخی میں گھل مل کر عجیب سا اثر دے رہی تھی۔ یہ دل و دماغ کو بوجھل کر دینے والا منظر تھا۔ میں کچھ دیر سوچا رہا۔ ابلی کا ہنر اسی رات صحتی راجا کا تھا جس کے ولا میں ذبیحہ شامیم تھا اور جہاں پولیس اور انجمنی نے تل کر چھاپا مارا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ابلی کا ہنر کو استعمال کیا جائے تو ہم مشرقی پنجاب تک کا طویل سفر بہت کم وقت میں طے کر سکتے تھے۔ وہاں میں عبداللہ اور وسیم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ کرل مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اس۔ ”بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں اس نے کہا۔“

”یہ بہت خطرناک ہو گا۔۔۔ یہ ابلی کا ہنر ہر جگہ پہچانا جائے گا۔“

”کیا خطرناک ہو گا۔“

”میں کہ تم اسے کھن دور لے جانے کے لیے استعمال کرو۔“

میں نے ابلی کا ہنر پر ہے نکالتا اس کا ساتھ کیا یہ

جنت ہوئے تھے اور اسے آسانی سے خراب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ہنر کا استعمال کیا مگر کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ پائلٹ نے کہا۔ ”یہ خراب نہیں ہو گا۔“

”تمہارے پاس کہاں تک پرواز کا اجازت نامہ ہے؟“

”پورے اظہار میں پرواز کر سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”اگر مجھے ہوشیار پر جانا ہو تو؟“

”تقریباً سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے اس میں چون گھٹنا لگے گا لیکن ابلی کا ہنر میں اتنی لمبی پرواز کا محلول نہیں ہے۔“ میں نے محلول کی جیک کیا۔ جیک تقریباً ساٹھ فیصد بھرا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کتنی پرواز کے لیے کافی ہو گا؟“

”تقریباً ساٹھ سے ستر کلومیٹر۔“

مجھے خیال آیا۔ میں انور کی بجائے نیچے کی طرف جانا چاہیے۔ بتائے مجھے جائیں گے پاکستان کی سرحد اتنا ہی پاس پڑے گا اور اسے عبور کرنا اتنا ہی کم مشکل ہو گا۔ لاہور اور اس سے اوپر سرحد حساس تھی اور اسے عبور کرنا جان جو حکم کا کام تھا۔ ”اگر ہم لاہور کی طرف جائیں تو۔۔۔؟“

”تب بھی اتنا ہی فاصلہ پڑے گا۔“

کرل غور سے من رہا تھا مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں اسے بے خبر بھی رکھتا تو جب ابلی کا ہنر چھوڑتا تو پاکستان خود کرل یا اپنے مالک سے رابطہ کر کے اسے بتا دیتا کہ ہم کہاں اترے تھے؟ میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ”لیک ہے ہم لاہور کی طرف جائیں گے۔“

میرا طبع نہایت خراب تھا۔ خون تلی، چہرے پر کئی دھم تھے جو دیکھنے والے کو فوراً حیرت کرتے۔ میری جینٹ بھی کئی جگہ سے خون آلود تھی لیکن اس کے اندر موجود شرٹ گھونٹا تھی میں نے جینٹ اتار دی۔ پھر وہاں موجود پانی لے کر چہرہ اور جسم کے دوسرے حصے صاف کیے۔ اس سے میں کئی حد تک صاف نظر آنے لگا۔ ابلی کا ہنر میں میڈیکل ایڈجسٹ موجود تھا اس کی مدد سے بھی میرا اثر بڑھتا ہوا۔ میں نے گیس ماسک پہنے ہی اتار دیا تھا اور اب میرے پاس اپنا اور جیت کا ٹائٹ ویجن تھا وہ میں نے سادی کے جیک میں رکھ دیا۔ میری ہاتھوں کا اثر واپس آن کی تھی لیکن آج کل ہر دوسرا شخص اسی قسم کی پینٹ لیکن کر محسوس رہا ہے۔ میں نے خود کو صاف کرنے اور طبع بہتر بنانے میں خود کو لگن کر لیا کیونکہ میں

ابن شعلوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا جو بیٹے کے جوان جسم کو چاٹ چکے تھے۔ اس بو کو محسوس نہیں کرنا چاہتا تھا جو دھوپ کے ساتھ لہلا میں گھٹیں رہی تھی۔ لیکن جب میں ساکت ہوا تو مجھے لگا میں خود کو مصروفیت کا دھوکا دے رہا تھا۔ میرا دل دواں دواں ابن شعلوں کی طرف متوجہ تھا۔

اس سے پہلے میں جان نہیں پایا تھا کہ جتنے میرے لیے کیا ہے۔ مجھے اس تسکین لڑکے سے کل محبت ہے جس کی محبت اور بہادری کا میں خود گواہ تھا۔ جو موت سے یوں کھیلتا تھا جیسے وہ اس کا پسندیدہ کھلونا ہو۔ جو مرنے سے بھی نہیں ڈرا۔ شاید اسی لیے وہ آسانی سے موت کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا پسندیدہ کھلونا اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرا ہم وطن اور ہم مذہب بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اس کے باوجود وہ مجھ سے شک ہو گیا۔ مجھ پر جان ٹاڑ کرنے لگا اور آخر میں اپنی زندگی مجھ پر ڈال گیا۔ جو کوئی راج کٹور نے میری جان لینے کے لیے چلائی تھی وہ اس نے اپنے وجود پر روک لی۔ اب اس کا وجود راکھ میں بدل رہا تھا۔ چٹا سے ہڈیاں جھٹکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میرا جذبہ ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے بیروں کے مل بیٹھ کر زمین پر ہاتھ رکھ لیا اور خاموش آواز میں مدونے لگا۔ اس وقت میں اس پاس سے بھی مائل ہو گیا تھا۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ کرنل قید ہے مگر دونوں پائلٹس تو آزاد ہیں۔ وہ مجھ پر حملہ کر سکتے تھے۔

مگر انہوں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید یوں میں اتنی انسانیت تھی کہ مجھے اس سوگ میں نہ گھٹیریں۔ جب میرا دل ڈرنا لگا ہوا تو میں اٹھ کر ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ سادگی بے ہوش تھی لیکن اس کی بیٹن پورل تھی۔ یہ بے ہوشی نہیں جسم کا سہاگ ڈیٹھس تھا جو قدرت نے خاص طور سے خواتین کو عطا کیا ہے۔ ان کا دکھ بشریاء کی صورت میں آنکھوں سے بہہ جاتا ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتی ہیں۔ کرنل مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ "شہید تم غلطی کر رہے ہو ایک بار پھر سوچ لو۔۔۔ تم اس لیے مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"میں سوچنے کی صلت لیا تو چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں جاؤ گے اٹھریا کی سرزمین پر تم کہیں محفوظ نہیں ہو۔"

"میں بہت مرے یہاں رہا ہوں اور اب تک محفوظ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور پائلٹس کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی

سیٹوں پر چلے گئے۔ "میں تمہیں یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں مجھے اُمید ہے تم خود کو آزاد کرالو گے اور چند گھنٹوں بعد واپس شا کے پاس واپس پہنچ جاؤ گے۔ مجھے کوئی فہرہ جس پر میں تم سے یا ڈیوڈ شا سے وابستہ نہ کر سکوں۔"

اس نے سوجا اور سر ہلایا۔ "ایک نمبر ہے لیکن اسے ذہن نشین کرو کہیں لگسنا مت۔"

"تاؤ میں بھی لکھنے کا قلم نہیں ہوں۔"

اس نے نمبر بتایا جو میں نے تین چار بار دہرایا اور مجھے یاد ہو گیا۔ کرنل نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنی ہی کمریوں کا اس لیے اس نے دوبارہ نہیں کہا۔ البتہ جب ہیلی کاپٹر کا انجن اشارت ہوا تو اتنا کہا۔ "اگر تمہیں بروڈی ضرورت ہو تو بلا جھجک کال کر لیتا۔"

"یقیناً میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے سر ہلایا اور پچھلے حصے میں آ گیا۔ میں نے ایک چاقو کرنل کی طرف پھینکا اور سلائیڈنگ اور کھینچ کر بند کر دیا اور سلائی کے گز سیٹ طٹ اپٹ دی۔ ہیلی کاپٹر کا انجن پوری رفتار سے چلنے لگا اور پھر وہ دھچکے سے نوپ اٹھا۔ میں نے آخری بار بیٹے کی چٹا دیکھی جس میں ٹیبلٹ اب بدم بڑ گئے تھے۔ انہوں نے اپنا کام کر لیا تھا۔ بیٹے کی راکٹ جیسے روٹی تھی۔ وقت کی ہوا اسے منتشر کر دیتی اور اس کا نام دفنان مٹ جاتا۔ لیکن جب تک میں زندہ رہتا وہ میرے دل میں زندہ رہتا۔ ہیلی کاپٹر نے جنوب مشرق کا رخ کیا تو میں چوٹا تھا۔ اس کے بریلو آف تھے اور وہ پہاڑوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے ہیڈ فون مالا تو کو پائلٹ نے مجھے ایک ہیڈ فون تھما دیا۔ میں نے اسے پہن کر پائلٹ سے کہا۔ "خیال رکھنا ہم زیادہ بلندی پر نہ جائیں۔"

"ہم اس وقت پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ ہماری بلندی ہے میدان ملتا ہے۔ میں ہم تمہیں ہزار فٹ کی بلندی پر آ جائیں گے۔"

"جب اچھ من ختم ہونے لگے تو کسی ہائی وے کے پاس رہنا ہم اتریں تو آگے بھی سفر کے لیے کھل جائے اور تم دونوں کو بھی مشکل نہ ہو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں ایسا ہی کروں گا۔"

میں سادگی کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی پھڑکا اور کچھ اس کے منہ میں پٹکا۔ وہ ہوش میں آنے لگی۔ میں نے مزید کوشش نہیں کی وہ خود سے جاگتی تو زیادہ اچھا تھا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آنکھیں کھول دیں

اور وہی منٹ بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ اب ہوش میں تھی لیکن خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے جو اگلے دو گھنٹے سے رخساروں پر ڈھلک آتے تھے۔ میں نے اس کی طرف پانی کی بوتل بڑھائی۔ اس نے ہند گھونٹ پانی لیا اور بولی۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ کی طرف۔" میں نے کہا۔ "وہاں سے ہم پاکستانی سرحد کی طرف جانے کی کوشش کریں گے۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" سادی نے سر ہلایا۔ "گلیوڈ شام کا ٹیبل اعتبار نہیں ہے۔ اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

"رہیم کی اس طرف سرحد پار آنے جانے والوں سے واقفیت ہے۔ وہ ان لوگوں کی مدد سے ہمیں سرحد پار کرا سکتا ہے۔" پائلٹس کے خیال سے میں نے ہیل فون اٹاروا تھا اور لیکن حد تک وہ بھی آواز میں بات کر رہے تھے۔

"جیت۔۔۔؟" سادی نے کچھ دیر بعد کہا تو میں نے سر دھڑکی۔

"راکھ ہو گیا۔"

سادی بھر روئے مگر اب اس کے رونے میں شدت نہیں تھی۔ مجھے خیال آیا۔ "سادی مجھے راج اور بڑے کتور کا بھی۔۔۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے ان کا ناموس کرنے کی۔" اس نے تڑپ کر میری بات کاٹی۔ "میرا ان خود غرض اور سفاک لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کاش میں جگ جگ جگ کی بکری بن ہوتی۔ پلیز آجندہ ان کی بات مت کرے گا۔ میرا منی ہیو ہے اور میرا حال اور مستقبل آپ لوگ ہیں اس کے علاوہ میرا کوئی ماضی نہیں ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے مجھے بھی اچھا نہیں لگتا کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ بس اب تم ہماری ہو۔"

"شہابی ان لوگوں کو کیسے قاتل کرے گا؟" سادی کا اشارہ پاکستان والوں کی طرف تھا۔

"پتا نہیں... لیکن بتانا تو ہوگا۔"

میں نے سارا اسلحہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ لٹا ہوا تھا۔ میں نے صرف ایک چھوٹی شات گن اور اس کے کچھ کارتوس سادی کے بیگ میں ڈال لیے تھے اور ایک پستول اور اس کے کچھ اضافی میگزین میری پتلون کی جیب میں لگے ہوئے تھے۔ سادی کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی ورنہ مجھے

خوش تھا کہ اتنی جھانگ روڑ کے بعد یہ لڑائی سفر اس کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ میں گزشتہ تین گھنٹے سے صرف عمل تھا۔ شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے اور سورج مغرب کی طرف چل رہا تھا مگر مجھے امید تھی جب تک ہم زمین پر اتریں گے روشنی پر قرار رہے گی۔ سادی بھی سولہ سترہ گھنٹے سے بے آرام تھی اور اس درد میں اسے بہت زیادہ حرکت بھی کرنا پڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا مرحلہ بھی آسان نہیں ہوگا۔ لیکن اس سے پہلے تو کام سے کم ایک مدت مکمل آرام کی ضرورت تھی۔

پائلٹ نے پلٹ کر اشارہ کیا تو میں نے ہیل فون لگا دیا۔ اس نے کہا۔ "ہم لدھیانہ سے تین گھنٹہ روڑ ہیں اور اب مشکل سے اس جگہ کی پرواز کا ایجنڈہ بن رہا ہے۔"

"اوس کے تم پانچ منٹ میں کوئی ہائی اسے تلاش کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ تین منٹ پرواز کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے اترنا۔"

"یہ شرط لگاؤ اگر اترنے کے لیے مناسب جگہ ملے گی۔"

"ہائی اسے سے مناسب جگہ کون سی ہوگی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "ناؤ گو۔"

پائلٹ نے سر ہلاتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی بلندی کم کرنا شروع کر دی۔ پانچ منٹ بعد ہم ایک بڑی ہائی چھ پر تھے اور اس جگہ زمین کی ہائی اسے پر بے پناہ ٹھیک تھا۔ ان میں بڑے ٹرکس اور بسیں بہت زیادہ تھیں۔ اس ٹریک میں ہائی اسے پر ہیلی کاپٹر اتارنا خود کشی کے مترادف ہوتا اور اس سے بہت زیادہ افراتفری مچسکتی۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔ "آس پاس کوئی جگہ نہ ہو اور فوری ہیلی کاپٹر اتر لو۔"

اسی لمحے ایک سرخ روشنی چلتے چلتے مجھے لگی جو اس بات کا اشارہ تھی کہ ایجنڈہ بہت کم رہ گیا ہے۔ میں اور پائلٹ دونوں بے تاب سے اترنے کے قابل کوئی جگہ دیکھ رہے تھے اور جگہ بیک وقت ہم دونوں کو نظر آئی۔ یہ ایک کھڑی کا میدان تھا جس میں دو تین خیمہ ڈالے گئے۔ پائلٹ ہیلی کاپٹر بچان کے ساد پر لانے لگا۔ کیلئے والے لپٹا کیل بھول کر ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ ہوئے اور جب وہ نیچے آنے لگا تو سب بھاگے تھے۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میدان صاف ہو گیا تھا اور ہیلی کاپٹر آرام سے اس نرم مٹی والے میدان میں اتر گیا۔ چھپے بے پناہ مٹی اڑا رہے تھے اس لیے میں نے اس وقت تک دروازہ کھولنے سے گریز کیا جب تک کچے کچے تقریباً

رک نہیں گئے اور ملی اڑنا تمام نہیں گئی۔ میں نے سادی سے کہا۔ ”تم اس اسٹیٹ کی راجکماری ہو جس کا یہ بیل کاہر ہے میں تمہارا محافظ اور سکرٹری ہوں۔“

وہ چپکے انداز میں مسکرائی۔ ”جو چاہے بنا دیں۔“ یہ کوئی گاؤں تھا جس کے ساتھ ہی میدان میں کھڑی ہو رہی تھی اور تقریباً ساتھ سڑک تاشائی بھی تھی۔ اسے لوگوں سے الگ تھا اور بلاوجہ اسے کی تلاش باذوق و ذوق مناسب نہیں تھی اس کے مقابلے میں حکمت کی سے کام لیا جاتا تو یہی لوگ ہماری مدد پر آمادہ ہو جاتے۔ میں نے سادی کا ہاتھ رکھنے کو کہا اور خود لیے اتر آیا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھلا رکھنے دیا تاکہ لوگ خود راجکماری کو دیکھ سکیں۔ ویسے سادی کچھ راجکماری ہی تھی۔ کور خانہ ان راجا خانہ ان تھا اور وہ اب اس کی انکوائی و آرٹ تھی یا شاید اس کی ایک بہن اور بھی تھی۔ جاگیر و دولت اب اسے ملتی یا پھر راج کور کے بچے وارث ہوتے۔ مگر اس وقت سادی ریاست چتر پور کی راجکماری تھی۔ بیل کاہر پر ریاست کا نام بھی تھا۔ اترنے سے پہلے میں نے پائٹلس کو خبردار کر دیا کہ وہ کوئی بلا حرکت بات کرنے سے گریز کریں جس کا انجام ان کی وفات کی صورت میں ملے۔ میرے اترتے ہی دو تھوڑے تھوڑے سانس آئے۔ وہ کھڑکی کے کھلاڑی تھے۔

”توں کون اسے۔“ ایک نے بیل کاہر میں مہمانی کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ریاست چتر پور کے مہاراجا تھیں۔ سنگھ کا بیل کاہر ہے۔ غل خرابی کی وجہ سے بیل کاہر یہاں اتارنا چاہتے تھے لوگوں کا خیال خراب ہو لیکن معاملہ جان کا تھا۔ بیل کاہر میں ریاست کی راجکماری سڑ کر رہی ہیں۔“

”توں کو کون اسے؟“ دوسرے نے بھی وہی سوال کیا۔

”میں پرسز کا سکرٹری اور ہاڈی گارڈ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہیں یہاں سے آگے جانے کے لیے کوئی گاڑی مل سکتی ہے؟“

”آگے کہاں؟“

”ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ وہاں راجا تھیں۔“

ہوتے کی سگائی ہے پرسز اسی میں حرکت کے لیے جاری تھیں۔

راجاؤں کے ذکر سے زیادہ انہیں بیل کاہر اور اس میں موجود سادی کی جھلک نے متاثر کیا تھا۔ ایک کچھ

دنہتا مصغر گزشت

ہوا۔ ”کیوں نہیں سرکار گڈیاں بہت... کسی حکم کرو۔“ ”میری خدمت ہے پرسز ہر گاڑی میں سفر نہیں کر سکتی ہیں۔“ میں نے سادی کی سانس پر وہی موجود گاؤں کے سرگردہ لوگوں میں مختصر ٹینگ ہوئی اور طے ہوا کہ لیٹے کی گاڑی پرسز کے لیے سوزوں رہے گی۔ وہ مضبوط بھی تھی اور طویل سفر کر سکتی تھی۔ لیٹا سنگھ عرف خیلاد رہیں موجود تھا۔ وہ درمیانے قدر اور درمیانے جسم کا صورت سے شریف نظر آنے والا شخص تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ٹانگ جا کر گاڑی لے آئے کیونکہ راجکماری کو بہر صورت آج کے دن وہاں پہنچنا ہے اور کل سے شادی کی تقریبات کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک گاڑی آتی میں نے گاؤں کے معززین کو پابند کر دیا کہ وہ پائٹلس اور بیل کاہر کی دیکھ بھال کریں گے جب تک مدد نہ آجائے۔ ان سے خدمت کر میں دیکھیں بیل کاہر میں آیا۔ میں نے پائٹلس سے کہا۔ ”ہم یہاں سے بچے جائیں گے اور ان کو بتایا ہے کہ بیل کاہر میں غل خرابی ہوئی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد تم رہتے ہو پر کسی سے مدد طلب کر رہتے ہو لیکن بہتر ہو گا کہ ہمارے ہمارے میں کسی کو مت متاثر نہ مکن ہے تم پر اپنے آکا کی طرف سے قیام نازل ہو میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“

”مجھ رہا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ ”تمہاری مصروفی کہ میں مار کر نہیں جا رہے۔“

”میں بلا وجہ کسی کو نہیں مارتا اور ہاں کر کے ہمارے میں بھی متاثر نہ اب تک وہیں بچنا ہو گا۔“

اس نے صرف سر ہلایا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رہیں گے۔ خیلادیں ملٹ میں اپنی گاڑی لے آیا۔ میری توقع کے عین مطابق یہ خستہ حال بھارتی ساؤتھ چیس کی لیکن گاؤں والوں کے لیے یہ کسی گھوڑی کار سے کم نہیں تھی۔ مگر میں نے اس پر تہرہ نہیں کیا کیونکہ اصل مرحلہ یہاں سے چلنا اور جھٹک لگ جانے کا تھا۔ میں نے سادی کا ایک انٹرکریسی میں رکھا اور وہ بہت نزاکت اور قرعے کے ساتھ آکر چیس میں بیٹھی تھی۔ اس وقت دور راجکماری کی کھل اور گاڑی کر رہی تھی۔ ویسے گاؤں والے حیران تھے کہ راجکماری اسے مادہ چلے میں اور اتنے معمولی سے سامان کے ساتھ تھی۔ میں نے ان کے شکوک رفع کرنے کے لیے جان چاری کیا کہ راجکماری خیلادیں سفر میں ہیں ہی لباس پہنتی ہیں اور ان کا سامان سڑک کے درختوں پہلے ہی ہوشیار پور پہنچ چکا ہے۔ بیل کاہر میں اتنا سامان لے جانے کی گنجائش نہیں

تھی۔ میں نے کہا۔ "اس میں تو راجیکاری کے رپورٹ کے
کس بھی نہیں آتے۔"

تیلی کا پڑاؤ کرنے کے دس منٹ بعد سورج غروب ہو
گیا تھا اور اب مکمل اندھیرا تھا۔ مگر وہاں موجود افراد جانے
کے لیے تیار نہیں تھے بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا
تھا۔ اس لیے جب کسی حرکت میں آئی تو میں نے اور سادی
نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے سب سے تباہ کن حد تک یہ تھا کہ کس
سوال جواب نہ شروع ہو جائیں یا کوئی چیز پر کاوائف کا رنہ
کل آئے یا کوئی ہوشیار پھر کے مفروضہ راہ کی اسٹری سے
وائف ہو جس کی آلف بے سے بھی ہم باوائف تھے تو معاملہ
خراب ہو جاتا اور پھر بات و ہیں طاقت کے استعمال تک
آ جاتی جس سے آگے مزید خرابیاں پیدا ہوتیں۔ میں لپٹے
کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جس کی زبان لکسی کے انجن کے
ساتھ ہی حرکت میں آ گئی تھی۔ وہ پہلے تو ایس ایچا غامدانی
تاریخ ستارہ مارا، اگر ہم جتو کے صدمے میں نہ ہوتے تو بہت
بڑھتے مگر ہمارے لیون نے مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ ہائی وے
تک آنے پر میں نے اسے خبردار کیا کہ پرسز خاموشی پسند
ہیں اور اپنے آس پاس بد ضرورت شور پسند نہیں کرتی ہیں۔
اس پر وہ خاموشی ہوا تھا۔

ہم ہائی وے پر الٹی سمت گئے تھے۔ یہ ظاہر ہمارا رخ
واپس شملہ کی طرف تھا لیکن کچھ دیر بعد لکسی ایک ذیلی ہائی
وے پر مڑی جو ہوشیار پور کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے
فلپس سے معلومات حاصل کیں کہ ان کے مطابق گھٹی ہائی
وے لدھیانہ کی طرف جا رہی تھی۔ مگر معلومات میں نے یہ
حاصل کیں کہ راستے میں کوئی پولیس چوکی اور چیک پوسٹ
آتی ہے یا نہیں۔ اس نے انکشاف کے انداز میں گالی دے
کر کہا۔ "کوئی جکدان.... سے خالی ہے۔ ہر جگہ کھانچے کے
لے بیٹھے ہوتے ہیں۔"

میں نے اچانک کہا۔ "واپس چلو۔۔۔"
وہ پھر نچکاہ گیا۔ "واپس.... کیا گاؤں چلوں؟"
"نہیں.... اب ہم لدھیانہ جائیں گے وہاں راجا
صاحب کی ایک کوٹھی ہے۔"
"تو پہلے بتانا تھا تو ہیں چلتے۔" اس نے کہا۔
"پرسز نے ابھی ارلڈہ کیا ہے پہلے تم کو کہاں سے
آتا۔"

"انہوں نے کب کہا ہے جی؟" وہ پھر حیران ہوا۔
"ابھی.... ہم تابعدار خادم ہیں آگے کا اشارہ دیکھتے

ہیں۔" میں نے کہا۔ کچھ دیر بعد آنے والے اولین کٹ سے
اس نے لکسی واپس موڑ لی۔ میں منٹ بعد ہم اس کے گاؤں
کے پاس سے گزرے تھے یہی گاؤں اپنی جگہ موجود تھا۔ مجھے
امید تھی کہ ایک دو گھنٹے میں ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور وہ
یہاں سے پرواز کر جائیں گے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک چیک
پوسٹ کے پاس سے گزرے تھے لیکن وہاں موجود پولیس
نے ہمیں روکا تھا۔ وہ صرف ہسول اور ڈکوں کو روک رہے
تھے کیونکہ اسی سے ان کی آمدنی ہوتی تھی۔ گاڑیوں کو
روکے سے بعض اوقات لینے کے لیے پڑ جاتے تھے۔ انڈیا
میں دولت مند اور اونچے طبقے کے لوگ بھی ٹیکسیوں یا عام سی
گاڑیوں میں سفر کرنے میں حار عسوس نہیں کرتے ہیں۔ فلپس
نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ ہائی وے پچانوے تھی۔ ہم چند ہی
گزرہ کی طرف جاتے ہوئے ہوشیار پور کی طرف مڑے
تھے۔ وہ ہائی وے انہیں تھی۔

میں اس کی گھنگوڑا بن ٹھیک کر رہا تھا۔ اس نے مزید
تلاش کی ہائی وے پچانوے ہی سوگا سے آگے فیروز پور کی
طرف جاتی تھی اور پچانوے آگے جا کر پاکستان میں
داخل ہونے کے بعد فیروز پور ریڈائن جاتی تھی جو قصور سے
ہوتی لاہور تک چلی جاتی تھی۔ فیروز پور مشرقی پنجاب میں
اہم ترین شہر تھا کیونکہ اس کے پاس ہی سیلج کا ہیڈ ورک تھا اور
ریج کلف نائی بد ریانت شخص نے اسے فراغ دلی سے لایا کو
بکس دیا تھا حالانکہ یہ آبادی اور اہمیت کے لحاظ سے پاکستان
کا فطری حصہ تھا۔ اسے لایا کو دینے کا مقصد پاکستان کو سیلج
کے ہائی سے محروم کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس کا کنٹرول
سنجالتے ہی لایا کو نے ہائی بند کر دیا۔ ایک نام نہاد معاہدے
کے ذریعے لایا کو کو مشرقی وریا بکس دے گئے حالانکہ وہ
سادے کے سادے کشمیر سے آتے ہیں اور کشمیر ہمارا حصہ
ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی اس فراغ دلی کا لایا کو کے ہوشیار
حکمرانوں نے یہ جواب دیا کہ اب وہ باقی تین دور یاؤں پر
بھی دھڑا دھڑا کم بنارہے ہیں اور مستقبل میں وہ طار پانی
کھل طور پر بند کرنے کی پوری تیاری کر رہے ہیں۔

فیروز پور کا نام سن کر یہ ساری باتیں میرے ذہن میں
آئی تھیں۔ لکسی والے نے پچانوے پچانوے میں چلا اور اس سے
کہا۔ "نی الاہل امیں کسی اچھے شاہک سینٹر پر اتار
وہ.... پرسز نے کچھ لیا ہے ہم وہاں سے فکس جائیں
گے۔"

فلپس کے چہرے پر شک آیا تھا مگر وہ جرأت نہیں کر سکا

کہ ٹیلی کاسٹ سے اترنے والوں پر کسی قسم کا ٹک کر سکے۔ اگر ہم وہ نہیں تھے جو ظاہر کر رہے تھے تب بھی اس کی کواکس سے بہت لمبی چڑھتے تھے اس لیے اس نے خاموش رہنے میں مالیت بھی۔ اس نے ہمیں اندر جانے کی سہولت لانے کے پاس بازار میں اتارا اس میں کئی جدید شاہجی سٹور تھے۔ یہ بازار نہیں ہے شکل سے چند گلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس شہر نے تقسیم سے پہلے بے شمار شاعر اور عالم پیدا کیے۔ بچے اترنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میری جیب تو خالی تھی۔ میں نے ایک کھوکھلا اور اس میں سے ایک پانچ سو روپی گڈی سے ایک نوٹ نکال کر فلیک کے حوالے کیا۔ اس کے چہرے پر جو خوشی دکھائی دی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ "اب جاؤ۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں سادی کے صراہ پہلے ایک ریسٹوران کی طرف بڑھتا ہوں۔ ہم دونوں کا صحن اور بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ ریسٹوران میں کھانے کا آرڈر کر کے ہم نے ہارٹی ہارٹی خود کو اس کے دلیں مردم میں لڑیں کیا۔ میدانی علاقے میں گری ہے پناہ تھی اور اسے ہی میں آکر سکون کا تھا۔ سادی کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوچ رہی تھیں۔ مددجو کر اس کا چہرہ بہتر ہوا تھا۔ کھانے کا موڈ نہیں تھا اس لیے میں نے اس کے لیے چائے اور اپنے لیے کافی کے ساتھ اسٹیکس کا آرڈر دیا۔ دھڑکنے والے وقت ان چہروں کے آئینہ پر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ کہہ نہیں اور خاموشی سے چپ گیا۔ اس کے جانے کے بعد سادی نے پوچھا۔ "اب ہم کیا کریں گے؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ولت یہاں تک کہ ہم صبح کھلا اور جائیں گے اور پھر دیکھ اور دوسروں سے رابطہ کریں گے۔"

وسیم کے نام پر اس کا چہرے پر رنگ آیا تھا اس نے لجاہت سے کہا۔ "خوشی کیا آج رابطہ کریں گے؟"

"آج۔" میں نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "کوشش کر سکتے ہیں۔"

لیپ ٹاپ اور اس کے ساتھ دوسرا سامان نہ جانے کہاں گیا تھا مگر مجھے سواٹل کے مقابلے میں انٹرنیٹ سے رابطہ محفوظ لگا تھا۔ چائے اور کافی کے ساتھ اگلی پانچ چیزوں نے ہمیں کسی قدر تازہ دم کر دیا تھا۔ ریسٹوران سے نکل کر ایک شاہجی سٹور میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنے لیے

چھٹا اور ڈائریکٹ شرت کے جڑے لیے۔ بنیان اور مونرے لیے۔ جوڑے مجھے اسی اسٹور میں مل گئے تھے۔ سادی کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس نے اسکی چیزوں کی خریداری کی جن سے ہمارا طبع نظر آتا۔ میرے لیے اس نے سن گلاس اور سادہ شیشوں والے لیریم لیے۔ ایک پی کیپ تھی۔ اپنے لیے اس نے فیشن بھل قسم کے دو ویسٹ لیے تھے۔ لڑائی روم میں اس نے لباس تبدیل کیا۔ اتارا جانے والا لباس میں نے باہر نکل کر ایک ڈسٹ بن میں ڈال دیا تھا۔ میرا اضافی جوتا اور دوسرا سامان سادی کے بیگ میں آگیا تھا اس کے لیے ہمیں انگ سے کوئی بیگ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہیں سے میں نے معلوم کیا تو اسی بازار میں ایک شاپ کا پتہ جہاں مجھے کپڑا اور اسی قسم کا دوسرا سامان مل سکتا تھا۔

لڈیہ کے ایک گھر نے سے شہر میں بھی کپڑا اور دوسرے سامان کی اسکی جدید شاپ موجود تھی جہاں سب کچھ دستیاب تھا۔ میں اندر داخل ہوا تھا کہ میری نظر ایک ڈسپلے میں پڑی اسکرین والے ٹیپ کپڑا پر گئی۔ یہ اس وقت سے آئے تھے اور تیزی سے مقبول ہو رہے تھے، میں نے سوچا کہ کپڑا کی بجائے ٹیپ کیوں نہ لے لوں۔ میں نے شاپ کیپر کو بتایا کہ مجھے ایسا ٹیپ چاہیے جس میں انٹرنیٹ کے لیے انگ سے کچھ لگانا پڑے۔ اس نے فوراً ایک ٹیپ نکال کر میرے سامنے رکھا۔ "سر یہ انٹرنیٹ پر پڑی ہے اس میں بلیں ہیں۔ صرف کلکشن آن کرنا پڑے گا۔"

"کلکشن کیسے آن ہوگا؟"

"سر آپ انٹرنیٹ پر رونا پڑے۔"

"سادی میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کیا یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ میں ادا کی کروں گا۔"

"کیوں نہیں سر۔" اس نے جھانک کر نے خوشدلی سے کہا۔

"انٹرنیٹ سمیت یہ آپ کو پینٹیکس بڑا ہو چکا ہے۔"

اس میں تین مہینے کا انٹرنیٹ بھی شامل ہوگا۔

"ٹھیک ہے تم اسے ایکٹو کرو اور پھر اس دوران میں رہا اس کا استعمال سمجھا دو۔"

"مجھے آتا ہے۔" سادی نے مددگاری سے۔ "مافی کے پاس ہے اس نے سکھایا تھا۔"

"بس تو تم انٹرنیٹ آن کرو۔"

"آپ شیج میں یہ کام کرنا ہوں۔" اس نے

سنانے لگی کہ سب کی طرف اشارہ کیا۔ چند منٹ میں اس

نے انٹرمیڈ آف کرا کے ہمیں چیک کر لیا اور بولا۔ "اے کراں دی انڈیا نہیں بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے مشکل پر جگہ نہیں گے۔ اس میں اعلیٰ گیر اے فرنٹ کیمبرے سے اسکاٹپ پروڈیو کال کی جاسکتی ہے۔"

"بیٹری ہائیکنگ تھی ہے؟"

"ناڈل یوز پے چار سے چھ گھنٹے اور آڈیو ویڈیو پر ٹین سے چار گھنٹے۔ یہ ہر طرح کی ویڈیو پے بیک کر سکتا ہے۔"

اس نے کر کے دکھا دیا۔ اس کے ساتھ چار جہز، چنڈ فرنی اور کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ سادی کی تھوڑے چڑچڑاہٹ ہو گئی تھی۔ باہر آ کر اس نے کہا۔ "اب ہم وہاں بات کر سکتے ہیں۔"

"ہاں لیکن اس کے لیے ہمیں کسی جگہ کی ضرورت ہو گی جہاں ہم کسی کی نظر اور کان میں آنے بغیر پاکستان رابطہ کر سکیں۔"

اس نے کہا اور ایک جگہ کی دالے کو روکا۔ اندر بیٹھ کر میں نے اس سے کسی ایسے ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ دیکھنے کا انتظام بھی ہو۔ جیسی دالے

نے جس سٹی فخر۔ نظروں سے سادی کو دیکھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ جیسی دالے نے کیا سوچا ہے مگر ہماری بات سے وہ جو چاہے سوچتا رہے۔ اس نے ایک ذرا اٹھ کر دیکھ کے ہوٹل کے سامنے جیسی روکی اور جنب

میں اسے کراہیدے رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "سرخ

اگر کوئی کمرہ چاہے تو وہاں ساگر سے بات کرنا۔۔۔ وہ دیکھ

ہے۔"

سادی ذرا دور تھی وہ نہیں سن سکی وہ نہ حریف نہ مٹاتی۔

ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی شائع چیز نہیں

تھی۔ ہوٹل والے اس کے بغیر کمرہ نہیں دیتے۔ ایسے میں

جیسی دالے کی طرف ذہیت کام آئی اس نے ہمیں حیاش

جوڑا سمجھا اور اپنے چائے والا کا نام دے دیا۔ ساگر ہماری

مدد کر سکتا تھا۔ لائننگ ہال بڑا اور اس وقت بھرا ہوا تھا۔

رات کے دس بجے وہاں شکل سے کوئی میز خالی نظر آ رہی تھی

مگر ایک ہیڈ ویئر نے ہمارے لیے جگہ نکال لی۔ میں نے سی

نوڈ کا آرڈر دیا تھا تاکہ ملانی حرم کا مسئلہ نہ ہو۔ بھوک ہم

دلوں کو نہیں تھی۔ ہم تو یہاں کسی اور مقصد کے تحت آئے

تھے۔ جو ویئر آزاد لینے آ رہے تھے اسے آزاد کے ساتھ ہی

ایک باغی سوکاوٹ تھا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر

آیا تھا کہ اگر میں اسے حکم دیتا کہ اپنے باپ کو مل کر دو تو شاید

وہ یہ بھی کر گزرتا۔ آزاد ری جیس کرتے ہوئے اس نے

آہستہ سے کہا۔ "سر کوئی خدمت؟"

"ساگر ڈی ایک ویئر ہے یہاں؟"

وہ بولا۔ "ہے لیکن سر جو کام ساگر کر سکتا ہے وہ میں

بھی کر سکتا ہوں۔"

میں نے سوچا اور آہستہ سے کہا۔ "ہمیں ایک دلت

کے لیے کمرہ چاہیے۔ انڈیا کی کھانا پڑھیں کے۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو

؟"

جیسی اور انڈیا کی نسبت یہ ویئر نہایت گھناؤم اور

تجربے کا تھا اس نے نظر اٹھا کر بھی سادی کو نہیں دیکھا اور

نہایت ناراض لہجے میں بولا۔ "کیوں نہیں سر۔۔۔ بالکل مل سکتا

ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہ ہو۔۔۔ نہ ابھی۔۔۔ نہ رات میں اور نہ

صبح۔" میں نے کسی قدر بد لے لہجے میں کہا۔ "میں مسئلے پہنچ

نہیں کرتا ہوں ان کا فوری حل نکال لیتا ہوں۔ اس میں مجھے

صرف مالی نقصان ہوتا ہے لیکن دوسروں کا نقصان اس سے

آگے کا ہوتا ہے۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدھا تھا اس نے جلدی سے

کہا۔ "سر کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔۔ میں گاڑتی دیتا ہوں۔"

"اس صورت میں تمہاری توقع سے زیادہ ملے گا۔"

"آپ آرام سے ڈز کر رہی۔" اس نے آہستہ سے

کہا۔ "کوشش کریں کم سے کم دو گھنٹے یہاں رہیں تاکہ آپ

کو ہر گز نہیں انتظار نہ کرنا پڑے۔"

اس کے جانے کے بعد ہم نے ڈز شروع کیا۔ سادی

کم کھا رہی تھی مگر میں نے اصرار کیا۔ "سادی کھاؤ۔۔۔ ہمیں

آنے والے وقت کے لیے تو لٹائی کی ضرورت ہے۔ یہ سوچ

کر کھاؤ۔۔۔ دیکھیں یہاں اور مجھے گزارنے ہیں۔"

ہم نے بہت سکون سے ڈز کیا۔ سب کھا دیا اس کے

بعد میں نے اپنے لیے کافی اور سادی کے لیے اورنگ جوس

منگو لیا۔ اسے دوائیاں لیتی تھیں۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے

تھے اور آرام وہ لٹسٹ ہے بھی سادی صحت ہوئی نظر آ رہی

تھی۔ میں نے ویئر کے لیے اشارہ کیا تو وہ ویئر نمودار ہوا۔

اس نے لجاہت سے کہا۔ "سر پلیز۔۔۔ صرف پندرہ منٹ

اور۔۔۔ بائٹ شلٹ پیسج ہو رہی ہے۔ اس میں اپنا آؤٹی

آئے گا اور وہ کوئی مسئلہ نہیں ہونے دے گا۔"

مجبوراً ہمیں مزید چھٹا پڑا اور اس کے لیے مجھے ایک

کافی اور چھٹا پڑی گئی۔ خدا خدا کر کے ویئر گیارہ بجاس

واپس آیا۔ اس نے مل میرے سامنے کھانا اور میں نے اسے

دیکھ کر دم مل کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے کہا۔ "میرے

“آپ نے کیا کیا؟“

وہ بھرتی سے چند قدم آگے چلا گیا اور ہم اٹھ کر یوں
 باہر کی طرف آئے جیسے ہوٹل سے جا رہے ہوں۔ وینٹر لائی
 میں ایک کونے میں دکھائی دیا اور اس نے ہمیں اشارہ کیا۔
 میں سہری کا ہاتھ تھام کر اس طرف بڑھ گیا۔ یہ عام گزرگاہ
 نہیں تھی۔ میڑبیوں کی ساخت بتا رہی تھی کہ یہ ہنگامی
 حالات کے لیے مخصوص تھیں۔ وینٹر ہمیں تیسری منزل پر
 لایا۔ اتنی میڑبیاں چڑھ کر سہری کی سائیں پھول گئی تھیں اور
 اس کے قدم ہلکے ہوئے تھے۔ مجھے اسے سہارا دینا پڑا تھا۔
 تیسری منزل پر ایک مینان رہبازی میں وینٹر نے ایک
 کمرے کا دروازہ کھولا۔ باہر اس کے پاس تھی۔ ہم اندر
 آئے اس نے ماسٹر سوچ دیا تو پورا کمرہ روشن ہو گیا
 تھا۔ ایک طرف بڑے سائز کا ڈبل بیڈ تھا جس پر تیس
 دلوٹ کی چادر تھی ہوئی تھی۔ فرش پر دوڑقالین تھا۔ ایک
 طرف کھڑکی پر بیماری پر دے تھے۔ سلا میں قالین لگا ہوا
 تھا۔ ایک کونے میں دو عدد لو سٹر صوفے تھے۔ دیواروں پر
 پینٹنگز آویزاں تھیں۔ اس نے انجے ہاتھ کا دروازہ کھول کر
 دکھا بالور بھرا اسے کی چلایا۔

"اپہری قہنگ اندام کے ایجنڈے کا کٹھن۔"

"خائف۔" میں نے کہا۔ "ایک رات کا وقت گیا ہے۔"

”صرف دس ہزار سر۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”ویسے اس کاروبار میں ہزاروں لوگوں کے لیے رجسٹر میں نام اور پتہ لانا لازمی ہوتا ہے۔ اب آپ سے کوئی نام جانیں پوچھنے گا۔“

”سوہی سرور غنٹ کھل اٹھو اس ہوتا ہے۔“ اس نے
سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے سوچا اور بات چیت ہزار بھی
اسے دے دئے ساتھ ہی میں نے شرٹ اٹھا کر اسے ہسٹول
کی جھٹک دکھائی۔

"کون کون کا کون"

اسکا رنگ بدلا تھا اس نے جلدی سے کہا۔ "کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

”گند، میں نے کر پیا داپس لینے کا قائل نہیں ہوں۔“

"سرکشی اور چیز کی ضرورت" اسی نے اشارہ

کہا۔ "یہاں سب دستیاب ہے مگر میں اور غیر مکی ہیں۔"

”ہاں کی ضرورت نہیں ہے شکریہ۔“ میں کھردرے لہجے میں بولا تو وہ سلام کر کے جانے لگا۔ پھر وردانے پر رکا۔ ”سیر آپ باہر نہیں جائیں گے شہ دم سروں کو کال کریں گے اور نہ ہی آنے والی کوئی کال ریسیو کریں گے۔ یہاں سے کوئی آواز بھی باہر نہ جائے جس سے اس پاس والے لاشرب ہوں اور سر کراچی کو پہنچے خالی کرنا ہوگا۔“

میں نے کہا اور دروازہ اٹھدے سے بند کر دیا۔ سناؤ گی ایک طرف محبوب سی ٹیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "سوئی گڑیا۔۔۔ یہ بھوری ہے۔"

”میں جانتی ہوں شوہلی۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بھربھی مجھے شرم آ رہی ہے۔“

کہا: "تم غریب ہو کر آ جاؤ میں رابطہ کر رہا ہوں۔"

”میں آتی ہوں۔“ وہ بولی اور واٹس روم کی طرف چلی گئی۔ میں نے اسکا تپ آن کیا اور سفیر کے نمبر پر کال کی۔ جب تل جہادی بھی تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں کیسے ان لوگوں کو یہ خبر سناؤں گا۔ جب کہ میں نے خود ابھی تک اسے باخفی طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ سفیر نے کال وصول کی اور میری آواز سن کر حسب معمول جانا۔

”ہم نے کہا کہ اس کا جواب ہے کہ کوئی رابطہ ہی نہیں۔“
 ”ہم نے کہا کہ اس کا جواب ہے کہ کوئی رابطہ ہی نہیں۔“
 ”ہم نے کہا کہ اس کا جواب ہے کہ کوئی رابطہ ہی نہیں۔“

"یہ تو کہاں ہے تم لوگ ساوی کر لے آئے؟"

"جنت مر گیا ہے۔۔۔ میں سداوی کو لے آ ہوں۔" میں نے اسی کیفیت میں کہا۔ میرے الفاظ نے سفیر کو شاک دیا تھا۔ وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

”تکوا میں نہ کر لیگی اسی چیز میں اچھی آسانی ہے
جان نہیں بھڑکتی جس۔“

”نہیں یاد رہا، بہت آسانی سے مر گیا۔“ سورا الہو گم کیے ہوئے لے گا۔ ”بارخیز ہو مر گیا گا مر گیا۔“

نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا۔" سفیر نے کہا پھر وہ بھی روئے لگا۔ "یہ تم دونوں کی ساداش ہے تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔ میں اسے بہت تنگ کرتا ہوں۔۔۔ شہباز میرے ساتھ

حرامی پناہ مست کر۔۔۔ میری جگہ سے ہات کرنا۔۔۔ وہ مجھ سے جان بچانا چاہتا ہے۔"

"سفیر وہ چلا گیا ہے سب کو چھوڑ کر۔"

اسی لمحے سفیر سے سہاگل دیکھنے لگا۔ "شعبان صاحب! کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔ جت۔۔۔ اس کی آواز مطلق میں پھنس گئی تھی۔"

"ہاں یار۔" میں نے غور پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

مجھے بچاتے ہوئے اس نے اپنی جان دھری۔ ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اس نے میرے ہاتھوں میں جان دے دی۔"

دیکھ کر روبرو تھا۔ عہد شکن آگیا اس نے سہاگل لیا تو اسے بھی قاتل بنا دیا۔ پہلے وہ شاگ میں رہ گیا تھا۔ پھر اس نے سادوی کے بارے میں پوچھا۔ "وہ میرے ساتھ ہے۔۔۔"

واش روم گئی ہے۔ ایک منٹ میں اسے بلانا ہوں۔" میں نے دروازے پر دھک دی۔ سادوی باہر آئی تو اس کا چہرہ پانی سے نہیں آلودوں سے بیگا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم بات کر دو میں آتا ہوں۔"

جب تک میں اپنے دل کا بوجھ کم کر کے آیا سادوی دو دھوکہ خاں ہو گئی تھی اور اس کی دیکھ سے ہات بھی ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سفیر اور عہد شکن نے بھی دیکھ کو اگلا چھوڑ دیا تھا۔ سادوی نے دینے پر کال لگائی تھی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ جت کا دکھ اپنی جگہ لیکن سادوی کو دیکھ کر دیکھ کے چہرے پر جو اطمینان آیا تھا وہ محسوس کیا جاسکتا تھا۔ جب تک سادوی واپس نہیں آئی دیکھ کے دل پر جو جھیت رہی تھی وہ دھلی جاتا تھا یا پھر سادوی جاتی تھی۔ یہ اطمینان ہی لان کی دلی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا سادوی نے مجھ سے کہا۔ "دیکھ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

دیکھ نے کہا۔ "سادوی نے مجھے مختصر حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"نیکل اب تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟"

"آپ گھر نہ کریں میں خود روٹھ ہوں اور اپنے آدمی بھی ساتھ لاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "آپ کل صبح مجھ سے رابطہ کر لے گا۔ اس وقت تک جویشن وارن ہو جائے گی۔"

"نیک ہے ایسی بات کرنا مناسب نہیں ہے اور ہم بہت گھمے ہوئے ہیں۔ سادوی کو آرام کی ضرورت ہے۔ کل

صبح بات کریں گے۔" میں نے کہا اور ٹیپ آل کر دیا۔ سادوی بستر پر نیم در لا ہو گئی تھی۔ اسے ہی چلنے کے بعد کراٹنگ ہو گیا تھا۔ یہاں وہ کچے کھیل موجود تھے۔ میں نے ایک کھیل اور کپڑا لیا۔ "تم سو جاؤ۔۔۔ میں نیچے ٹیپ دے رہا ہوں۔"

وہ بے چین ہو گئی۔ "شوہلی! نیچے صرف قالین ہے آپ بے آرام ہوں گے۔"

"میں تو کمرہ دی زمین پر سوتا آیا ہوں۔ تم فکر مت کرو قالین بگڑے۔ میں کھیل بھی بچاؤں گا۔ تم سو جاؤ۔" میں نے کہا اور قالین پر ٹکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ ابھی سردی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ کھیل لیتا۔ سادوی کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"شوہلی! کیا ہم جت کے لیے دعا نہیں کر سکتے؟" "ہاں نہیں۔" میں نے سرد آواز بھری۔ "ہم ان کی تکلیف کے اتنی ہیں جنہوں نے منافقوں کی بخشش کے لیے بھی دعا کی تھی۔ جت منافق تو نہیں تھا۔ ہم اللہ سے مانگ سکتے ہیں آگے وہ مرضی بھلا لک ہے کہ بخشے یا نہ بخشے۔"

سادوی خاموش ہو گئی پھر اس نے نہیں کہا تھا۔ میں نے دل میں جت کے لیے دعا کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جو منہ خستہ حال ہو رہا تھا اور دل کی کیفیت اس سے بھی زیادہ خستہ تھی۔ اس کے باوجود بہت مشکل سے نیند آئی۔ میں شاید دو بجے سو رہا تھا اور صبح سات بجے آگے کھل گئی۔ جسم لوٹ رہا تھا اور سر میں درد تھا۔ سادوی بے خبر سو رہی تھی میں نے اسے سونے دیا اور خود اٹھ کر واش روم میں آیا۔ یہ نگہبوری قسم کا ہاتھ روم تھا جس میں ہاتھ بٹ بھی تھا۔ میں نے اسے گرم پانی سے گھرا۔ اس میں گھون اور جراثیم کش ملا تھا اور کپڑے اپنا کر اس میں بیٹھ گیا۔ جہاں جہاں دلم تھے اوروں کی قد و ہرے تھے وہاں مر جھکی گئی تھیں۔ کچھ دیر میں تکلیف کم ہو گئی اور گرم پانی جسم سے درد کھینچنے لگا تھا۔ میں گردن تک اس میں لاؤب کر لیٹ گیا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تو بجے ہمیں یہاں سے لگتا تھا اس کے بعد ہم کبیں ناشتا کرتے اور پھر گھومتے پھرتے رہتے۔ اگر وہیم صبح تک یہاں بٹھا کر ان لوگوں سے رابطہ کر لیتا جو سرحد پار کراتے تھے تو ممکن ہے آئے وانی رات ہم پاکستان میں ہوتے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو ہمیں پھر رات گزارنے کے لیے یہ لٹکانا تو تھا ہوتا تھا۔ نو گھنٹے کا آرام کافی ہوتا۔

میں شام غنودگی میں چلا گیا تھا اچانک برابر والے

تا حیراب تک برقرار تھی کہ میرے ذہن بہت تیزی سے بھر جاتے ہیں۔ اب بھی معمولی ذہن بھر چکے تھے اور بس کھرٹ ہائی رہ گیا تھا اور جو گھر سے تھے وہ بھی بھرنے کی پوزیشن میں آچکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹیب اور انٹر ہیڈ کی سہولت اپنی جگہ لیکن مجھے ایک سوپائل کی ضرورت تھی۔ اس کی مدد سے بہت جلد رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ اور بینک نکل کے ساتھ ایک دیک تھا جس پر قلف شوٹیں رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کرشل کا بنا ہوا ٹیڈی بیٹر تھا۔ یہ ذرا مختلف چیز تھی میں نے پہلی بار کرشل کا بنا ہوا ٹیڈی بیٹر دیکھا تھا۔ اس کا شیشہ کی قدر گھر سے بزرگ کا تھا۔ میں نے ایسے ہی اسے اٹھا یا تو اس کے نیچے چھپا ہوا تار نظر آیا۔ تار ٹیڈی بیٹر کے اندر جا رہا تھا اور نیچے یہ دھار میں غائب ہو رہا تھا۔

یہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کوئی تارٹ شوٹیں تھا اس کے اندر روشنی ہوتی تھی اور یہ رات کی تاریکی میں نظر آتا۔ تار بجلی کا ہو سکتا تھا۔ مگر میں جن حالات سے گزر رہا تھا اور جس طرح میں یہ کرا لیا تھا۔ میں مفلوک ہو گیا۔ میں نے اسے ہلا کر دیکھا۔ یہ بڑا ٹیڈی تھا شاید ایک سوا ٹھوڈن ہو گا۔ پھر میں نے تار کھینچ کر توڑ دیا اور ٹیڈی بیٹر نیچے گرا دیا۔ وہ نوٹ گیا اور اس کے اندر بھی چیز سامنے آگئی۔ یہ

کمرے سے ایسی دھمک ہوئی جیسے کوئی دیوار سے ٹکرایا ہو۔ ساتھ ہی بجلی کی تسوانی چچ سنائی دی تھی۔ میں چونک گیا۔ شاید برابر والے کمرے میں کوئی جوڑا تھا اور مرد نے معاملات سلھانے کے لیے بازو کا سہارا لیا تھا۔ دھمک خاصی بلند تھی اور اتنی قوت سے کوئی دیوار سے ٹکرائے تو اس کی وفات کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ مگر جب آواز دوبارہ نہیں سنائی دی تو میں واپس لیٹ گیا۔ پھر مجھے وقت کا خیال آیا۔ برابر سے اپنی درست واقعہ اٹھا کر دیکھی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ میں سوا گھنٹے سے یہاں تھا۔ گرم پانی نے سِل کھیل کے ساتھ درد بھی کھینچ لیا تھا اور میرا جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ ہا ہرٹل کر میں نے کوئی ٹیک شاور لیا اور تویہ سے جسم صاف کر کے کپڑے پہن کر باہر آیا۔ سادی جاگ گئی تھی۔ مجھے آٹھ بج کر آگئی۔ میں نے اس سے کہا۔ "جلدی سے واش روم سے ہواؤ۔۔۔ ہمیں نو بجے یہاں سے جانا ہے۔"

"میں ہاتھ بھی لوں گی۔"

"اسی لیے جلدی کا کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اور بینک نکل کے آئینے میں دیکھ کر بال بٹائے۔ مجھے عجیب تھا اس کی دوائیاں کھائے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا لیکن ان کی یہ

جاسوسی ڈائجسٹ

عید کی خوشیوں کے سنگ
جاسوسی کے شہر کے بغریب رنگ

اولین صفحات ● جرم کی عین دلدل میں بہتے سگرائے لوگوں کے دھنسنے کا دل خراش فساد۔۔۔ روبینہ رشید کے قلم سے

آوارہ گرد ● دکھ کے شہر کے تھیں کی ایک بڑی بھاری نوکھی دنیا کی جھلک۔۔۔ ہر ایک کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبداللہ حبیبی کی شہریت

جواہری ● احمد اقبال کے شہر قلم سے ایک جولدلی کے کھیل کے تحت ناخوش

مغرب کے نالیہ انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب و ادب کی مکا جہریت کی بڑی بڑی مثال فرانس کی کہانیاں

سراورق کی کھانا پکانا

بھٹی کھانی ● مصوٰی بھٹی کے انہر رنگ دلوں کے بہانہ دیووں کی مظہر دل سوز کہانی

دوسرا کھانی ● نالہر کی سسین دلوں کی حیات کے تحفظ کو بڑی خطرہ بڑی سسینی خیر و شر



آپ کے خیر۔۔۔
مشرور مجھیں۔۔۔
ادنیٰ کی دلچسپ باتیں۔۔۔ کھائیں

چھوٹا سا لیکن جدی ترین کیرا تھا اور اس کا لینس تیار ہوا تھا کہ یہ بہت واضح تصویر یا ریڈیو نے سنا ہے۔ بات واضح تھی۔
 دیگر اور اس کے ساتھ دوسرے افراد کا پورا ٹیکنگ تھا۔ وہ عیاش طبع لوگوں کو یہاں کراہیا کرتے تھے اور ان کی شرمناک سرگرمیوں کی تصاویر اور ریڈیو بنا کر پھر انہیں بلیک میل کرتے تھے۔ ظاہر ہے جو ایک رات کے لیے دس ہزار دے سکتے ہوں گے وہ دولت مند ہی ہوں گے۔ اگرچہ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا کیونکہ ہم یہاں رات گزارنے آئے تھے اور کچھ دیر میں یہاں سے چلے جاتے۔ اس کے باوجود مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

سادا کی مشہور لہری تھی اس لیے اسے پتہ نہیں چلا کہ یہاں کیا ہوا تھا وہ باہر آئی تو ٹیڈی بیٹر دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ہوتوں پر ہاتھی رکھتے ہوئے اسے کیرا دکھایا تو اس کی آنکھیں پھلکی گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو میں نے اشد سے منع کیا اور بولا۔ "تیار ہو جاؤ وہ آنے والا ہو گا وہی نہیں یہاں سے باہر نکالے گا۔"

"میں تیار ہوں۔" سادا نے جواب دیا اور جو سامان بیگ سے باہر تھا اسے اندر رکھ لیا۔ میں نے کیرا چٹون کی جیب میں رکھ لیا اور ٹیڈی بیٹر کے گلے پر ٹیڈی پٹے سے رہنے دیجئے۔ ٹھیک تو بیٹے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا اندر آیا تھا اور اس نے آتے ہی ٹیڈی بیٹر کے گلے دیکھ لیے۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"...کیا؟"
 "ٹھیک سے ٹوٹ گیا۔۔۔ میں اس کی قیمت دیتے کو تیار ہوں۔" میں نے سکون سے کہا۔

"مگر اس میں۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔
 "شاید تم اس کی بات کر رہے ہو۔" اب میں نے اسے کیرا دکھایا تو اس کا دبا ہوا منہ بھی اڑ گیا۔ مگر اچھائی باقی تھی۔
 "مجھے کیا معلوم سر۔"

"تمہیں شاید اپنے باپ کا علم نہ ہو لیکن اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔" میں نے اسے گریبان سے بکڑ کر کھینچا اور سر کی بھرپور ٹکڑی کی ناک پر سیدھی۔ چڑی لوستے کی آواز کے ساتھ اس کے منہ سے ایک دردناک کراہی اٹھی اور اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ میں نے ہسٹل نکال کر بال اس کے منہ میں دھک دی۔ اس کی آواز مطلق میں گھٹ گئی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ یہاں رات کو کد کتنے والوں کی ریڈیو بٹاتے ہو۔۔۔ یہ کام کہاں ہوتا ہے؟"

اس کی ناک سے خون پھوٹ کر لٹکا تھا اور اس کی شدید شرمٹ پر گر رہا تھا۔ اس نے لٹی میں سر ہلایا۔ اس بار میں نے سر کی بجائے گھونسے سے کام لیا اور اس کی ناک کا ربا مہا بھی لمبہ ہو گیا۔ وہ ہلایا تھا مگر اس نے اونچی آواز نکالتے سے گریز کیا۔ یہ اس کا مسئلہ بھی تھا۔ "اپنی خوب صورت ناک کو تم نے خود گھنٹی بنوا لیا ہے مگر تم چینی ناک کے ساتھ بہ خوبی دعوہ رہ سکتے بہت بگڑ میں نے قہاری گردن توڑ دی تو تم سو فیصد مر جاؤ گے۔ اس لیے میرے سوال کا درست جواب دو۔"

وہ دہشت زدہ ہو گیا تھا اس لیے کسی قدر ہنگامہ بیٹ کے بعد اپنے دو دانت نکلوا کر بان گیا۔ میں نے اسے سوچ دیا کہ وہ دانش دم میں جا کر اپنی ناک دھولے جو سوچ کر اپنے اصل سائز سے دوگنی ہو گئی تھی۔ اس نے منہ کر کہا۔ "اب اس طبقے کے ساتھ باہر جاؤں گا؟"

"بعد میں وضاحت کر سکتے ہو کہ بیڑیوں سے گر گئے تھے یا بے خیالی میں دیوار سے ٹکرائے تھے۔ اب وقت ضائع مت کرو ورنہ خود ضائع ہو جاؤ گے۔"

بادل نا خواست وہ مجھے اور سادا کی کونے کو باہر آیا۔ میں نے ہسٹل ہاتھ میں لے کر دوبارہ چٹون کی جیب میں کر لیا تھا اور اسے خبردار کیا کہ میں یہاں سے بھی درست ترین فٹائڈ لے سکتا ہوں اس لیے وہ خود سے مرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ ہمیں اسی حکم کے ایک کمرے میں لایا۔ دستک کے جواب میں ایک شخص نے پوچھ کر دروازہ کھولا اور مجھے دیگر کے عقب میں دیکھ کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے دیگر کو اس پر دھکیل کر یہ کوشش ناکام بنا دی۔ دونوں پیچھے گرے اور ان کے لٹنے سے پہلے ہم اندر آ گئے تھے۔ وہاں ایک شخص بیڑی پر گئے بڑے ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جس پر مختلف کیمروں کے مناظر آرہے تھے۔ ایک سکہ ایک طرف کھڑا تھا ایل سی ڈی کے سامنے بیٹھے شخص نے اپنے کی کوشش کی اور ہسٹل دیکھ کر واپس بیٹھ گیا۔ "سب اس طرف دیوار کے ساتھ منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔"

انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے ان کی تلاشی لی صرف مانیٹر کے سامنے بیٹھے شخص کے پاس سے ایک گرامی دوا چاقو نکلا تھا۔ باقی سب بیٹھے تھے۔ سکہ کے پاس کچھ نہیں

تھا اور مجھے لگا کہ وہ ان کا ساتھی بھی نہیں تھا۔ جلد اس کی تصدیق ہو گئی جب اس نے رو دیے والے لمبے لمبے میں کہا۔ "اوسے بیٹوں جان دیج... مدد دی سوں سبے کدیا اچھے آواں۔"

"سروراجی آرام سے۔" میں نے تلاشی سے فارغ ہو کر کہا اور پھر تیز پٹھے ٹھنک سے پوچھا۔ "ان کسروں کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟"

اس نے لرزاتے ہاتھوں سے ایک طرف رکھے کپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "سب اس میں ریکارڈ ہوتا ہے۔"

"کوئی کل بدلت کی ریکارڈنگ کہاں ہے؟"

اس نے مجھے ہلکے دکھائی جہاں سب ریکارڈنگ ہوتا تھا۔ یہ جدید ترین کپیوٹر تھا جس میں بڑی گنجائش والی ہارڈ ڈسک لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وی ڈی ریکارڈنگ تھا گویا ان لوگوں نے مکمل بندوبست کیا ہوا تھا۔ یہ صرف ان تین افراد کا سیٹ اپ نہیں تھا اس میں یقیناً اس ہوٹل کے اور لوگ بھی ملوث تھے۔ میں نے صرف اپنے کمرے کی ریکارڈنگ چیک کی۔ سادی کی موجودگی میں باقی کمروں کی ریکارڈنگ چیک نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہارڈ ڈسک سے مکمل فولڈر اڈا دیا اور وہ بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے وہ باری دہر اور کی طرف رخ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے کر میں نے کمرے کی تلاشی لی تو ایک دروازے سے کئی ڈبے سی ڈی کے لٹکے۔ ان میں ریکارڈنگ شدہ وی ڈی اور ڈی وی ڈی لاج بھری ہوئی تھیں۔ یہ سب ہیر پر رکھ کر میں نے سکھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو اور یہاں کس خوشی میں ہو؟"

"میں ہوشیار سنگھ ہوں جی... ادھر فیروز چار سے آگے میری زمین ہے۔"

"تم زمیندار ہو... یہاں کس لیے آئے تھے؟"

"جس کے لیے تم آئے تھے۔" دروازہ کھولتے والے نے نہ ہر پلے لمبے میں کہا۔ وہ جوان عمر شخص تھا یہ بیٹوں ہی جو بھن عمر تھے۔ جواب میں میں نے عقب سے اس کی گدی پر گھونسا مارا اور آگے سے اس کا منہ دہر سے لگا اس دہری ضرب نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ وہ مجھے گرا تو مائٹروڈالے نے جلدی سے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی تم دیکھ لو گے۔" میں نے کہا اور سکھ سے پوچھا۔

"یہاں تمہاری موجودگی کا مقصد پوچھا ہے؟"

"وہ ایک لڑکی مجھے یہاں لانی تھی۔" اس نے

ہوٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ یہ جملہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ہوائیاں لانے لگی تھیں۔ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

"ٹھیک ہے وہ لڑکی تمہیں یہاں لانی تھی۔"

"وہ ان کی ساتھی تھی۔" ہوشیار سنگھ نے اس بار رو دیے والے لمبے میں کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"یہ کیوں نہیں بتاتا تو نے اسے مار دیا ہے۔"

مائٹروڈالے بولا۔ "تو جھٹھل مارا ہے۔"

مجھے گج واش دوم میں دیوار کے ساتھ دھم کی آواز اور قسائی چاقو کا خیال آیا۔ "یہ میرے بھائی دالے کمرے میں تھا؟"

دھرتے سر ہلایا۔ "اس نے بڑا فرق کر دیا ہے۔ سب لاش کا کیا کریں؟"

لاش کا سینے پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے جلد ہی جلد روڈ کی اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے کہ پولیس منظر نامے میں داخل ہو۔ ان میں سے ایک بے ہوش تھا۔ دیگر کے سر پر میں نے پھتول کا دست مارا اور وہ گرا تو مائٹروڈالے چولا کر اس سے پہلے کہ وہ صورت حال سمجھتا میں نے اسے بھی بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے گھٹیا کر درخواست کی کہ اسے بے ہوش نہ کیا جائے۔ میں نے اسے قتل دی۔ "تم جلد سے ساتھ چل رہے ہو۔" میں نے کہا اور ان تینوں کی تلاشی لی۔ ان کے پاس موبائل اور دوسری چیزیں تھیں لیکن میں نے صرف موبائل لیے تھے۔ یہاں موجود ایک میٹک اسٹل اور سرداری کے پاتھروں ماری جانے والی لڑکی سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس سردار جی سے دل چسپی ضرور ہو گئی تھی اسی لیے میں نے اس کی تلاشی بھی لی اور اس کا پرس اور موبائل فون نکال لیا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ میں نے ڈی وی ڈی کے ساتھ کپیوٹر کھول کر اس کی ہارڈ ڈسک بھی نکال لی۔ وقت نہیں تھا ورنہ میں انہیں مناج کر دیتا۔ اب یہ کام یہاں سے نکل کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ "اگر تم نے فراہمی کو خوش کی تو میں یہ دونوں جزیں پولیس کے حوالے کر دوں گا اور وہ خود تمہیں تلاش کر لے گی۔"

"نن... نہیں۔" وہ ہکلا یا۔ "میں نہیں بھاگوں گا۔"

"اسی میں تمہاری بھاری ہے۔" میں نے کہا اور

دروازہ کھول کر باہر بھاگا۔ راہداری سناں تھی۔ درحقیقت یہ پورا ٹھکانہ ہی سناں تھا اور شاید ہی قسم کی سرگرمیوں کے

لے مخصوص تھا۔ ہم تینوں ان ہی میز چلوں سے بچے آئے اور لابی سے ہوتے ہوئے ڈاننگ ہال میں داخل ہوئے۔ اس وقت لابی میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اندر جاتے ہی ہم نے وائس کی رولہ لی اور لابی میں آئے۔ کسی نے کس روکا اور ہم آرام سے باہر نکلتے آئے تھے۔ میں نے ہوشیار سنگھ سے پوچھا: ”تمہارے پاس کوئی گاڑی ہے؟“

”بالکل ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”لوہر پاس ہی کھڑی ہے۔“

مہر راجپ چند سال پرانی تھی اور اس کا ظاہری طبع خراب تھا لیکن جب ہوشیار سنگھ نے اس کا اتنا اسٹارٹ کیا تو وہ ایک سیکنڈ میں اسٹارٹ ہو گیا۔ یہ اندر سے بھی آرام وہ تھی۔ بھارت میں تیار ہونے والی یہ جیب پٹے میں دوپا ہوتی ہے اس لیے میں مطمئن تھا۔ میں نے اس سے کہا: ”پٹے کسی ایسے ریستوران چلو جہاں ہم ناشاکر سکیں۔“

”میں... میں بھی چلوں گا؟“ اس نے پوچھا۔

”بالکل... باب ہم ساتھ ساتھ ہیں گے۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ مجھے تم ایسے لگے ہو اور جو مجھے اچھا لگتا ہے میں اس کا ساتھ بھی نہیں چھوڑتا۔“ میں نے اس کا شانہ چھیڑ دیا۔ ”دیکھو تمہاری خاطر میں یہ سارا کچرا اٹھا لیا ہوں ورنہ کیا ہوتا پولیس اس میں تمہاری ویلہ بوجھتی اور سہمی تمہارے گھر آتی۔“

”تم نے آئے ہو لیکن اب اپنے پاس رکھو گے مجھے بلیک میل کرو گے۔“ ہوشیار سنگھ نے مردہ لہجے میں کہا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اردو میں بات کر رہا ہوں تو وہ بھی اردو بولنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس نے کم سے کم کالج کی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی۔

”بالکل بھی نہیں ابھی ناشتے کے بعد ہم کسی مناسب جگہ بیٹھ کر انہیں مضامع کریں گے میں یہ کام تمہارے سامنے کروں گا۔“

”واقعی؟“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”بالکل جلد تم دیکھ لو گے اب چلو۔“

ہوشیار سنگھ نے جیب ایک اٹلی روپے کے ریستوران کے سامنے روکی اور ہم اتر کر اندر آئے۔ سرداری نے سادہ شلوار سوٹ پہن لیا تھا جو پنجاب میں عام پہنا دیا ہے۔ چیٹ شرٹ اور جوکر میں وہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنا ایک

میٹل بھی ساتھ رکھا تھا اور اس سوٹ کے ساتھ وہی پہنے ہوئے تھی۔ سامان ہم نے جیب میں چھوڑ دیا تھا۔ ہوشیار سنگھ کا خیال تھا کہ ناشاکر ہم اس کے خرچ پر کریں گے لیکن ہال میں نے دیا۔ ناشاکر کے ہم باہر آئے اور جیب میں بیٹھے تو ہوشیار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا: ”لب ہم تمہارے گھر چلیں گے۔“

وہ بدکا۔ ”وہ کیوں کی؟“

”میں نے بتایا کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“ میں نے کہا اور پستول والی جیب پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”اب چلو۔“

اس نے جلدی سے جیب اسٹارٹ کر دی۔ پارکنگ سے نکلنے کے بعد اس نے کہا: ”تم نے یوں تھا کہ ان چیزوں کو ہٹا کر دو گے۔“

”کیوں نہیں... جیب کسی ایسی جگہ رکھنا جہاں لوگ نہ ہوں۔“

کچھ دیر بعد اس نے جیب ایک میدان کے ساتھ روکی جس میں چھڑپاں اگی ہوئی تھیں۔ ہوشیار سنگھ نے میری ہدایت کے مطابق سوچی گھاس اور شاخیں جمع کیں اور ان میں پی ڈی کے لے اور ہمارا ڈسک رکھ کر اوپر سے کچھ پائپروں چھڑکا۔ کیونکہ ماچس یا لائٹر نہیں تھا اس لیے لائٹس بعد از کالائٹر ٹال کر لگایا تو پائپروں نے فوراً آگ پکڑ لی تھی۔ سادہ جیب میں بیٹھی تھی اور ہم اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ نے ان چیزوں کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں نہیں لے لیا۔ اب ہوشیار سنگھ کچھ مطمئن تھا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مطمئن لگ رہا تھا۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پانی کسی اپنا راستہ لو۔“

”راستے کے بچے۔“ میں نے اسے گردن سے پکڑ کر آگ کی طرف دھکا دیا اور پستول نکال لیا۔ ”تم کیا کہتے ہو میں اس پکڑے کا حجاج ہوں۔ میں تمہیں سبکیں کوئی مار کر پیٹک جاؤں گا اور تمہارے گھر بھی پٹکی جاؤں گا۔“

وہ آگ کے پاس گرا اور چل دی سے اس سے دور ہو گیا۔ اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ”لوئے ایسا نہ کرنا میرے چہرے چھوٹے بچے ہیں۔“

”بچے ہیں تو ان کی ماں بھی ہوگی۔“

”ہے جی کیوں نہیں ہے ورنہ بچے کہاں سے آتے؟“

”اگر اپنے بچوں کو پیتم اور بیوی کو درد خواہش کرنا

چاہے تو شرافت سے چلو۔"

اس بار وہ شرافت سے ڈرائیجنگ سیٹ پر آگیا۔ لدھیانہ پاکستان کی سرحد سے کوئی اتنی کلومیٹر دور ہے۔ اس لحاظ سے ہوشیارنگہ کا گھر بھی اتنی دور ہوتا ہے۔ چاہے تھا کیونکہ فیروز پور سرحد کے بالکل پاس ہے۔ یہ میں نے ٹیب میں گوگل میپ پر دیکھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا لیکن بہترین سڑک اور جیب کی وجہ سے ایک گھنٹے میں طے ہو گیا۔ یہ کوئی گاؤں نہیں تھا بلکہ غلام اوس تھا۔ ہر غلام اوس میں زمین کے مالک کا گھر بنا ہوا تھا۔ اس لیے سارے گھر الگ الگ تھے۔ یہ چھوٹا سا بنگلا تھا مکان تھا جس کی چھت آری سی لیکن کھریل اشاکل کی تھی۔ یہ ایک منزل تھا اور کوئی سات مرتلے پر بچھلا ہوا تھا۔ سامنے پھروں سے بنا ہوا خوب صورت پورچ تھا۔ اردن کی آواز پر اندر سے ایک نو عمر لڑکی نکلی اور اس نے گیت گھولا۔ مکان کے چاروں طرف احاطہ تھا پور اس میں گھاس کے لان کے ساتھ پھولدار پودوں کے پتے بھی تھے۔ راستے میں ہم نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سادہ سی نشست پر آرام کرتی رہی تھی اور میں سوچتا رہا۔

ہم کوئی بارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ ہوشیارنگہ نے جیب پورچ میں روکی اور اترنے لگا تو میں نے کہا۔ "خیال رکھنا کوئی چالاکي دیکھا کر اپنے لیے مشکل مت کھڑی کرنا۔۔۔ ابھی تمہاری بیوی نہیں جانتی ہے کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں ایک عورت کی لاش چھوڑ آئے ہو۔ کوئی ہنگامہ ہو تو وہ جان جائے گی۔"

"میں کچھ نہیں کروں گا میرے باپ۔" وہ زور دے کر والے لہجے میں بولا۔ "تم کیوں میرے ساتھ چلے آئے ہو؟"

"بس ایسے ہی، ویسے تم فکر مت کرو میں بیک ملر نہیں ہوں ورنہ وہ سبک ضائع نہ کرتا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی تضحیکیاں ان سی ڈیج میں تھیں۔" میں نے کہا۔ "ایک دو دن تمہارے ساتھ رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ بلکہ تم چاہو تو ہم یہاں رکھنے کا معاوضہ بھی دے سکتے ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیے بس تم میری جان چھوڑ دو۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے کہ میرے کپے پر حرف بہ حرف عمل کرو۔"

اس نے سر ہلایا پھر یہی اتر گیا۔ میں اور سادی بھی پیچھے آئے تھے۔ اس وقت دھوپ کی شدت ناقابل برداشت

تھی۔ جیب اے سی تھی اس لیے اصل موسم کا باہر آنے پر اندازہ ہوا تھا۔ یہ جولا کی کاٹھن تھا اور اب تک آستان سال تھا یعنی پانچ نہیں ہوئی تھی۔ ہوشیارنگہ ہمیں اندر لایا۔ آٹار میں ہی پُریش انداز میں سہا ہوا ڈرائنگ روم تھا اور یہی بتانے کے لیے کافی تھا کہ ہوشیارنگہ خاما دولت مند شخص تھا۔ یہ دولت کا بخاری تو تھا جسے ٹالنے وہ اس ہوئی تک گیا تھا۔ وہ سونا سکے تھا یعنی معمولی سی شیڈ تھی صرف سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ جسے اس نے ایک خاص ٹوٹی میں لپیٹا ہوا تھا یہ پگڑی نہیں تھی۔ اس نے نو عمر خادمہ سے کہا۔ "شیلہ جا کر شیلہ لے آ۔"

شیلہ کے جانے کے بعد اس نے کہا۔ "واہ گورو کے واسطے میری بیوی کے سامنے کچھ مت کہنا وہ مجھے شریف آدمی سمجھتی ہے اسے پتا چل گیا تو مجھے معاف نہیں کرے گی۔"

"ویسے تم اس قابل ہو لیکن بے فکر ہو جاؤ رہاں سے کون نہیں لگے گا۔"

"اچھا اب میرا پرک اور موہاں دے دو۔"

میں نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کر دیں اور جیسے ہی ہوشیارنگہ سے ٹکلا میں نے ایک موہاں نکالا۔ اس پر سفیر کا نمبر ملا۔ اس نے ٹکی ٹکی پر کال ریسیو کر لی۔ میں نے بلا تمہید کہا۔ "ہم سرحد کے پاس ہیں۔۔۔ ہم کہاں ہیں؟"

"دو اور عبد اللہ اور کاڑیوں میں لگے تھے۔ وہ اس وقت قصور سے آگے گزرا سکے والا رول پر قنوی والا ٹائی علاقے میں زمیندار کالی کھوکھر کے پاس ہیں۔"

"ٹیک لے سے یہ موہاں نمبر دے دو۔ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ پھر میں نے ٹیب نکال کر اس پر مذکورہ پاکستانی علاقہ دیکھا۔ یہ سرحد سے مشکل سے ایک کلومیٹر دور تھا۔ کچھ دیر میں ٹرکی ہمارے لیے ٹھیکین لے آئی جو اس موسم میں بہترین ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ علاقہ کیا کہلاتا ہے؟"

"دھوب محلہ۔" اس نے جواب دیا اور باہر چلی گئی۔ میں نے ٹیب پر دیکھا تو حیرت انگیز پر دونوں جگہوں کو بالکل پاس آیا۔ جیسے ٹوٹی والا سرحد سے ایک کلومیٹر دور تھا اسی طرح دھوب محلہ سرحد سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور اس سے ذرا آگے فیروز پور کی آبادی تھی۔ یہ سارا علاقہ آباد اور سرسبز و شاداب ہے۔ سادی کو بتایا تو وہ بہن کر رہی پُر جوش

ہو گئی تھی کہ دوسم اور عبد اللہ ہم سے صرف دو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھے۔ لیکن یہ دنیا کے مشکل ترین دو کلومیٹرز تھے۔ کیونکہ درمیان میں وہ لکیر تھی جو آگ و خون سے بھٹی گئی تھی۔ سرحد کے دونوں طرف فوج اور دوسرے بڑا لشکر دھتوں کی موجودگی قاری تھی۔ دوسم جس کمال کھوکھر کے پاس تھا کیا وہ وہی شخص تھا جس کا دوسم نے ذکر کیا تھا یا پھر دوسم اس کے پاس رکا ہوا تھا۔ میں نے کسی کا گلاں قسم کیا تھا کہ موہاٹل نے قتل دی۔ لہر پاکستان کا تھا اور ابھی تھا یعنی کوئی جانا بچھا نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیڈی۔ "ہلو۔"

"میں بات کر رہا ہوں۔" دوسم کی آواز آئی۔ "آپ کہاں ہیں۔"

"کنڈا سنگ والا روڈ انڈیا میں مسیخی والا روڈ میں جاتی ہے۔ تقریباً ایک کلومیٹر دور صوبہ محلہ میں ہیں۔"

"یہ تو ابھی خبر ہے کہ آپ انکس پاس ہیں۔" دوسم نے کہا۔ "لیکن کراسنگ آسان نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"میں جس کے پاس ٹھہرا ہوں اس کا کہنا ہے آج کل بہت سختی ہو رہی ہے اور چوہیں کھتے سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔"

"سادو" کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "اس کی بجائے میں کوئی اور راستہ تلاش کرنے کو ترجیح دوں گا۔"

"آپ محلوٹ ہیں؟"

"فی الحال۔" میں نے کہا۔ "ٹیک ڈیٹار کے گھر ہیں اور بڑی مدد کے مہمان ہیں۔"

"وہ خطرناک ہو سکتا ہے؟"

"نہیں وہ قاتل نہیں ہے۔"

"جب لہیک ہے آپ یہیں رکھیں جب تک میں کوئی محفوظ راستہ تلاش نہ کروں۔" دوسم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ ہم جتنی کم بات کرتے اتنا ہی اچھا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہوشیار پاس کے گھر کے کسی فرد کے سامنے بات نہیں ہوئی۔ ہوشیار تقریباً چالیس برس کا شخص تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کے

بچے چھوٹے ہوں گے۔ گیت پر کوئی چکر لگایا نہیں تھا اور گھر میں بھی کسی اور مرد کے آجاری فی الحال نظر نہیں آئے تھے۔ اگر

ہوشیار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا تو اسے قابو کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اگر اس سے لڑ پڑا اور افراتفری مچا دیا

جاسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوشیار ایک جوان عورت کے ساتھ

آمد آیا اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ بہت حسین عورت تھی۔ اس نے فلتواریس کے ساتھ دو پٹا لیا ہوا تھا اور خود کو مناسب انداز میں ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے تعارف کر لیا۔ اس کی بیوی کا نام سوویت تھا۔ اس نے ہمارا نام اجیت اور کوشل بتائے تھے وہ گرم جوشی سے سادگی سے ملی۔ اسے گلے لگایا اور سادگی سے بولی۔ "ہوشیار کہہ رہا ہے آپ بہت اچھے ہیں، کچھ دن اور مہمان رہیں گے۔"

"ہاں سردار گی سے اتفاقاً ملاقات ہوگی۔"

"اتفاقاً؟" وہ چوکی۔ "یہ تو کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کالج کے زمانے سے جانتے ہیں۔"

"وہی کہہ رہا ہوں یہاں اتفاقاً ملاقات ہوگی۔ شاید دس سال بعد میں لہیک کہہ رہا ہوں؟" میں نے ہوشیار کی طرف دیکھا۔

"ہاں یاد۔۔۔" میں نے ٹارل انداز میں کہا۔ "اتفاقاً عرصہ ہو گیا ہے۔"

سوویت نے سادگی کی طرف دیکھا اور بولی۔ "آپ کی بیوی بہت پیاری ہے اجیت بیٹا۔"

سادگی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہوشیار سنگھ نے جلدی سے کہا۔ "تو یہاں کر لیا جانی کو اندر لے جا۔ آرام سے بٹھا۔"

سوویت سادگی کو وہاں سے لے گئی۔ ان کے جاتے ہی ہوشیار نے کہا۔ "معال کرنا مجھے تمہارے ناموں کا خیال ہی نہیں رہتا تھا اس لیے جو میں آتا ہوں دیا۔"

"کوئی بات نہیں بلکہ اچھا ہے تم ہمارے بارے میں نہ جانو۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں؟"

"میں، سوویت اور ہمارے ٹین بچے ہیں بڑا بیٹا ہے دس سال کا اور اس سے چھوٹی سات اور چار سال کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ ٹیلا اور کام کرتی ہے اور علی رہتی ہے۔"

"کوئی مرد ملازم؟"

"کوئی نہیں ہے۔۔۔ پیچھے زمین پر کام کرنے والے چار آدمیوں کے گھر بنے ہیں۔"

"یہ ابھی بات ہے ہمارے بارے میں کم سے کم لوگوں کو بتا چلے۔ اسی میں تمہارا بھی بھلا ہوگا۔"

وہ ہنسیا۔ "مجھے تم لوگ کچھ پڑا سرور سے لگ رہے ہو۔"

"ہم واقعی پڑا سرور ہیں اور ہمارے بارے میں نہ جانتا ہی بھر ہوگا۔" میں نے اس کا خدشہ بھلانے کی کوشش

کی۔

نہیں کی۔ وہ ہمارے بارے میں بتنا زیادہ مشکوک رہتا کی
بےوقوفی سے اتنا ہی گریز کرتا۔ "وہ بے تم کھٹکے ہو گئے کہ
میں کس قسم کا آدمی ہوں لیکن ایک بار پھر سمجھا دوں۔ اگر
تمہارے دماغ میں کوئی الٹا سیدھا خیال ہے یا تمہارے
پاس کوئی اختیار ہے اور تم نے اسے استعمال کرنے کی کوشش
کی تو یقیناً ممکن ہے یہاں گرنے والی لاشیں دو سے کہیں
زیادہ ہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہمیں یہاں بنا کر رکھو
اور ہمارے جانے کے بعد ہمیں بھول جائے۔ اگر تم چاہو تو میں
اس میزبانی کا معاوضہ بھی دے سکتا ہوں۔ میں پہلے ہی
پیشکش کر چکا ہوں۔"

"اسکی بات نہیں ہے۔" اس نے کسی قدر بے چینی
سے کہا۔ "بس تم جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔"
"میری بھی کچھ خواہش ہے۔" میں نے کہا۔ "تم
زمیندار ہو تم سے ملے لوگ آتے ہوں گے؟"
"بہت کم۔" اس نے کہا۔ "ابھی مہول کی فصل
درمیان میں ہے۔ یہ پادری بھی نہیں آ رہے۔"

"وہ امرتسر میں ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"جب تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں میں سے میری بیوی کی زمین ہے۔" اس نے
انکھیں کر کہا۔ "وہ میرے سر کی ایک ہی اولاد ہے۔ سادری
زمین اسے ملی۔"

"یعنی تمہیں ملی۔ تمہاری بیوی خوب صورت عورت
ہے اس کے باوجود تم ادھر ادھر منہ مارتے پھر رہے ہو۔"
وہ کھپکھپا گیا تھا۔ "میری تو بہ جو نسب میں کہیں
جائیں۔"

"وہاں کیا ہوا تھا؟"

جواب میں وہ چپ رہا تو میں نے کہا۔ "تم نے بھی بتاؤ
جب بھی کل سب اخبار پائی ڈی میں آجائے گا۔"

اس نے چہرہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا
اور آہستہ سے بولا۔ "وہ مجھے ہلکے سے مل کر رہی تھی۔ میرا بھڑا
ہوا تو میں نے اسے دھکا دیا تھا اس کا سر دیوار سے لگا اور وہ
مر گئی۔ میں واہ گود کی سو میں نے صرف اسے دھکا دیا تھا
کیونکہ وہ میرا منہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اگر اس کے
ناٹھوں کے نشانہات آتے تو میں سویت کو کیا منہ
دکھاتا۔ چلیری میں دھکا لڑے سے لگا اور وہ دیوار سے ٹکرا کر
وہیں گر گئی تھی۔"

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اس پر دباؤ
دیا۔ "اس کے باوجود یہ کئی ہی کہائے گا۔"

"میں نے اسے ایک دھکے کے سوا کچھ بھی نہیں دیا
تھا۔" ہوشیار کے چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی تھی۔ "اگر
معاوضہ چاہیں تب بھی تو وہ یہاں بھی آ سکتی ہے۔"
"کیسے؟" میں نے ان کو اپنا چٹا پٹا تھا؟

"ہمیں لیکن تمہیں جب اپنا نام اور فیروز پور کا تدارک
تھا تو وہ بھی سن رہے تھے۔ یہ جگہ کوئی بہت بڑی نہیں ہے اور
یہاں دور درجن ہوشیار بھی نہیں ہوں گے۔"

میں مسکرایا تھا۔ "مگر وہ سب تمہارے جیسے ہیں تو وہ
حقیقت یہاں کوئی اوشیار نہیں ہے۔"

"میں ہی سب سے ہوشیار ہوں۔" اس نے تصدیق
کی۔ "اس سے تم اعتماد نہ کر سکتے ہو باقی سب کے بارے
میں۔"

اس کی یہ بات کافی غور تھی اگر لاش والی بات چاہیں
تک پہنچا اور وہ جیوں پکڑے گئے تو پوچھ لیس کو یہاں آنے میں
زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پوچھا۔ "یہاں لی وی کیبل
ہے۔"

"بافل۔" میرے پاس ٹاٹا اسکاٹی ہے۔" اس نے
کہا اور ایک کونے میں دکھائی دے سائیکل کا ایل سی ڈی ٹی وی
ریسٹ سے آگے کیا۔ پھر اس نے پنجابی کا ایک مقامی بیورو
پیش لگایا۔ "اگر سوائے پوچھ لیس تک کیا ہے تو لازمی اس پر خبر
آئے گی۔"

لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ اس کا
مطلب تھا معاملہ یاد دہا گیا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا
کہ بات پوچھ لیس تک نہیں پہنچتی تھی۔ یہ ایک بڑے ہونٹ کی
ساکھ کا معاملہ تھا۔ اس لیے خاموشی کا رد و حال کا بھی امکان
تھا۔ اس صورت میں پوچھ لیس بہر حال تفتیش کرتی اور یہاں
آنے کا بھی بہت زیادہ امکان تھا۔ ایک بج رہا تھا کچھ دیر
بعد ٹیلا نے کھانا گھننے کی اطلاع دی۔ وہ تقریباً چودہ چودہ
پیس کی صحت مند اور مناسب شکل و صورت والی لڑکی
تھی۔ میں ہوشیار کے ساتھ ڈرائنگ روم کے ساتھ موجود
لاؤنج میں آیا۔ ڈرائنگ ایریا بھی کچھ تھا اور اس کے ساتھ بڑا
ساکن تھا۔ سویت نے کھانا خود بنایا تھا اور کچھ وہ بھی
میزی خورد تھے اس لیے یہ خدمت نہیں تھا کہ کسی ڈش میں کوئی
نقد چیز شامل ہوگی۔ کھانے میں مٹر پلاؤ اور روٹی کے ساتھ
بھائی تھی۔ کئی طرح کے چاچا اور چٹنیاں بھی تھیں۔ ٹیلا کھانا

لگا رہی تھی۔ مجھے بچے نظر نہیں آتے میں نے ان کے ہارے میں بچہ چھانوسمیت بولا۔

"سمیاتی وہ اپنے دادے کے ہاں گئے ہیں۔ اسکول کی چھڑیاں ہیں۔"

یہ بھی اچھا تھا کہ یہاں بچے نہیں تھے ورنہ بچے اندر کی خبریں سب سے زیادہ ہمارے پہنچاتے ہیں۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر سویت نے کہا۔ "سمیاتی اور بھربائی آپ آرام کریں آج گرمی بہت ہے شام کوڑی میں پر چلیں گے۔"

کھانے کے بعد کسی کے گھاس نے سونے پر سہاگ کا کام کیا تھا۔ سادی کی آنکھیں پونچھل ہو رہی تھیں میں نے اس سے کہا۔ "تم آرام کرو میں ذرا ہوشیار سے کپ شپ کروں گا۔"

ہوشیار کا خیال تھا کہ میں اس کی جان چھوڑ دوں گا اس لیے میری بات پر اسے مایوسی ہوئی تھی۔ سادی کھڑی ہو گئی۔ سویت نے ہمارے لیے ایک کرا بھی سیٹ کر دیا تھا۔ میں اور ہوشیار وہاں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ہوشیار نے ٹی وی آن کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تم مجھے اپنے سامنے دکھنا چاہتے ہو؟"

"اس کی بجائے تم کہہ سکتے ہو کہ میں پوری طرح ہوشیار رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں پولیس آسکتی ہے اور اس صورت میں مجھے اپنا بچاؤ کرنا ہوگا۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "جیہیں پولیس سے خطرہ ہے؟"

"میں مطلوب تو نہیں ہوں لیکن بعض وجوہات کی بنا پر پولیس کے ہاتھ آنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ اگر وہ یہاں آئی تو لالہ کی بات ہے تمہارے ساتھ مجھے بھی لے جائے گی۔"

"اس صورت میں یہاں رکنا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔" اس نے گویا مجھے ڈرانے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں خطرہ مول لینے والا آدمی ہوں۔"

ہوشیار سگہ ہوشیار آدمی تھا۔ وہ عام شخص تھا اس لیے ہنگامی صورت میں بدحواس ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک عورت ماری گئی تھی اور پھر وہ بلیک میٹنگ کے چکر میں بھی آ رہا تھا۔ میں اسے دلوں چکروں سے لالہ کا ہاتھ مکر یہ کام میں نے ٹی سیکل اللہ نہیں کیا تھا۔ اس میں میرا بخاؤ تھا۔ مجھے اس سرزمین پر ایک ٹھکانے کی ضرورت تھی اور وہ مجھے مل گیا

تھا۔ اتفاق کی بات ہے یہ سرحد کے ہائل پاس تھا اور اب دسیم بھی دوسری طرف آ گیا تھا اس لیے ہمارا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ہوشیار یہ بات نہیں جانتا تھا مگر وہ اتنا ضرور سمجھ رہا تھا کہ ہم کسی مقصد سے اس کے پاس ٹھہرے ہیں۔ ٹی الحال اسے بے خبر رکھنا ضروری تھا۔ اگر وہ جان جاتا کہ میں پاکستانی ہوں تو ممکن ہے اس کی حب الوطنی کی رنگ بھڑک جاتی اور وہ تمام خطرات کو پس پشت ڈال کر میری بیخ کنی پر عمل چلا دے۔ اس لیے میں اسے دھمکانے کے ساتھ ساتھ نرمی سے بات کر رہا تھا اور اسے یقین دلانا تھا کہ میں اس کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ وہ مطمئن نہیں تھا اور میں چاہتا بھی تھا کہ وہ میری طرف سے ٹینشن میں رہے مگر یہ ٹینشن اتنی نہ بڑھے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہ ہو۔

میں نے موہاگل کو واہیریت پر کر لیا تھا۔ ہاتی دو سو ہاگل آف کر دیے تھے۔ اگر دسیم مجھے کال کرنا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوشیار کو اس کا علم ہو۔ میں نے کہا۔ "تم اس چکر میں مت پڑو۔۔۔ اگر پولیس نے تمہیں گرفتار بھی کیا تو تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم سرحد سے اس ہاگل میں رہ کے ہی نہیں۔"

"وہاں کی مافوق فطرت مجھے دیکھا ہے۔"

"تم کھانے پینے کے لیے بھی وہاں جا سکتے ہو۔"

"میں دواؤ برداشت نہیں کر سکتا۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ "تم جانتے ہو پولیس کس طرح سے پوچھتا ہے۔"

"انسان پر مشقیں آتی ہیں اسے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ہاتھ پاؤں چھوڑ دینا کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں پر میں بزدل آدمی ہوں۔"

"اگر تم بزدل نہ ہوتے تو یہ سب نہیں کرتے آدمی سب سے زیادہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے۔"

"سویت سے میری جان جاتی ہے اگر اسے پتا چل گیا تو وہ لات مار کر مجھے یہاں سے نکال دے گی۔"

"یہ سب اس کا ہے؟"

"ہاں اس کا اور اس کے بعد بچوں کا۔" ہوشیار نے خشکی سانس لی۔ "میں مرتے دم تک ان لوگوں کے لیے بس کام کرتا رہوں گا۔"

"میرا آدمی اپنی بیوی بچوں کے لیے کام کرتا ہے۔ تمہیں ٹھکرانا کرنا چاہیے کہ اپنا کام کر دے ہو کسی کی

لوکری نہیں کر رہے۔ مجھے تو لگا ہے سمیت نے سب تمہارے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔

”یہ تو ہے۔“ اس نے کسی قدر شرمندگی کے ساتھ کہا۔ ”سمیت نے آج تک پلٹ کر حساب نہیں مانگا کہ کتنا کمایا ہے اور کہاں خرچ کیا ہے۔“

”اس لیے میرا حضور ہے کہ اب ان پکروں سے گریز کرو یہ یقیناً تمہاری بیوی بچوں کی دعاؤں میں جو میں وہاں پہنچ گیا اور اس وقت تم حالات میں ہوتے یا پھر ان سفاک بلیک سمروں کے چنگ میں جو بالآخر تمہارے حقوق کا آخری فقرہ تک چوس جاتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں دودھ کرتا ہوں۔۔۔“
 ”دودھ مت کرو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“
 میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اگر کوئی دودھ کرتا ہے تو خود سے کرے۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ”میں ذرا آرام کر لوں رات سے جاگا ہوا ہوں اور اب سر بھاری ہو رہا ہے۔“
 ”ہاں نکل آرام کرو مگر کوئی اہمقانہ حرکت مت کرنا جو تمہارا آرام ہمیشہ کے لیے غارت کر دے۔“

ہوشیار وہاں سے چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شیلا کو آواز دے لوں۔ میں صوفے پر نیم رہا ہوا گیا۔ رات چند گھنٹے کی ہے خواب بند نہ آئے مجھے کسی حد تک تازہ دم کر دیا تھا۔ زخم بھرنے سے جسمانی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے ابتدائی مرہم پٹی کے بعد کچا دوا کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ میں نے پشت سے سر ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنے والے صبح مرہم سے پہلے ہمارے لیے آرام کا یہ وقفہ قیمتی تھا۔ ہم دونوں ہی ہسپتالی اور چلی مچھن کا شکار تھے۔ آدھے گھنٹے بعد موہاگل واپس برٹ ہوا۔ میں نے سوچا کہ ہم کی کال ہوگی مگر کال منجائی نہیں سے تھی۔ میں نے کال دیسیو کی۔ دوسری طرف سے منتہائی آواز آئی۔ ”تم کون ہو یہ موہاگل تمہارے پاس کہاں سے آیا۔“

یہ وہی تھا جس کی ناک کو میں نے آفسیٹک بنا دیا تھا۔ ”میں وہی ہوں اور یہ موہاگل اب میرے پاس رہے گا۔“

اس نے ہنرک کر مائی دی۔ ”تجے دیکھ لیں گے۔۔۔ پاتال سے بھی تلاش کر لیں گے۔“

”خبردار۔“ میں دیکھی آواز میں ہنسا۔ ”مگر تمہیں اس کی رحمت نہیں کرنا پڑے گی۔ جلد میں تم لوگوں سے خود رابطہ

کروں گا۔ اب میں تمہارا باپ ہوں۔ وہ تمام مسئلے میرے پاس ہے۔“

وہ ایک لمبے کے لمبے چپ ہوا پھر اس نے دھوی کیا۔ ”تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ ہمارے پاس اس کی کاغذیں ہیں۔“

”ہاں لیکن ایک چیز کی کاغذ نہیں ہوگی۔ تمہیں معلوم ہے جب تم تینوں بے ہوش ہوئے تو میں نے کیا کیا تھا؟“
 میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”کیا۔۔۔ کیا تو نے؟“

”وہاں ایک عدد لاش تھی اور میں نے باری باری تم بچوں کے ساتھ اس کی تصویریں لی ہیں۔ تم لوگوں نے وہ لاش یقیناً لٹکانے لگا دی ہوگی۔ لیکن یہ تصویریں بھی کافی ہیں۔ پھر میں خود معلوم کر لے گی کہ لاش کہاں گئی؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

”پاپی کے ساتھ میں جند رہی کروں گا۔ اس موہاگل کو بھول جاؤ اور لمبر بند کرانے کی کوشش مت کرنا ورنہ وہ تصادم پر نہیں تک پہنچی جائیں گی۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ یہ خیال گنگو کے دماغ میں میرے ذہن میں آتا تھا مجھے یقین ہے اس کی حالت لمبر ہوگی ہوگی، اس جھوٹ پر کہ میں نے لاش کے ساتھ ان کی تصاویر بنائی تھیں۔ وہ اس بات پر یقیناً نہ بھی کرتے تب بھی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی ہوگی کہ اپنے موہاگل لمبر بند کراتے۔ یہ موہاگل میرے لیے اشد ضروری ہو گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے اسی لمبر پر کال کی دہرتے ہی کال دیسیو کی تھی۔

”اب کیا ہے؟“

”تمیز سے بات کرو۔“ میں نے غرا کر کہا۔ ”لاش کا کیا کیا؟“

”ٹھکانے لگا دی ہے۔“ اس نے کسی قدر حوصلہ کر کے کہا۔ ”اب اسے کوئی تلاش نہیں کر سکتا ہے۔“

”گڈ میں بھی کیا جانتا ہوں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ لاش غائب تھی اور پولیس کو اس کے قاتل کی تلاش نہیں تھی یعنی پولیس کا ہوشیار شکار کے گھر آنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے شیلا کو آواز دی۔ وہ غورا آئی۔ ”جی سرکار۔“

”مجھے کمرہ دکھاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ مجھے ساوی والے کمرے تک لے آئی۔ دھنک کے جواب میں اندر سے

سادگی نے کہا۔

"آجاف"

میں ابد آج سادی آرام کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ یہ جگہ مل گئی اور بد نہیں بٹھکا پڑا۔" "ہاں واقعی اس کا احسان ہے وہ بھی آزمائش کو ہماری اوقات سے زیادہ نہیں بڑھاتا ہے۔"

"وسیم کی کال آئی؟"

"نہیں۔" میں صوفے پر چڑھ گیا۔ سادی جلدی سے بیٹھ گئی۔

"آپ آرام کر لیں۔۔۔ آپ رات میں بھی کم سوتے تھے۔"

"میں کسی کا جاگنا لازمی ہے۔"

"میں جاگوں گی۔" اس نے کہا۔ "دو گھنٹے سولی ہوں تاکہ کافی ہے۔"

اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ ذرا آرام کر لوں۔ "مجھے دو گھنٹے بھر اٹھا دینا۔" میں نے ہسٹل سادی کے حوالے کیا۔ "کوئی مسئلہ ہوتا ہے استعمال کرتا۔"

"میں کر لوں گی۔" وہ احمد سے بولی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں سو گیا تھا۔ اس بار بھی تندرست گہری اور بے خواب تھی۔ میں اس وقت چوتھا جب سادی نے مجھے اٹھایا۔ اس کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے طمینان ہوا تھا۔

"اٹھ جائیں دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ سوویت نے باہر لان میں جانے کا انتظام کیا ہے۔"

میں منہ پر پانی مار کر باہر آیا۔ پانے سات بجے دھوپ تقریباً ختم ہو چکی تھی اور لان کو پانی دینے سے ایک نم اور خوشگوار سے ٹھنک کا احساس ہو رہا تھا۔ یہاں جدید ترین لان جسٹرز ایک ماربل ٹاپ میز کے گرد کئی ٹھیں۔ ٹیلا جانے کے ساتھ ٹیش کیے جانے والے لوازمات ہمارے پاس تھے۔ اس میں سو سے اور کھس تھے۔ دونوں چیزیں آلوکی تھیں اس لیے ہم نے بے فکر ہو کر کھا لیں۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ سادی اور سوویت اس دوران میں خاصی بے تکلف ہو گئی تھیں اور انہوں نے ایک طرف اپنی محل جمانی ہوئی تھی۔ ہوشیار نے چائے کے بعد مجھ سے کہا۔ "آؤ میں تمہیں اپنا فارم دکھاتا ہوں۔"

فارم بننے کے ساتھ ہی تھا۔ ہم غنمی دروازے سے

باہر آئے تو دور تک زمین پر چاول کی فصل مل گئی ہوئی تھی اور ابھی کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ پودے درخت اونچے ہو چکے تھے۔ ہماری زمینوں پر بھی چاول کھتے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ یہاں پودے بہت پائس پائس لگے تھے۔ لیکن فی مربع فٹ زیادہ پودے لگے تھے اور بھی اونچے تھے کہ انڈیا میں چاول کی فی ایکڑ پیداوار ہم سے کہیں زیادہ ہے۔ حکومت کسانوں کو کھانا اور بجلی میں سب سستی دیتی ہے۔ پانی سبیا کرنا حکومت کا کام ہے اور وہ پاکستان کے حصے کا پانی چاکر تھوڑی سے یہ فریضہ سر انجام دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "ابھی ہارمیں شروع نہیں ہوئی ہیں پھر پانی کہاں سے لے رہے ہو؟"

"وہ دیکھ رہے ہو؟" ہوشیار منگنے نے مغرب میں دور ہوا میں بلند ہونے سیاہ دھوئیں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس وقت نوٹ نہیں کیا تھا۔

"ہاں یہ کیا ہے کوئی بھٹی کام کر رہی ہے؟" "نہیں یہ ڈیزل سے چلنے والے میگا ٹیوب ویل ہیں۔" ہوشیار منگنے نے انکشاف کیا۔ "یہاں اعلان ہماری طرف ہے۔ اس لیے جب ہم زمین سے پانی نکالتے ہیں تو پاکستان کا پانی ہماری طرف آتا ہے۔ یہ ٹیوب ویل ایک منٹ میں ایک ہزار لیٹر پانی زمین سے کھینچتے ہیں اور یہ پانی بہت بڑے پائپوں کی مدد سے یہاں زمینوں پر دیا جاتا ہے۔ پائپوں کی مدد سے یہ پانی سولر دور تک پہنچایا جاتا ہے۔"

میں دنگ رو گیا۔ یہ انکشاف تھا۔ کم سے کم میرے لیے تو انکشاف ہی تھا۔ لیکن یہ میرے ملک کے ارباب اختیار اور اقلیت ہوں مگر جب انہیں دریاؤں کے پانی کی چوری کی پروا نہیں ہے تو ٹیوب ویلوں سے پانی چرانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے حکمران ملک و قوم کے مفاد سے کس حد تک پروا ہو سکتے ہیں۔ یہ شاخ کاٹنے والا کیس نہیں تھا یہ تو جڑ کاٹنے والی بات تھی۔ انڈیا صرف دریاؤں کا پانی نہیں روک رہا تھا بلکہ وہ زمین پانی بھی چرا رہا تھا اور یہ صرف چوری نہیں تھی بلکہ اس کے جسک پشت پاکستان سے دشمنی کا ہڈ پہ پوری شدت سے کارفرما تھا۔ جس خشک سال اور قحط سے ہمارے چند ماہرین زراعت و معاشیات خبردار کر رہے تھے انڈیا اسے جلد از جلد لانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ بین الاقوامی تجارت کے معاہدوں کی مدد سے وہ بہت جلد ہمیں اپنے

کو دس بھی کر کے تھے اسی لیے وہ کاشت کے ہر پہ طریقے اپنائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس بہترین گھر تھا اور وہ گاڑیاں تھیں۔ جیپ وہ اپنے لیے استعمال کرتا تھا جب کہ قاضیان کے ساتھ آنے جانے کے لیے اس کے پاس بڑے گاڑی کی جھوٹی کار تھی۔ اس نے چند مہینے پہلے لی تھی۔ ہم شہر آئے تھے اس کی زمین کی آخری حد تک چلے گئے۔ یہاں سے وہ ریگنڈیل وکیل دکھائی دے رہے تھے جو زمین سے پانی کھینچ کر آگے بھیج رہے تھے۔ ان کی تعداد کم سے کم بھی دو تین لاکھ اور یہ سرحد سے کچھ فاصلے پر ہر سو گز کے بعد لگے ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ نے کہا: "یہ ہمارے کھلے چلتے ہیں۔"

"ہم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

”نہیں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔“
 ”مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے جہاں تک دیکھا ہے
 یہ ہر سو گز بعد اسی طرح گئے ہوئے ہیں۔ انہیں لوگوں سے
 لایزل دیا جاتا ہے۔“

”تم لوگ پانی کا مواضع دیتے ہو؟“
 ”ہاں بالکل... ورنہ یہ خوب عریں کیسے مل سکتے ہیں۔“
 مگر یہ مواضع بہت زیادہ خشک ہے یوں سمجھ لیں مجھے مینے میں
 لیکن چار ہزار روپے سے زیادہ خشک دینا پڑتا ہے۔“

”اچانک پتلون کی جیب میں موجود سوپاکئی نے میری ٹیٹن دی تو میں نے ہوشیارانہ شکل کی طرف دیکھ کر پھول اٹکی۔
 گھٹا میں ہلند کی بور تو دیکھ موجود چند درختوں کے جھنڈ کی
 طرف بڑھ گیا۔ درختوں میں کالج کر پتا چلا کہ وہ ان ہی
 کاموں کے لیے مخصوص تھے جس کا بہانہ کر کے میں یہاں آیا
 تھا۔ اس لیے فضا تھک رہی تھی۔ میں نے سوپاکئی نکالا اس
 روپکم کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ”کیا ہو رہا
 ہے؟“

”کام چل رہا ہے۔“ وسیم کی آواز آئی۔ ”ممکن ہے
 نجات ہو جائے۔“
 ”کام کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ تمنا نے کہا۔ ”خطرہ کم سے
 کم ہے۔“

”میں بھی خوش کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب
 دیا۔ ”آپ دلوں ٹھیک ہیں؟“
 ”ہاں جیسا حالات بہتر ہیں۔“

”مختار میں بھر رہا ہے کروں گا۔“ اس نے کہا اور کمال
 سٹوئی۔ میں سو ہاتھ لگ کر وہاں آتا تو ہوشیار ہی مجھ کو کھڑا
 رکھیں وہ اپنی فعل کا محاذ کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا
 میں تھا کہ اس کے ہاتھوں باری جانے والی عورت کی لاش

191

ابن تینوں نے ٹھکانے لگا دی تھی اور یہ کام انہوں نے اپنی گردن بچانے کے لیے کیا تھا۔ میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتا تھا اس طرح اس پر سے دھاؤ کم ہو جاتا جب تک وہ اس خول میں رہتا کوئی اسکی حرکت کرنے سے گریز کرتا جس سے معاملہ پولیس کے ہاتھ میں نہ پہنچ جائے۔ اب تک اس کا روتھل مطمئن کرنے والا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ میں سادی کو لے کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ وہ انتہائی مقامی حکام کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ اسے میرے بارے میں علم نہیں تھا کہ میں کہاں تھا؟

ڈیوڈ شا زیادہ سے زیادہ اس ہاتھ تک پہنچ سکتا تھا جہاں قبیلے نے مجھے اور سادی کو اتارا تھا۔ چارہ بہت بڑا تھا اور وہاں بے شمار شاہک سینٹرز اور دکانیں تھیں جس میں ہم بے شمار کے تھے وہ اس جگہ سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا وہاں بھی دھاری موجودگی کا کوئی پرکار نہیں تھا۔ جب تک وہ تینوں پولیس یا ڈیوڈ شا کے ہاتھ نہیں آتے ہماری تینوں وہی مشکل تھی۔ اس کے باوجود میں سو فیصد مطمئن نہیں تھا۔ دشمن کو کبھی بے خوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے میں اپنی طور پر مستعد تھا۔ ہم واپس آئے تو سورج ڈوبنے کے بعد دھاری بھی روشنی بھی تاریکی میں بدل چکی تھی۔ سو میت نے ہم سے محذرت کی تھی کہ وہ بڑی غور تھے اور کسی قسم کا گوشت نہیں کھاتے تھے اس میں پھل بھی شامل تھی ہاں اظہ سے استعمال کرتے تھے اور ڈنر میں اظہ دلی سے بنی ایک ڈش موجود تھی۔ یہ اصل میں اظہ ابر پانی تھی جو میں نے پہلی بار کھائی تھی۔ وہ لوگ جلدی کھانے کے عادی تھے اس لیے ساڑھے آٹھ بجے میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔

جلد کھانے کے ساتھ وہ جلد سونے کے عادی بھی تھے جیسا کہ گاؤں دیہات کا رواج ہے۔ ہن کا گھر شہری سہولتوں سے آراستہ تھا مگر معمولات دیہاتی ہی تھے۔ کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر جاہل قندی کی۔ میری کوشش تھی کہ ہوشیار زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ رہے۔ وہ بچے ہم اپنے گروں میں آگئے۔ وہ جلدی سو جانے کے عادی تھے میں نے سادی سے کہا۔ "ہم کمرے میں ہوں گے لیکن کوئی ایک جاگتا رہے گا۔ ابھی تم سو جاؤ میں تمہیں صبح چار بجے جاگا دوں گا۔"

سادی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ میں نے مختصر مشاہدہ کیا اور ایک طرف صوفے پر اپنی جگہ بنالی تھی۔ یہاں اسے ہی

نہیں تھا اس لیے کبیل کی ضرورت نہیں تھی۔ پتھرا ہل پر اچھا اور اس کی ہوا گرمی اور جس دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے بعد موسم اچھا تھا جس آلودہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بارش آنے والی تھی۔ مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی آجائے گی۔ بارہ بجے گرج چمک شروع ہوئی اور وہی منٹ بعد تیز ہواؤں کے ساتھ موسلا دار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے کھڑکی کے پت کھول دیے تھے اندر کی گرمی نکل اور باہر سے ٹھک و خم ہوا اندر آئی۔ شدید بارش کا سلسلہ کوئی آدھے گھنٹے جاری رہا اس کے بعد اس کی شدت میں کمی آئی۔ مگر گرج چمک کا سلسلہ جاری تھا۔ میں صوفے پر نیم درال تھا۔ کمرے کی بڑی روشنیاں بند کر کے صرف ایک شینگول روشنی والا ٹائٹ لیمپ آن کیا ہوا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ باہر کوئی گاڑی رکی ہے۔ ویسے تو آواز نہیں آتی تھی لیکن ابجین بند کرنے سے پہلے اسے ریس دی جاتی ہے تو اس کی آواز آتی تھی۔ میں چوکتا ہو گیا اور دروازے تک آیا۔ میں نے باہر مہانگا لیکن لاؤنج خالی تھا۔ ہوشیار سنگھ کے گھر میں چار بیڈروم تھے اور ان چاروں کے دروازے لاؤنج میں کھلتے تھے۔ لاؤنج گھر کے وسط میں تھا۔ مگر لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ہمارا کمرہ پورچ اور گیٹ کی طرف تھا اس لیے میں نے آواز سن لی۔ خاص دیر تک کوئی اور آہٹ نہیں ہوئی تو میں دروازہ بند کرنے والا بن گیا تھا کہ اس لیے کال پٹی بجی۔ بچانے والے نے نہایت بدتمیزی سے پٹی پٹی پر انگلی رکھ دی تھی اور تھریا آدھے منٹ تک مسلسل بجاتا رہا۔ اندر سے ہوشیار پا جاے اور بنیان میں افراتفری کے ساتھ برآمد ہوا۔ یقیناً میری طرح اس کے ذہن میں بھی خیال آیا ہوگا کہ پولیس آگئی۔ پولیس۔ کسی کے گھر آدھی رات کو اسی طرح نازل ہو سکتی تھی۔

میں پتا کہ بیگ سے شاٹ گن نکال سکوں تو سادی کو بیدار پایا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں بیگ کی طرف بڑھا تھا کہ باہر سے ہوشیار سنگھ کی حیرت زدہ آواز آئی۔ "سکیجے تو...؟"

"ہاں بھائی مئی... ایک سال بعد ہی تو دیکھا ہے... کیا شکل چل گئی ہے جو پچاس بیس رہے تھے۔"

"تو یہاں کیوں آیا ہے؟"

"ہوشیار بار تو میرا بھائی ہے۔" سکیجے نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ ہوشیار سنگھ سے

ہاں کل مختلف اور صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر آنے والا شخص تھا۔ لہجے سے وہ بھی ہوشیار کی طرح بڑھا کھٹا لگ رہا تھا۔ "اسے بھائی سے ملنے آیا ہوں۔"

"سکھتے تھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا تو جانتے سب نے تجھ سے ملنے غم کر لیا ہے۔ سویت بھی پسند نہیں کرے گی۔"

"بھربھائی کو چھوڑ دینی بات کر۔" سکھتے نے کہا۔ "وہ بے چاری تو اور بھی بہت کچھ پسند نہیں کرے گی جو تو کرتا بھرتا ہے۔"

"آہستہ بول۔" ہوشیار نے برہمی سے کہا۔ "کیا تو میرا گھر پر ہار کرنے آیا ہے۔"

"میں تیرا بھائی ہوں دشمن نہیں۔۔۔ یہاں سے گزرتا تھا سوچا ایک رات تیرے پاس رک جاؤں کچھ چلا جاؤں گا۔"

"تو چل سے کب آیا؟"

"دو چلتے پہلے رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس علاقے میں تو کیاں جا رہا تھا جو یہاں سے گزرا۔" ہوشیار کے لہجے میں شک تھا۔

"میں جا رہا تھا۔" سکھتے نے زحمتی سے کہا۔

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں آیا ہے۔ کوئی گڑبڑ تو کر کے نہیں آیا ہے کہ پیچھے سے چھپیں بھی آ رہی ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں بھائی جی۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے کہا تھا بس ایک رات دکوں گا اور پھر ہم اپنی راہ لیں گے۔"

"ہم؟" ہوشیار کی چونکی آواز آئی۔ "اور کون ہے؟"

"میرے دو دوست بھی ہیں۔" اس نے کہا تو میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ سکھتے کا کوئی علائقہ کام کر کے یہاں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی اسے برداشت نہیں کرے گا اور وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے آیا تھا۔ یہ بات ہوشیار نے بھی محسوس کر لی۔

"سکھتے میں تھے نہیں ٹھہرا سکتا اپنے دوستوں کو لے کر اسی وقت نکل جا۔" ہوشیار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "چل نکل یہاں سے۔"

"اب میں نہیں جاؤں گا۔" سکھتے نے کہا اور آواز دی۔ "آ جاؤ امداد اپنا ہی گھر ہے۔"

"سکھتے یہ کیا کر رہا ہے ان بد معاشوں کو اندر بلا رہا ہے۔" ہوشیار نے برہمی سے کہا اور میں گہری سانس لے کر

وہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں کہیں جاؤں اور وہاں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ یہاں بھی مسئلہ آ گیا تھا۔ سکھتے کے دونوں آدمی اندر آ گئے اور ہوشیار کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ دونوں آدمی سچ تھے اور انہوں نے وہ دروازہ جیک اٹھا رکھے تھے۔

"بھائی جی یہ بد معاش نہیں ہیں لیکن ضرورت پڑے تو میں جاتے ہیں۔" سکھتے نے دانت نکال کر کہا۔ "میں ایک رات کی بات ہے سچ ہم چلے جائیں گے۔"

"تم لوگ کوئی دادرست کر کے آئے ہو۔" ہوشیار نے اذیت لہجے میں کہا۔ "پولیس سے بچنے کے لیے یہاں آئے ہو۔"

"ہاں، ادھر پولیس سرگرم ہے۔" ایک آدمی نے نہان کھولی۔ وہ طویل قامت اور دلی جسامت کا مالک تھا۔ "اس وقت ہمارے کٹے ہیں کچھ کھول دیں گے تو ہم چلے جائیں گے۔"

"بھئی کو پتا نہیں چلے گا۔" سکھتے بولا۔ "مجھے معلوم ہے بچہ پاتا پتا کے واسطے ہیں۔ ادھر میں بھر جاتی ہوگی۔"

"کچھ مہمان بھی ہیں۔" ہوشیار نے آہستہ سے کہا۔ "میرے کالج کے وقت کا دوست ہے، بھائی کے ساتھ ادھر آیا ہوا ہے۔"

"اس کی خیر ہے تم بتا دینا کہ بھائی اور اس کے دوست ہیں۔ کوئی سانسے نہیں آئے گا ہم کرے تک رہیں گے۔"

ان لوگوں کے تہہ تا رہے تھے کہ اگر ہوشیار نے انکار کیا تو وہ زبردستی پر اتر آئیں گے۔ طویل قامت کے شانے سے شاٹ گن لگ رہی تھی اور دھڑلے سے اپنی توقع کے ساتھ چٹوٹ کی دھنسی وٹ میں پستول بھی اٹکایا ہوا تھا۔ سکھتے خالی ہاتھ تو لیکن لگ رہا تھا کہ اس کے پاس بھی کوئی نہ کوئی ہتھیار ہو گا۔ ہوشیار نے محسوس کیا کہ وہ اب انکار کر کے نقصان میں رہے گا۔ لیکن اس نے سر ہلایا۔ "اپنی بات پر قائم رہنا کل تک یہاں سے چلے جانا۔"

"بھائی جی اندر تو آئے وہ۔ ابھی آئے نہیں اور کالے لٹے کی بات شروع کر دی۔" سکھتے آگے بڑھا تو ہوشیار نے روکا۔

"ادھر نہیں یہاں اندر کے ہیں۔ تم لوگ اس کرے میں جاؤ۔"

میں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کیونکہ اب

روا کر آئے تو کھلا دروازہ دیکھ سکتے تھے۔ میری توجہ کا مرکز
تکبیر کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں موجود بیگ تھے۔
انہوں نے جس طرح افکار رکھے تھے اس سے ظاہر تھا کہ ان
میں خاصا وزن قلمدہ بیگوں میں کپڑے اور ضرورت کا
سامان لے کر گھومنے والے لوگ نہیں تھے۔ ان بیگوں میں
یقیناً نوٹ کا مال یا ایسی کوئی چیز تھی جس کے لیے پولیس ان
کے پیچھے تھی اور علاقے کو ہاتھ دھونے والوں سے بند کیا گیا
تھا۔ وہ بچوں اسی کمرے میں ملے گئے جو ہوشیار نے ان کے
لئے کھولا تھا۔ میں پلٹا تو سادی کو پیچھے کھڑے پایا اس نے
سرگوشی میں کہا۔ "شوہن لگ رہا ہے مصیبت آگئی ہے۔"
"لازمی بات ہے ہم نہیں قدم بڑھو فرمائیں اور وہاں
کوئی مصیبت یا آفت نہ آئے۔ ممکن ہی نہیں ہے۔"
"جب کیا کریں پولیس آگئی تو ان کے ساتھ ہمیں بھی
سمیت کر لے جائے گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "اس کا بہت زیادہ امکان
ہے۔ کیونکہ اگر پولیس نے انکا بندی کی ہے تو ہون کے ہاتھ
نہ آنے کی صورت میں وہ گھروں تک بھی آسکتی ہے۔ یقیناً یہ
کوئی ایسا کام کر کے آئے ہیں جس کی وجہ سے پولیس بڑے
پیمانے پر حرکت میں آئی ہے۔"

"شوہن دیکھنے والے کیا پھر؟"
"میں بس شام کو اس کی کال آئی تھی، جنہیں بتایا تھا۔
"میں دانہیں صوفے پر دراز ہو گیا۔" وہ ہمدی کوشش کر رہا
گا لیکن میں نے اسے بتا دیا ہے کہ جب تک خطرہ صرف وہاں
بعد تک نہ ہو میں جنہیں لے کر بارڈر کر اس نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو جب وقت آئے گا جب دیکھا جائے
گا۔" سادی بستر پر بیٹھ گئی۔ "لیکن شوہن مجھے لگ رہا ہے یہ
لوگ کچھ گڑبڑ کریں گے۔"
"وہ کیسے؟"

"جیسے ہم ان سے چوکتا ہیں اسی طرح وہ بھی ہم سے
چوکتا ہوں گے۔ بھائی کی بات انگ ہے لیکن ہوشیار کا بھائی
ہم پر اعتبار نہیں کرے گا۔"

سادی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ویسے بھی ان لوگوں کے
اعمال سے لگ رہا تھا کہ وہ صرف ایک رات کے لیے یہاں
نہیں آئے تھے۔ جب تک پولیس ان کی تلاش میں ہوئی وہ
اسی جگہ رہے اور یہاں انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہوشیار بھر
حال اسے بھائی کو پولیس کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ
نہیں رہے تو اس کا پورا امکان تھا کہ جلد یا بدیر قادی

حالات ہوتی اور یہ ملاقات خوشوار نہیں ہوتی۔ وہ تین تھے
اور مسلح بھی تھے۔ پھر ماوی جرائم پیش تھے ان کے لیے کسی پر
ہاتھ اٹھانا یا کسی کو مار دینا بڑا دردناک مشکل کام نہیں تھا۔ میں سوچ
رہا تھا کہ میں انتظار کرنے کی بجائے پہلے میں ہی کیوں نہ
کچھ کر گزروں۔ یہ گھوڑے کے پہلے پھونک مارنے والا
کیس بھی ہو سکتا تھا۔ جلد یا بدیر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ
حالات کو اپنے ہاتھ میں لیا جائے اور تب وہ اسلئے کے زور
پر ہمیں پر خال بنا لیتے۔ اگر میں پہلے کارروائی کرتا تب بھی
خطرہ تھا کہ وہ مزاحمت کریں گے اور یہاں کچھ گولیاں چلیں
گی۔ اس صورت میں پولیس کے آنے کا امکان بڑھ
جاتا۔ بے شک اس پاس کوئی گھر نہیں تھا لیکن یہ جگہ پر ان
نہیں نہیں تھی۔ بڑی سڑک پاس تھی۔ میں نے دروازہ اندر
سے بند کر لیا تھا اب کوئی نہ بروقت اندر نہیں آ سکتا تھا۔

مجھے خود پر اعتماد تھا کہ وہ تینوں میرے لیے مسئلہ نہیں
ہوں گے۔ مگر انہیں کارہ کر کے رکھنا آسان نہیں تھا اور کل تو
اس مسئلے کا بالکل بھی حل نہیں تھا۔ اس سے دیگر کئی مسائل
کھڑے ہو جاتے۔ یہاں ہوشیار کے کارڈ میں بھی الی خانہ
کے ساتھ رہتے تھے۔ اسے لوگوں کو خاموش کرانا ممکن نہیں
تھا۔ اس لیے جو کرنا تھا خاموشی سے کرنا تھا۔ میں سوچ رہا تھا
سادی وہ بارہ لیٹ گئی۔ اسے وقتی تشویش ہوئی تھی اور نہ اسے
بھی یقین تھا کہ میں اس جگہ سے نکل سکتا ہوں۔ وہ غنودگی
میں گئی تھی کہ دروازے پر آگئی سی دنگ ہوئی اور وہ جاگ
گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ کون ہے؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے
تک آیا۔ دنگ اتنی لمبی تھی کہ اگر ہم ذہنی طور پر چوکتا نہ
ہوتے تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔ پھر باہر پارش ہو رہی کی
گرج چمک کا شور تھا۔ امکان یہی تھا کہ باہر ہوشیار ہوگا اس
لیے میں نے ممکن حد تک دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کون؟"

"میں ہوں ہوشیار۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
میں نے گہری سانس لی لیکن مطمئن نہیں ہوا تھا کیونکہ ہوشیار
کو گنہگار منت پر بھی یہاں ملا یا جا سکتا تھا۔ میں نے ہستول نکالی
کر ہاتھ پشت پر کیا اور دروازہ کھولی دیا۔ ہوشیار تیزی سے
اندر آیا۔ سادی نے جلدی سے دوپٹا لٹیک کیا اور میں نے
پوچھا۔

"یہ کیا حرکت ہے تم اس طرح منہ اٹھائے کس خوشی
میں اندر آ رہے ہو؟"

"آئی ایم سوری۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا اور

بھری ہوئی۔ "ہم بڑی مشکل میں ہیں مجھے۔"

"ہم سے کیا مراد ہے؟"

"میرا مطلب ہے ہم دونوں۔" اس نے گھبرا کر کہا
کیونکہ میں نے ذرا اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ "وہ گروہ کے
لیے آواز دہکنے کو کہہ رہی تھیں۔"

"وہ کون؟"

"میرا بھائی اور اس کے ساتھی۔"

"میرا تمہارے بھائی یا اس کے ساتھیوں سے کیا
تعلق ہو سکتا ہے؟"

ہوشیار نے سوچا اور پھر مجھے پوری بات بتانے کا
فیصلہ کیا حالانکہ میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ اس نے کہا
شروع کیا۔ "میرا چھوٹا بھائی ہے سنگیت سنگھ۔ جوانی میں لالہ
چکروں میں پڑ گیا۔"

"جیسے تم شادی کے بعد لالہ چکروں میں پڑ گئے۔"
میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے ہم ڈرائنگ روم میں مل کر
بات کرتے ہیں۔"

ہوشیار نے سر ہلایا تو میں نے سادی کو اشارہ کیا کہ وہ
اندروں سے دروازہ بند کر لے۔ وہ سر ہلاتی ہوئی کھڑی ہوئی تو
میں اور ہوشیار باہر نکل آئے اور دو بے قدموں ڈرائنگ روم
میں آ گئے۔ ہوشیار نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے لالہ
کو دیا اور مجھے تنگ حد تک دور والے حصے میں لا کر
بولے۔ "اس نے جرم شروع کر دیا ہے۔ ایک سال پہلے وہ پکڑا
گیا۔ خوش قسمتی سے ایک گواہ کر ہو گیا اور اسے صرف چھ
مہینے کی سزا ہوئی۔ وہ چھوٹا آقا واداب یہاں ہے۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے
انجان بن کر کہا۔

"مجھے شبہ ہے کہ وہ اور اس کے دو ساتھی کہیں کوئی
داروایت کر کے آئے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے اور
علاقے کی ناکابندی کر رہی ہے۔"

"ہاں اب میرا مسئلہ بھی بن رہا ہے۔" میں نے سر
ہلایا۔ "تمہارا مسئلہ تو ہے ہی۔"

"وہ کہہ رہا ہے کہ کسٹا چلا جائے گا لیکن مجھے یقین ہے
وہ یہاں جہم کر رہے ہوں گے۔"

"ساتنے کی بات ہے پولیس ابھی جلدی اپنی تلاش ختم
نہیں کرے گی اور یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"ابھی تو میں نے انہیں قایل کر کے تم میرے دوست
ہو۔"

"سوال یہ ہے کہ گروہ یہاں رہے اور پولیس انہیں
تلاش کرتی آگئی تو وہ اپنی شرافت سے ظرد کو پولیس کے
حوالے نہیں کریں گے۔" میں نے ہوشیار کو قائل کرنا شروع
کر دیا۔ "یہ گولیاں چلائیں گے اور مارا ماری ہوگی۔ لیکن
پولیس سے بچنے کے لیے یہ تمہیں اور ہمیں بے مثال
بنائیں۔"

در حقیقت وہ پہلے ہی قائل تھا اور جو باتیں میرے
ذہن میں تھیں وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لیے تو وہ میرے
پاس آیا تھا۔ وہ حنکر ہو گیا۔ "یہ تو ہے۔"

"یہ مقابلہ کریں گے اور گولیاں چلائیں گے تو حجاب
میں پولیس پھول تو نہیں مارے گی اور گولیاں سامنے آنے
والے کو نہیں دیکھتی ہیں۔ ہم بھی مارے جاسکتے ہیں۔"

"یہ بھی ہے۔" اس نے پھر اتفاق کیا۔
"اس صورت میں ہمیں وہ کام کرنا چاہیے جس سے
مسئلہ خاموشی سے حل ہو جائے۔"

"خاموشی سے کیسے؟"
"یہ جانتا ہوں کہ اسے پاس خیر کی دوا ہے؟"
"ہاں کل ہے کچھ مہینے پہلے مجھے خیر نہیں آتی تھی تو میں
لایا تھا۔ اس کے بعد خود خیر آنے لگی تو اس کا لہا ویسا ہی پڑا
ہے۔"

"تمہیک ہے انہیں چائے میں دوا ملا کر دے دو۔"
میں نے مشورہ دیا۔

"چائے اس وقت؟"
"ہاں... تم کہہ سکتے ہو کہ گھر سے تمہاری خیر آگئی
ہے اور تم اپنے لیے چائے بنا رہے تھے تو سوچا کہ ان تینوں
کے لیے بھی بنا دو۔ تم ان کے ساتھ ہی چائے بنا تاکہ انہیں
شک نہ ہو۔"

"دوا دلائی۔" اس نے اعتراض کیا۔ "اس سے تو میں
بھی سوچاؤں گا۔"

"مہینے لیے تم بطور دوا دلی لیتا۔"
"تب تک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"تب تو قائل کرو۔ اگر وہ کچھ سوچے تو تم اٹھا کر تو
چائے نہیں دو گے۔"

"میں ابھی جاتا ہوں۔" وہ بولا۔ "میرے پاس
گولیاں ہیں پہلے انہیں میں لیتا ہوں۔"

وہ کچھ ہوشیار تھا۔ شکر ہے اسے یہ حرکت تازے
سامحہ کرنے کا خیال نہیں آیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم نے

شرافت سے کام لیا تھا اور اس کی مدد ہی کی تھی۔ اسے آگ اور
بلک میٹنگ کے چکر سے بچا لیا تھا۔ وہ دروازے کی طرف
بڑھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا کہ سامنے سنگیت اور اس
کے دونوں ساتھی دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں پر شک ہی
تھا۔ سنگیت نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ ”بھائی جی
دروازہ بند کر کے کیا کر رہے تھے؟“

اس خاموش کھڑا رہا ہوشیار نے مڑ کر دیکھا تو اس کی
ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ میں نے آنکھوں میں ہلکے اشارہ
کیا کہ حوصلہ کرے۔ اس نے اشارہ سمجھ لیا اور کسی قدر گرم
لہجے میں بولا۔ ”تو کون ہوتا ہے مجھ سے میرے گھر میں یہ
سوال کرنے والا۔“

”بارخ کیوں ہوتے ہو پارا ایسے ہی پوچھ لیا۔“
میں آگے آیا۔ ”تم تینوں ساتھ ساتھ رہتے ہو
کیا... جہر وقت؟“

طویل قامت نے غرا کر میری طرف دیکھا اور ہوشیار
سے کہا۔ ”اسیے پار کو کھالے ہمارے منہ نہ لگے۔“

”منہ لگنے والی بات بھی نہیں ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”بات کرنے سے پہلے آئیے میں منہ کچھ لیا کرو۔“

”لگ ہے تو اس طرح نہیں مانے گا۔“ طویل قامت
آگے آیا تھا کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہاں نہیں... یہ میرے دوست کا گھر ہے اس کا
نقصان میرا نقصان ہے ہاتھ ہٹاتے ہیں۔“

تو نہ والا خوش تھا اور سنگیت بھی دل چاہی لے رہا تھا
ہیسا لگ رہا تھا ان کا دل پسند تماشا ہونے والا ہے۔ طویل
قامت بولا۔ ”تم خود مقابلے کا کہہ رہے ہو بعد میں روئے
مت۔ میں ہاتھ چلاتے ہوئے یہ نہیں سوچتا کہ آگے والے
کے منہ ناک کا کیا ہوگا؟“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ ہوشیار گھبرا گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم ٹکرمٹ کرو ہم ڈراما
جادو اخیال کریں گے۔“ میں نے کہتے ہوئے باہر کا رخ
کیا۔ وہ چاروں بھی پیچھے تھے۔ ہوشیار اپنے بھائی سے کہہ
کہ رہا تھا مگر وہ اس کی سننے کے سوا میں نہیں تھا۔ اس کی
بھانے وہ اپنے ساتھی کے ہاتھوں میری مرمت دیکھنا چاہتا
تھا۔ اب وہ ہوشیار ہو گئے تھے اور شاید دروازہ لاچار ہو گیا تھا۔
اس لیے میں نے دوسرا طریقہ سوچا تھا۔ ہم باہر آئے چچاں
ہوشیار کی جیب کے ساتھ ایک کتہہ اسی پرانی کار کھڑی تھی۔
وہ لوگ اسی میں آئے تھے اور انہوں نے چالاک سے کام

لیتے ہوئے گاڑی بھی اندر کھڑی کر لی تھی۔ اس لیے اب
پورچ میں جگہ نہیں تھی۔ ہم لان میں آگئے۔ ہوشیار اب
خاموش تھا اس نے سمجھ لیا تھا کہ اس کی کوئی نہیں سنے
گا۔ سنگیت اور تو نہ والا ذرا دیر کھڑے ہو گئے اور طویل
قامت آگے آیا۔ میں نے انداز میں اس کی طرح دونوں ہاتھ
آگے کیے۔ طویل قامت مسکرایا اور اسی کا چہرہ لان یسپ کی
جلی روشنی میں حریف کر دیا نظر آنے لگا۔ مجھے کڑور حسوس
کر کے وہ آگے آیا اور میں نے آدھے صحت میں کھیل ختم کر
دیا۔ اس کے دو دار کا کام بڑا کر میں نے پہلے اس کے پیچ
میں مکا مارا اور جب وہ جھکا تو اس کے سر پر پستول کا دست
رسید کیا وہ وہیں گر گیا۔ تو نہ والے کا ہاتھ اپنی ویلٹ کی طرف
گیڑھا تھا کہ میں نے پستول اس کی طرف کر دیا۔ ”ہاتھ اڑا
اور حرکت مت کرنا ورنہ...“ میں نے پستول کو جنٹیل دی تو
اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے ہاتھ اڑا کر کہے۔ سنگیت نے
اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب ہوائیاں ان کے چہروں پر اڑ رہی
تھیں۔ وہ میرے پرزے اڑتے دیکھتے آئے تھے اور یہاں
تماشا ہی اٹھا ہو گیا تھا۔

”ہاتھ گروں پر۔“ میں نے حکم دیا تو انہوں نے اس
بار بھی کھیل کی اور ہوشیار نے میرے کہنے پر ان کی خلافی لے
کر ہتھیار برآمد کر لیے۔ دونوں کے پاس پستول تھے۔ نہتے
ہونے پر ان کا رہا سہا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ سنگیت نے
کہا۔ ”بھائی جی ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”اتنی آسانی سے نہیں۔“ میں نے کہا اور ہوشیار سے
پوچھا۔ ”کوئی جگہ ہے جہاں ان کو بند کیا جاسکے تو صرف ان
کی آتما نہیں وہاں سے نکل سکیں؟“

”ہاں نکل ہے۔“ اس نے کہا اور میں لان کے ساتھ ہی
کھڑی تک آیا۔ یہ اوڑا اور قاتل سامان دیکھنے کے لیے تھی۔
بہت اشکوں سے مٹی اس کھڑی کی چھت بھی پگھلائی اور
دروازہ موٹی لوہے کی چادر کاٹا ہوا تھا۔ یہ انتظام شاید
سامان کو چوروں سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا اور یہاں
سے بچ جانے کی رو میں تو کھلی تھی۔ ایسی سامانی
جن پر نکال میں جنم کی مدد سے یہ خود کو آزاد کر سکتے تھے اور
پھر انکس کھڑی میں رکھ لیا۔ میں نے کہا۔

”آرام سے بیٹھنا۔۔۔ ہنگامہ کیا تو اپنا نقصان خود کرو
گئے۔“

”بھائی تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“ سنگیت نے بھائی کو
دھمکایا۔

"تو نے بہت اچھا کیا جو ان بد معاشوں کو لے کر میرے گھر آ گیا۔" ہوشیار نے سچ لہجے میں جواب دیا۔
 "ہم سرحد کے تیرا کوئی اور قصان نہیں کرتے۔"
 "تو اس مت کر۔۔۔ یہ میرا دوست ہے اس کے ساتھ کیا کر رہے تھے تیرے ساتھی اور تو۔۔۔ تو کہتا ہے میرا قصان نہیں کر رہے تھے۔ ابھی پہلے معلوم کر لوں کہ تم لوگوں نے کیا کیا ہے پھر تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔"

ہوشیار احمد سے ایک بڑا اور مضبوط تالا لے آیا اسے یاہر ال دیا۔ ہم اندر آئے پہلے میں نے سادی کو تسلی دی کہ حالات میرے قابو میں ہیں اور وہ سو جائے پھر میں ہوشیار کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس میں یہ تینوں رکے تھے وہاں ان کے اخائی اسٹے کے ساتھ وہی دونوں بڑے بیگ بھی تھے۔ ہوشیار نے ایک بیگ کھولا اور میری توقع کے عین مطابق اس میں کرسیوں کا ڈھیر لٹکا تھا۔ یہ سارے خزانہ اور پانچ سو ڈالے بٹے کرسی ٹوٹ تھے جن پر تنگ کی پٹی لگی تھی۔ ہوشیار نے گھبرا کر کہا۔ "واہ کرو کی سو۔۔۔ کسی بیگ میں ڈاکا لگا ہوا ہے۔"

"تنگ تو بلیا ہی رہا ہے۔" میں نے دوسرا بیگ بھی کھولا اور وہ بھی اسی طرح کرسی سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں بیگوں کا مشترکہ وزن کوئی پچاس کلو گرام تھا۔ ہوشیار نے گٹھیاں گھسیں اور مجھے آگاہ کیا۔

"دو سو گٹھیاں لاکھ والی اور تین سو پچاس ہزار والی ہیں۔"

"ساڑھے تین کروڑ روپے۔" میں حیران ہوا تھا۔ "یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور پولیس بلازی چکنا ہوگی۔"
 "اتنی بڑی واردات کی توئی پہ لازمی آ رہی ہو گی۔" ہوشیار نے کہا تو ہم نے نشست گاہ کا رخ کیا۔ اس نے ٹی وی آن کر کے مقامی غورچیل لگایا تو اس پر اس وقت کی خبر چل رہی تھی۔ نامعلوم افراد نے امرتسر سے لدھیانہ آنے والے کیش آرمرڈ ٹرک کو لوٹ لیا تھا۔ ڈاکوؤں نے ٹرک کے چاروں جانب فکوں کا قتل کر دیا تھا اور اس میں موجود ساڑھے تین کروڑ کی رقم لوٹ کر لے گئے تھے۔ یہ خبر دیکھتے ہوئے رات دو بجے ہوشیار سنگھ کے بارہ بچا گئے تھے۔ "یہ تو قاتل بھی ہیں۔"

"پولیس بہت سرگرمی سے ان کی تلاش میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ ابھی خبر ہے کہ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہے۔ مگر بہت سی باتوں سے وہ ان کی تلاش پہ چل

جائے گا کڈا کوئوں نے کہاں کا رخ کیا ہے۔"
 "وہ سیدھی یہاں آئے گی۔" ہوشیار نے مدد اپنے رالے لہجے میں کہا۔ "دو رقم کہہ رہے ہو کہ انکی بات ہے۔"
 "میرا مطلب ہے وہ ناموں سے واقف نہیں ہے ورنہ یہ پتا چلا تا کنون سا مشکل ہوتا کہ سنگھ کا بھائی ہوشیار سنگھ اسی علاقے میں رہتا ہے۔ لدھیانہ یہاں سے بہت دور ہے۔"

"آقا دور بھی نہیں ہے۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔
 "اب ان کو چھپا کر رکھنا اور ضروری ہو گیا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کے لیے چائے بناؤ وہی دوا والی۔"

"شراب میں نہ دیدوں۔" ہوشیار سنگھ نے بہتر تجویز دی۔ "زیادہ اثر کرے گی۔"

"یہ بہتر رہے گا۔" میں نے کہا تو اس لیے نشست گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"یہ سویت ہوگی وہ جاگ گئی ہوگی۔" ہوشیار نے کہا اور باہر چلا گیا۔ وہ اس صحنہ بعد آیا تو اس کے ہاتھ میں دھلی شراب کی بوتل تھی۔ اس نے مجھے دکھائی۔ "دوا نہیں کر اس میں شامل کر دی ہے۔"

ہم باہر آئے۔ گھڑی کا تالا کھولا اور ہم اندر آئے۔ طویل قامت کو ہوش آگیا تھا اور وہ سر تھامے مجھے فونی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تو نے اچھا نہیں کیا ابھی مجھے جانا نہیں ہے۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "نہیں ایک دن کی بات ہے پھر تم کما کر دو کروں گا۔"

"تم لوگوں نے آمرا ٹرک لوٹا اور اس کے گاؤں کو بار دیا۔" ہوشیار سچ لہجے میں کہا۔ اس نے شراب کی بوتل سنگیت کی طرف اچھال دی۔ میں نے اندر آنے سے پہلے ہتھول نکال لیا تھا اس لیے وہ شرافت کے دائرے میں تھے۔ سنگیت نے مٹھوک لہجے میں کہا۔

"تو شراب کیوں لا رہا ہے۔"

"تایا تو ہے کہ تم لوگ ایک دن آرام سے رہو گے۔" شاہنشاہ باب چٹا شروع کر دو۔

"اس میں ہر ہے۔" سنگیت کا ٹھنڈا ہاں ہوا گیا۔
 "میں تم تینوں کو خالی ہاتھ سے بھی مار سکتا ہوں تو نہ ہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد۔۔۔" میں نے ہتھول کو چٹش دی تو طویل قامت نے

شکیت سے بولنے کر منہ سے لگائی۔ اسے ضرورت بھی تھی اس نے ایک سی ہار میں چوتھائی بوتل صاف کر دی۔ پھر گینڈے نے بوتل کے ساتھ ملکی سلوک کیا۔ شکیت کو جب میں نے بجایا تو اس نے بوتل منہ سے لگائی تھی۔ اس دوران میں طویل قامت جھوٹے لگا تھا مگر پہلے گینڈے لڑکا پھر طویل قامت گرا اور آخر میں شکیت نے مزید ایک گھونٹ لیا تھا اٹکا خسل ہونے سے پہلے۔ بوتل تقریباً خالی ہو گئی تھی۔
 ”یہ مجھے کم سے کم دس بارہ گھنٹے کے لیے۔“ ہوشیار نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔

”کوئی دوا انسان کو آٹھ گھنٹے سے زیادہ دیر تک نہیں سلا سکتی ہے اس سے زیادہ دیر سونے کی صورت میں انسان کی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے۔“ میں نے اسے آگاہ کیا۔ ”ہاں یہ دس بارہ گھنٹے تک کسی قافلے نہیں رہیں گے۔“ ہم باہر آئے اور ہوشیار نے تالا لگا دیا۔ ہم اندر آئے تو میں نے ہوشیار کا شانہ تھپکا۔ ”اب تم سو جاؤ۔“
 ”اور تم؟“

”میں جاگتا رہوں گا۔ پولیس کی طرف سے ہوشیار رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خیال ہے یہ گاڑی کہیں اور نہ چھوڑ دیں۔“

”بچے کھڑی کر دیتے ہیں۔“ ہوشیار نے تھوڑے پیش کی۔ ”باہر جانا خطرے والی بات ہوگی۔ میں روڈ پاس ہے اور اس پر پولیس موجود ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے تب بچے کھڑی کر دوں گا ابھی یہ کام کرو۔“ میں نے مشورہ دیا اور ہوشیار جیل کے لیے چلا گیا۔ اب اس کا رویہ میرے ساتھ تقریباً نرم ہو گیا تھا اور وہ بھڑک نہیں رہا تھا اور نہ ہی اس کی نظروں اور انداز میں قاصت تھی۔ اس نے عیسوی کر لیا تھا کہ میں اپنے ساتھ اس کی مدد بھی کر رہا تھا۔ دم دار لے چک ابھی تک ان کے کمرے میں پڑے ہوئے تھے۔ ہوشیار آیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”انہیں چھپانا ہے۔ صبح شیل یا کوئی اور بندہ نہ جانے کے یہ لوگ یہاں آئے تھے۔“

گھر میں ایک اسٹور روم تھا مگر وہ کھلا تھا اس لیے ہوشیار کے کمرے کے ہاتھ روم کے اوپر والی دو جھتی سے کام لیا گیا۔ ہم نے اسٹور بھی بیگوں میں ڈال دیا اور انہیں دو چھتی پر سامان کے پیچھے رکھ دیا۔ سوویت جان کی تھی اور ہر اسان تھی۔ مگر وہ ہوشیار کا مسئلہ تھی وہ لسٹ سنبھال لیتا۔ اس نے گاڑی پیچھے ملازموں کے مکانات کے ساتھ

ڈریئر اور دوسری مشینری کے شے میں کھڑی کر دی تھی۔ میں نے سوویت سے کہا۔ ”بھر جائی اگر خشک نہ ہو تو میرے لیے ایک کپ چائے بنا دیں۔“

اس نے ہڈ پانی لچھ میں کہا۔ ”کیسی بات کرتے ہیں سوویت بھیا آپ نے تو ہمیں ان ڈاکوؤں سے بچایا ہے آپ کی سوا تو حرم ہے۔“

سوویت چائے بہت اچھی بناتی تھی اور اس کے پاس چئی بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ میں دس لاکھ فی بیٹھ گیا تھا۔ ہوشیار کمرے میں تھا سوویت مجھے چائے دے کر بولی۔ ”بھائی جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیتا اب یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”شکریہ رکھتا۔“ میں نے کہا وہ اندر چلی گئی تھی۔ باہر مگرچ چمک رک گئی تھی مگر موسم بارش والا ہی ہو رہا تھا۔ ابھی کبھی تیز ہوا کے خشک جھوٹے آتے تھے۔ میں باغیچے تک وہاں رہا مگر کمرے میں آیا اور سادی کو چاکر سو گیا۔ وہ کمرے سے ہی اس پاس نظر رکھ سکتی تھی۔ اس نے مجھے نو بجے جگایا۔ وہ خود منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر چکی تھی۔

”شولی اندر جائیں ناشتا کر لیں۔“
 ”کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟“

”نہیں ہوشیار بھی سو رہا ہے، میں اور سوویت باتیں کر رہے تھے۔“

میں نے سو ہانچ چمک کیے ان پر کھل نہیں آئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اب دسم اسی وقت کال کرتا جب وہ ہمارے لیے بندوبست کر لیتا یا پھر نہیں کر پاتا اور ہمیں کوئی تہا دل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ ایسے میری خواہش تھی کہ وہ انتظام کر لے اور ہم ہمیں سے سرحد پار کر جائیں۔ میں اور سادی جی جلدی یہاں سے چلے جاتے اندر سے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے منہ ہاتھ دھونے کی بجائے غسل کیا اور اپنے زخموں کا جائزہ لیا جو تقریباً بھر چکے تھے۔ ماتھے کے زخم پر کھڑک آگیا تھا جو شاید ایک دن میں اتر جاتا۔ ہاتھ زخم صاف ہو چکے تھے اور معمولی نشان رہ گئے تھے۔ رات میں نے جاتے رہنے کے خیال سے کم کہا یا تھا اس لیے اب بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتے میں دسکی اٹھ رہے اور پرائیوٹ تھے۔ ان کے ساتھ سویتی کا طول اور کٹی تھی۔ میں نے ناشتے سے پورا انصاف کیا، سوویت تازہ پرائیوٹ بنا رہی تھی۔ اسی دوران میں ہوشیار بھی آکر میرے ساتھ ناشتے میں شامل ہو گیا۔ اس نے کہا۔

"میں بکھر رہے تھے کیا تھا وہ بے سرحال بن چکے ہیں۔"
 "یہ تم نے اچھا نہیں کہا۔ اگر ان میں سے کسی کو ہوش
 آ گیا ہوتا تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔"
 "میں صرف نام کا ہوشیار نہیں ہوں۔" اس نے فر
 سے کہا۔ "پستول لے کر گیا تھا۔"
 "یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کو پچیس کے حوالے کرنے کا
 حوصلہ کتنے ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "خاص طور سے جب ان
 میں تمہارا بھائی بھی شامل ہے۔"
 وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "مشکل ہے اگر سنگیت نہ ہوتا تو
 میں ایسا کر گزرتا۔"

"دوسری صورت میں کیا یہ تمہیں بخش دیں گے؟ کل
 رات ان کے ساتھ جو ہول ہے۔"
 اس بار ہوشیار سنگھ کا رنگ اڑ گیا تھا اور نوالہ اس کے
 حلق میں پھنس گیا جسے اس نے جلدی سے لسی سے نیچے
 اتار دیا۔ وہ مشکل میں پڑ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ "جو سوچتا ہے
 جلدی سوچ لو، میرے پاس وقت نہیں ہے شاید ہمیں بھی جلد
 جانا پڑے۔"
 "میں سوچتا ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔
 تاہم یہ اس کے بس سے باہر تھا۔ میں ناشائستہ کر رہا تھا کہ
 سوبال دابھر مٹ ہوا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 "میں وائش دھم سے آتا ہوں۔"

وائش دھم میں آ کر میں نے کال ریسیو کی دوسری
 طرف اہم تھا۔ اس نے بلا نہیں کیا۔ "سیاہنہاس کا بندوبست
 کر لیں، جو جتے ایسے ہوں کہ جتنی اور نا اہل و زمین پر جیڑی
 سے حرکت کر سکیں اور سر سے ہاتھی تک سیاہ رنگ کے سوا
 کچھ نہ ہو۔"

"میں بندوبست کرتا ہوں۔"
 "یہ کام آج رات تک کر لیں اور ہاں ٹائٹ وچن
 بھی ہوں۔"

"وہ ہیں اور بہت اچھی کوالٹی کے ہیں۔"
 "بس تو کام بن گیا۔" دھم بولا۔ "تیسرے آپ کو یہ
 سوبال بھی ساتھ رکھنا ہو گا، وینڈر فری کے ساتھ رہنمائی کے
 لیے۔ اسے پوری طرح چارج ہونا چاہیے۔"
 "ہو جائے گا ورنہ میں کوئی بھی چار جنگ واک سینٹ
 لے لوں گا۔"

"آج رات تیار رہے گا میں شام کے وقت راپڈ
 کروں گا۔"

میں ہاتھ دھو کر آیا تو سادگی سر اپا انتظار بنی ہوئی تھی۔
 وہ بکھر گئی تھی کہ مجھے کال آئی تھی۔ میں نے آنکھ سے اشک دھو کیا
 کہ وہ ڈرامہ کرے اور ہوشیار سے کہا۔ "میں کچھ کپڑے
 چاہتا ہوں جہاں سے مل سکتے ہیں۔"
 "یہاں تو مشکل ہے۔" اس نے کہا۔ "اور فیروز
 پر جانا پڑے گا۔ وہاں کچھ دکانیں ہیں جہاں کپڑے مل
 جاتے ہیں۔"
 "بس تو ابھی چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ابھی۔" وہ شکر ہو گیا۔ "ان کو چھوڑ کر آؤ۔"
 "وہ آرام سے پڑے ہیں اور کوٹھری سے باہر نہیں
 آ سکتے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ہم ایک گھنٹے سے بھی کم
 وقت میں واپس آ جائیں گے۔"

میں نے اسے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں سادگی
 کے ساتھ کمرے میں آیا اور اسے مختصر اوسٹم سے ہونے والی
 گنگو سٹائل۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا تھا کہ ہم آج رات ہی
 واپس جا رہے تھے۔ "میں سامان لینے جا رہا ہوں تم ہوشیار
 رہنا اور کسی مشکل صورت میں حال میں پستول کے استعمال
 سے مت بچکنا۔"

"آپ نگر نہ کریں میں سب دیکھ لوں گی۔" اس نے
 اعتماد سے کہا۔

ہم فیروز پور کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ حقیقت
 وحب محلہ فیروز پور شہر میں ہی ہے لیکن آبادی کم ہونے کی
 وجہ سے الگ تھلک لگتا ہے۔ ہائی وے پاکستان والا پارا
 روڈ کی طرف جانے کی بجائے ہوشیار نے اندرونی سڑکوں
 کا انتخاب کیا اور ہم ہینر پولیس سے بڑھتی کیے فیروز پور
 کٹھن میٹ اپر پانچ گئے وہاں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا
 بازار تھا۔ میں نے ریڈی میڈ ہونڈی گاڑی کی ایک دکان
 کا انتخاب کیا۔ اس کے پاس ہر سائز کے ڈنڈے مردانہ ٹراؤڈر
 اور پودے آستین کی لی ٹرٹ موجود تھیں میں نے سیاہ رنگ
 میں دیکھنے کو کہا۔ دکاندار راجہ ان ہوا تھا کہ میں نے اس
 موسم میں پوری آستین کی لی ٹرٹ مانگی تھی۔ مگر اسے
 دکاندار کی سے مطلب تھا اس نے مجھے مطلوبہ سائز کے
 ٹراؤڈر اور ٹی شرٹس دے دیں۔ ایک میں نے اپنا سائز کالیا
 تھا اور ایک سادگی کالیا تھا۔ اس کے پاس کھل کر لیسی ہو جانے
 والی ٹوئیاں بھی تھیں۔ یہ سردی کا حال تھا جو فروخت سے بچ
 گیا تھا۔ میں نے وہ بھی لے لیں اور سیاہ ہی رنگ کے
 باریک دھانے لیے۔ اس کے بعد ہم ایک سٹرا اسٹور آئے

یہاں سے کیونسی کے کرپ ریسرول والے جوتے لیے۔
 ان کا رنگ گہرا تھا مگر انہیں سیاہ کیا جاسکتا تھا۔ یہ ساری
 خریداری مشکل سے آدھے گھنٹے میں ختم ہو گئی۔ پھر میں نے
 وہیں ایک سوہاگل مشاپ سے ایک ساواہ اسکرین مگر لکھی بیٹری
 والا سوہاگل لیا۔ یہ نیا تھا اس لیے قابلِ بھروسہ تھا۔ ہم کچنگ
 ایک کھینٹے میں واپس آ گئے تھے۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اس خریداری نے
 ہوشیار کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اس نے راستے میں دو تین بار مجھ
 سے پوچھا کہ میں نے یہ کپڑے اور جوتے کہاں لیے ہیں
 لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ واپس آتے ہی میں نے
 کمرے میں آکر سب سے پہلے ٹاپ چیک کیے۔ خاص طور
 سے جوتوں کے۔ اپنا سا کونو دکان پر دیکھ لیا تھا مگر سادی کا
 اندازے سے لایا تھا اس نے پہلے جوتے چیک کیے۔ یہ
 اسے معمولی سے پڑے تھے۔ اس نے کہا: "کوئی بات نہیں
 میں سونے پہن لوں گی۔"

پھر اس نے واش روم میں جا کر چست ٹراؤزر اور لی
 شرٹ پہنی اور چھینتی ہوئی باہر آئی۔ میں جسا تو وہ شرما
 گئی: "دلہات گگہ دی ہوں اس میں۔"

"مجھوتی ہے تمہارے میاں جی کا حکم ہے۔" میں
 نے سوہاگل کو چارج پر لگاتے ہوئے کہا: "وہ پھر میں ہم
 لے کر کریں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ فل ڈریس ریسرول ہوگی رات کے
 اصل ڈرائے کے لیے۔" میں نے کہا اور باہر نکل
 آیا۔ ہوشیار سنگھ لاؤنج میں تھا اور سوہیت سے کچھ کہہ رہا تھا
 مجھ کو کچھ کرچک دم چپ ہو گیا۔ میں نے پوچھا:

"ان کو چیک کیا؟"

"نہیں۔"

"آؤ دیکھ لیں۔" میں نے کہا اور ہم کٹری تک
 آئے۔ ہوشیار نے چاکھولا۔ دو تین ہوش میں تھے مگر ان
 کی صورتیں جھڑی ہوئی تھیں۔ تنگیت نے بھائی کو دیکھتے ہی
 وہی راگ الاپنا شروع کر دیا جس میں دھمکیاں بھی تھیں اور
 التجائیں بھی۔ ہر حقیقت وہ تین ہی خوفزدہ تھے۔ وہ جو
 کر کے آئے تھے انہیں اندازہ تھا کہ اب تک ہم واقف ہو
 چکے ہوں گے۔ میں نے کہا: "پولیس تمہیں ہانگوں کی طرح
 کاٹ کر رہی ہے۔ چارنگ اور ساڑھے تین گروتی لکھتی
 معمولی بات نہیں ہوتی ہے۔"

"تو خود کو میرا بھائی کہتا ہے اور یہاں چلا
 آیا۔" ہوشیار نے نظرت سے تنگیت کو دیکھا۔ "تیرے پیچھے
 پولیس آئی تو میں بھی بھاگا ہوں۔"

تنگیت کا سر جھک گیا تھا۔ میں نے کہا: "وہی تم
 تینوں میں قابل ہو کر بھائی چڑھاؤ لیکن ابھی ہم نے قیصل
 نہیں کیا ہے لیکن ہے نہیں چھوڑ دیں۔ اس لیے آرام سے
 بیٹھا اور کوئی ہنگامہ مت کرنا۔"

"ہم کوئی ہنگامہ نہیں کریں گے۔" سونے نے یقین
 دلایا۔

لے نے چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا: "پیشاب آ رہا
 ہے۔"

"یہیں کر لو۔" ہوشیار نے کہا۔ "کچھ دیر میں تمہیں
 کھانے کو لے جائے گا۔"

"شراب نہیں پی سکتی۔" سونے نے ہونٹوں پر زبان
 پھیری۔

"ابھی جس شام کھڑی گا۔" ہوشیار نے انکار کیا۔ ہم
 انہیں بند کر کے اندر آئے۔ اس بار میں ہوشیار کو نشست گاہ
 میں لے آیا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میری کچھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"میری ایک تجویز ہے۔" میں نے کہا۔ "انہیں ایک
 بار پھر شراب میں دوادے دو اور ان کی گاڑی میں داخل کر
 انہیں یہاں سے دور نہیں چھوڑ آؤ۔"

"دور جانا ممکن نہیں ہے۔ پولیس نے تاکے لگائے
 ہوں گے۔"

"تم پہلے خود جا کر دیکھ لو کہ پولیس کتنی سرگرم ہے اور
 انہیں چھوڑنے کا کام تار کی کے بعد کرنا۔"

اس نے فوراً کہا: "تم میری مدد کرو گے۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا: "ہاں میں تمہاری مدد
 کروں گا۔"

"ان کا اسلحہ اور دو رقم؟" ہوشیار کا لہجہ رقم کا ذکر
 کرتے ہوئے ارا تھل ہوا تھا۔

"وہ بھی ساتھ ہوگی۔ اس رقم کے چکر میں مت پڑو۔
 تم نے خود نہیں کیا وہ ساری ٹی اور سٹی گھنٹوں ہیں ان کے
 خبردار پولیس کے پاس ہوں گے اور تمہارے پاس سے ایک
 نوٹ بھی نکل آتا تو تم بھی ان کے ساتھ مارے جاؤ گے۔"
 ہوشیار غوراً سیدھا ہو گیا۔ اس نے صفائی پیش

کی۔ "میری نیت فریب نہیں ہے میں صرف بوجہ ہاتھ"۔
 "تم ابھی کھانے کے بعد نکلتا اور دیکھ کر آ جاتا اس
 کے بعد ہم لیٹ کر سوتے ہیں۔"

سوویت نے دال چاول بنائے تھے جس کے ساتھ
 چٹنیاں اور اچار تھا۔ ایک ڈھنگے میں سب لالہ کران تھیں
 کو پیچھا دیا گیا اور پھر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد
 ہوشیار اپنے مشین پر روانہ ہو گیا اس کے چلتے ہی میں
 سادی کو لے کر کمرے میں آ گیا۔ اگرچہ سوویت اس سے
 کپ شپ کرنا چاہتی تھی۔ ہم دونوں نے کپڑے بدلے اور
 سیاہ ٹراؤزر اور فل آئٹین کی ٹی شرٹ میں آ گئے۔ جوتے
 اندر براؤن کالر کے تھے اور تاریکی میں یہ سیاہ ہی نظر
 آتے۔ میں جوتے پہنا لایا تھا انکس سر پرچہ ہا کر دیکھا۔ یہ
 گردن تک آ رہی تھی۔ پھر ان میں آنکھوں والی جگہ ہلکے
 سے کاٹ کر سوراخ کیے اور آخر میں کمرے میں تاریکی
 کر کے ٹائٹ وین لگا کر ایک دوسرے کا ساتھ
 کیا۔ چست سیاہ لباس اور سر تا پا سیاہ ہونے کی وجہ سے
 رات کی تاریکی میں نظر آنے کا امکان کم تھا اور آج رات بھی
 بادل ہوتے تو کام اور آسان ہو جاتا۔ سادی نے جوتوں
 میں سونے پہن کر دیکھے اور وہ مطمئن تھی اب جوتے اسے
 لٹ تھے۔

ریپرسل سے فارغ ہو کر وہ باہر چلی گئی اور میں لیٹ
 کر آرام کرنے لگا مجھے ہوشیار کی دالیں کا انتظار تھا۔ وہ چار
 بجے واپس آیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں باہر نکلا تو وہ نہاد و حوگر
 تازہ دم ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس علاقے میں
 پولیس معمول کے مطابق ہے۔ "ہم آرام سے انکس دور تک
 چھوڑ کر آ سکتے ہیں۔"

"گڈ ف ہم تاریکی چھاتے ہی روانہ ہو جائیں
 گے۔" میں نے کہا۔

"میں انکس شرب دے آتا ہوں۔"
 "صرف دے کر نہیں آئی ہے انکس پہلے کی طرح
 پلانی ہے۔ ورنہ وہ اپنے گاڑی کا بھی دے سکتے ہیں۔"
 "سب تم بھی چلو۔"

ہم کو غریب تک آئے۔ اس پار بھی ہوشیار دیکھی شراب
 کی بوتل لایا تھا اور انکس اس پار بھی پہنچ چکی تھی۔ دیکھتے ہی
 دیکھتے وہاں ہو گئے تھے۔ ہوشیار ان کی گاڑی لانے چلا گیا۔
 میں اندر آیا۔ مجھے لب و لہجہ کی کال کا انتظار تھا۔ میں نے
 سوچ لیا تھا کہ جب تک اس کی کال نہیں آئی تو میں اسے

کال کروں گا۔ مگر پتے چھ بجے ہی اس کی کال آ گئی۔ اس
 نے کہا۔ "گوگل سیپ پر بلاؤ فلائیں۔"

میں نے لب ان کر کے اس پر گوگل سیپ پر سرحدی
 علاقہ نکالا اور دیکھ کر گاہ کہا۔ "کال لیا۔"
 "اس میں فیروز پور دوا پر دیکھیں۔ ورنہ اس
 کرنے کے لیے ایک بل ہے۔"
 "بالکل ہے۔"

"یہاں اور باغیچہ کی حد میں ہے لیکن اس سے بچے
 چند سو گز کے بعد یہ گھوم کر پاکستان کی حد میں چلا جاتا ہے۔"
 "ٹھیک۔"

"آپ نے اسی جگہ آنا ہے۔ یہاں سے کراسنگ
 کرتے ہی آپ خشب میں آ جائیں گے اور باغیچہ کی طرف
 سے محفوظ ہو جائیں گے۔"
 "رہنمائی کیسے ہوگی؟"

"آپ ٹائٹ وین استعمال کریں گے اور ہماری
 طرف سے ایک انفرادی تاریکی آپ کو گائیڈ کرے گی۔ لیکن
 خیال رہے یہاں اٹلانٹک نے کسی زمانے میں بارودی سرنگیں
 بچھا دی تھیں اور آپ ٹائٹ وین سے زمین دیکھ کر آئیں
 گے۔ یہاں بارودی سرنگ ہوگی وہاں سپاٹ مائٹ نظر آئے
 گے۔"

میں گرجند ہو گیا۔ "یہ خطرناک چیز ہے۔"
 "اس لیے میں نے ٹائٹ وین کا کہا ہے۔ کچھ ایسی
 صرف ایک لیڈ فٹورہہ جائے گا۔ آپ موبائل سے رابطے
 میں ہوں گے اور آپ کو گائیڈ کیا جائے گا۔"
 "تم لوگ علاقے کی گرائی کر رہے ہو گے؟"
 "بالکل۔ کسی کی آمد سے ہم پہلے ہی خبردار ہو جائیں
 گے۔"

"وقت کیا ہوگا؟"
 "رات بارہ کے بعد۔ آپ اشارہ ملے پھر روانہ ہوں
 گے لیکن ہارونک بالکل تیار رہے گا۔"
 "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دیکھنے کے کال کاٹ
 دی۔

موبائل چارج ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا پیڈ فوری
 آزما کر دیکھا وہ بہترین کام کر رہا تھا۔ میں نے سم اس
 میں غلطی کر دی۔ سوویت نے آج بھی چائے پر اہتمام کیا
 ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ہم نے ٹوائٹیں کو اندر بھیج دیا
 اور جیسے ہی تاریکی ہوئی اسی ہادی ان تینوں کو لا کر کار

کی کچلی نشست پر ڈھیر کر کے ان پر چادر ڈال دی تھی۔ اسکو اور دم والے بیک ڈکی میں رکھے۔ میرے مشورے پر ہوشیار نے گاڑی کی این تھام بچیوں کو صاف کر دیا تھا جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے تھے۔ اس نے اس گاڑی کی ڈرائیونگ سنبھالی اور میں ہوشیار کی جیب میں اس کے پیچھے تھا۔ یہ سب کرتے ہوئے میرے دل میں غم نہ تھا کہ کہیں کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں اور ہماری ردا کی کمپانی میں نہ جائے۔ اُن ہونٹیں میرے آس پاس علی رہتی تھیں۔

مگر سب آسانی سے ہو گیا۔ ان تینوں کو گاڑی سمیت لدھیانہ سے کوئی چالیس کلومیٹر پہلے سڑک کے ساتھ چھوڑا۔ ان پر سے چادر ہٹا دی تھی اور سنگیت کو اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ دسکی شراب کی خانی بول گاڑی میں ڈال دی اور اس کے دونوں دیکھنے دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ اُمید تھی کہ پولیس جلد پا کر برہنہ تک پہنچ جائے گی۔ ہم نو بجے تک وہاں بیٹھ گئے تھے۔ ہوشیار کسی قدر غلامند مگر مطمئن بھی تھا میں نے اسے قتل دی کہ پولیس ڈاکوؤں کی کوا اس پر توجہ نہیں دے گی جب کہ اسے لوٹ بکا مال بھی مل جائے گا۔ ان تینوں کی بچت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بھالسی سے فک گئے جب بھی ساری عمر جیل میں گزرے گی۔ لہذا اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کا کھانا دہرے سے پور ہلکا کھا لیا تھا۔ پھر چھکن اور خیر کا بھانہ کر کے کمرے میں آ گئے۔ خور ہوشیار بھی تنکا ہوا تھا۔ وہ سوویت سمیت اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

رات دس بجے تک ایک بار پھر بادل آ گئے مگر آج گرج چمک نہیں ہو رہی تھی۔ یہ انہی بات تھی ورنہ اس میں نائنٹ وین کا استہان بہت مشکل ہو جاتا۔ گیارہ بجے ہم تیار ہونے لگے اور بارہ بجے تک ہم بالکل تیار تھے۔ بارہ بج کر پانچ منٹ پر دس کی کال آئی۔

"کل جائیں اور پچائٹ پر پہنچ کر مجھے اشارہ دیجئے گا میں کال کروں گا۔"

"چلو۔" میں نے سادی سے کہا اور ہم خاموشی سے مکان سے نکل آئے۔ مٹی صے سے نکلنے کی بجائے ہم گورم کر کیتوں وٹیل طرف آئے۔ نائنٹ وین کی وجہ سے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ہمیں چار کلومیٹر تک پیدل چلنا تھا۔ مجھے سادی کی فکر تھی مگر اس نے کہا۔ "میں چل لوں گی۔ ویسے بھی چلنا ہے نہ بھاگنا تو نہیں ہے۔"

"تھکن ہے بھاگنا ہے۔"

"تو بھاگ بھی لوں گی۔"

ہم ساڑھے بارہ بجے سرحد کے پاس تھے۔ یہاں اڑھیس سائیڈ پر انہوں نے ایک چھکنے والی خلی لائن بنارکھی تھی تاکہ مقامی لوگ سرحد سے ہوشیار رہیں اور فلسطی سے بھی پار نہ جائیں۔ ہم حسین والا ہارڈوروڈ گراں کر کے یہاں تک آئے تھے۔ علاقہ صاف اور خالی تھا۔ یہاں نہ تو آبادی تھی اور نہ کھیت تھے۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں نے دسیم کو مس کالی دی اور اس نے مجھے کال کر لی۔ "ہم پہنچ گئے ہیں۔"

"رائٹ آپ دونوں نظر میں ہیں۔ کراس کر کے اس طرف آئیں اور دریا کے کنارے تک بہت احتیاط سے زمین چیک کر کے چلیں۔ سادی آپ کے پیچھے رہے۔ دریا پار دیکھیں روشنی نظر آرہی ہے۔"

دریا پار سرخ روشنی پار پار چل بھر رہی تھی۔ "ہاں نظر آرہی ہے۔" میں نے کہا اور سادی کو ہدایت کی۔ "تم ٹھیک میرے نقش قدم پر چلو۔ اس قدم سے پیچھے نہ چلو گی۔"

"وہ کیوں؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔

"یہاں بارہوی سرگرم ہیں۔ زمین کو غور سے دیکھتی رہنا کوئی سیٹ الگ سے دکھائی دے تو سمجھ لیں یہ بارہوی سرگرم ہے۔"

سادی نے سر ہلایا۔ میں جھکے جھکے آگے بڑھا۔ دسیم نے کہا۔ "سو گڑ کا گھڑا خطرناک ہے وہ پا میں اتر کر پائیں طرف مڑ جائیے گا پانی ہے لیکن زیادہ نہیں ہے۔"

اس طرح جھکے جھکے چلتا آسان نہیں تھا میں نظر ہمارے زمین بھی دیکھ رہا تھا۔ اپنے آس پاس کی گرائی میں نے دسیم کے سپرد کر دی تھی جو یقیناً سرحد پار سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے جیسے دریا کی احضان پاس آ رہی تھی میرے دل کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ سادی ٹھیک میرے پیچھے تھی اور اس کے لیے اس طرح جھک کر چلنا زیادہ مشکل کام تھا۔ بالآخر ہم دریا کی احضان تک پہنچ گئے۔ دسیم نے قہقہہ پی کی۔ "آپ ڈھلان پر ہیں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ ہم نے کسی دشواری کے بغیر ایک طرف سے سرحد پار کر لی تھی۔ اسی لمحے میرا ہاتھ کسی چیز پر گیا اور کلک کی آواز آئی تھی۔ میرا تیز رفتار دماغ سے دھڑکن والی غم گیا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قزنب

(آفاق حیدر آباد کا جواب)

سرسن امتیاز..... حیدر آباد

عید کے دن اداس ہے گھر میں
لیک یہ غریب روٹی ہے
ہاں کہ کچھ یہ پوچھ بیٹا تھا
عید بنگوں ہی میں کیوں ہوئی ہے
(ذیشان احمدی لڑکوں کا جواب)

ماوراء..... خیر کا حیدر آباد

نکان منزل جان لے لے نہ لے
رہے کی جڑ ہے یہ زوئی ہتھوڑا
(عارف ممتاز مہتمم لڑکوں کا جواب)

حکیم سید محمد رضا شاہ..... دوکڑی سورا

منوت کی آخری لہکی کو دریا غور سے سن
زندگی بھر کا غلام اسی آواز میں ہے
(امجد حبیب رولپنڈی کا جواب)

نذیر حسن شاہی..... لاہور

یہ دہائی کیوں یہ فتنائے خود کشی کیوں
نویں صبح ہے قلب مدام کی حرکتیں
نویں صبح دین..... جہنم

یہ حادثہ سر ساحل ملا گیا سب کو
ہنود میں ڈوبنے والوں کے ہاتھ بگاڑا
اتحاد حسین..... سیٹ آباد

یہ سوچ کر ہلوں میں پھیلائی ہوں آلو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں
گارسہاکی..... کراچی

یہ زندگی تو کسی اور کی جیسی ہوئی امت ہے
ہم تو صرف سالوں کی دم ادا کرتے ہیں
(اقم لاہور کا جواب)

مظہر علی خان..... لاہور

الجھا ہے پاؤں یار کا دلف دماغ میں
لو آپ اپنے دام میں سیار آگیا

ماہنامہ سرگزشت

(داسین مشتاق لاہور کا جواب)

ایم افضل کمرل..... ننگانہ صاحب

تیری تلاش میں میرا وجود بھی نہ رہا
مٹا مٹی میری ہمت کو تھہری آرزو
(عزیز الدین لاڑکانہ کا جواب)

عسیر الحسن..... پشور

ان کا جنگ تھا ان کا قانون تھا
جس طرح جی میں آیا جلتے رہے
حسین احسان..... فیصل آباد

آکسی خوف میں اتریں کسی ظلم کو اور میں
کسی اڑے اڑے کے میں سنا نہیں خود کو
انجرام احمد..... کوٹ سہیل

اس عمر میں خوش فہمیاں ابھی نہیں ہوتیں
اس عمر کو دھول کے حوالے نہیں کرنا
کاشی شرف..... مصروف حیدر

اپنے حالات سے میں صلح تو کر لوں لیکن
مجھ میں روپوش جو اک شخص ہے مر جائے گا
(نور الدین اسفند پوری کا جواب)

ہدین اختر..... حاصل پور

یہ اور بات کہ دن کی اجازت میں
تیرا خیال گل ز دکھائی دیتا ہے
نصیب خان..... کوٹ

یہ لہری تو ہے اپنی زمین کا ہم پر
خیر میں ہوتا نہیں ہے اگر شر کوئی
انجرام احمد..... کوٹ آد

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہیں کون ہے اپنا
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن
حسین احمد..... خاں پور

یوں تو چہرے ہزار تھے لیکن
ایک چہرے کو آگیا دکھنا
(اقم ریاض لاہور کا جواب)

اگست 2004ء

203

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

گزرہ..... چادر
زندگی جب اسی مشکل سے گزر گئی غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
(محمد زبیر علی خان کا جواب)

انجم سہیل..... لاڈکانہ
ان کے سروں پہ کاش سلامت رہیں سدا
ملت کی فتنوں کی رداؤں کی خیر ہو
نیا دکھو کھر..... شہنشاہ

اس کے قریب جاؤں
اس تک نہ پہنچی پاؤں
نظام الہیہ..... لاہور

آہیں جو آنکھ میں صورت دل وہیں بن گئی
جو کہ اچھا نہیں وہ عمر بھر اچھا لگا
دریاب خان..... کراچی
ایسے جیون میں نہیں اپنے تصور میں سی سی
آئے جانے کی اجازت ہی مجھے دے جانا
(جبر صوفی فیصل آباد کا جواب)

ادب خان..... ہنگ صدر
قبل حسین روز کا معمول بن گیا
وہا میں آج بھی ہے حکومت بڑے کی
(شیم اعلیٰ تھان کا جواب)

مرزا ادلی بیگ..... حیدرآباد
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دعا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے
(اکرم علی بلوچ پور خان کا جواب)

فکیر ہرمن..... کھانہ
میرے لیے کی محکم میں تیرا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جہاں کی گزری آگئی دوست
(راء حبیب الرحمن لاہور کا جواب)

اسامیل ربوہ..... مظفر گڑھ
یہ بھی کیا امن کا معیار بنا رکھا ہے
شاخ رجن کو گود بنا رکھا ہے
مدللہ نذیر..... سلطان

پادوں کے کاندھ پر گھوڑوں اکھوں سے میں دل پر
شعر و ادب کی دنیا دہن کون سی دیکھی جہاں ہے

ماہنامہ سرگشت

اصولِ ارخان..... کراچی
یہ لوگ کراچی کے کیا ہیں دیوانے ہیں غرور دانے ہیں
کیا ہوش سے بیگانے ہیں سیدھے ہیں ماہانے ہیں
(مرزا ادلی بیگ حیدرآباد کا جواب)

مہر باز خان..... کوئٹہ
وہا شب ہے جو کہ ظہر گئی
مرے بے ہر تھے کیا خیر
فہیم ہونو..... لاڈکانہ

”جن کے ہوتے ہیں خود شیدائیں میں
انہیں کہیں سے بلاؤں بڑا اندھیرا ہے
(نوشین عارف فیصل آباد کا جواب)

لطیف محمد عزیز مٹے..... لندن
اوا کھوں چا کھوں یا اکلہا دوا کھوں
تیری ہر مسکراہٹ مجھ سے پچانی نہیں جہاں
(لطیف عزیز مٹے لندن کا جواب)

حیدر حسین..... راولپنڈی
ہوتا عذاب تھا بھی رونا عذاب تھا
کیا پرہیز تیرے دوستو ہوتا عذاب تھا
نالیہ نوشین..... کوئٹہ

ہو کے بھرتی پہ مرثیہ ہوا
ایک جنت ہے بے خبر ہوا
(نوبت گل کا جواب)

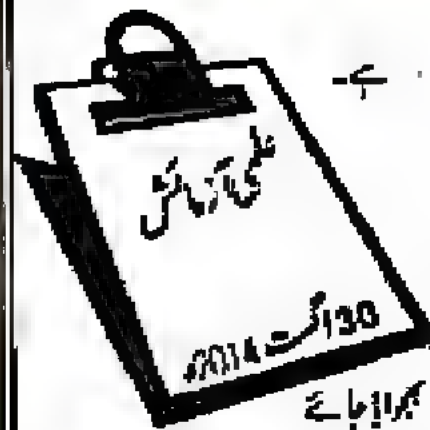
طالب حسین عظمیٰ..... سلطان
اک قیامت ہے کہ ہر شام گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں نقش میری تمہاں کا
(شعیب عزیز مٹے لندن کا جواب)

میر تقی جٹ..... حافظ آباد
وہ سحر جس سے لہذا ہے شہستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی ازاں سے پیدا

بیت بازی کا اصول ہے جس طرف پر شعر غم
ہوتا ہے اسی نقطہ سے شروع ہونے والا شعر ارسال
کریں۔ اکثر کارٹیں اس اصول کو نظر انداز کر رہے
ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تک کر دیے جاتے ہیں۔ اس
اصول کو نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

اگست 2014ء

204



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سائنس □ ہائیڈرو □ مرکز نش □ بھرا جائے
کسی ایک پر [X] کیجیے۔

30 اگست 2014ء

گزشتہ شمارے کے مطابق دریافت ہوئے 30 اگست 2014ء تک علمی آزمائش 932 کسٹمرز 74200 پارسل آریں



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سائنس ڈائجسٹ
ماہنامہ ہائیڈرو ڈائجسٹ

کے حصول میں وقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے کب کب سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت لیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
شعبہ سائنس 0301-2454188

بہشتیہ سوسائٹی پبلی کیشنز
35802552-35326783-35804200
فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63، فیز 11، سائنس ڈائجسٹ، قادیان، کوئٹہ، اسلام آباد
فون 35893313 فیکس 35802551

اگست 2014ء



قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے ایک نیا سلسلہ "بیت بازی"
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! متحرک کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) **66**

مقابلہ بیت بازی

پست میں نمبر 982 کراچی 74200

ماہنامہ مرکز نش

2015

علمی آزمائش 105

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا سفردہ انتظامیہ

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے میں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، مسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ ہاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک برسال ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک ملی سرگزشت" کے عنوان سے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرح مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ غریب شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیں اور پھر سوچیں کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوہن پر درج کر کے اس طرح پر دیا گیا کچھ کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اگست 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے منتظر قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کا سوال

قرآن پاک میں نمر سوز کے قریب کے ایک سمندر کا ذکر سورہ اعراف آیت 16، 5، 4، 2، 1، 4 میں آیا ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے پیام حیرت انگیز تھا مگر آج سائنس کتنی ہے کہ دنیا بھر کے سمندر میں سب سے ٹھہرا ہوا پانی یہی ہے اور اس وجہ سے اس کا نام بھی ہونا چاہیے تھا۔ قرآن پاک میں اس سمندر کے صے کو کس نام سے یاد کیا گیا ہے؟ اور درحقیقت نام ہے۔۔۔۔۔؟

علمی آزمائش 103 کا جواب

دریائے فرات کے مغربی کنارے واقع ایک مشہور شہر کوئٹہ ہے جسے قاری کی فتح کے بعد حضرت مرث کے دور میں سپاہیوں نے آباد کیا تھا تاکہ فارس کے باقی اگر کبھی حملہ کریں تو انہیں روکا جائے۔ اس شہر کے قریب کبھی شہر بائلی ہوا کرتا تھا جو کھنڈر میں تبدیل ہو کر زمین بوس ہو چکا تھا۔ ابو العباس نے 750 ہجری میں اسے اپنا دارالکھلافہ بنایا۔ اس دوران میں یہ شہر بہت ہار دھن تھا اور تجارتی و مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ اس شہر کو علمی مرکز ہونے کا بھی فخر حاصل ہے کہ یہاں کی رسم الخط نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ اس شہر کوئٹہ کو کئی اور وجہ سے بھی شہرت حاصل ہے۔

انعام یافتگان

1۔ نسیم جو کھنڈ، ہالہ، 2۔ مذاہد شیرازی، ملتان، 3۔ افرطی، صوفائی، کراچی

4۔ کنول، حیدرآباد، 5۔ بی بی شیریں خان، کوئٹہ

ان کا رہنمائی کے علاوہ جن لوگوں کے جہاد میں حصہ لیا۔

کراچی سے عمران جوانی، محمد احمد (سلمان قادری طبر)، سید عزیز اللہ بن، علیہ نورین، فرید اللہ بن بلوچ، شہال
 قیوم، بکلیل، انجم، اشرف، سامی، حمید اختر، قمر عباس، کوکب قادری، ڈاکٹر یمن ظفر اسماعیل، رضوان احمد ہاشمی نصرت
 حسین، اسلام آباد سے فتح دین، ناصر اختر ناصر، ممتاز الدین فتح، عمار انصاری، نسیم بٹ، لہمان شاہ، انور یوسف زئی۔
 مظفر گڑھ سے خاقان خان، جان محمد عباسی، زاہد سوگی، احمد توحید، ساجد انور، وجاہت مرزا، اسد علی، عبدال رؤف
 کھتری، رافق قریشی، عثمان عثمانی، شاہ خان، میر جاوید میر، ظفر انجم، یحیٰی عثمانی، سعید حیدر، انجم پرویز، اجتہاد علی،
 رابعہ اختر، پرویز بھٹو، نسیم اشرف، ملک محمد انجیل، لاہور سے امروہہ اسلم ملک، حفیظ علی خٹن، امروہہ اختر، ثاقب نسیم،
 محمد نجو، محمد احسن، نواز کبیر، عبدالخالق چوہان، چوہدری رب نواز، زینت جہاں، کائنات مرزا، توسیف بابرہوی،
 منہرین اختر، بشری خالق، نیاز چوہان، یاسمین فرحت، تونسہ شریف سے میاں جمال محمود، احسان شہزاد، سلطان سے محمد
 یحیٰی شفیق، گل باز خان، خالد آفریدی، ذکیہ حسین غنیہ، جمال، رخسانہ یاسمین، نور بیہ اختر، الطاف کمر، حسن محمود۔
 بہاولپور سے سید محمد شفیق (شاہد)، نواز علی، مہوش خان، جعفر انوار، بہاولنگر سے منیراں نسیم، الطیر احمد لاشاری، افضل
 ایڈ، فرید عباسی، محمد ارشد ظفر حسین۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی، ملک، انعام اللہ، ماورخ، نسیم امتیاز انصاری، نور باب
 فرحان، آفرید مظہر، موسیٰ خان، مشتاق احمد، نسیم قریشی، فصاحت اللہ، نورین ایاز، کوئٹہ سے عبدالقادر، شیخ اللہ بن،
 نواز بلوچ، قمر اللہ بن لاشاری، سید محمد رضا کاگی، میر پر خاں سے، خود یز اختر (سٹالائٹ ٹاؤن)، عقیل احمد،
 سندھ سے منصور، شیخ الہادی، حمایت اللہ، آغا مظہر، ڈیٹان قمر لہاش، مرزا اسحاق بیگ، مرزا ہادی بیگ، سندھ و آدم سے
 انعام احسن، ناصر زید پوری، انصار حسین، احمد علی افتخار، لعل آباد سے امتیاز حسن، حمزہ اسلم، میر چود آزاد کشمیر
 سے نیاز بھٹ، افتخار احمد، محمود نیاز، شیخ الہادی، محمد توقیر، ارشد حسین، نسیم انجم، ناصر حسین، خان محمد خان، قاسم خان، قمر
 حسن، نظام حسین، ناز خان، ڈوب دیشین سے، کئی چنگیزی نصرت اللہ، محمد سائین، وردانہ قمر، احباب خان۔
 میر پور آزاد کشمیر سے محمد ہارون۔ خیر پور میری سے سید تقی زیدی، گل لیاقت۔ سکھر سے ارشد ولی محمد، بشری اصغر، مسکان
 علی، سلمان منگریج، شبنم پورہ سے چوہدری اللہ دتہ، کائنات علی، سفیر احمد، سید ساحل۔ گجرات سے نھان سعید، جہلم
 سے محمد عوید، کمال اللہ خان، کاشف خان، وردو جول، سعید احمد، اسلام آباد سے انور یوسف زئی، محمد ہارون، اسما
 حیدر، فیروز رحمانی۔ سوئی لیرہ کٹی سے خاقان احمد، حمایت کمر۔ کوٹ ادو سے طیب احمد، صالح احمد، دالپنڈی سے
 ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، جویریہ سلیم احمد، محمد سعید اقبال، حبیب الرحمن، کوہاٹ کینٹ سے ڈاکٹر بڑ شاہ،
 احمد علی، نیاز خان۔ ہاڑی سے منشی محمد مزید، منشی خورشید احمد کنول (لڈن) محمد اقبال راے (پور پالہ)۔ ہاشم پور
 سے منصور احمد، محمد علی، زینت جو کھید۔ مظفر گڑھ رانا محمد سجاد (نواں شہر) اور باب رضا، منہا لیب احمد، قاضی یاسین۔
 انجم سے ملک جاوید محمد خان سرکائی (برہ زئی)۔ ڈی جی خان سے سجاد احمد، جے ایس، جمیل چیمبر، سہیل گل، شمس
 اصغر۔ ڈی آئی خان سے محمد اکبر، محمد سجاد، ساجد علی، عابد علی بدخشاہ، گل۔ بدانا ظفر اقبال بلوچین، قاضی سلیم خان، عباس
 اختر، ناصر حسین، نسیم عباس، نصرت اللہ، لہ سے نسیم عباس، نصرت اللہ، احمد خان، نسیم خان، نسیم اللہ، نیاز خان۔ نگار اللہ روز،
 اقبال حسن، نسیم آزاد، ڈیٹان حیدر، بہادر علی۔ بہاولنگر سے سید حسن، قاضی اختر، نسیم زہیر، نیاز احمد، قطب اللہ بن
 احمد۔ سرگودھا سے ظفر اقبال جاوید (سلوٹوئی) الراس سلطان، شاہد سلطان۔ ساہیوال سے محمد افضل، مظہر حسین
 قادری، طاہر علی، انعام اللہ، سلیم آقا۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، اشرف خان، دودھ خان۔ جنگ سے عطا
 المصطفیٰ، نذیر علی، سعدان رفیع، کاظم علی سید۔ میانوالی سے نواز خالق (جیسی ٹیل) سلیم سید محمد رضا شاہ (نورنگہ روکھڑی)۔
 ننڈا جہان محمد سے حمزہ اسلم، ملہ ملک سے خود یز حسین، فصاحت عثمان۔
 ممالک غیر سے اشرف سلطان (بیڈ فورڈ انگلیش) سلمان فردوس۔ فیصل صدیقی۔ زونی کشمیری (الحسن) ساجد علی
 پاکستانی (رام) امیر صادق، سلمان اشرف، کبیر زینب، اشرف زیدی (شارجہ) صہبہ وقار (لوکیہ جاپان) سعادت علی
 خان (مہرگ) سلطان منگریج (اوپاما) دکیل قریشی (ادمان)۔

آخری راستہ

محترمہ علما و رسول!

السلام علیکم!

امید تو یہی ہے بخیریت ہوں گی۔ بھائی ہاں برادری سببم رائج ہے اور اس سببم سے زیادہ مردوں کا غصہ، انا کا سوال۔ اس کا حکم بارہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میں سناہ بھی ہیں کچھ ہوا ہے۔ اگر ہوسکے تو میری اس روداد کو شائع کر دیں تاکہ لوگوں کو ہوش آئے کہ غصے کی وجہ سے کس طرح عورتوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

رہا ب

(خند و آباد)

جاتے کیونکہ برسوں پہلے ہاں کا خالو سے کسی بات پر جھگڑا ہوا اور آج تک ان کے درمیان بات چیت بند تھی۔ خالو بھی طارے اس نہیں آتے تھے اسی طرح صائم بھی نہیں آتے تھے البتہ علیقا خالو کے ساتھ دو بار آئی تھی اور میں تو اسی کے ساتھ بہت بار خالو کے ہاں جا چکی تھی۔ خالو کے ڈی اے میں آفسر تھے۔ ان کی رہائش گلشن اقبال کے ایک خوبصورت علاقے میں تھی۔ یہاں درمیانے سائز کے پتھر ہیں اور صاف ستمرا پوش علاقہ ہے۔ خالو کا اپنا بنگلا ہے جو پارک کے سامنے ہے۔ یہاں بچے کھتے اور مہذب لوگ رہتے ہیں۔ جب بھی ہم یہاں آتے تو عام طور سے رات کو ٹھیکے اور ہوا کھانے کے لیے پارک چلے جاتے تھے۔

میں نے ایک بار اسی سے پوچھا کہ ہاں اور خالو میں کیا اختلاف ہے؟ انی نے بتایا کہ غلطی ہاں کی تھی۔ اصل میں بابا بہت غصیلے اور سخت طبیعت کے مالک ہیں۔ انی سے محبت کی شادی کی، اس کے باوجود بعض اوقات ان پر بھی غصہ ہو جاتے ہیں اور ایسے میں جو مہ میں آئے بولتے جاتے ہیں۔ انی ان کی فطرت سمجھتی ہیں اس لیے خاموش رہتی ہیں۔ جب بابا کا خصا تر جاتا ہے تو وہ انی کو مٹا لیتے ہیں لیکن وہ سبھی نہیں مانتے۔ معافی مانگنا یا شرمندہ ہونا ان کی

جیسے ہی کوئی کراچی سے نکلے گا وہ طبیعت چھانے لگی تھی۔ میرا دل سر جھا گیا تھا اور دل چاہ رہا تھا کہ ہمیں کوئی سے آ کر جاؤں۔ شاید براہ میں انی نہ ہوں تو میں بھی کوئی مگر لیا ممکن نہیں تھا۔ ہم کوئی سے حیدر آباد جا رہے تھے۔ جہاں ایک متوسط علاقے میں ہماری رہائش ہے۔ گھر میں میرے علاوہ انی بابا اور میرے دو بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ میں اور انی کراچی میں خالو کے گھر آئے ہوئے تھے۔ حیدر آباد سے ہاں نے ہمیں کوئی میں شہر دیا اور یہاں کراچی میں میرے خالو بس اڈے پر موجود تھے۔ ہمیں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار کراچی آ چکی تھی لیکن اس بار کا مزہ ہی الگ تھا۔ خالو کے دو بچے ہیں۔ بڑے صائم ہیں جو چار سال سے آسٹریلیا میں ہوتے ہیں اور وہاں پڑھ رہے ہیں اور ان کو وہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔ ان سے پھوٹی علیقا میرے برابر ہی ہے۔ ہم دونوں نے اتفاق سے اسی سال گریجویٹیشن کے سچے نو بچے تھے۔

میں قانع تھی اس لیے انی کے ساتھ کراچی آ گئی۔ انی کو انی بھن سے بہت محبت ہے اور وہ سبھی میں تین چہرہ ہار لازمی ان سے ملے آتی ہیں۔ خالو بہت سالوں بعد ہمارے ہاں آئی ہیں۔ بابا اور بھائی خالو کے گھر بالکل نہیں

دور تک غمگین تھی۔ آپس میں لڑائی جھگڑے تھے اور عورت کی بکائی
 اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنے ہارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھیں۔
 تعلیم اور پسند کی شادی کا حق نہیں تھا۔ خاص طور سے پسند کی
 شادی کا حق تو بالکل نہیں تھا۔ اگر کوئی لڑکی یہ حق استعمال کرتا
 چاہتی تو اسے دلہن کے سر پر جڑے کی بجائے سفید کفن نصیب
 ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ رہنے والے ایسا سوچ رکھتے تھے تو ان
 لوگوں کے ہارے میں سوچیں جو اندرون صوبہ آباد تھے۔ یہاں
 بھی لڑکیوں کو پڑھانے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اس میں سے ایک
 ہی لڑکی اسکول جاتی تھی اور کالج جانا تو بہت ہی بڑی بات تھی
 جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب میں اسکول کے بعد کالج جانے لگی
 تو اس پر بہت ہاتھیں ہوئی تھیں۔ بابا تو ایک ہار فیصلہ کر کے
 خاموش ہو گئے تھے مگر بھائی بھنے والوں کی باتوں پر مشتعل
 ہو جاتے اور بابا اسی سے کہتے کہ مجھے کالج سے نکال کر گھر

مرشت میں نہیں ہے۔ اصل میں بابا کا تعلق اندرون صوبہ
 کے ایک قبائلی علاقے سے ہے وہاں کے رسم و رواج اور
 خاص طور سے عورتوں کے حالات اتنے سخت ہیں کہ میں نے
 سن کر ہلکا سا شکر ادا کیا کہ ہم حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ اگرچہ
 یہاں بھی میرا دم گھٹتا تھا مگر ہم یہاں باہر تو نکل سکتے تھے۔
 میں نے بابا کے نہ چاہنے کے باوجود کالج سے گریجویشن کیا
 تھا۔ اس کی اجازت مجھے امی نے دلہن کی اور نہ بابا اور ان سے
 بھی زیادہ بھائی تو اس کے بالکل حق میں نہیں تھے۔ ایک ہار
 وہ خالو کے سامنے امی کو سنا رہے تھے اور خالو نے وہ میاں
 میں مداخلت کر دی اور بابا اس پر ان سے ٹکر پڑے۔

میرے دلوں میں بڑے بھائی اور اور منور پڑھے لکھے
 ہیں۔ انہوں نے بھی گریجویشن کیا ہے مگر ان کی ذہنیت بابا
 سے بھی زیادہ قبائلی ہے۔ بابا تو سترہ سال کے تھے جب
 کراچی آئے اور انہوں نے وہیں کالج
 میں تعلیم حاصل کی۔ پھر جاب کرنے
 لگے تھے۔ وہ ہیں امی سے ملاقات ہوئی۔
 دلوں میں پسندیدگی ہوئی اور بابا نے
 امی کے والدین سے رشتے کی بات کی۔
 انہوں نے صاف قادیا تھا کہ ان میں
 ذات برادری سے ہار وشت نہیں ہوتا ہے
 اس لیے ان کی طرف سے کوئی نہیں آئے
 گا۔ اگر وہ اسکیلے انہیں رشتہ دینا چاہیں تو
 یہ شادی ممکن ہے۔ امی کے والدین
 نے امی کی پسند و بھی اور انہوں نے بابا
 کو ہاں کر دی۔ بابا سادگی سے برائت
 لے کر آئے اور امی کو حیدر آباد چلے
 گئے۔ دو سال بعد وہ حیدر آباد چلے
 گئے۔ وہاں انہوں نے آنکھیں شاپ کا
 کاروبار کر لیا تھا۔ چند سال میں کاروبار
 جم گیا۔ بابا چاہتے تو حیدر آباد کے کسی
 اچھے علاقے میں مکان لے سکتے تھے مگر
 اس جگہ ہماری برادری کے لوگ آباد تھے
 اس لیے بابا نے سکھ رہے کا فیصلہ کیا۔
 حیدر آباد کے اس محلے میں آنے کے
 بعد امی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ بابا کی
 برادری کس قسم کی ہے۔ وہ آج کے ہدیہ دور
 میں بھی وہی قبائلی سوچ رکھتے تھے۔ جہالت



سے ڈرتے تھے اور جب بابا کو قصہ آتا تو وہ گھر سے نکھک جاتے۔

گھر میں اورائی کہاں جاتیں؟ ہم گھر میں ہوتے تھے اور بابا کا سارا قصہ ہم پر اترتا تھا۔ ہم خاموشی سے سننے پر مجبور تھے۔ امی کا تعلق کیونکہ برادری سے نہیں تھا اس لیے بابا کا خاندان تو ایک طرف رہا برادری کی عورتیں بھی امی سے بہت کم ملتی تھیں۔ کچھ کچھ سالوں میں چند ایک گھڑوں میں ہی امی کا آنا جانا ہوا تھا اور وہاں بھی دو گنی دونوں میں ایک آدھ بار جاتی تھیں۔ اسی طرح یہ عورتیں بھی بہت کم ہمارے ہاں آتی تھیں۔ جب میں چھوٹی تھی تب میری چند ایک سہیلیاں تھیں۔ لیکن جب دس سال کی ہوئی تو میرے بلاوجہ گھر سے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔

دس سال کی عمر کے بعد میں باؤ تو اسکول جاتی تھی یا پھر امی اور بابا کے ساتھ کبھی نکلتی تھی۔ خاص طور سے محلے میں امی کے ساتھ ہی دلتی جاتی تھی اور تب ہی مجھے اپنی عمر کی لڑکیوں سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ مگر جیسے جیسے میں آگے بڑھتی گئی تو ان لڑکیوں سے میرا رکن بننے لگا۔ ان میں سے کوئی بھی تعلیم یافتہ نہیں تھی صرف ایک لڑکی نے چار معائنات تک پڑھا تھا اور دس کے بعد اسے گھر بٹھا لیا گیا تھا۔ وہ بھی خوش تھی کیونکہ پڑھنا اسے پسند ہی نہیں تھا۔ مجھے پڑھنا پسند تھا۔ صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ میں اس کے علاوہ بھی پڑھنا چاہتی تھی مگر ہمارے گھر میں ایسی کسی چیز کی حق سے ممانعت تھی۔ حد یہ کہ بابا بچوں کے رسائل کے قائل بھی نہیں تھے۔ اس لیے میں اپنا شوق اسکول میں پورا کر لیتی تھی۔ وہاں لڑکیوں کے پاس رسائل اور کتب ہوتی تھیں۔ آدمی چھٹی میں جب دوسری لڑکیاں کھانے پہنچے اور کھینے یا گہوں میں مصروف ہوتی تھیں تو میں کلاسی میں بیٹھی کوئی شے کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ رہی ہوتی تھی۔

پڑھنے میں تیز تھی، میں نے صرف ساڑھے چودہ سال کی عمر میں بھڑک کا امتحان دیا اور جب میرا وزٹ آتا تو میں اس وقت چودہ کی بھی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے امتحان میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کی جس کی مجھے بھی امید نہیں تھی۔ میں نے حیدر آباد بورڈ میں ساتویں اور لڑکیوں میں چھٹی پوزیشن لی تھی۔ اس پر میرے اسکول والوں نے ایک خصوصی تقریب منعقد کی تھی اور اس میں ایک صوفائی ویزیر کو بھی بلایا تھا۔ بابا صرف دربار کائن کر چلے گئے ورنہ ان کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دل پر نے مجھے انعام اور شیلڈ کے

بخائیں۔

جب میں چھوٹی تھی تب بھی ہمارے گھر کا ماحول گھٹا ہوا اور خاموشی سا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے اتنا احساس نہیں ہوتا تھا۔ بابا مجھ سے محبت کرتے تھے مگر جیسے باپ بیٹیوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں ایسا انہوں نے بھی نہیں کیا تھا۔ ہماری برادری میں بیٹیوں سے تقریباً سب ہی ایسا برتاؤ کرتے تھے بلکہ بہت برا سلوک کیا جاتا تھا۔ اس لیے مجھے پتا بھی نہیں تھا لیکن جب میں چھ سال کی تھی تب بیکلہ برادری کے ساتھ خالہ کے گھر گئی تھی۔ اس سے پہلے بابا مجھے بھی جانے نہیں دیتے تھے۔ امی کو بھی بڑی مشکل سے اجازت ملتی تھی۔ خالو سے بھگڑا میری پیدائش کے بعد ہی ہو گیا تھا اس لیے میں نے زندگی میں پہلی بار خالہ، خالو اور ان کے بچوں کو دیکھا تھا۔ چھوٹی ہونے کے باوجود میں نے کچھ دیر میں جان لیا تھا کہ ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ماحول کھلا، روشن اور محبت سے بھرپور تھا۔ ہمارے ہاں جب بابا گھر آتے تو ہم بہن بھائی کسی قدر سہم جاتے اور باادب ہو جاتے۔ بابا کے ہوتے ہوئے کوئی اونچی آواز میں نہ تو بات کرتا تھا اور نہ ہی ہنستا ہوتا تھا۔ بھائی بھی بچپن سے بابا کے رنگ میں دسکے ہوئے تھے۔

اس کے برعکس جب خالو گھر آتے تو ان کے بچے کھل جاتے تھے۔ صائم اور علیا دوڑ کر خالو سے لپٹ جاتیں اور وہ ان کو چار کرتے اور ان کے بارے میں پوچھتے تھے۔ خالہ اور خالو کی شادی اور بیچ بھی اس کے باوجود ان میں جو محبت اور آپس کا تعلق تھا وہ میں نے امی ابو میں بھی محسوس نہیں کیا حالانکہ ان کی تو محبت کی شادی تھی۔ صائم اور علیا خالو کی طیر موجودگی میں جتنے شوق ہوتے تھے ان کے آنے کے بعد تو اس سے بھی زیادہ شوقی اور شور شرابے پر اتر آتے تھے۔ خالو پر امانتے یا ان کی ڈانٹنے کی بجائے ان کا ساتھ دیتے تھے۔ خالہ ان سے کہیں کہ آپ بچوں کے ساتھ بچے بن جاتے ہیں اور میں جنت سے سوچتی کہ کیا باپ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ اس وقت مجھے شدت سے اپنے گھر کے گھٹے اور پورے ماحول کا احساس ہوتا اور میں دل سے دعا کرتی کہ اللہ ہمارا گھر بھی ایسا ہی کر دے۔ مگر میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کا ماحول خراب سے خراب ہوتا چلا گیا۔ بابا پہلے سے زیادہ غصہ کرنے لگے تھے اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتے۔ بھائی جو حراج میں ان کے قریب تھے ان کے لمحے

ساتھ بہت شباہی تھی دی اور ہا ہا سے کہا کہ وہ مجھے آگے بھی تسلیم دلائیں۔ اگرچہ بابا کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اس وقت ان کے منہ سے نکل گیا۔ "کیوں نہیں سائیں اگر میری بیٹی آگے بڑھنا چاہے گی تو میں اسے ضرور بڑھاؤں گا۔"

میں نے اور امی نے بابا کے یہی الفاظ پکڑ لیے اور ان سے مطالبہ کیا کہ مجھے کافی میں داخل کرائیں۔ بابا نہیں مان رہے تھے اور بھائی تو بالکل بھی تیار نہیں تھے مگر امی نے نہ جانے کیسے بابا کو متاویا۔ مگر جب میں کافی جانے لگی تو بابا اور بھائیوں نے مجھ سے گل کر کہا کہ اگر میں نے کہیں ان کی عزت کو ٹانگا یا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ اچھا نہیں کیا ہوگا۔ ہماری برادری میں ایسی باتوں پر کل سے کم بات نہیں ہوتی تھی۔ ذیل تو پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر لڑکی کسی کے ساتھ فرار ہو جائے تو اسے اور لڑکے کو طلاق کر کے ہاتھ جوڑ کے کی دوسرے سزا دی جاتی تھی۔ اگر لڑکا اور لڑکی ہاتھ نہیں آتے تھے تو ان کے گھر والوں کو سزا ہوتی تھی اور یہ سزا عام طور سے لڑکی کے بدلے لڑکی یا بھر بھاری مالیت کا جرمانہ ہوتا تھا۔ میں سن کر رو گئی کیونکہ میری طرف سے کسی قسم کی یقین دہانی کی ہوا اور بھائیوں کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔

جب میں نے نظر کیا تب بھائیوں نے ایک بار پھر زور دیا کہ مجھے گھر بٹھا لیا جائے بلکہ میری شادی کر دی جائے۔ یہ مطالبہ من کر میری جان گل گئی۔ کیونکہ مجھے برادری میں ہی رشتہ ملتا اور یہاں سب مرد ایک جیسے ہی تھے۔ میں بابا کے گھر سے نکل کر کسی ایسے ہی پاس سے بھی بدتر ماحول والے گھر میں جا سکتی تھی لیکن بھری کی آہٹ نہیں تھی۔ میں نے رد و حرک اور امی کے پیچھے بڑھ کر ہا ہا سے کسی نہ کسی طرح بی اے کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ پتا نہیں امی نے کیسے ان سے یہ بات منوائی مگر اس کے بعد بابا کا موڑ بہت دن تک خراب رہا تھا وہ مجھ سے بات کرتے ہی نہیں تھے اور امی سے کرتے جب بھی ان کا لہجہ سخت ہوتا تھا۔ بھائی مجھ سے بات کرنا تو ایک طرف، دو یکنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں لگ رہا تھا انہوں نے میری تعلیم کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اگر وہ بابا پر ذرا بھی حاوی ہوتے تو لازمی مجھے گھر بٹھا دیتے۔

بہت دنوں بعد بابا کا موڑ ٹھیک ہوا تھا تب انہوں نے امی کو کراچی جانے کی اجازت دی مگر میرے لیے مسخ کر دیا۔ اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے میرے لیے کیوں

مسخ کیا ہے۔ میں امی کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر اجازت نہ ملنے پر تڑپ کر رہ گئی۔ دایمیں آنے کے بعد امی نے ایک دن میرے پوچھنے پر چپکے سے بتایا کہ خالہ کی خواہش تھی کہ وہ مجھے صائم کے لیے لے جائیں۔ مگر جب امی نے ابو سے یہ بات کی تو وہ اسنے لمبے میں آگے کر امی کو مارا کہ کہیں طلاق نہ دے دیں۔ برادری سے ہا ہر شادی اگر مرد کے لیے گناہ مسطرہ تھی تو عورت کے لیے گناہ کبیرہ تھی۔ گناہ تو اللہ معاف کر دیتا ہے لیکن اس کی تو معافی بھی نہیں تھی۔ پھر انہوں نے امی سے کہا کہ اب انہوں نے یہ بات دوبارہ کی تو ان کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا اور اس کے بعد ہی ابو نے مجھے امی کے ساتھ خالہ کے گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان دنوں میں بی اے پاورٹ دن میں تھی۔ پھر جن دنوں میرے امتحان ہو رہے تھے خالہ کے گھر سے اطلاع آئی کہ صائم نے اپنے ساتھ آسٹریلیا میں پڑھنے والی ایک پاکستانی لڑکی کو پسند کر لیا ہے اور جلد خالہ اس کے گھر رشتہ لے کر چلا ہی گیا۔

صائم ابھی خوش شکل اور گورے رنگ کے تھے۔ قد طویل تھا شاید چھ فٹ سے زار زیادہ تھا۔ لیکن میرے خیال میں سب کا قد طویل ہی ہوتا ہے۔ خود میں بھی پوچھتی تھی اور میرا قد پانچ فٹ سات انچ تھا۔ میں کئی بار ان سے ملی تھی مگر ہمیشہ داخل کزن ہی سمجھا تھا۔ وہ دو سال پہلے گریجویٹ کے بعد آسٹریلیا چلے گئے تھے۔ جب امی نے بتایا کہ خالہ مجھے لینا چاہ رہی تھیں تب بھی میں نے کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ ہاں اس کا محسوس تھا کہ میں خالہ کے ہاں نہیں جا سکتی۔ مجھے ان کے گھر کا ماحول بہت پسند تھا۔ بہر حال جب صائم کی مگنی ہو گئی تب بابا کو اعتراض نہیں رہا اس لیے جب میں نے گریجویٹ کے بعد دوسرے لیے تب مجھے بھی امی کے ساتھ جانے کی اجازت مل گئی۔ چلنا بھی قاری تھی اور ہم نے مل کر خوب مچھائے کیا۔ صائم باہر تھے لیکن اکثر وہ اسکاٹپ پر گھر والوں سے رابطے میں رہتے تھے۔ بلکہ ان کا اسکاٹپ ہر وقت آن رہتا تھا۔

صائم نے ایم فل مکمل کر لیا تھا اور اب بی ایچ اے کی کر رہے تھے۔ ساتھ ہی جڑوئی جاب بھی کرتے تھے جس سے ان کو اتنی رقم مل جاتی کہ اپنا گزارہ ہو جاتا تھا۔ آسٹریلیا کی شہریت اتنی آسانی سے نہیں ملتی ہے لیکن صائم کو مل گئی تھی۔ ان سے بھی گپ شپ ہوتی تھی۔ موسم سرد تھا مگر خالہ اور خالو نے ہمیں ہر جگہ گھمایا پھر لایا۔ ہم ساحل سمندر پر بھی

گئے تھے۔ ایک مہینہ کیسے گزرا اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ جب ہم وہاں جا رہے تھے تو میرا دل ہانکھل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ کاش بابا مان جاتے اور میں آج خانہ کے گھر ہوتی۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ بابا کی برادری میں لڑکی باہر سے لا لی جاتی تھی۔ پھر بھی مان لیا جاتا ہے، بے شک قبول نہ کیا جائے مگر لڑکی برادری سے باہر دینا کسی صورت قبول نہیں کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والوں کو برادری اور علاقے سے نکال دیا جاتا ہے۔ ان کو پھر کوئی لڑکی نہیں دینا اور نہ کوئی لین دین کیا جاتا ہے۔

اور بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ وہ پورے پانچ برس بڑے تھے۔ اس لیے ایک سال پہلے بابا نے ان کی برادری میں شادی کر دی۔ بھری ہونے والی بھائی اریٹا کا ایک بھائی تھا۔ ارشد معمولی بچہ تھا تھا اور سولہ سنیٹکوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس کی عید آباد میں ہی دکان تھی۔ جن دنوں میں بے اسے قائل کے پیچھے دے رہی تھی میرے کانوں میں بگڑ لگی باتیں بڑیں کہ شاید ارشد کے گھر والے مجھے مانگ رہے تھے۔ یعنی دینے کا معاملہ تھا۔ مگر بابا اس کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک گھر میں آدمی ایک ہی رشتہ کرے تاکہ اگر ایک کا معاملہ خراب ہو تو دوسرے پر اس کا اثر نہ پڑے۔ اس سے مجھے اُسید ہوئی کہ یہ رشتہ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ارشد مجھے نہ پرگتا تھا۔ قفل صورت کا مناسب تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی گند تھی۔ حدود تین بار ہمارے ہاں آیا اور ہر بار سامنا ہونے پر اس نے جس طرح مجھ کو دیکھا تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

میں بس کی کھڑکی کے شیشے سے سرکاتے بیٹھی تھی کہ اسی نے پوچھا۔ ”نہ باب کیا سوچ رہی ہے؟“ ”کچھ نہیں ائی۔“ میں نے بے دلی سے کہا پھر پوچھا۔ ”ای آپ اور بابا کراچی میں نہیں رہ سکتے تھے حیدر آباد میں میرا دم ٹھہرتا ہے۔“

ای کچھ دیر خاموش رہیں پھر مرد آہ بھر کر بولیں۔ ”میری بچی بات شہر کی نہیں ہے، ہمارے گھر کی ہے، یہ گھر نہیں بھی ہوتا اس کا بھی ماحول ہوتا اور پوچی دم ٹھہرتا۔“ ائی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ بابا اور بھائیوں کے ساتھ ہم اگر امریکا یا یورپ کے کسی ملک میں رہتے تب بھی ہمارے گھر کا بھی ماحول ہوتا۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں نے خدا کر کے گریجویشن کر لیا تھا مگر مجھے اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ امکان بھی تھا کہ مجھے کسی جاہل یا معمولی بڑے گھسے سے بواہ

دیا جائے گا۔ ہمارے لواؤں سے محبت کی شاہی کی تھی اس کے باوجود وہ کس طرح رہ رہی تھیں۔ میرے ساتھ نہ جانے کیا ہوگا۔ ان ہی سوچوں میں سڑک ٹھک گیا اور بس اگلے پر منور ہو جاتا تھا۔ وہ گاڑی ساتھ لایا تھا۔ ہمارے ہاں دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کمرشل بھی جو آئل سپلائی کرنے کے کام آتی تھی بابا اور بھائی عام طور سے اسے استعمال کرتے تھے۔ ایک کار بھی جو گھر کے کاموں اور آنے جانے کے لیے مخصوص تھی لیکن بھی کبھی ضرورت ہوتی تو بابا اور بھائی دونوں گاڑیاں لے جاتے تھے۔

بابا اور انور کے مقابلے میں منور کا رویہ مجھ سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ وہ نارمل بات بھی کرتا تو ایسا لگتا جیسے لڑائی ہو رہا ہو۔ اس کی نظر میں ہر وقت ہیں مجھے شک سے کھو جاتا جیسے نہ جانے میں نے کیا جرم کر دیا ہے۔ خاص طور سے جب میں کالج سے آتی اور وہ گھر میں ہوتا تو پانچ دس منٹ دیر سے آنے پر بھی لاتعداد سوالات کرتا تھا۔ بعض اوقات تو اس کے سوالوں سے زنج آکر میں رونے لگتی تھی۔ مگر ہمارے گھر میں مردوں سے نہ مان چلانے یا جواب دینے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ منور خیسے کا بہت تیز تھا اور ائی بھی اس سے بڑی تھیں وہ خود صرف بابا سے بڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت بھی اس کا موڑ خراب تھا۔ اس نے یہ مشکل دلی کو سلام کیا اور میرے سلام کا جواب دینے بغیر سامان کار کی ڈکی میں رکھنے لگا۔ راستے میں ائی نے پوچھا۔ ”منور گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں سب ٹھیک ہے۔“ اس نے اگڑے لہجے میں کہا۔ مگر ائی اور میں ٹھیک گھسے تھے۔ کوئی مسئلہ تھا۔ ہم گھر پہنچے تو خلاف معمول بابا گھر پر تھے اور وہ فوراً ہی ائی کو اندر لے گئے۔ اس سے میرا تھا اور شکا کیونکہ ہمارے ہاں کسی بھی سائلے میں عورتوں کو شامل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ انہیں صرف ٹیبلے سائے جاتے تھے۔ ایسا کیا بات تھی جو بابا ائی کو الگ لے گئے تھے۔ ایک گھسے بھدائی کمرے سے نکلیں تو ان کا چہرہ سنا ہوا تھا۔ منور ہمیں گھر لاتے ہی باہر چلا گیا تھا۔ ائی سے بات کرنے کے کچھ دیر بعد بابا بھی چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں ائی کے پاس آئی۔

”ای کیا ہوا ہے، بابا آپ سے کیا کہہ رہے تھے؟“ ”کچھ نہیں ہوا۔“ ائی نے مجھے ہلکا جاپا گھر میں ان کے سر ہو گئی۔ اس گھر میں وہی ایک فرد تھیں جن پر میرا بس چل تھا اور میں ان سے خدا بھی کر سکتی تھی۔ آخر میں نے ان

سے انگوڑی لیا۔ ای نے انکشاف کیا۔

"منور... غیر برادری کی ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

یہ بھاری مخالف برادری تھی اور ان سے تو صرف خون وشت کا رشتہ تھا شادی بیاہ کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسری حیرت تھی اس بات پر ہوئی تھی کہ منور جو اس بارے میں اتنا بولتا تھا اور برادری سے باہر شادی کو گناہ قرار دیتا تھا وہ خود نہ صرف برادری سے باہر شادی کرنا چاہ رہا تھا بلکہ لڑکی بھی اس نے مخالف برادری کی چنی تھی۔ اگر یہ بات کھل جاتی تو اس پر بہت بڑا فساد ہو جاتا۔ ہمارے اس برادر یوں کی لڑائی میں نکل ہوتا اور کردار معمولی بات بھی جاتی تھی۔ میں بابا اور بھائیوں کے لیے پریشان ہوئی۔ اگر منور کوئی ایسا سیدھا کام کر جاتا تو رد میں بابا اور بھائی بھی آ جاتے۔ میں نے امی سے بھی یہی کہا تو وہ بولیں۔ "مجھے بھی سہی ڈر ہے۔ تو جانتی ہے منور کتنا اکثر ہے۔"

"ہاں ویسے تو برادری کا راگ لانا چاہتا تھا اور اب خود برادری سے باہر شادی کا کہہ رہا ہے کیا اسے نہیں معلوم کہ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ وہ لوگ بھی نہیں مانیں گے۔"

"ہات ان کے ماننے کی نہیں ہے۔" امی نے رد ہانے لپچے میں کہا۔ "منور پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے حیرے بابا سے کہا ہے کہ وہ لڑکی کو لے کر بھاگ جائے گا اور اس سے کورٹ میریج کر لے گا۔"

اس بار میں کچھ دلی ہوئی۔ "ای وہ اتنا خود غرض ہو گیا ہے اسے اپنے باپ بھائی کی بھی پروا نہیں ہے تو بھاری کیا ہوگی۔"

"میں نے کہا نا وہ پاگل ہو گیا ہے۔"

"بابا اور بھائی کو نہیں کر سکتے؟"

"انہوں نے سب کر کے دیکھ لیا ہے۔ اسے مارا تک ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ کہتا ہے مر جاؤں گا مگر شادی اسی سے کروں گا۔"

منور کا تو نہیں چاہتا لیکن اگر وہ اس لڑکی کو لے کر بھاگ جاتا تو ہم گمراہوں کی حالت خطرے میں پڑ جاتی۔ یہ ایسا خطرہ تھا جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کیونکہ میں بچپن سے ہی دشمنی اور شقی آتی تھی۔ اسکی باتوں پر نکل و خون ہی ہوتے تھے۔ خود ہمارے محلے میں کئی ایسے واقعات پیش آچکے تھے۔ دو گمراہوں کو ایک لڑکی حیدر آباد کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی تو برادری والے اسے

اور لڑکے کو کراچی سے پکڑ کر لائے اور اپنے علاقے میں لے جا کر جڑے میں انہیں سزا سنا کر اسی وقت اس پر عمل درآمد بھی کرادیا۔ ان کو قتل کر کے ان کی لاشیں کسی خفیہ جگہ دفن کر دی گئی تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ برادری کا ایک خفیہ قبرستان ہے جہاں ایسی ہی لاشوں کو دفن کیا جاتا ہے اور ان میں اکثریت عورتوں اور لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ مرد عام طور سے بھاگ جاتے ہیں یا بھاری جہانے دے کر قتل جاتے ہیں مگر عورت کے محلے میں صرف موت آتی ہے۔ اگر سزائے موت سے بچنے کے لیے جہانہ کیا جاتا ہے تو عورت کی طرف سے کوئی ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتا اور بالآخر اسے موت ہی نصیب ہوتی ہے۔

رات بابا اور تورائے تو سب نے میٹنگ کی اور اس میں زندگی میں پہلی بار امی کو بھی شامل کیا گیا۔ منور نہیں آیا تھا۔ پھر وہ رات کے تنگ نہیں آیا تو بابا اور تور پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل گئے۔ میں اور امی پریشانی کے ساتھ جاگتے رہے۔ بابا فجر کے قریب آئے تو ان کی پریشانی ان کے چہرے سے ہٹا پڑ رہی تھی۔ میں امی کے ساتھ تھی مگر انہوں نے میرے سامنے ہی امی سے کہا۔ "جیب بہت بڑا ہوا ہے، منور اس لڑکی کو لے کر نہیں بھاگ گیا ہے۔"

امی نے سینے پر ہاتھ مارا۔ "اے یہ اس نے کیا کیا؟"

بابا زندگی میں پہلی بار فکرت لگ رہے تھے۔ وہ چہرے جس میں اب دواڑ آگئی تھی۔ انہوں نے مجھے لیے میں کہا۔ "بات اب تنگ کھلی نہیں ہے۔ انور اسے تلاش کر رہا ہے۔ اگر وہ مل گیا تو بات اب بھی کھلی ہے لیکن وہ نہ ملتا تو..."

اس کے آگے جو تھا اس سے ہم بھی اچھی طرح واقف تھے۔ لڑکی کے گمراہے شاید بے خبر تھے کہ ان کی لڑکی کس کے ساتھ بھاگی ہے وہ نہ وہ اب تک ہمارے گھر پر دھوا بول بچے ہوتے۔ ایسے معاملات میں تاخیر نہیں کی جاتی تھی لیکن چند دن بعد خود واضح ہو جاتا جب منور بھی غائب ہوتا اور اس کے بعد جو ہوتا اس کا سوچ کر میری دماغ کا پیسہ لگی تھی۔ ای مدد رہی نہیں اور بابا کم صدم سے ٹھہر رہے تھے۔ انور کی گھنٹے بعد آیا اور اس نے آتے ہی بابا کو گھٹی میں سر ہلا کر قادیا کہہ کر کام رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ منور لڑکی کو لے کر حیدر آباد سے ہی چلا گیا تھا کیونکہ اس کے ساتھ کار بھی غائب تھی۔ حیدر آباد جیسے چھوٹے شہر میں ان کا چھپنا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح احمد دینی صوبہ بھی وہ نہیں چھپتے تو یہ

رات کو یہاں گئے ہیں میں کمرے سے لگی اور نشست گاؤں میں
بیٹھے بابا اور انور کی گفتگو سن لی۔ انور کہہ رہا تھا۔ "بس ایک
بار وہ ہاتھ آ جائیں۔"

"اس مسئلے کا بھی حل ہے۔" بابا نے کہا۔ "منور کو
چپ کرادیں گے اور لڑکی ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے
گی۔ اس کے گھر اور برادری والوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ
وہ کہاں گئی۔"

"ایسی جگہ کاڑیں گے کہ پھر قیامت کے دن ہی اٹھے
گی۔" انور نے غصت سے کہا۔

میں دنگ رہ گئی تھی۔ وہ اس لڑکی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا
رہے تھے جس کا جرم یہ تھا کہ وہ منور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔
اس طرح دیکھا جائے تو منور بڑا مجرم تھا۔ بھلی تو مرد کرنا ہے
اور وہ آگے بڑھتا ہے۔ انور کو اپنے بھائی کی لگن اور اس کے
لپے وہ ایک لڑکی کو قتل کرنے کو بھی تیار تھا۔ میں دے قدموں
واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب تک میری خواہش تھی کہ کاش
منور اور وہ لڑکی مل جائیں۔ اگر چہ ان کے ملنے سے بھی مسئلہ حل
نہیں ہوتا۔ مگر یہ جان کر کہ بابا اور انور نے مسئلہ حل کرنے کے
لیے کیا سوچا ہے۔ اب میری خواہش تھی کہ وہ نہ ملیں۔ اس
صورت میں بھی یہ راز کھل کر رہتا اور دونوں برادر بچاں میں
کھیدگی آ جاتی۔ بابا اور انور خطرے میں پڑ جاتے کیونکہ وہ مرد
تھے اور باہر جانا ان کی مجبوری تھی۔ وہ گھر نہیں بیٹھ سکتے تھے اور
ان کو نشانہ بنانا آسان تھا۔

دو دن بعد بابا اور انور نے دکان پر ہی اور لٹا کیا اور ایک
جھلی زن کال ریسیور کی جس میں قاپا گیا کہ منور کا کراچی میں
الٹکی ڈینٹ ہو گیا ہے اور وہ لڑکی حالت میں اسپتال میں ہے۔
بابا اور انور مارکیٹ اور برادری میں یہ خبر پھیل کر خود کراچی
روانہ ہو گئے۔ اللہ جانے وہ کہاں گئے تھے۔ بابا اور انور بعد آ گئے
لیکن انور ایک ہفتے بعد آیا تھا۔ چپ کر پڑا اور اس کی گفتگو سن تو
پتا چلا کہ وہ کراچی آ چکی تھی۔ منور ایک ہفتے تک وہاں
ہوٹلوں میں منور اور لڑکی کو تلاش کرتا رہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ
نہیں ملا تھا۔ منور کے چند ایک دوست اور واقف کار کراچی میں
تھے۔ انہوں نے ان سے بھی رابطہ کیا مگر منور کبھی نہیں ملا۔ ایسا
لگ رہا تھا کہ وہ کسی بہت محفوظ جگہ تھا جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا
تھا۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ دوسری برادری والوں کو قلم ہو گیا تھا اور
بڑی خاموشی اور ہوشیاری سے منور اور لڑکی کے ساتھ شہوت کی
تلاش میں بھی تھے۔

انور کی کراچی واپسی سے چار دن بعد کی بات

بات زیادہ دیر چھٹی نہیں رہتی۔ اگر وہ کراچی چلے جاتے تو
ان کے بچنے کا امکان تھا۔ مکہ وہ بعد انور اور بابا بھی بچی
بات کہہ رہے تھے کہ وہ کراچی چلے گئے ہیں۔ منور کا موہاں
مستقل بندہ چار ہاتھ بابا شام تک بار بار غرائی کرتے رہے
مگر موہاں آن نہیں تھا۔

ہماری برادری میں گھر میں کھانے کو ہونا نہ ہو لیکن
اسلئے ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی خاصا اسلئے تھا۔ بابا کے
پاس ایک راتفل اور ایک پستول کا لائسنس تھا۔ انور کے نام
پر شاٹ گن اور منور کے نام پستول کا لائسنس تھا۔ اس کا
پستول بھی اس کے ساتھ ہی غائب تھا۔ مگر ہمارے ہاں
لائسنس سے ہٹ کر بھی کچھ اسلئے تھا۔ اس میں ایک کلاشکوف
بھی شامل تھی۔ شام تک بابا اور انور نے وہ سارا اسلئے نکال
لیا۔ عام حالات میں وہ دکان پر چلے جاتے ہوئے پستول وغیرہ
ساتھ رکھتے تھے کیونکہ چوری ڈکیتی کا خطرہ رہتا ہے مگر اگلے
دن وہ جب گئے تو انہوں نے گاڑی میں کلاشکوف اور
راتفل بھی رکھ لی تھی۔ اس شام بابا نے گھر آ لے پر قاپا کہ
انہوں نے سب جانے والوں کو بھی بتایا ہے کہ منور تیل کی
خریداری کے لیے کراچی گیا ہوا ہے۔

یہ بہانہ بھی چند دن چل سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ
لوگوں کو کیا بتاتے کہ منور کہاں ہے۔ ہمارے ہاں ذات
برادری میں کوئی بات چھٹی نہیں ہے۔ اگر لڑکی ہماری برادری
کی ہوتی تو اب تک پتا بھی چلا ہوتا مگر وہ دوسری برادری
کی تھی اس لیے لڑکی کے گھر والے بے لطف تک جان نہیں سکے
تھے۔ مگر وہ کوشش میں ہوں گے۔ اس معاملے میں ان جانلی
لوگوں کی عقل بعض اوقات چڑھے کھول کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی
ہے۔ وہ اتنی محنت اور جانفشانی سے اپنے بھروسوں کو تلاش
کرتے ہیں کہ کیا پولیس کرتی ہوگی۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ
ان کا مجرم پک جائے کیونکہ ان کی تلاش دلوں پانچھوں نہیں
بلکہ سالوں اور عشروں جا رہی رہتی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ
انہوں نے چندہ میں سال بعد اپنے بھروسوں کو تلاش کر لیا جو
کہیں چھپ کر زندگی گزار رہے تھے اور انہیں سوان کے
بچوں کے قتل کر دیا گیا۔

بابا اور انور کسی قدر پُر امید تھے کہ اگر منور مل جائے تو
وہ اسے سمجھا سکتے تھے اور اسے واپس لے آتے۔ مگر میری
سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے کیسے واپس لا سکتے تھے؟ اور اگر
اسے واپس لے بھی آتے تب بھی وہ اس لڑکی کا کیا کرتے
جو منور کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس کا پتا مجھے اس وقت چلا جب

تھی۔ میں لی وی پر غور جمیل دیکھ رہی تھی کہ اچانک خبر آنے لگی، ایک پوش علاقے میں پٹھلے میں فائرنگ جس سے عین انفراد ہلاک ہو گئے۔ مارے جانے والوں میں ایک عورت اور دو مرد شامل تھے۔ ان کا تعلق احمدیہ صوبہ سے تھا۔ یہ سن کر اور پھر عورت کا جان کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے جلدی سے لی وی کی آواز دہکی کر وی اور انتظار کرنے لگی کہ کب اس خبر کی تفصیل آتی ہے۔ اسی مگن میں کھانا ہمارا ہی نہیں۔ اس دوران میں جمیل کھاتی رہی اور اسی آچائیں تو میں جلدی سے کوئی انٹر نیٹ صفحہ جمیل لگا لیتی تھی۔ بالآخر دو گھنٹے بعد اس کی تفصیل آئی۔ مارے جانے والوں کے نام نشر ہوئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ ان میں ایک نام منور کا تھا۔ بڑی کا نام فہیمہ تھا اور دوسرا مرد جو ہمارا گیارہواں بچلے کا مالک تھا اور اس کا تعلق بھی ہماری برادری سے تھا۔

اس کے دو ملازموں کے مطابق چار خوب پوش مسلح افراد اچانک پٹھلے میں گھسے اور انہوں نے احمدیہ دھند فائرنگ کر کے ان عین انفراد کو قتل کیا اور اس کے بعد فرار ہو گئے۔ کسی نے انہیں روکنے کی جرأت نہیں کی اور بچی نہیں بلکہ کسی نے منور آدمیوں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ ان کا تعلق ہماری مخالف برادری اور شیعہ کے گھر سے ہوگا۔ میں اپنی چلیں بدوک رہی تھی اور جب میری برداشت سے باہر ہو گیا تو میں لی وی بند کر کے ہاتھ روم میں آئی اور وہیں آنسو بہانے لگی۔ منور کیساتھ ہی سچ میرا بھائی تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے یہ چکر شروع ہوا تھا تب سے مجھے لگ رہا تھا کہ اس کا ایسا ہی انجام ہوگا۔ اس کے باوجود مجھے بہت بڑا دھچکا لگا تھا۔ میں رات روم سے باہر آئی تو لی وی نے دیکھ لیا۔ ”کیا ہوا ہاسپتال کیوں مدد لیا ہے؟“

”کچھ نہیں ائی۔“ میں نے کہا اور پھر بہانہ بنایا۔ ”منور بھائی کی طرف سے دل پریشان ہے اس لیے رونا آ گیا۔“

میں اسی کو یہ خبر سنانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی اس لیے جیسے ہی ائی مگن کی طرف گئیں میں نے ہاتھ کونوں کر کے صرف اتنا کہا کہ وہ لی وی لگا کر بکھیں۔ منور کے بارے میں خبر آرہی ہے۔ دکان پر لی وی تھا کیونکہ آٹل کا کام ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بہت دیر بعد کوئی گا کب آتا ہے اور زیادہ تر تو فون پر آرڈر کرتے تھے اور کوئی جا کر سپلائی دے آتا تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے ہاتھ لگنے والے دکان پر لی وی رکھا

ہوا تھا۔ انور کو کرکٹ کا شوق تھا۔ اس لیے بابا نے فوری خبر دیکھ لی اور اس کے فوراً بعد وہ دکان بند کر کے انور کے ساتھ گھر آئے اور انہوں نے برادری کے بڑوں کو بلا لیا۔ ہمارے گھر ایک طویل میٹنگ ہوئی۔ محلے کی عورتیں بھی آگئی تھیں۔ ایک طرف میٹنگ ہو رہی تھی اور دوسری طرف عورتیں ائی اور میرے ساتھ لی کر دو عورتیں تھیں۔ میٹنگ کے بعد ہاتھ لگا اور برادری کے کوئی درجن بھر افراد پوری طرح سچ ہو کر کراہی روانہ ہو گئے اور یہاں محلے میں بھی سب ہوشیار ہو گئے تھے۔

اتفاق سے مخالف برادری کا محلہ بھی ہمارے محلے کے پاس ہی تھا۔ اس لیے آئے سناٹے صوبہ سے عین گئے۔ ایک فائرنگ کا میز سکھاتا جس میں نہ جانے اور کتنی جانیں ضائع ہوئیں مگر اس موقع پر دونوں طرف کے بزرگ آڑے آئے اور دونوں نے اس پر قرارداد رکھا۔ مگر جیسے ہی ہاتھ لگا اور انور کی لاش لے کر وہیں آئے ماحول بدل گیا۔ وہ انتقام کے لیے پاگل ہو رہے تھے۔ اسی نے بابا کو سمجھنا چاہا تو انہوں نے زمین کی میں چلی ہمارا ائی پر ہاتھ اٹھایا اور پھینک مار کر بولے۔ ”میرا بھائی بیٹا مرا ہے اور میں چوڑیاں پہن کر بیٹھا رہوں گا۔“

”منور کی لاش چکی ضرور ہے لیکن آخری نہیں ہے۔“ انور نے بھی خطرناک لہجہ میں کہا۔ ان دونوں کو سمجھنا پڑا تھا اس لیے میں ائی کو ان کے سامنے سے ہٹا کر لے گئی۔ منور کی تلخ آنکھوں کے دن کی گئی اور اس کے فوراً بعد برادری کا اجلاس ہوا۔ کیونکہ مرنے والا دوسرا فرد بھی ہماری برادری کا ہی تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مخالف برادری انکار کر رہی تھی کہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ ہماری برادری اسی پر سپرے علاقے کے بڑوں کا ہجوم بٹھانے کی بات کر رہی تھی اور وہ مان نہیں رہے تھے کہ جب ہم نے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو بزرگ کس بات کا بٹھایا جائے۔ ہاتھ لگا اور انور کو شہ قاتل کہ یہ شیعہ کے گھر والوں کا کام ہے۔ اس کے چار بھائی تھے اور چاروں ہمدردی قسم کے تھے۔ وہ تو کھلے عام اسلحہ لے کر گھومتے تھے۔ انور سخت طیش میں تھا لیکن وہ ان کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اکیلا تھا اور مخالف چار بھائی تھے اور ان کے پاس دوسرے بھی کئی ہمدردی قسم کے ملازم تھے۔

ہاتھ لگنے منور کے قتل کی ایف آئی آر کراچی میں مخالف برادری کے نام کٹوا دی گئی مگر کسی کا نام نہیں لیا تھا۔ کوئی گرفتاری بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔ منور کے چالیسویں تک

سکون رہا تھا۔ خالہ اور خالو وہیں جا چکے تھے۔ وہ پہلے تین دنوں کے وقت آئے تھے اور اس کے بعد وہ بارہ کئی دن کے لیے آئے تھے۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ وہ اپنا اختلاف بھولی کر آگئے اور لب پایا بھی لایا سے اچھی طرح سے لے گئے۔ دوسری بار میں ملیا بھی آئی تھی اور وہ میرے گھر کا ماحول دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ اس نے تھلائی میں مجھ سے پوچھا۔ "وہ باب تو کیسے مدھنسی ہے اس ماحول میں؟" میں نے ٹھنڈی سا کس لی۔ "بیس ہفتہ رہا لکھا کچھ کر رہے تھے۔"

"صاف کرنا لیکن میں نے اتنے روکھے اور سخت باپ بھائی نہیں دیکھے۔"

"گناہات ہے میں نے بھی اپنے گھر کے علاوہ کہیں نہیں دیکھے ہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"کاش میں تم کو یہاں سے لے جاسکتی۔" علیٹا نے کہا۔ "عام بھائی بڑے تو نہیں ہیں جو تمہارے بابا نے یوں انکار کیا۔"

"وہ بالکل بھی بڑے نہیں ہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "بڑے تو میرے قصبہ ہیں۔ ہماری برادری کے دم ورداج ہیں جن میں شیوں کو انہم میں جھونکا جاتا ہے۔"

خالہ خالو اور علیٹا کے جانے کے بعد ماحول پھر دیکھا ہی ہو گیا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ اب منور ہوا جادو تھا۔ وہ مجھے بالکل ان نظروں سے دیکھتا تھا جن سے منور دیکھتا تھا اور بابا چپ چاپ سوچوں میں گم رہنے لگے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے رات کو امی سے کہا۔ "حیو مجھے لگے رہا ہے اور کسی پکڑ میں ہے۔"

"کسے پکڑ میں؟" امی پریشان ہو گئیں وہ پہلے ہی ایک بیٹا مٹوا چکی تھیں۔ "کسی لڑکی کا پکڑ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ مجھے لگ رہا ہے وہ بدلے کے پکڑ میں ہے۔" بابا بولے۔ "بدلتو ہمیں لینا ہے لیکن ابھی وہ ہوشیار ہیں۔ چوٹ اس وقت مار لی ہے جب لوہا گرم ہو۔"

امی کو بابا کا پیشہ یاد تھا اس لیے انہوں نے مخالفت تو نہیں کی لیکن پوچھا۔ "وہ کیسے... آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"آج کل وہ وہاں پر گم آتا ہے۔ دو تین دوست ہیں جن کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ نہیں پتا ہے وہ ہر وقت کج رہتا ہے۔"

"وہ تو لیک ہے لیکن یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بدلے کے پکڑ میں ہے۔"

میرے ایک واقف بھرنے اسے دو بار مخالف برادری کے محلے میں دیکھا ہے اور وہاں جانا بالکل لیک نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ٹھنڈے نہیں پڑے ہیں۔

"میرا بچہ مار تو دیا ہے اب کیا چاہتے ہیں؟"

"حیو لڑتے کا معاملہ ہے ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہم بھی آسانی سے ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔" بابا نے گہری سانس لی۔ "منور نے بہت برا کیا اسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بھی بہن ہے۔"

امی خوفزدہ ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو کہہ رہی ہوں وہ باب کی شادی کر دیتے ہیں۔"

"کس سے؟ ابھی کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔"

"ارینا کا بھائی ارشد ہے نا؟"

میں جو چھپ کر امی بابا کی باتیں سن رہی تھی میرے قدموں تلے سے زمین ٹکس گئی۔ بابا نے کہا۔ "میں انکار کر چکا ہوں۔"

"ان کو تو نہیں کیا نا۔" امی بولیں۔ "اب ہم بات کر سکتے ہیں۔"

بابا سوچ میں پڑ گئے اور پھر انہوں نے کہا۔ "ہاں ہم نے ان کو انکار نہیں کیا لیکن گھر میں بات ہوئی گی۔"

تب میں جان گئی کہ بابا امی کی بات مان گئے ہیں اور میں کسی صورت ارشد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

عارف ہماری برادری سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا گھر ہماری گلی کے کونے پر تھا وہ کسی نئی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا۔ عمر میں مجھ سے دو تین سال بڑا تھا اور جب میں کالج آتی جاتی تو اکثر وہ ان اوقات میں گلی کے کونے پر موجود رہتا تھا۔ اسی طرح جب بھی شام کو چھت پر جاتی تو کچھ دیر بعد وہ بھی آ جاتا اور اس کی لگاؤ کا مرکز میں ہی ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ اس کا انداز ہوساز نہ نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ دل چسپی سے اور سراپے والے انداز میں دیکھتا تھا۔ کسی لڑکی یا عورت کو ایسی نگاہ بہت کم بری لگتی ہے۔ مجھے بھی بری نہیں لگتی تھی۔ اس لیے وہ جب مجھے دیکھتا تو میں بے نیازی بن جاتی۔ پھر صورت شکل کا بھی مناسب تھا لیکن میں نے بھی اس کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ گلی بار اس سے یوں آشنا سا مٹا ہوا کہ اس کی امی اور میری امی کی آپس میں ابھی سلام دعا تھی۔ امی ہفتہ دن دن میں ان کے گھر جاتی تھیں اور وہ بھی اسی طرح ہمارے گھر ہر لگاتار

تھیں۔ جب ان کے ہاں جاتے جب بھی عارف سے سامنا ہو جاتا تھا۔

پھر سہود کی تفریق میں بھی عارف اور اس کے بھائی آگے آگے رہے تھے۔ اگلے دن ای جا رہی تھیں تو میں نے پوچھا۔ "ای کہاں جا رہی ہیں؟"

"رحمت کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"میں بھی چلوں؟" میں نے پوچھا تو ای نے حیرت سے میری طرف دیکھا کیونکہ میں نے بہت عرصہ ہوا ان کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں چلو۔" ای نے حجت نہیں کی اور مان گئیں۔

میں ان کے ساتھ عارف کے گھر پہنچی اور واقعی سے ای نے دروازہ کھولا۔ مجھے ای کے پیچھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آئی تھی کہ میری آنکھیں خود بہ خود جھک گئیں اور شاید چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ عارف نے اپنی ای کو آواز دے کر بتایا اور پیچھے ہٹ کر راستہ دیا۔ میری قبل امداد آتے ہوئے سلب ہوئی اور جب تک میں اسے ٹھیک کرتی ای آگے چلی گئی تھیں۔ میں امداد آئی اور عارف کے پاس سے گزرنے لگی تو اس نے سرگوشی میں کہا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

میرا دل دھڑک اٹھا تھا اور میں چلدی سے آگے بڑھ گئی۔ جب تک میں امداد کمرے میں نہیں چلی گئی عارف کی نگاہیں میرا تعاقب کرتی رہیں تھیں۔ رحمت آئی نے گرم جوشی سے استہلال کیا اور اپنی بہو کو شہلا لائے کو کہا۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے اور پھر اٹھ گئے۔ اتفاق سے اس بار بھی محنت میں عارف سے سامنا ہوا۔ اس کی نگاہوں کا پیغام بہت واضح تھا اور اس بار بھی میں نے سر ہٹا لیا تھا۔ مشکل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ جب عورت نہ نہیں کرے تو اسے ہاں سمجھنا چاہیے اور عارف نے سمجھ لیا تھا۔ آج کل اگر لڑکا اور لڑکی رابطہ کرنا چاہیں تو یہ درابھی مشکل نہیں ہے۔ سواگل نے اسے بہت آسان کر دیا ہے۔ میرے پاس سواگل تھا اور بابا نے بڑی مشکل سے اجازت دی تھی۔ ای نے یہ کہہ کر دلوایا تھا کہ میں کلنگ جاتی ہوں کسی مشکل میں ہوں تو گھر کال کر کے بتا تو سکتی ہوں۔ بھائی اس معاملے میں بھی حاکم تھے مگر مجھے سواگل مل گیا اور اب تک میرے پاس تھا۔

ایک بار ہمارا سواگل پر رابطہ ہوا تو معاملہ تیزی سے آگے بڑھتا پہلے ایس ایم ایس پر بات ہوئی اور اس کے

بعد عارف نے کال کی۔ میں نے ای سے مجھپ کر اس سے بات کی۔ بابا اور نور بھائی کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں کال پر اس سے بات کرتی میں تو ایسے میں سواگل کو بھی کم ہی ہاتھ میں لیتی تھی مجھے کیا دھڑکاٹا رہتا تھا کہ میں سواگل واپس نہ لے لیا جائے۔ اگر ہمیں ہوتا تو میں انہی بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اب یہ ظاہر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے میری کوشش ہوئی تھی کہ بابا یا نور کی نظر میرے سواگل پر نہ جائے۔ اس کل پر عارف نے ڈراما کر اپنی پسند کا اظہار کیا اور دوسری کال میں اس نے کہہ دیا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ میں ہنگامی مگر میں نے بھی ڈھکے پیچھے اعزاز میں کہہ دیا کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ عارف خوش ہو گیا تھا۔ تیسری بار اس نے کال کی تو اس نے کہا۔ "رہا اب میں اپنی ای کو تمہارے گھر رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہوں۔"

میں نے غلطی سانس لی۔ "عارف یہ ممکن نہیں ہے۔"

وہ حیران ہوا۔ "کیوں، میں تمہاری برابری کا تو ہوں۔"

"بات یہیں ہے، اصل میں بابا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

وہ دنگ رہ گیا اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تم نے مجھے بتایا نہیں۔"

"میری امت نہیں ہو رہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"جب تم نے اقرار کیا تو کیا بات کو یہیں تک لے کر کیوں آئیں؟"

"اس معاملے میں، میں اتنی ہی بے بس ہوں جتنا کہ تم ہو۔"

"اب کیا ہوگا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"گنگا بات ہے کہ عارف میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی مگر میں کہہ نہیں کر سکتی۔ مجھے ارشاد سے فکرت ہے مگر میں بابا کے سامنے لار کی جرأت نہیں کر سکتی۔"

عارف جیسے ناگل ہونے لگا تھا۔ "رہا اب کچھ کرو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا۔ "میں ایک کمزور لڑکی ہوں تم مرد ہو کیا تم کچھ کر سکتے ہو؟"

"ہاں میں کر سکتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں

نے کر کہیں دور ہاسکتا ہوں۔ یونہی میرے ساتھ چلو گی۔“
میں اڑ گئی۔ ”عارف یہ بہت بڑا فیصلہ ہو گا۔ تم جانتے
ہو ہمارے ہاں ایسے موقع پر کیا ہوتا ہے، میرے بھائی منور کا
والدہ پرانا نہیں ہے۔“

اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں مرنے کا خطرہ
مول لے سکتا ہوں لیکن تم سے دور نہیں رہ سکتا۔“
”عارف مجھے کچھ سوچنے کی سہلت دو۔“ میں نے التجا کی۔
”سوچ لو مگر جلدی، ایسا نہ ہو کہ تمہارے گھر والے
اچانک تمہاری شادی کر دیں۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کیونکہ ہمارے ہاں ایسا ہی رواج
تھا۔ لڑکیوں کی اچانک ہی شادی کر دی جاتی تھی اور بعض
اوقات تو ان کو اپنی شادی والے دن پہنچا تھا کہ آج ان کی
شادی ہے۔ مگر چہ عام طور سے ایسا اس وقت ہوتا تھا جب
گھر والوں کو سن گئی جاتی کہ لڑکی کسی اور میں دل چسپی
لے رہی ہے۔ اور انہیں خطرہ ہو کہ وہ ان کی عزت ہاؤں تلے
رو رو کر گھر سے فرار ہو جائے گی۔ عارف سے اس گفتگو کے
بعد میں کشش میں بڑھ گئی تھی۔ اگر میں بھی ایسا ہی کرتی تو بابا
اور امی پر کیا گزرتی۔ مگر بات ہے مجھے امی کی زیادہ فکر
تھی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ مجھے عارف سے محبت نہیں تھی، بس
میں کسی صورت اس شے سے شادی نہیں کرتی چاہتی تھی۔ پہلے
مجھے اس سے چڑھتی مگر جب سے میں نے امی اور بابا کی گفتگو
سنی تھی مجھے اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس سے شادی کی
نسبت مجھے یہ زیادہ آسان لگ رہا تھا کہ میں گھر سے بھاگ
جاؤں۔ بے شک اس جرم میں، میں بھی منور اور شبنم کی
طرح عمل کر دی جاؤں۔ عارف کی طرف میں اسی وجہ سے
بڑھتی تھی مگر جب اس نے یہ تجویز پیش کی تو میں سوچ میں پڑ
گئی۔ جب ارشد کا سوچتی تو مجھے فرار آسان لگتا تھا مگر جب
امی کا سوچتی تو میری ہمت جراب دے جاتی اور مجھے خیال
آتا کہ اس سے بھرے میں اسی جہنم میں جلتی رہوں۔

کئی دن تک اسی کشش میں رہی۔ جس واحد چیز نے
مجھے فیصلہ کرنے سے روکا ہوا تھا وہ امی اور بابا کی خاموشی
تھی۔ اگر انہوں نے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو
امی کے توسط سے لازمی میرے علم میں آ جاتا اور میں اس
بارے میں باز خود کوئی بات نہیں کر سکتی تھی۔ امی سے بات
کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر بابا فیصلہ کر لیتے تو پھر دنیا
کی کوئی طاقت مجھے اس شادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔ عارف
بہرہ دوسرے تیسرے دن مجھے کال کر کے پوچھتا تھا اور میں ہر

بار اسے ٹال دیتی تھی۔ مگر اب میرے لیے بھی مشکل ہوتا جا
رہا تھا۔ یہ دن دن بعد کی بات تھی۔ اس دن باا دکان پر گئے
تھے خود انور گھر میں تھا۔ وہ ناشتا کر رہا تھا۔ وہ لاہور سے
جاتا تھا کیونکہ سپلائی پر عام طور سے انور اور منور ہی جاتے
تھے اس لیے وہ دیر سے جاتے تھے۔ میں چائے نکال رہی تھی
کہ انور کے موبائل پر کال آئی اس نے ریسیو کی۔

”ہلو... ہاں... کیا؟“ وہ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بابا کو...“
”انور... کیا، کیا ہوا؟“ امی نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

”کسی نے بابا پر فائرنگ کی ہے۔“ اس نے غضب
ناک لہجے میں کہا اور تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ پھر وہ باہر
آیا تو اس کے ہاتھ میں کلاشکوف تھی۔ امی نے اسے روکے
کی کوشش کی مگر وہ انہیں دھکیلا ہوا نکل گیا۔ میں اس کے
پیچھے بھاگی تھی۔ جب میں باہر گئی تو وہ گاڑی میں
بیٹھ کر جا رہا تھا۔ پیچھے امی دھماکیں مار کر رو رہی تھیں۔ میں
واپس آئی اور پریشانی میں وہ واڑہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ امی
کی حالت خراب تھی اور میں انہیں سنبھال رہی تھی۔ ان کے
لپے پانی نہ رہی تھی کہ انہوں نے گھر کے سامنے کسی بھاری
گالی کا انجن خریدا۔ میری پچھلی حس نے خبردار کیا اور میں
رواڑے کی طرف لپکی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں
رواڑہ اندر سے بند کرتی وہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو
ڈھانچا پش افراد اندر آئے۔ میں پلٹ کر واپس بھاگی تو ان
میں سے ایک دھماکا۔

”میں بے ہوش ہوں۔“

دوسرا گالیوں دیتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کی زبان
مکندگی اگل رہی تھی۔ اس سے پہلے میں اندر داخل ہو کر
کمرے کا دروازہ بند کرتی اس نے غضب سے میری چوٹی
کچڑ کر مجھے وہیں کچن میں پھینک دیا۔ پیچھے گرتے ہی میرا سر
بہت زور سے فرش سے ٹکرایا اور مجھے چکر آئے۔ لگے۔ پھر
مجھے بس اتنا یاد تھا کہ کوئی مجھے اٹھا کر شانے پر ڈال کر لے جا
رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو
میں ایک تنگ دھار یک اور گرم کپڑی میں فرش پر پڑی تھی۔
میرے سر کی چوٹ سے خون بہہ کر میرے چہرے تک آ گیا
تھا اور جب میں بے شعور تھی تو یہ شرخاک آکھشت ہوا کہ
میرے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شے بے حد
خوف کے عالم میں سڑ سڑ کر وہاں کے کونے میں گھس کر
بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لباس اٹھانے کے علاوہ
میرے ساتھ اور کوئی رہی ہوئی نہیں ہوئی تھی لیکن ایک

کنواری لڑکی کے لیے یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ اسے جیسے سب لباس کھدایا جائے۔

میں اتنی خوفزدہ تھی کہ چاہنے کے باوجود بھی کھل کر نہیں رو سکی تھی۔ میں دہائی دہائی سسکیاں لے رہی تھی۔ نہ جانے میں کہاں تھی اور مجھے یہاں لانے والے کون لوگ تھے۔ ان کے غلط عزائم تو میری بے لپاسی سے واضح تھے۔ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ یہ سوچ کر میرا دل چادر ہاتھ کی زینٹ میں بٹنے لگا اور مجھے اپنے اندر سولے۔ میں اس رات سے گزرنے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے دل کی گہرائی سے غلبہ سے دعا کی کہ مجھے رات کی زندگی کی بجائے عزت کی موت دیدے۔ یہ شاید غلویت کی گھڑی تھی کیونکہ چند منٹ بعد کوٹھری کا دروازہ کھلا اور میں خود میں حریہ مٹ گئی۔ خود کو آنے والے کی نگاہ سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی اگرچہ میں کتنا چھپا سکتی تھی؟ مگر آنے والی عورت تھی۔ اس نے اندر آ کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور میرے پاس آ کر ایک جھڑا میری طرف بڑھایا۔

"اوی یہ کیوں ہو۔"

میں نے جھپٹ کر اس سے لباس لیا اور جلدی جلدی بہن لیا۔ اسی دوران میں عورت بند دوسری طرف کر کے کھڑی رہی تھی۔ کپڑے پہن کر مجھے ایسا سکون ملا کہ اس وقت وہ عورت مجھ سے جان بھی مانگتی تو میں ان کپڑوں کے بدلے خوشی سے دے دیتی۔ میں نے لہڑی آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں۔"

"یہ سائیں کمال کا گھر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔"

"وہ مجھے اٹھا کر کے لائے۔"

"سائیں کے ساتھ چار آدمی اور تھے۔" عورت نے کہا۔ "اوی حیرالہاس ہانگل پھٹ گیا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے چلنے کے بعد اٹھا دیا۔ اب یہ دوسرا لباس لائی ہوں۔"

میرا لباس یقیناً ان درندوں کی دست درازی سے پہنا تھا لیکن یہ جان کر مجھے اطمینان ہوا کہ میرا لباس اس عورت نے اٹھا تھا اور اب مجھے دوسرا جوڑا مل گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور لجاہت سے بولی۔ "تم نے مجھے اوی کہا ہے۔۔۔ اب اوی میں گرد کھاؤ۔۔۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔"

اس نے بھی میں سر ہلا دیا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

"اب مجھے ہر لادہ ہانگل کا تھیل دے دو۔ میں عزت دینے کی بجائے جان دینا چاہتا ہوں۔"

عورت تقریباً تین گھنٹوں کی اور بہت خوب صورت

تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر سر ہلا دیا۔ "تھیک ہے میں کچھ کرتی ہوں مگر تو خود ہانگل مت کرنا ورنہ۔۔۔"

"میں چپ رہوں گی۔" میں نے جلدی سے کہا پھر ہچکاتے ہوئے پوچھا۔ "تم لوگ کس برادری سے ہو؟"

عورت کے جواب نے تصدیق کر دی تھی وہ اور سائیں کمال تھاری خالف برادری سے تھے۔ اپنی طرف سے لڑا سکون ہوا تو مجھے ہانپا اور الور کا خیال آیا۔ یہ کام کرنے والوں نے جیتنا پوری تھاری سے کیا تھا۔ ایک طرف انہوں نے ہانپا پر حملہ کیا اور جب اور گھر سے نکلا تو وہ پیچھے سے اندر گھس آئے اور مجھے اٹھا لائے۔ پانچویں امی پر کیا گزری ہوگی؟ ابا کیسے ہوں گے؟ یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا اور میں بدونے لگی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اپنی فکر لائق ہو گئی تھی اگرچہ اس عورت نے کہا تھا کہ وہ کچھ کرے گی لیکن وہ بہر حال ہے اس عورت تھی۔ لیکن ہے وہ میری مدد نہ کر پاتی اور مجھ پر وہ سب گز رہا تھا جس کا سوچ کر میرا دماغ دانا کاغذ رہا تھا۔ اس رات سے موت بہت آسان اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے اور یہ میری زندگی کے مشکل ترین دو گھنٹے تھے جو دو صدیاں بن کر گزرے۔ ابھی دل بہت تیز دھڑکتا اور ابھی ایسا لگا جیسے رکت گیا ہو۔

ایک بار پھر دروازہ کھلا تو میں آنے والے حالت کے لیے تیار ہو گئی۔ اندیشہ تھا کہ اب کوئی مرد آئے گا مگر وہی عورت تھی اس نے اشارے سے مجھے باہر آنے کو کہا اور میں حیرتی سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آئی۔ یہ ایک پرانا حویلی تھا مکان تھا اور کوٹھری اندر کمرے میں تھی۔ عورت نے ہاتھ میں کیڑوں کے جوڑے تھام رکھے تھے اور یہ میرے لیے تھے کیونکہ گھر میں میرے بیروں میں چلنے والی جو لانے کے دوران میں کھیں گری تھی۔ عورت مجھے گھر کے پچھلے حصے میں لائی اور جوتے پہننے کو دے۔ یہ درازا تھک تھے لیکن مجھے ننگے پاؤں نہیں چلنا پڑتا۔ میں نے جوتے پہنتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "یہ کون کی جگہ ہے۔"

اس نے حیدرآباد کی ایک جگہ کا نام بتایا۔ مجھے یہی آئے ہوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ جگہ میرے گھر سے خاصی دور تھی۔ میں نے عورت سے کہا۔ "میں اتنی دور کیسے جاؤں گی؟"

"یہاں سے دس گھنٹے مل جاتے ہیں۔" وہ بولی اور پھر ایک چادر میرے حوالے کی۔ "اسی سے خود کو چھپا لیتا۔"

یہ مکان کا پچھلا حصہ تھا جو ایک پھولی سی گندی گلی میں کھل رہا تھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے کھڑے گاڑیوں جیسے مکانات تھے۔ درمیان میں گنداپانی بہہ رہا تھا۔ میرے باہر آتے ہی عورت لے دو تھوڑے بندہ کر لیا اور میں اندازے سے ایک طرف بڑھ گئی۔ یہ پرانے حیدرآباد کا علاقہ تھا۔ پھولی پھولی پھولی بھلیوں کی سی گلیاں تھیں۔ دن کا وقت تھا اور گرمی شدت کی تھی اس لیے گلیاں دیران تھیں۔ بہت دیر بعد جا کر میں ایک سڑک پر لگی اور ایک رکشا روک کر اسے اپنے محلے کا تالا اس نے پیشے کا اشارہ کیا۔ "چلو بی۔"

میں بیٹھ گئی یہ سوچے بغیر کہ میرے پاس رقم کے نام پر ایک سٹرک بھی نہیں تھا۔ مگر اس وقت مجھے جلد از جلد اس جگہ سے نکل جانے کی فکر تھی جب گلیوں میں چل رہی تھی تب بھی یہ دھڑکاٹا ہوا تھا کہ ابھی پیچھے سے وہی لوگ نہ آ جائیں اور مجھے پھر پکڑ کر لے جائیں۔ دیکھنے والے کو میں گھبراہٹ کر بھی کر رہی تھی۔ یہ سبھی ایسی خیال نے تعویذ دی تھی۔ یہ جگہ میں نے پہلی بار دیکھی تھی لیکن آدھے گھنٹے بعد رکشا ہمارے علاقے میں داخل ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ میں اسے گلیوں کا قاتی رہی اور پھر منٹ بعد رکشا گلی میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کا جھوم دیکھ کر ہراساں ہو گیا۔ یہ سب مرا تھے اور جب رکشا گھر کے سامنے دکا تو اندر سے روکنے دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اتری تو چاروں کے باوجود لوگوں نے پہچان لیا۔ مختلف آوازیں بلند ہوئیں جو میری آمد کا اعلان کر رہی تھیں۔ میں انہیں نظر انداز کر کے اندر داخل ہوئی تو اسی عورتوں کے درمیان گھری بیٹھنے کے عالم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ روتے والی دوسری عورتیں تھیں۔ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا... کیا ہوا ہے یہاں؟"

"مجھے لے جانے والوں نے نہیں تالا۔" ایک عورت طنز پر لہجے میں بولی۔ "وہ تیرے باپ اور بھائی کو مار کر یہاں آئے تھے تجھے لے جانے کے لیے۔"

یہ سنتے ہی میرا سر جو پہلے ہی چکرار رہا تھا یک دم تار کی طرح ڈوب گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو باپ اور بھائی کے لاشیں آٹکی تھیں۔ اسی ان سے لپٹ کر دور رہی تھیں۔ مکان میں خرید لوگوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ باپا کے دو نزدیک کے سبھی رشتے دار آگئے تھے اور رات کے قریب خالہ خانو بھی آگئے۔ تین تین لگے دن صبح کے وقت طے پائی تھی۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا اور اب گھر کے اندر کے

محاطات میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سب ہی مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سوائے خالہ کے کسی عورت نے مجھ سے باپا اور بھائی کی تعویذ نہیں کی تھی۔ اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا لیکن جب میں نے کچھ عورتوں کے منہ سے لفظ کادی سنا تو میں چونکی تھی اور جب مجھے پتا چلا کہ یہ مجھے عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ میں ہراساں ہو گئی۔ میں ابھی طرح جانتی تھی کہ اگر کوئی لڑکی یا عورت اس طرح غیر مردوں کے گھنے میں رہ کر آئے تو بے آبرو سمجھا جاتا ہے اور ہمارے رواج میں اسے گندی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

"نہیں میں تو پاک دامن ہوں۔" میں نے خود کو تسلی دی۔ رات کے وقت محلے والے ہاں چلے گئے اور صرف کچھ رشتے دار خواہن تھیں۔ خالو اور دوسرے مردوں نے لاشیں گرمی کی وجہ سے سرد خانے میں رکھوا دی تھیں۔ صبح انہیں وہیں سے تھلا کر لودر میں پہنا کر لایا جاتا اور چہرہ کرا کر قبرستان لے جاتے۔ خالو جب یہ کام نفاذ کرتے تو وہ بھی کچھ پریشان تھے۔ انہوں نے خالہ سے چپکے سے بات کی اور خالہ اسی کے پاس آئیں۔ میں وہیں تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "رہا اب مجھے ہانچی سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" مجھے فوراً خیال آیا۔ "میرے ہارے میں؟"

خالہ ہنسی لگائیں۔ "ہاں۔"

"خالہ میرے سامنے بات کریں۔"

"تیرے خالو تارے ہیں کہ باہر کچھ لوگ کہہ رہے کہ یہ برادری کی عزت کا معاملہ ہے۔"

"اگر عزت کا معاملہ ہے تو یہ جا کر ان لوگوں سے نمیش جو مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے اور جنہوں نے باپا اور بھائی کو مارا ہے۔" میں نے رخ لہجے میں کہا۔ "میں جانتی ہوں وہ مجھے کادی کر کے مارنے کو کہہ رہے ہوں گے لیکن خالہ میں پاک دامن ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے خالہ اور امی کو ساری بات قاتی۔ انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ ویسے بھی دونوں گھر بے کار تھیں اور انہوں نے جان لیا تھا کہ مجھے کسی نے نہیں چھوڑا ہے، بس امی نے یہ پوچھا کہ میرے کپڑے کہاں گئے تو میں نے بتایا کہ وہ پھٹے گئے تھے تو اس ٹیکہ دل عورت نے مجھے اپنا جوڑا دے دیا۔ خالہ نے خالو کو بلا کر سب بتا دیا۔ وہ بولے۔

"بات ہمارے ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے اصل مسئلہ ان چالوں کا ہے۔"

"ہم ہائی اور باب کو ساتھ لے جاتے ہیں۔" خالد نے کہا۔

"میں نے بھی یہی سوچا ہے بعد میں اس مکان اور دکان کا معاملہ دیکھتے رہیں گے۔"

"بس تو ہم سوئم کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔" خالد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اسی اگرچہ اب ہوش میں تھیں مگر ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ اس خطرے کو محسوس کر سکتیں۔ خالد کی بات پر انہوں نے تڑپ کر کہا۔

"صبر بھائی جلدی نہیں جائیں گے۔ یہاں میرے شوہر بونچوں کی لاشیں ہیں۔" وہ روئے گئیں۔ "میں ان کی قبروں کو کیسے چھوڑ کر جاؤں میرا تو سب لٹ گیا ہے۔"

"ہائی آپ رہا باب کی طرف دیکھیں اب یہ خطرے میں ہے۔ برادری والے اسے گاڑی کر کے مارنے کی بات کر رہے ہیں۔"

اسی چمک سکیں اور جلدی سے مجھے چنے سے لگا لیا۔ "نہیں میں اپنی لاش کے قریب کسی کو آنے نہیں دوں گی۔ کسی کو ساتھ نہیں لگائے دوں گی۔ میرے پاس اب اس کے سوا ہے ہی کیا؟"

"آپ جانتی ہیں تا یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ کسی کی نہیں سنیں گے۔ بس اپنی من مانی کریں گے۔" خالد اسی کو سمجھاتے ہوئے کمرے میں شے لے گئیں۔ میں اپنے کمرے میں آئی۔

یہ سچ ہے کہ خالو کی بات نے مجھے ہر اسامی کر دیا تھا۔ میں اپنی برادری والوں کو جانتی تھی۔ انہوں نے یہ بات کی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ میرے بابا اور بھائی نہیں رہے تھے اور ان کو روکنے والا کوئی نہیں تھا لیکن اگر وہ ہوتے تب بھی وہ برادری کا ساتھ دیتے، مجھے نہیں بچاتے۔ ہمارے ہاں یہ بہت بڑی بات تھی کہ لڑکی کہیں اور رہ کر آئے۔ اسے لازمی ہے آکر سکھا جاتا تھا اور اس سلسلے میں میڈیکل رپورٹ کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ایک بار امی نے مجھے بتایا تھا کہ بابا کے آہل علاقے میں ایک باپ نے اپنی چودہ سال بیٹی کو زرا سے قہرے پرائیڈوں سے مار مار کر قتل کر دیا تھا۔ وہ صبح کے وقت جلاسنے کے لیے لکڑی لینے گئی تھی اور وہاں ہی میں لگی میں آتے ہوئے گل کا ایک لڑکا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ باپ یہ مظلوم دیکھ رہا تھا اور اس نے نیچا پر بدکاری کا الزام لگاتے ہوئے اسے مار دیا۔ یہ واقعہ سن کر میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ کئی دن کا لچ ہی نہیں لگتی تھی۔

خوف کے ساتھ اطمینان کی بات یہ تھی کہ خالو اور خالد ہمیں یہاں سے لے جا رہے تھے۔ اگرچہ محفوظ تو ہم کراچی میں بھی نہیں ہوتے۔ منور اور اسی لڑکی کو کراچی کے انتہائی محفوظ علاقے میں گھر میں گھس کر قتل کیا گیا تھا۔ مگر یہاں تو خطرہ میرے چاروں طرف تھا۔ میں لپٹی ہوئی تھی اور خیرہ آنکھوں سے درد تھی۔ اچانک میرے سواہل نے تل دی۔ میں نے اٹھا کر دیکھا تو مارل کا نمبر تھا۔ میں نے اس کا نمبر محفوظ نہیں کیا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر وہ مجھے ہائی یاد تھا۔ عجیب بات تھی سچ کر وہ انہیں آنے کے بعد مجھے ایک بار بھی حارث کا خیال نہیں آیا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ اب اس کی کال آئی تو مجھے خیال آیا۔ پہلے میں نے سواہل ساکھٹ پر کیا اور پھر کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کال ریسیڈ کی۔ "ریلو۔"

"رہا باب۔" حارث نے سمجھ لیا۔ "تم کل اپنی بابا اور بھائی کی تدفین کھل ہونے سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کیوں؟" میں چکی۔ "کیونکہ برادری نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تدفین سے آتے ہی بڑے شخص کے طور تم جاتی ہو وہ کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔"

میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ "وہ مجھے کاری قرار دیں گے؟"

"بالکل اور اس کے بعد تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کوئی تمہیں بچا نہیں سکے گا۔ اس سے پہلے بھاگ جاؤ تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔"

"حارث تم مجھے نہیں بچا سکتے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"نہیں۔" اس نے صاف گولی سے کہا۔ "اب میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

حارث نے فون بند کر دیا تھا اور میں ہر اسامی ہی ہٹھی رہ گئی۔ حارث برادری کا فرد تھا اور وہ سب جانتا تھا۔ یقیناً اس کے سامنے بات ہوئی تھی تب ہی وہ مجھے اتنے یقین سے بتا رہا تھا۔ اسی کی حالت ایسا نہیں تھی کہ ان سے بات کی جاتی اس لیے میں نے خالد سے بات کی۔ وہ سو گئی تھیں میں انہیں جگا کر دوسرے کمرے میں لائی اور آنے والے خطرے کے بارے میں بتایا، البتہ میں نے حارث کی بھانے محلے کی ایک لڑکی کا ذکر کیا جو اتفاق سے یہ بات جان

مکلی تھی۔ خالو بھی ہراساں ہو گئیں۔ انہوں نے کہا: "میں تیرے خالو سے بات کرتی ہوں وہی کوئی مل نکالیں گے۔" یہ معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑا مسئلہ ہی قاتلیانا کا ہے۔ اس کے سامنے انسانیت اور مذہب تک کو کھم سمجھا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد خالو خاموشی سے میرے کمرے میں آئیں۔ "رہا اب اپنی چیزیں اور سامان تیار کر لو۔"

"کیا ہم ابھی جا رہے ہیں؟"

"نہیں۔" خالو بولیں۔ "تیرا اور ہاتھی کا سامان اور ضروری چیزیں ہم تیرے خالو کی گاڑی میں رکھ رہے ہیں۔ مگلی میں پہرہ ہے۔ محلے کے لڑکے پہرے پر ہیں۔ صبح جنازے کے وقت تم ہماری گاڑی کی ڈک میں چھپ جاؤ گی۔ قبرستان کے باہر جب سب چلے جائیں تو تم اتر کر دیکھو۔ اس آواز پر پہنچو گا۔ وہاں کراچی جانے والی کبھی بس پر بیٹھ جانا اور سہراب گوٹھ میں اتر کر اس پتے پر چلنا چاہا۔ جب ہم آئیں گے تو موقع دیکھ کر تمہیں لے آئیں گے۔"

خالو نے مجھے ایک کاغذ دیا جس پر چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنا سامان تیار کیا۔ سامان لینے ممکن نہیں تھا۔ بس چند جوتے اور اہم چیزیں خاص طور سے ڈاکوئٹس رکھ لیے۔ کچھ رقم اور زبردست ہتھیار بھی رکھ لیے۔ خالو نے کہا کہ ہاتھی سامان وہ لے آئیں گے۔ ممکن ہے انہیں آئے میں دیر لے لے اس لیے میں گھبراؤں نہیں۔ خالو کو مکان اور مکان کا بندوبست بھی کرنا تھا اس لیے دیر ہو سکتی تھی۔ خالو نے مجھے ایک سم بھی دی کہ میں اپنی سم کی بجائے اسے اپنے سواگل میں لگا لوں۔ وہ اسی پر مجھ سے رابطہ رکھیں۔ میں اسی سم سے بہ وقت ضرورت ان سے رابطہ کر سکتی تھی۔ جنازے کی نو بجے اٹھانے تھے۔ بابا کی یک پہرہ کھڑی ہوئی تھی۔ ہماری گاڑی کراچی میں پولیس کی تحویل میں تھی اس لیے خالو کی کارگاہ میں کھڑی کر دی گئی تھی۔ صبح روشنی ہونے سے پہلے خالو نے مجھے لے جا کر ڈک میں چھپا دیا تھا۔ روشنی ہونے کے بعد میری کم شدگی کا ڈراما ہونا تھا اس کے بعد میری تلاش کا ڈراما ہوتا۔

امکان یہی تھا کہ کار کی ڈک کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کوئی توجہ دیتا اور میں پکڑی جاتی۔ مگر ابھی خاصی تھی اور کچھ علی ویر میں میرا حشر ہو گیا جب کہ مجھے کئی گھنٹے اس میں گزارنے تھے۔ خالو نے مجھے چھپانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ سواگل واپس آنا اور رکھوں اور جب خالو مجھے نکل دیں تو میں ڈک سے نکل

آؤں۔ بیگ کے ساتھ ایک مہاپا بھی تھا۔ میں مہاپا پہن کر دوسروں کی نظروں سے محفوظ ہو جاتی۔ مگر تب تک مجھے ڈک میں رہنا تھا۔ یہ چند گھنٹے میں نے کیسے گزارے یہ میں ہی جانتی ہوں۔ باہر کی ہر میری تلاش کا شہرہ تھا۔ خالو نے اپنی کوئی نہیں بتایا تھا اسی لیے ان کے دہانے میں کج کی تڑپ تھی اور وہ دوسروں سے کہہ رہی تھیں کہ میری رہا اب کو تلاش کر کے لاؤ۔ باہر بھی اس حوالے سے بھاگ دوڑ جاری تھی۔ ایک بار خالو چند آدمیوں کے ساتھ اندر آئے وہ شب ظاہر کر رہے تھے کہ مجھے شاید ان ہی لوگوں نے اغوا کیا ہے جو پہلے بھی اٹھانے گئے تھے۔

مگر مردہاں سے اختلاف کر رہے تھے کس کا سچ ہے میں کون بھاں تک آ سکتا ہے؟ گویا یہ بات درست تھی کہ پہلے ہی پہرہ لگا دیا گیا تھا کہ میں فرار نہ ہو سکوں۔ خالو نے کہا کہ جنازہ اٹھا لیتے ہیں اس کے بعد ایف آئی آر درج کرا دیں گے۔ کچھ دیر میں ایس۔ پیس میں بابا اور بھائی کی منیجر آئیں۔ گھر میں ایک بار پھر رونے دھونے کا شور بلند ہوا۔ میں ڈک میں اپنے منہ میں دو پٹا تھوس کر رہی تھی کہ آواز ڈک سے باہر نہ جائے۔ نو بجے جنازے اٹھے تو خالو بھی اپنی کار لے کر نکلے تھے۔ ان کی کار میں کئی افراد اور تھے کیونکہ ان کے ہاتھیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ قبرستان ہمارے محلے سے کچھ ہی دور ہے۔ گاڑی خالو نے اسی جگہ روکی جو قبرستان کی گزرو گاہ سے دور تھی۔ یہ انہوں نے میری آسانی کے لیے کیا پھر سب مرد جنازے لے کر اُٹھ چلے گئے۔ میں نے موبائل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد موبائل واپس آئی ہو۔ میں نے دیکھا خالو کا فیر آ رہا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ میں نکل جاؤں۔ ڈک احمد سے آرام سے نکل جاتی تھی میں نے کھولا اور اپنا بیگ اور مہاپا لے کر باہر آئی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے ایک طرف چل پڑی۔ پھر ایک جگہ موڑنے دیکھ کر میں نے مہاپا پہن لیا۔ رکشا مجھے چند منٹ بعد مل گیا اور اس نے مجھے پندرہ منٹ میں بس آواز پر پہنچا دیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کراچی جانے والی ایک بس بالکل تیار تھی اور اس میں جگہ تھی۔ میں سوار ہو گئی گت ہو لیا۔ سواگل بیجے بس حرکت میں آئی اور گیا وہ بیجے تک میں حیدر آباد کی حدود سے نکل چکی تھی۔ اگرچہ محفوظ اب بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے بس سہراب گوٹھ پہنچی تو میں وہیں اتر گئی۔ کراچی میں موسم اچھا تھا مجھے اچھا

لگا۔ مگر یہ اتنی شدت کی نہیں تھی۔ میں نے چند رستے والوں سے ہمت کی اور جس نے بچے پر پہنچانے کا دھڑکی کیا اس کے رستے میں بیٹھ گئی۔

بنا ایف بی ایم یا کو تھا جو یہاں سے لڑا اور نہیں تھا اور مجھے ایک غیبت تک جانا تھا۔ گیسٹ پر سو جو دنگا نے میری رضامندی کی اور میں دوسری منزل پر واقع اس غیبت تک پہنچی اور کال پیل بجائی تو ایک خاتون نے دروازہ کھولا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تذبذب کے ساتھ اپنا تعارف کرایا اور خالہ کا حوالہ دیا تو خاتون نے مجھ کو جوش ہو گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”مجھے صیہ کی کال آگئی تھی تم باہر کیوں کھڑی ہو آؤ اندر آؤ۔“

غیبت اندر سے صاف متھرا اور سہا سہا ہوا تھا۔ ”میرا نام ریحانہ ہے اور میں صیہ کی بچپن کی دوست ہوں۔ ہم اسکول سے کالج تک کلاس لیں رہے ہیں۔ یہ عجیب اتار دو۔۔۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ میری بیٹیاں کالج سے آنے والی ہیں اور یہاں شام کو آتے ہیں۔“

میں نے سکون محسوس کیا تھا۔ کی میں بند بند میرا حشر ہو گیا تھا۔ ریحانہ آئی نے غسل کا مشورہ دیا اور مجھے غسل خانہ دکھایا۔ جب تک میں نہائی دھوئی ریحانہ آئی کی دہلیز پر بیٹیاں کالج سے آگئی تھیں۔ ایک میری ہم عمر تھی اور دوسری دوسرائی چھوٹی تھی۔ ریحانہ آئی کی طرح فن کی بیٹیاں بھی دوستانہ فطرت کی تھیں اس لیے میں تین دن ان لوگوں کے ساتھ بہت سکون سے رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بابا اور انور کا دکھ ہلکا ہوتا تھا مگر اب مجھے ان کی فکر ہو رہی تھی۔ خالہ دن میں ایک دو پارلیس ایم ایس کرتی تھیں کہ سب ٹھیک ہے اور وہ جلد کراچی آجائیں گی۔ لیکن انہیں آنے میں تین دن لگ گئے تھے۔ خالو نے برادری والوں سے مل کر مخالف برادری پر میرے انخواہ کی ایف آئی آر درج کرا دی تھی۔ اگرچہ وہ ایک بار مجھے خواہ کر کے تھے اور اس قابل تھے کہ ان پر ایف آئی آر کڑائی جاتی لیکن اس بار یہ ہیف آئی آر دراصل مجھے میری اپنی برادری سے بچانے کے لیے کوہنہ لگی تھی۔

مکان بند کر دیا تھا اور دکان فروخت پر لگا دی۔ امی کا ارادہ تھا کہ دونوں چیزیں فروخت کر کے ہمیشہ کے لیے کراچی آجائیں گی۔ خالو نے ایک دیکل کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو درافت کی منتقلی کا کام کرواتا اور اس کے لیے امی کا حیدر آباد جانا بھی ضروری نہیں تھا۔ چار دن بعد جب

میں امی سے ملی تو وہ مجھ سے ٹپٹ کر رہ گئی تھیں۔ معاملہ تازہ تھا اور اس کا خدشہ تھا کہ برادری واسلے چھپا اور جاسوسی کرتے کہیں کراچی تک نہ پہنچے آئیں۔ اس لیے مجھے چھپا کر خالہ کے گھر تک لایا گیا تھا اور بہت دن میں اندر والے کمرے میں رہی۔ امی مجھے باہر تو کیا، مگر اور ہمت پر بھی نہیں جانے دیتی تھیں۔ وہ مہینے بعد سب امی کے نام ہو گیا تو انہوں نے سب فروخت کر دیا۔ غیبت میں بیٹے کی وجہ سے قیمت کم ملی تھی۔ پھر بھی دکان، مکان اور گاڑی کی قیمت کے مل کر ایک کروڑ روپے مل گئے تھے۔

امی نے خالہ اور خالو کے مشورے سے ان کے بچکے کی چھت پر دو کمرے اور ایک لائونج بنوایا جس میں کچن بھی تھا۔ اس میں دروازہ خرچ نہیں آیا تھا۔ باقی رقم سے امی نے خالو کے مشورے سے پھر اچھے پرہیزگار گھرانے میں چل بسیں جہاں پر کرائے پر چڑھا دیے۔ ان سے ماہانہ چالیس چالیس ہزار روپے ملنے لگے تھے جو ہم ماں بیٹی کے لیے کافی تھے۔ اس طرف سے مطمئن ہوا تو امی کو میری فکر لاحق ہوئی۔ ان ہی دنوں صائم کی شادی کے سلسلے میں ہمت ہو رہی تھی۔ اس کی عکس پر تعظیم عمل کر لی تھی۔ جب کہ صائم چاب کے ساتھ آگے لی انٹی ڈی کی تیاری کر رہے تھے۔ خالہ اور صائم دونوں عی شادی کے لیے تیار تھے۔ علیچا نے تاریخ طے ہونے سے پہلے صائم کی شادی کی شاہجگ شروع کر دی تھی۔ کئی مہینے گزر جانے کے بعد مجھے اعتماد آ گیا تھا اور میں بھی کبھی باہر چلی جاتی۔ لیکن باہر جاتے ہوئے میں مکمل حبا ئے اور نقاب میں ہوتی تھی۔ شروع میں احتیاط کی وجہ سے ایسا کیا لیکن بعد میں مجھے عادت ہو گئی۔

اس روز بھی میں اور علیچا اپنی گاڑی میں تھے۔ خالو نے کوشش کر کے ہماری کار پولیس کی تحویل سے نکلوا دی تھی۔ اس کا حشر ہو گیا تھا۔ نرمت پر اچھا خاصا فرج آیا تھا۔ مگر ہمیں آنے جانے کے لیے اپنی گاڑی مل گئی تھی۔ میں نے ارا نیوٹنگ سیکھ لی تھی لیکن عرف کا لونی کی سڑکوں پر چلائی تھی۔ باہر جاتے ہوئے علیچا ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ ہم نزدیک ہی ایک شاہجگ مال تک آئے۔ وہاں کئی گھنٹے خریداری میں گزار دیے اور جب باہر نکلے تو میں چونگی تھی۔ ہماری گاڑی کے پاس ایک جانا بچھانا گھس کھڑا تھا اور وہ ہماری برادری کا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے اسے پہلے دیکھ لیا اور ہراساں ہو کر علیچا کو بھی بتا دیا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ”تم یہاں رکو میں اس سے پوچھ سکتی ہوں کہ یہ

ہادی گاڑی کے پاس کیا کر رہا ہے؟

”نہیں تم انہیں پانتی نہیں ہو بہت وحشی ہوتے ہیں تمہارے ساتھ کوئی مس لی ہو نہ کریں۔ اس لیے بات کرنے کے بجائے تم گاڑی لے کر بہ ظاہر یہاں سے جاؤ لیکن مال کے پیچھے والے حصے میں آجانا۔“

علینا نے ایسا ہی کیا وہ اس شخص کو نظر انداز کر کے سامان سمیت گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی پارکنگ سے نکال کر لے گئی۔ وہ شخص ہانپن نظر آنے لگا کیونکہ اسے میری تلاش تھی۔ علینا کا چہرہ کھلا تھا۔ اس نے صرف جلیا ہن رکھا تھا۔ جب تک میں شاہجی مال کے پچھلے حصے میں پہنچی وہ گاڑی لے کر آگئی تھی اور میرے جیسے ہی اس نے گاڑی دوڑا دی۔ کالونی آئے تک ہم بار بار پیچھے دیکھتے رہے کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا ہے۔ مگر کچھ کرنا ہمارے دم میں دم آیا لیکن جب میں نے اسی اور خال کو دیکھا تو ان کا دم خشک ہو گیا تھا۔ شام کو خالو آئے تو اس سلسلے میں مینک ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ مجھے یہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ صائم بھی اس کا پیرا آگئے تھے اور انہوں نے مشورہ دیا۔ ”رہا ب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آسٹریلیا بھیج دیں۔“

قالہ نے اعتراض کیا۔ ”وہاں بیاہیلی کیسے رہے گی؟“
”بیاہ کیسے رہ رہی ہے؟“ صائم نے اپنی منگیتر کا نام لیا۔ ”ایسے ہی رہا ب بھی رہے گی یہ یہاں بالکل محفوظ ہو گئی۔ میں اس کا یہاں داخلہ کروا دیتا ہوں اس کی بیاہ پر اسے ویزا مل جائے گا اور یہ یہاں آ جائے۔“

ای مجھے اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھیں مگر برادری کے آدمی کا یہاں پناہ جانا ایسا بات نہیں تھی جسے نظر انداز کیا جاتا اس لیے وہ مجبوراً مان گئیں۔ صائم نے سلی دی تھی کہ اگر رہا ب کو آسٹریلیا کی شہریت مل گئی تو اسی ہی وہاں آسکیں گی جیسے صائم کو مل گئی تھی تو اب خالہ اور خالو وہاں جا سکتے تھے۔ بلکہ صائم نے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی خالو رچاڑ ہوں گے وہ سب کو وہاں بلا لیں گے۔ اس وقت تک علینا کی شادی ہو جاتی۔ اگرچہ علینا کی خواہش تھی کہ وہ بھی آسٹریلیا جائے مگر خالہ اس کے لیے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ انی کے مانتے کے بعد خالو نے سب سے پہلے میرا پاسپورٹ بنوایا اور اس دور میں صائم نے سڈنی کی ایک یونیورسٹی میں میرا ماسٹر میں داخلہ کرا دیا۔ میں نے یہاں ویزے کے لیے درخواست دی اور ساتھ ہی انگلش لیٹکوئج کورس بھی کرنے لگی کیونکہ گریجویشن میں بہت اچھے مارکس کے باوجود میری

انگریزی اتنی اچھی نہیں تھی۔ صائم نے بتایا تھا کہ مجھے وہاں جا کر پچھلے دو بیٹے ہوں گے اور جب میں ان کے معیار پر پورا اتروں گی تو مجھے ماسٹر میں داخلہ ملے گا۔

مجھے ویزا مل گیا اور میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ ان ہی دنوں اچانک صائم کی منگیتر صبا نے اس سے شادی سے انکار کر دیا۔ صائم اور خالہ کے گھر والے حیران رہ گئے تھے۔ یہ اطلاع ہمیں صبا کے گھر والوں سے ملی تھی۔ صائم نے صبا سے پوچھا کہ اس نے کیوں انکار کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ اس کا دل بہن دل گیا ہے اب وہ صائم سے شادی نہیں کر سکتی ہے۔ صائم نے کھونج لگا لگا کہ اس کے پس پشت کیا بات ہے تو اسے بتا چلا کہ صبا جہاں جا رہی تھی وہاں اس کی ایک مقامی آدمی سے ملاقات ہوئی اور وہ صائم کو بھول کر اس کے چکر میں پڑ گئی۔ صائم کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ خالہ اور باقی سب بھی شاک میں تھے۔ علینا نے تو خاص تیاری بھی کر لی تھی۔ خود میں بھی دگی تھی۔ خالہ کے گھر کی مکمل ٹوشی تھی اور وہ بچوں اچانک لیا میٹ ہو گئی۔

یہ سب ہو جانے کے باوجود میرے ذہن میں صائم کا خیال نہیں آیا تھا۔ انی اور خالہ نے آپس میں کچھ بات کی اور ایک رات انی نے مجھ سے صائم کے بارے میں پوچھا۔ ”بھئی جا رہی ہے کہ اس کی جلد از جلد شاہی کر دی جائے اور وہ پہلے ہی نہیں جا رہی تھی۔“

خود میرے لیے اس سے انہی بیاہ لیا گیا ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ہاں کر دی اور میری مدد انی سے پہلے صائم سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ اب وہ اپنی بیوی کو رہیمہ کہتے۔ اس خوشی کے موقع پر سب کسی قدر مسرور تھے کہ وہ ہماری شادی کو اس بھر پر اعداد میں نہیں کر سکیں گے جس طرح کرنا چاہتے تھے اور وجہ یہ تھی کہ میں تقریباً دوپوش زندگی گزار رہی تھی۔ کل میری آسٹریلیا روانگی ہے اور جانے سے پہلے میں اپنی یہ سچائی اپنے پسندیدہ بڑے سرگزشت کے لیے بھیج رہی ہوں مجھے امید ہے یہ شائع ہوگی اور لوگوں کو مزہ پڑے گا کہ بعض لوگوں کے لیے اس ملک میں رہنا ہو رہا ہے رہنا کتنا دشوار بنا دیا جاتا ہے اور انہیں وطن چھوڑ کر دیار غیر میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ امکان ہے کہ میں بھی اب یہی واہیں نہیں آسکوں گی۔ صائم نے سوچ لیا ہے کہ وہ ایک سال کے اندر باقی سب کو بھی آسٹریلیا بلا لیں گے۔ لاکھ کرے یہ کام خیر و خوبی سے ہو جائے آمین۔



محترم و مکرم معراج رسول
موبہانہ آداب

ہمارا معاشرہ کس رخ پر جا رہا ہے اس کے لیے صرف لتا کہہ یوں کہ
تھاپی مقتدر یغنی والی ہے اگر لوگوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے۔ کلش
قیصر صاحب یہ غلطی نہ کرتے تو شاید لتا بڑا حادثہ نہ ہوتا، قارئین
کو بیدار کرنے کے لیے میں نے یہ واقعہ من وعن لکھ دیا ہے۔ اب لوگ
سبیل حاصل کریں نہ کریں یہ ان کی مرضی ہے۔ شمس احمد
(لاہور)



ایک ٹی بی کیٹ میں کام کرتے تھے اس لیے دوستی ہو گئی
تگرہ بھر دی ہو گئی تھی۔ قیصر صاحب تاج تھے اور ہول
نیل کا کام کرتے تھے۔ اچھا کھاتے تھے بھی اس پیش
سوسائٹی میں پے دوسرے کا گھر چاہی تھا۔ گھر میں ہر سہولت اور

اس بات کو چاہیں گزرے۔ قیصر صاحب ہمارے
گھر کے سامنے رہتے تھے اور ان سے میرے ابو کی بہت
انجلی دوستی تھی۔ ابو عمر میں ان سے خاصے بڑے تھے۔ ابو
پچاس کے تھے اور وہ چالیس کے تھے۔ دونوں ساتھ ہی

آسان تھی۔ ان کے چاروں بچے ایک اعلیٰ درجے کے اسکول میں پڑھتے تھے اور ان کے پاس تقریباً اسی کار تھی۔ فریح بھی کھاتا تھا۔ ہر بچے کو ہر چارہ ہوتے تھے۔ وہ بھی تفریح پر اور بھی ہمارے کھاتے پر۔ آنا جانا اور مہمان نوازی بھی بہت تھی۔ رشتے دار محدود تھے۔ لیکن دوست احباب بہت تھے اور پھر محلے والوں سے ملنا ملنا تھا۔ ان کے چاروں بچے جو سب بچے تھے بہت پیارے اور ادھارہ لڑکے رکھتے تھے اس لیے محلے میں سب بچوں سے ان کی ملتی تھی۔ سب سے بڑا بچہ دو سال کا تھا اور سب سے چھوٹا آٹھ سال۔ کھیل کود اور پڑھنے میں ہی نہیں محلے والوں کے کام آنے میں بھی آگے آگے تھے۔ کسی خاتون کو دکان سے کچھ منگوانا ہوتا اور گھر میں کوئی نہ ہوتا تو وہ بلا جھجک ان سے کہہ دیتی تھی اور وہ فوراً کر دیتے تھے۔

قیصر صاحب آزاد خیال تھے۔ میں نے ان کو جیسے کی نماز کے لیے بھی جاتے نہیں دیکھا۔ بس عید بقرعہ پر ملے جاتے تھے۔ لیکن شیوہ تھے اور بڑے مالدار اعداء کے ہال رکھے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ بھی ایسی ہی کرتے تھے۔ البتہ ان کی عظیم اتنی آزاد خیالی نہیں تھی۔ ہمارا ڈھک چھب کر جاتی تھیں۔ باقاعدہ پردہ تو نہیں کرتے تھیں مگر چادر لٹکا لیتیں۔ میں نے بھی ان کو خیال میں نہیں دیکھا۔ لیکن وہ اسے ہاں آتی تھیں تو اسی طرح آتی تھیں۔ اسی سے زیادہ ان کی میری بیوی راحیلہ سے نفی تھی۔ میری شادی ایک سال پہلے ہی ہوئی تھی۔ سزا قیصر کا نام گفتہ تھا اور وہ گفتہ سے زیادہ کی نہیں تھیں۔ مگر دیکھتے میں تیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔ ہرے کے فتوش بہت خوب صورت اور مصممانہ تھے۔ جسم ڈھکا چھپا ہوتا تھا مگر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس لحاظ سے بھی خوب صورت ہیں۔ چار بچوں کے باوجود ان کی خوب صورتی مائل نہیں پڑی تھی۔ راحیلہ نے بھی ایک دو بار مجھ سے کہا تھا کہ گفتہ ہائی بہت خوب صورت ہیں۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ بچہ تیس برس کی اور چار بچوں کی ماں ہیں۔

میرے ابو حمزہ احمد بھی اسی مارکیٹ میں کام کرتے تھے۔ ان کا کام بیک وقت ہول سیل اور ریٹیل کا تھا۔ میں اسی ایجوکی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ میرے بعد ایک بھائی اور دو بھینس ہیں۔۔۔ ابو چاہتے تھے کہ میں تعلیم حاصل کر کے ان کے ساتھ کام کروں مگر میں نے آئی ٹی کی فیئلہ چنی اور۔۔۔ ایسی ایس کے بعد ایک فرم میں جاب کر رہا تھا۔ جاب کے دو سال بعد میری شادی ہو گئی۔ مجھ سے چھوٹا شہرہ ایف ایم بی اے

کر رہا تھا اور دونوں بھینس شازیہ اور شرمین ابھی کالج میں تھیں۔ قیصر صاحب کے بچے ہماری محرومی سے غلغلی تھے۔ میں انہیں برس کا تھا اور شہزادہ میں کا تھا۔ اس لیے بچوں سے بس چلو ہاتھ تھی۔ البتہ بھی قیصر صاحب سے بات ہو جاتی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ انہیں کپیڈ کے معاملے میں میری مدد کی ضرورت ہوتی تھی۔ جیسے ونڈو ڈیا کوئی سالٹ ویٹر انسٹال کرانا ہو یا پھر کوئی مسئلہ ہو تو اسے حل کرنا ہو۔ وہ اپنی حادثات کے مطابق مجھ سے بے تکلفی سے پیش آتے تھے مگر میں حفظ مراتب کے پیش نظر ان سے ہمیشہ ایک خاص احترام سے ملتا تھا۔

قیصر صاحب کیسے رانی وی ہور موہل کے شوقین تھے۔ ان کے پاس اس وقت ہالیس انچ کا نیا ایل سی ڈی ٹی وی تھا۔ اپنا لیپ ٹاپ انک تھا۔ گھر کے لیے جدید ترین کپیڈ خرید رکھا ہوا تھا اور ان کے اور ان کی بیگم کے پاس آئی فون تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس قسم کے آلات کے کتنے شوقین تھے۔ اکثر ان پر حق مجھ سے بات کرتے تھے خاص طور سے کپیڈ پر کیونکہ یہ میری فیئلہ تھی۔ اس شام میں آفس سے آرہا تھا کہ قیصر صاحب اپنے گیٹ پر دکھائی دیئے۔ وہ کسی سے سو بات پر بات کر رہے تھے اور انہوں نے بات کرتے ہوئے مجھے ہاتھ سے روکنے کا اشارہ کیا۔ میں دھک گیا۔ وہ بات کر کے میری طرف آئے۔ "اچھا ہوا پڑتم مل گئے۔۔۔ میرا لیپ ٹاپ تھوڑا مسئلہ کر رہا ہے اسے دیکھا لو۔"

"کیا مسئلہ کر رہا ہے؟"

"ڈیجیٹل ٹاپ پر موجود فولڈرز کو اپن کرنا چاہوں تو وہ نہیں کھل رہے ہیں۔ وہی ڈرائیو میں جا کر اوپر کروں تو کھل رہے ہیں۔ بڑی مشکل ہوئی ہے اور بارڈرائیو میں کھسکا پڑا ہے۔"

"تو رکی دیکھنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! ڈرافٹس ہو کر آ جاؤ۔" وہ بولے۔ "میں گھر ہی ہوں۔"

"میں آتا ہوں۔" میں نے کہا اور بائیک کھڑی کر کے امدد چلا گیا۔ راحیلہ کو بتایا اور پھر فریش ہو کر بیچ کر کے آدھے کھینے بعد قیصر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے کال کھل بھائی تو ان کے بڑے بیٹے شہزادہ کو دیکھا۔

"میں آگئی۔"

"قیصر صاحب نے بلا دیا تھا لیپ ٹاپ میں کوئی مسئلہ ہے۔"

"آپ آجائیں ابھو گئے ہوئے ہیں۔" اس نے کہا۔
 "گئے ہوئے ہیں تو میں پھر آ جاؤں گا۔"
 "آپ آجائیں انکل۔۔۔ ابو کسی دوست سے ملنے
 گئے ہیں ان کا فون آیا تھا۔"

میں نے سوچا اور اندر چلا گیا۔ ٹرنے مجھے ڈراٹھک
 روم میں بٹھا ہوا اور کچھ دیر بعد لیپ ٹاپ لے آیا اس نے لیپ
 ٹاپ سامنے پھر رکھا اور بولا۔ "آئی پو چوری ہیں کیا دیکھیں
 گئے؟"

"تکلف نہ کریں میں بس یہ دیکھنے آیا ہوں۔" میں
 نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ٹرانڈر گیا تو میں نے
 لیپ ٹاپ اٹھا کر آن کیا۔ یہ ڈیل کا جدید لیپ ٹاپ تھا اور
 خاصا مہنگا بھی تھا۔ قیصر صاحب نے مسئلہ بتا دیا تھا میں اسی
 لحاظ سے چیک کرتے لگا۔ فولڈرز سیٹنگ میں گڑبڑ ہوئی تھی۔
 میں نے پہلے اس کا ڈیٹن آپشن ختم کیا جس میں فولڈرز چھپا
 دیے جاتے ہیں پھر سیٹنگ پیج کی اور اس کے بعد ڈرائیو
 کے اندر جا کر فولڈرز کھولی کر چیک کرنے لگا۔ سی ڈرائیو میں
 مالی ڈاکو خٹس ہوئیں کی تو اس میں ایک چھپا ہوا فولڈر موجود
 تھا۔ اس پر مالی نوٹ لکھا ہوا تھا۔ مجھے یہ فولڈر نہیں کھولنا چاہیے تھا
 مگر نہ جانے کیوں میں نے کھول لیا۔ اس میں تصاویر تھیں۔
 میں نے پہلی تصویر ٹھک کی تو وہ ڈیٹا کالڈ ہو رہی تھی کھل گئی اور
 یہ گفتگو کی تصویر تھی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور بغیر روپے
 کے بے ہنگام نہ رہا ہوا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ صاف گھبراہٹ تھی۔
 تصویر قیصر صاحب نے لیٹی تھی۔ میں نے تصویر بدلی اور پھر
 بدلا چلا گیا۔ اچانک ایک ایسی تصویر آئی کہ مجھے پسینا
 آ گیا۔ اس میں گفتگو نے بہت ٹھکری مائیک ہائی ہوئی تھی۔
 جس میں ان کا جسم جھٹک رہا تھا اور بہت سا جسم تو مائیک سے
 باہر ہی تھا۔ میں نے آج تک ان کا چہرہ عیاں دیکھا تھا۔ میں
 نے بتایا کہ وہ بہت خوب صورت اور مصومانہ سے نقوش
 رکھتی تھیں۔ جسم پہلی بار دیکھا تھا اور وہ جسمانی طور پر بھی
 بہت پُرکشش تھیں۔ میں نے گھبرا کر ٹائل بند کر دی اور پھر
 فولڈر بھی بند کر دیا۔ سیٹنگ ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے
 دوبارہ ڈیٹن آپشن میٹ کر دیا۔ اب فولڈر ایک ٹاپ سے
 بھی کھل رہے تھے۔ میں نے کمپیوٹر بند کیا اور ٹرانڈر کو آواز
 دی۔ وہ شربت کا گلاس فرے میں رکھے ہوئے آیا۔ "انکل۔۔۔"

"ہو گیا۔" میں نے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کیا اور

کھڑا ہو گیا۔

"آئی جلدی، انکل شربت تو لی لیں۔"

مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی مگر کچھ ٹھگ ہو رہا تھا میں نے
 گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا اور فرے پر
 رکھتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ گلی میں کھل کر میں نے کچھ
 دیر وہیں دک کر اپنی حالت درست کی۔ ای ایو نے ہم بہن
 بھائیوں کی پرورش اس طرح کی تھی کہ اگر کبھی برائی کی طرف
 تھم رہے تھے تو مارے شرمندگی کے فوراً واپس
 آ جاتے۔ میں بھڑک کے زمانے سے کمپیوٹر استعمال کر رہا
 ہوں۔ لیکن شاید ہی کبھی ایسا ہوا کہ میں نے اس کا فائدہ
 استعمال کیا ہو جو تارے ملک میں بہت عام ہے۔ اگر کبھی کیا
 بھی تو اس سے خوشی نہیں ہوئی بلکہ بے چینی سی ہوئی اور پھر
 میں نے آہستہ آہستہ نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ خوش قسمتی سے
 دوست بھی ایسے ملے جتنے جو پڑھنے لکھنے والے اور سچے
 ہوئے لائق کے تھے۔ اس لیے ہم برائیوں میں نہیں پڑے
 اور کمپیوٹر کا بہت استعمال کیا تھا۔

میں انظر کے دوران ہی چھوٹے سولے سافٹ ویئر
 بنانے لگا تھا۔ پھر بی سی ایس کیا تو اپنی اسی صلاحیت کی وجہ
 سے مجھے اس آئی بی ٹرم میں جاب مل گئی جس کا شمار پاکستان
 کی بڑی آئی ٹی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ پہلے آفس لاہور میں ہے
 لیکن کراچی کا آفس بھی خاصا بڑا ہے۔ میں اس کے سافٹ
 ویئر ڈیپٹارٹ میں مردوں کے شعبے میں کام کرتا تھا۔ میرا وارڈ تھا
 کہ جاب کے کچھ عرصے بعد انیم بی ایس کروں گا۔ مگر جاب
 میں ایسا لگا اور پھر شادی ہو گئی تو اب تک موقع نہیں ملا تھا مگر
 اپنی معلومات اپ ڈیٹ کر رہا تھا تھا۔ دراصل یہ لیڈ ہی ایس
 ہے کہ اس میں روز ہی کوئی نہ کوئی اپ ڈیٹ آتی ہے۔ اس
 لیے کمپیوٹر سے حلق کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے
 میں میری معلومات نہ ہوں۔ سافٹ ویئر سے لے کر ہارڈ
 ویئر تک اور میٹورنگ سے لے کر انٹرویو تک سب کے
 بارے میں مجھے معلوم ہے کہ کہاں کہاں ہوتا ہے؟

میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے لو جو ان دوسری ٹیکنالوجی
 کی طرح کمپیوٹر اور انٹرویو ٹیکنالوجی کا فائدہ استعمال کر رہے
 ہیں۔ ان کا بیشتر وقت نام نہاد سوشل میڈیا پر گزرتا ہے۔ اس سے صرف ان کا
 قیمتی وقت اور پیسائی برہا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنا دماغ اور جسم
 بھی بگاڑ لیتے ہیں۔ پہلے انٹرویو کیلے بریلی کا گڑبڑ بنے
 ہوئے تھے لیکن جب سے کمپیوٹر سے ہوئے اور خاصی طور

مگر میں نے سوچا نہیں تھا کہ لڑکی کا یہ ایسے شوق رکھتی ہے۔ شاید یہ سب انسان کی فطرت میں ہے۔ دولت مندوں کو اور دلچسپ میرے تو انہوں نے بہت پہلے یہ سب کر لیا تھا۔ لڑکی کا اس کو ٹیٹا لڑکی کی ترقی سے یہ سوچ ملا ہے تو وہ اب یہ سب کر رہی ہیں۔ میں نے بتایا کہ قیصر صاحب ذرا آزاد خیال شخص تھے مگر مجھے گفت پر حیرت تھی، وہ تو واقعی مجھے رہنے والی قانون تھیں، انہوں نے ایسی تصاویر بنوانے پر آمادگی کیوں ظاہر کی؟ مجھے یاد ہے شادی کے ابتدائی دنوں میں جب انسان کو دیسے ہی شوق ہو رہے ہوتے ہیں تو میں نے راحیلہ کی ایک تصویر لی تھی جس میں وہ چادر پہنے کے تھی تو اس نے جب تک وہ تصویر ڈیلیٹ نہیں کر لی اسے ممکن نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایک تصویر ہی تو ہے۔"

"اب لیکن میں اس طرح تصویر بنوانے کی قائل نہیں ہوں اسے کوئی اور بھی دیکھ سکتا ہے۔"

راحیلہ گھر سے باہر نکل جایا اور خراب کے ساتھ جاتی تھی۔

"کیسے یہ میرا سوا ہاٹل ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے سوا کون دیکھے گا؟"

"کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کسی کے ہاتھ لگ جائے وہ کھول لے یا آپ سے خدانہ خواستہ ممکن جائے تو کوئی اور نہیں دیکھ لے گا۔"

میں کسی قدر قائل ہوا تھا مگر اسے پھینکنے کے لیے بحث جاری رکھی۔ "تو میں اس پر یکدور فی کڈنگا دوں گا۔"

"آپ ہی نے بتایا تھا کہ یہ یکدور فی کڈ صرف دل بہلانے والی چیزیں ہیں، ماہرین ایک سینٹر میں انہیں کھول لیتے ہیں۔" اس نے جواب کرتے ہوئے کہا۔ میں ہنس دیا تھا۔

"اچھا یا اب خیال رکھوں گا آجیہ، ایسی تصاویر نہیں لیں گا۔"

"ضرورت بھی کیا ہے میں آپ کی ہوں جیسے چاہیں جب چاہیں دیکھیں۔" اس نے کہا تو میں نے شرارت سے پوچھا۔

"جیسے اور جب چاہوں۔"

راحیلہ شرما گئی۔ "میں ایک بات کر رہی ہوں بلالو، نری ہونے کی نہیں ہو رہی۔"

راحیلہ امی الہ کی پسند تھی اور شادی کے بعد میری پسند

سے لپ ٹاپ اور اسمارٹ فون آئے تو یہ سب اتنا آسان ہو گیا کہ اب انڈر ایج بچے بھی سب جانتے ہیں کیونکہ وہ سب دیکھتے ہیں اور میں باپ یا ماں کے بدوں کو بتا ہی نہیں چکا ہے۔ ہمارا معاشرہ اتنی تیزی سے بگاڑ کی طرف جارہا ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تصور تو اس وقت کیا جائے گا جب لوگ یا معاشرے کے نمائندہ اور اس بارے میں سوچیں اور لوگوں میں شعور بیدار کرنے کی کوئی ہم چلائیں یہاں تو سب سوئے ہوئے ہیں۔

میرے ایک کونیک نے اتفاق سے لپٹے تیرہ سالہ بچے کا اسمارٹ فون چیک تو اس میں ایسی چیزیں تھیں کہ وہ دنگ رہ گیا تھا۔ انہوں میں چھٹے والا بچہ نہ صرف فٹش

ایب سائنس کا ہاتھ دھرت کرتا تھا بلکہ اس نے کچھ ایسے سوشل میڈیا پر بھی جوڈن کیے ہوئے تھے جہاں بلاشبہ سب کچھ دکھایا جاتا ہے۔ اس نے بچے کو مارا اور اس کا اسمارٹ

فون توڑ دیا۔ مگر وہ پریشان تھا جو اس کا بیٹا دیکھ چکا تھا اسے تو اس کے ڈان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن وہ دفتر میں رہ

تھا۔ ہمیشہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھا تو پتہ چڑا۔ اس نے مجھے بچے کے بارے میں سب بتایا۔ میں سوائے المیوں کے

بہر گیا کر سکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ وقت دے۔ ابو لے ہمارے ساتھ بیٹا کیا تھا

کاروباری ہونے کے باوجود وہ ہمیں پورا وقت دیتے تھے اور ہماری ہر سرگرمی پر نظر رکھتے تھے۔ والدین بچوں کی

جاسوسی نہ کریں صرف ان کے معمولات پر نظر رکھیں تو اس سے ہی انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا بچہ کیا کر رہا ہے؟

مگر یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہمارے ہاں بچہ اور اتنی عمر و بچہ والے لوگ بھی ایسی حرکتیں کر سکتے

ہیں۔ قیصر صاحب کے لپ ٹاپ کے اس جیسے فولڈر میں بلا ملال سینکڑوں تصاویر تھیں، میں نے چند ایک ہی دیکھی

تھیں اور یقیناً آگے اس سے بھی زیادہ سلسلے خیر تصاویر ہوسکتی ہیں۔ یہ بہت آسان کام تھا آئی فون یا لاپ ٹاپ کیلکولیٹر سے

تصویر بننے کے لیے لپ ٹاپ میں غفلت کروچا۔ یقیناً یہ سب وہ اپنی کسی جس کو تسکین پہنچانے کے لیے کرتے تھے۔ وہ ان

طالب علموں اگر وقت ملتا تھا تو میں ڈائجسٹ چڑھ لیتا تھا اور

ان میں ایسی کہانیاں بھی پڑھیں کہ شوقین حراج لوگ اپنی بیویوں کی خاص تصاویر بناتے تھے اور انہیں بھیجا کر دیکھتے

تھے۔ وہ سب دولت مند اور اہلٹ کلاس سے تھیں دیکھتے تھے۔ ہماری اہلٹ کلاس تو شروع سے آزاد خیال رہی ہے۔

کام کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں۔ فراز کو اکثر سامان لینے کے لیے جانا پڑتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں بھی لڑکے شاپ دیکھتے ہیں۔ ایک دن وہ سامان لینے کے لیے نکلا تھا مگر کچھ اور گیا تھا کہ حالات خراب ہو گئے اور وہ واپس آ گیا۔ مارکیٹ بند ہو گئی تھی اس لیے اس نے لڑکوں کی چھٹی کر دی۔ خود رک گیا کیونکہ اسے کچھ کام تھا۔ دونوں لڑکے جو آپس میں دوست بھی تھے جگت میں جاتے ہوئے اپنی بوائے بیویوں کے ساتھ گئے۔ فراز نے ایسے ہی بوائے بیوی چیک کی کیونکہ اسے علم نہیں تھا کہ وہ یہاں بوائے بیوی لگاتے تھے۔

جب اس نے بوائے بیوی کیپوٹر سے لگا کر لوہن کی تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس میں ایسی تصاویر اور ویڈیوز بھری ہوئی تھیں جن کو دیکھ کر صاف چا چتا تھا کہ وہ یہاں آئے۔ اسے کیپوٹر اور موبائل فونز سے لگائی گئی ہیں۔ ان میں بعض افراد تو فریڈ کے جانے پہچانے تھے اور ان میں سے بیشتر تصاویر اور ویڈیوز دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ انسانی کی بات ہے اگلے ہی دن میں فراز کے پاس بیٹھے گیا تو وہ ان دونوں لڑکوں کو پہکار دیا تھا اور پھر اس نے ان کی چھٹی کر دی۔ بوائے بیوی اس نے پہلے ہی صاف کر دی تھی۔ اس نے پوچھا تو اس نے ان کے کمرے بتائے۔ اس پر ایک لڑکا ڈھٹائی سے بولا۔ ”ہمارا کیا قصور ہے لوگ کیوں بتاتے ہیں ایسی تصاویریں اور ویڈیوز۔۔۔ اب بھٹکیں۔“

فراز نے ان کی چھٹی کرنے کے بعد مجھے سب بتایا تو میں بھی حیران ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ایسی بات ہے جس سے کوئی کیپوٹر اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والا ناواقف ہو ہی نہیں سکتا مگر میں اسے بہت چھوٹے چلنے پر سمجھتا تھا۔ یہاں فراز نے جو بتایا اس سے تو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ دبا کس قدر کھیل چکی ہے۔ صرف ایک موبائل اور کیپوٹر شاپ پر ایک بوائے بیوی میں ایسی درجنوں لائق جوڑوں کی تصاویر اور ویڈیوز تھیں جو مجموعی طور پر یہ کہتی ہوں گی اس کا قصور بھی محال ہے۔ فراز نے بتایا کہ نو جوان لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی لیکن ایسے لوگ بھی تھے جو پیچور اور شادی شدہ لگ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی تصاویر اور ویڈیوز بنا رکھی تھیں۔ پھر ان کو اتنی سمجھ نہیں ہوئی کہ وہ اسے کیپوٹر اور موبائل سے ڈیلیٹ کر دیں۔ اکثر بے پروائی کرتے ہیں اور یہ چیزیں غیر متعلقہ لوگوں کے ہاتھ لگ جاتی ہیں یا وہ انہیں دیکھ بیٹے ہیں۔

یہی تھی۔ اس میں حسن اور دل کشی سے زیادہ اس کی سوچ اور سلیقے کا دخل تھا۔ وہ اتنی اچھی سوچ کی مالک ہے کہ میں اس سے سیکھتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے نہ جانے میری کس تنگی کے بدلے مجھے ایسی بیوی دی ہے۔ میں اس سے کوئی بات نہیں چھٹاتا ہوں لیکن یہ بات ایسی تھی کہ میں اس سے کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بلکہ مجھے تو خود اس کے بارے میں سوچنے یا تصور کرنے ہوئے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور میں بار بار سوچ رہا تھا کہ کاش میں نے وہ فولڈر کھولا ہی نہ ہوتا۔ مگر یہ سچ ہے کہ شیطان انسان کے اندر راہ کی طرح رہتا ہے اور اسے ایک لمحے میں گمراہ کر دیتا ہے۔ مگر میں ایک لمحے کو سوچتا تو شاید بھی اسے نہ کہوں مگر مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں تھی اور اس سے پہلے میں فولڈر کھول چکا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نکلی ہوئی تصاویر سامنے نہیں آئی تھیں اور یہ میری گنہگار تھی۔

میں گمراہ آیا تو راحیلہ نے کھانے کا پوچھا مگر مجھے بھوک نہیں تھی اس لیے میں نے یہاں کر دیا کہ آج شام آفیس میں بڑا کھانا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہر عورت راحیلہ کی طرح مضبوط اور کھداد کیوں نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح راحیلہ نے مجھے سمجھایا تھا کیا اس طرح گفتگو اپنے شوہر کو نہیں سمجھا سکتی تھیں۔ مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سمجھا ہوا اور قیصر صاحب نہ مانے ہوں۔ بعض شوہر اپنی خواہشات کے آگے وہی کی بات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں اور انہیں مجھ سے شوہر کی خواہش پر سر جھکا پڑتا ہے۔ شاید یہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ ایک فیئر مزدور نے لنان کی بیوی کو اس حال میں دیکھ لیا جس میں دیکھنے کا حق صرف شوہر کا ہوتا ہے۔ قیصر صاحب تصاویر ایک خفیہ فولڈر میں چھپا کر مطمئن ہو گئے تھے حالانکہ اسے تو ایک بچہ بھی کھول سکتا ہے۔ پھر بھی کیپوٹر میں ایسا مسئلہ ہو کہ وہ آن ہی نہ ہو اور اسے کسی کے پاس لے جانا پڑے تو اس کا بھی بہت امکان ہوتا ہے کہ وہ یہ فولڈر اور اس میں موجود تصاویر دیکھ لے گا۔

میرے اسکول کے زمانے کا ایک دوست فراز ہے۔ اس نے آگے بڑھنے کے بجائے ہارڈ ویئر کو پس کر کے اپنی شاپ کھول لی تھی۔ وہ سامان بھی فروخت کرتا تھا اور ونڈوز کے ساتھ دوسرے سافٹ ویئر بھی لائسنس کر کے دیتا تھا۔ پھر اس نے موبائل ریپرنگ بھی شروع کر دی۔ فراز خود سلیجے ہوئے زمانہ کا آدمی ہے مگر اس کی شاپ پر جوڑے کے

اگر چہ قیصر صاحب کے ساتھ دوسرا معاملہ تھا۔ ان کا کپیوٹر میں نے ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اتفاقاً ہی لے کر یہ امکان تو نہیں تھا کہ وہ چیزیں لپک کر جائیں۔ وہ وہیں آئے تو انہوں نے مجھے کال کی۔ میں اس وقت بھی گھبرا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ انہوں نے جان لیا ہے کہ میں نے غلطی فراموش کر لی تھی اور وہ میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ "تمہیک یار تم نے مسئلہ حل کر دیا اور نہ بہت مشکل ہو رہی تھی۔"

"وہ قیصر صاحب۔" میں نے کہا۔

"شمر تیار ہوا تاہم مشکل سے بانٹ سکتے تھے۔"

"کام ہو گیا تھا اور آپ تھے نہیں اس لیے میں بیٹھ کر

کیا کرتا۔"

"تمہیک ہے ایک بار پھر شکریہ۔"

کال بند کر کے میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ راجیل

پاس موجود تھی اور مجھے دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ "آپ

نیشن میں کیوں ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"وہ کیسے؟ آپ کو اسے سی میں بھی بیٹھنا آ رہا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ چھوا۔ "آپ کی طبیعت تمہیک ہے نا؟"

میں نے اسے یقین دلایا کہ میری طبیعت تمہیک ہے۔

اگلے دن پچھلی تھی اور میں پچھلی والے دن ذرا دیر سے الگ

ہوں۔ البتہ راجیل جلد ہی اٹھ جاتی ہے کیونکہ ناشا دی بتاتی

ہے۔ میں واش روم سے ہو کر آیا تو ڈرائنگ روم کی طرف

سے بولنے کی آواز آئی۔ پھر راجیل گفتگو کے ساتھ ڈرائنگ

روم سے نکلی۔ وہ جارہی تھی اور انہیں دیکھ کر مجھے بے اختیار

وہ تصور یاد آگئی۔ وہ رکی نہیں تھی تو مایہ جلی تھی مگر

جب تک میرے سامنے رہیں میں انہیں ہی دیکھتا رہا۔

راجیل دروازے تک پہنچ کر آئی اور مجھ سے کہا۔ "کیا ہو گیا

ہے آپ کو؟ آپ نے سلام کیا نہیں اور انہیں گھور رہے تھے۔"

میں چونکا۔ "سوری میں کسی سوچ میں تھا اور مجھے تو چاہی

ہی نہیں چلا کہ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔"

راجیل سمجھتی تھی کہ میں کس فطرت کا آدمی ہوں اس

لیے وہ مطمئن ہو گئی۔ "گفتگو باجی کہہ رہی تھی کہ آپ اتنی

انہی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں، کیا بچپن میں تھا۔"

"نہیں پاپو دفتر کے ایک معاملے میں سوچ رہا تھا۔

ان سے میری طرف سے سندی کر لینا اور اب ناشا

وو۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا مگر ناشا کے

دوران میں سوچتا رہا کہ میں نے انہیں ایسے کیوں دیکھا کیا اس لیے کہ میں انہیں تقریباً پہلی بار دیکھ چکا تھا۔ بے شک تصویر میں دیکھا تھا مگر تصویر تو ان کی ہی تھی۔ اس سے پہلے ان کے لیے میرے اعداد و جزات و احترام تھا، میں نے خود کو ٹوٹا تو اس کا شائبہ بھی اب ہاتی نہیں پایا تھا۔ ایک ذرا سی بے احتیاطی نے ایک شریف عورت کو میری نظر میں بے عزت کر دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس میں ان کا کتنا تصور ہے لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا سامنا نہیں کروں گا ہوا گروہ سامنے آئیں بھی تو ان کی طرف نہیں دیکھوں گا۔

اگرچہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ وہ دن میں ہمارے

ہاں ایک دو پکر لگاتی تھیں۔ اسی طرح میں آٹھس سے آنے

کے بعد تین چار بار ضرور باہر جاتا تھا اور اکثر وہ دروازے

پر بچوں سے بات کہہ دیتی ہوتی تھیں یا خواہ کتنی آجاری ہوتی

تھیں۔ مگر کاروبار کا سودا وہ خود لے کر آتی تھیں۔ اس

لیے نہ چاہتے ہوئے تھی ان سے سامنا ہو جاتا تھا۔ یہ ضرور

ہوا کہ اس دن کے بعد سے میں نے ان کے گھر جانا بند کر

دیا۔ اگر قیصر صاحب جانتے تو کوئی بہانہ کر دیتا تھا۔ ان کو

کوئی کام ہوتا تو اپنے پاس بیٹھ سکتا کرتا تھا۔ قیصر

صاحب نے بھی اس گرج کو محسوس کر لیا اور انہوں نے ابو

سے شکایت کی تو ابو نے مجھے بلا لیا۔ "کیا بات ہے بد خود اور

تم قیصر صاحب کے ہاں کیوں نہیں جا رہے؟"

"ابو جانتا ہوں لیکن اکثر مصروفیت ہوتی ہے؟" میں

نے بہانہ کیا۔

"چننا بلا نہیں تو چلے جایا کرو، پڑوسیوں کے بہت

حقوق ہوتے ہیں۔" ابو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

میں ان کو کیا بتاتا کہ پڑوسیوں کے حقوق کا مجھے بھی پتا

تھا اور میں اسی وجہ سے وہاں جانے سے گریزاں تھا۔ جو ہو

چکا تھا اسے لوٹایا تو نہیں چاہتا تھا مگر میں اتنا تو کر ہی سکتا

تھا کہ حریف سوچنے اور دیکھنے سے گریز کروں جو میرے تصور

کو خراب کرے۔ دیکھا جائے تو تصور نہ میرا تھا اور نہ ہی

گفتگو کا تھا، یہ سراسر قیصر صاحب کا تصور تھا مگر میں اپنی

جہی کی ایسی تصاویر بنی ہی نہیں چاہے تھیں۔ اگر لیں تھیں تو

ان کو اتنی بے پروائی سے کپیوٹر میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ میں

اسے بے پروائی ہی کہوں گا۔ دفتر کا استعمال کرنے والے

لوگ جانتے ہیں کہ کسی کپیوٹر میں کسی چیز کو تلاش کرنا کتنا

آسان ہوتا ہے۔ اگر صرف سرچ کے آپشن میں تصور لکھ کر

تلاش کیا جاتا تو یہ ساری تصاویر سامنے آ جاتیں۔ اس سے

کوئی فرقی نہیں پڑتا کہ وہ چھپے ہوئے نوٹدہ میں تھیں۔

گفتہ کا سامنا کرنا اور ان کے بارے میں سوچنا بھڑا تو رفتہ رفتہ میں سکون میں آ گیا مگر اب مجھے قیصر صاحب سے جڑ ہو گئی تھی۔ ان کا سامنا ہوتا تو میرے دل میں آتا کہ یہ شخص کسی قسم کی عزت کے قائل نہیں ہے۔ جس نے اپنی عزت کو یوں قضا شایا دیا۔ اتنی عمر، تجربے اور سمجھ بوجھ کے باوجود وہ نفس کے ہاتھوں ایسا کلام بنا کہ آگے پیچھے کے نتائج کا بھی نہیں سوچا۔ اسے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ تصاویر اس کے بچوں نے ہی دیکھ لیں تو ان پر کیا اثر پڑے گا؟ یا جیسے میں نے دیکھا تھا اسی طرح ان کے گھر میں آنے والا کوئی اور فرد دیکھ لے تو؟ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں انہیں مشورہ دے دوں کہ خدا کے لیے یہ سب ختم کر دیں اس سے پہلے کہ یہ سب انہیں ختم کر دے مگر میں بس سوچ کر رہ جاتا تھا۔ کیونکہ بہت تو میں قیامت تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں ان سے بھی گریز کرنے لگا تھا مگر اس طرح کہ انہیں اجناس نہ ہو اور وہ پھر ابو سے ملاعت نہ کریں۔

ایک دن انہوں نے بچے سے کہلوایا کہ لیپ باپ بھر دی مسئلہ کر رہا تھا۔ میں آ کر دیکھ لوں۔ میں نے کہلوایا کہ میں آ رہا ہوں لیکن کیا نہیں۔ انہوں نے دوبارہ کہلوایا اور میں بھر نہیں گیا۔ اس کے بعد انہوں نے نہیں کہا۔ ابو تو نہیں لیکن راجیلہ نے میرا گریز محسوس کر لیا تھا۔ ایک دن اس نے پوچھ لیا۔ "کیا بات ہے قیصر صاحب سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"جب گفتہ باجی آتی ہیں تب آپ کرے سے نہیں نکلتے اور قیصر صاحب کی طرف سے بلاوا آئے تو کوئی بہانہ کر دیتے ہیں۔"

"نہیں بارہ عمر میں بڑے ہیں اور میرے خیال میں آدمی کو اپنے ہم عمر لوگوں سے ملنا جتنا چاہیے۔"

"مگر وہ پڑوسی ہیں ان کے کام تو آنا چاہیے۔"

"کیا کام آؤں۔" میں نے ہنسنے سے کہا۔ "ان کے کمپیوٹر کا مسئلہ ہوتا ہے وہ ٹھیک کر دیتا ہوں، اب ضروری ہے کہ ان سے گپ شپ کروں یا ان کے گھر آؤں جاؤں۔"

راجیلہ سمجھ گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہ رہا، اس لیے وہ خاموش ہو گئی۔ اب میں قیصر صاحب سے اتنا بڑھ کر ہو گیا تھا کہ مجھے یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ کبھی اور نے وہ تصاویر دیکھ لیں تو کیا ہوگا۔ میری ہلا سے جو بھی ہوتا رہے۔ میں نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا کہ یہ میرا

مسئلہ نہیں تھا۔ مگر جو ہوا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بھی چھٹی کا دن تھا۔ میں سو رہا تھا کہ راجیلہ نے مجھے بھیجوا کر دکھایا۔ "نہیں! نہیں! غضب ہو گیا ہے۔"

میں بڑبڑا کر اٹھا۔ "کیا ہوا مگر میں سب خبریت ہے؟"

"مگر میں سب لکھ چکا ہے۔ گفتہ باجی کے بیٹے ٹھہر نے خودکشی کر لی ہے۔"

"میرے خدا!... کب... کیسے؟"

"ابھی پتا چلا ہے، ان کے گھر تو رونا بیٹھا ہوا ہے۔" اس نے اپنے کمرے میں بیٹھے سے رو کر باوجود کہ خود کو بھانسی دے لے۔ "راجیلہ بدالسی ہو رہی تھی۔" پتا نہیں گفتہ باجی کا کیا حال ہوگا؟"

میرا بھی دماغ گھوم گیا تھا یہ خبر سن کر اور مجھے فوراً خیال آیا کہ شاید ٹھہرنے بھی ماں کی تصویریں دیکھ لیں اور اس نے مادے شرم کے خودکشی کر لی۔ وہ چودہ کا ہونے والا تھا اور عملاً وہ بالغ تھا اسے سب معلوم تھا۔ وہاں کی یہ بے عزتی مرداشت نہیں کر سکا اور اس نے خودکشی کر لی۔ میں جلدی سے باہر آیا تو قیصر صاحب کے گھر کے سامنے محلے والوں کا جھوم تھا اور اندر سے رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اندر ہی تھے اور انہوں نے لوگوں کو اندر آنے سے روکا تھا۔ اس پر کچھ محلے والے برامان کر چلے گئے تھے کہ کہا بھی محلے والے تھے اور ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر ابو نے ٹھیک کہا تھا۔ انہوں نے قیصر صاحب کو شرم کی لاش بھی چھندے سے اتارنے نہیں دی تھی۔ کچھ دیر میں پولیس آگئی اور پھر ضروری کارروائی کے بعد لاش اتار کر پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی گئی۔

تب میں نے۔۔۔۔۔ قیصر صاحب اور گفتہ کو دیکھا۔

وہ لاش کے ساتھ باہر آ گئے تھے۔ گفتہ کو ٹھیک ہارپوں بغیر دوپٹے کے اور کھلے بالوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا، جہاں بیٹا مر جائے تو ماں کو کہاں ہوش رہتا ہے۔ یہی حال گفتہ کا تھا۔ انہیں دیکھ کر میں پیچھے ہٹ گیا۔

گناہات ہے اس وقت مجھے بہ دلوں میاں سے کی اچھے نہیں لگدے تھے۔ شرم کی موت کے ممکنہ ذائقے رادوی تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں قیاس آرائی کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے ٹھہر کی خودکشی کی وجہ کچھ اور ہو اگر اس نے ماں کی ایسی تصاویر دیکھ لی ہیں تو یہ اس کے باپ کے کمپیوٹر میں تھیں اور باپ نے ہی دیکھی ہیں۔ یہ یقیناً اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ ذرا بے پروا قسم کے میاں بھوی کے بیٹے بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں اور وہ

اسے فطری سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ شاید قیصر صاحب نے اسے کسی وجہ سے ڈانکا ہو یا اس کا کسی دوست سے جھگڑا ہو اور آج کل نا سمجھ بچے معمولی سی بات پر زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ آئے دن ٹی وی اور اخبار میں ایسی خبریں آتی ہیں۔ بچے اسے معمولی بات سمجھتے ہیں اور جب انہیں کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔

شام تک قیصر کا پوسٹ مارٹم ہو گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس نے خودکشی کی تھی اور دم گھٹنے سے موت واقع ہوئی تھی۔ لاش رات گھٹے ملی تھی اس لیے تھنیا اگلے دن تک کے لیے ملتی کر دی تھی۔ قیصر صاحب کے گھر والے نہیں تھے۔ مطلب ماں باپ گزر چکے تھے اور بہن بھائی نہیں تھے۔ دور کے بکھرے وار تھے جو حیدر آباد میں رہتے تھے، انہیں آتا تھا۔ وہ بھی رات تک پہنچے تھے۔ پڑوسی اور قریب ہونے کے باعث ہمارا سارا گھر قیصر صاحب کے لمبے میں شریک تھا۔ سارے معاملات ایسے اپنے ہاتھ لے رکھے تھے اور بڑا بیٹا ہونے کے باعث میں برہمہ کا شریک تھا۔ قیصر اور کفن کا بندہ دوست میں نے ہی کیا تھا۔ بکرا لاش لانا اور غسل اور دوسرے مراحل سے گزرتا۔ میں ان سب میں شامل رہا تھا۔ اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد قیصر کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچایا گیا۔ اس کی مرقہ نہیں تھی مگر موت مرد کچھ کر نہیں آتی ہے۔ پھر اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ بچہ اور نا سمجھ تھا جو اپنی زندگی ہار گیا۔

ایسا سانحہ ہو جائے تو گھر والوں کو پہلے میں دیر لگتی ہے ایسا ہی قیصر صاحب کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ بہنوں بن کے ہونٹوں سے کسی غائب رہی تھی۔ کبھی مسکراتے بھی تو یوں چمک جاتے جیسے کوئی جرم کر گئے ہوں۔ پولیس نے تفتیش کی اور سب کے ذہنوں پر یہ سوال تھا کہ آخر ثمر نے کیوں خودکشی کی۔ قیصر صاحب قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک دن پہلے شر خوش ہوا تھا۔ شام تک وہ بھائیوں اور محلے کے لڑکوں کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیلا رہا اور پھر وہ اپنے دوست سے ملے گیا۔ دوست اس کے ساتھ ہی بڑھتا تھا اور پھر وہ رات کو بچے والہں آیا۔ گفتہ نے اس سے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا کہ اس نے دوست کے گھر کھانا کھا لیا ہے پھر وہ کمرے میں چلا گیا۔ بڑا ہونے کے بعد اسے الگ کمرہ دے دیا تھا۔ پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا اور صبح جب گفتہ اسے اٹھانے نہیں تو اس کی لاش پھندے سے پھول رہی تھی۔ وہ تو چچا نہ کر بے ہوش ہو گئیں۔ قیصر

صاحب نے دیکھا تو ان کے حواس بھی کم ہو گئے تھے پھر انہوں نے ایڈ کو کالی کی تو وہ فوراً کھینچ گئے تھے نور انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ابو نے قیصر صاحب کو لاش اتارنے سے روکا اور وہ بد بظاتی ہو کر لاش اتارنے چاہے تھے۔ اس کی حالت تاروی تھی کہ وہ مرنے چکا ہے۔ اس لیے ابو نے انہیں روک دیا۔

گویا میرا اندازہ غلط تھا اگر اس نے ٹیپ چاپ میں اس کی تصویریں دیکھی ہوتیں تو سارا دن اتنا خوش نہ رہتا۔ میں نے ابو سے کہا۔ "پہ دوست کے پاس گیا تھا اسی دوران میں کچھ ہوا ہے جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کی ہے۔"

"دوست کا کہنا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے اور وہ اس کے پاس سے بھی ٹھیک تھا کہ کیا تھا۔"

"ممکن ہے وہ غلط ہو جائے کہہ رہا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" ابو نے تائید کی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "پر اب وجہ جو بھی ہو جائے والا تو واپس نہیں آئے گا۔"

"ابو وجہ جاننا بھی ضروری ہے۔" میں نے دبے لفظوں میں کہا۔ "جس وجہ سے ایک فرد خودکشی کر سکتا ہے اسی وجہ سے کوئی دوسرا بھی کر سکتا ہے۔ اتنا سا لڑکا تھا اسے کیا ذہنی مسئلہ ہو سکتا تھا۔"

ابو نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "تجسس کیا کہا چاہ رہے ہو؟"

"ابو ممکن ہے مسئلہ ان کے گھر کا ہو۔"

"اگر گھر کا ہے تب بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کسی کے گھر کے مسئلے میں کس طرح دلچسپی دے سکتے ہو؟"

ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر چہ آجائے نہیں تھے کہ ثمر نے اسی وجہ سے خودکشی کی ہو مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا اس میں قیصر صاحب اور گفتہ کا کسی نہ کسی طرح کردار ہے۔ ایک لڑکھ میسے بعد وہ لوگ معمول پر آ گئے تھے۔ بچوں نے ٹھیلنا اور تفریح کرنا شروع کر دیا تھا۔ ثمر کے چالیسویں کے بعد قیصر صاحب ابی خانہ کے ہمراہ پہلی باہر ہوئے پر گئے تھے۔ اسی طرح گفتہ نے ہمارے پاس آنا چنا شروع کر دیا۔ درمیان میں بھی وہ ایک دو بار آئیں مگر راجیلہ اور امی سے مل کر دلتی رہی تھیں۔ اب آئیں تو معمول کی بات ہوتی تھی۔ راجیلہ مجھے اپنے کے ہارے میں ملاتی رہتی تھی۔ ان دنوں وہ امید سے تھی اور ایسی حالت میں عورت حواس ہو جاتی ہے اور اس کا لڑکا وہ خیال رکھتا پڑتا ہے اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی باتوں میں...

دیکھی لیتا تھا اور سنا تھا۔ ایک مدت اس نے غایا۔

”شکر ہے گلشنِ باغی نادل ہوئی ہیں ویران کا بہت برا حال ہو گیا تھا سر کی جہاں میں۔“

”تم نے پوچھا نہیں کہ شرنے کیوں خود کشی کی؟“

”پوچھا تو میں ہے چوری کو بھی کچھ نہیں معلوم۔“ راحیلہ نے سانس سے کہا۔ میرا دل چاہا کہ اسے اپنے قیاس سے آگاہ کروں لیکن پھر میری زبان رک گئی۔ راحیلہ مجھ پر پورا اتر کر گئی مگر اور پھر اس معاملے میں میرا تصور بھی نہیں تھا اس کے باوجود کسی عورت کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا شوہر کی اور کور کچے ہو رہا ہو بھی کسی واقعہ کا عورت کو اس لیے میں چپ رہا۔ لیصر صاحب بھی معمول پر آ گئے تھے۔ اب پہلے کی طرح اپنی مذاق اور گلی میں چٹلنے کرنے لگے تھے۔ میں خطر آٹا تو گھبر لیتے تھے۔ اب میں کتا پکڑا۔ اب سے قریبی قتل کی وجہ سے ان سے ایک حد سے زیادہ گریز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیصر صاحب کی حد تک ٹھک تھا مگر جب گلشن سانس آتا تھا تو اس پاس ہوتی تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ ان کی ناز بیا تصویر میرے ذہن میں آ جاتی۔ جب کہ میں اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی بھی میں محسوس کرتا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے آفس کی طرف سے کچھ ٹرینگ کے لیے لاہور بھیجا گیا۔ جب مجھے بتایا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے تھوڑی سی جگہ بھی جو اس طرح مل گئی۔ یہ نکلنے جتنے کا کھوس تھا۔ ہمیں باہر سے بعض ہارڈ ویئر کپڑوں نے ایک بڑا ساٹ ویئر آؤٹ فٹنگ اور یہ ٹرینگ ای کے مسئلے میں تھی۔ میں تین جتنے لاہور میں رہا۔ پھر دفتر والوں کی طرف سے ایک گروپ ناردرن ایئر یا چارہ تھا مجھے بھی اس میں شامل کر لیا گیا اور میں تقریباً پانچ جتنے بعد واپس آیا۔ گھر والے اور خاص طور سے راحیلہ بے تابی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ بھی اسے عرصے میں سے دور نہیں رہی۔ سیکے بھی جاتی تو مشکل سے دو دن میں لوٹ آتی تھی۔ اس عرصے میں جو باتیں میج تھیں کرنے کی وہ کر رہی تھی۔ حالانکہ وہ فی فون پر بات ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل نہیں بھرا تھا۔ اچانک وہ بولیں۔ ”ایک بات تو بتانا بھول ہی گئی۔ گلشن باغی یہاں سے چلی گئی۔“

میں پوچھا ”تو کب چلے گئے۔ کب۔ کہاں؟“

”گئے ہوئے آج چار دن ہو گئے ہیں کسی کو نہیں معلوم کہ کہاں گئے ہیں۔ اب کوئی نہیں معلوم۔۔۔ انہوں نے گھری

نہیں کا رو ہار بھی مروخت کر دیا ہے۔“

میں حیران رہ گیا۔ ”ایسا کیا کہہ چکا ہے اچانک میں چلے گئے؟“

”جی تو کچھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ابھی ایک جتنے پہلے

تک تو سب ٹھیک تھا۔“

”ہاں تو کئی مسئلہ نہیں تھا۔“ ”پھر انہوں نے ایسا

کیوں کیا؟“

”خاص بات یہ کہ لیصر صاحب اب کے بہت نزدیک

تھے اس کے باوجود انہوں نے اب کو بھی نہیں بتایا کہ وہ کیوں

سب کچھ ہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔“

اس طرح اچانک جانے میں کوئی بات تو ہے۔ ورنہ

کون یوں ایسا ایسا بھائی گھر ترک کر کے جاتا ہے۔ جن

صاحب نے ان سے یہ مکان خریدا تھا ان کی تائی قیامت اس

ملاقات میں اسے بڑے مکان کی قیمت سے پندرہ فیصد کم ملی

اور شاید اسی وجہ سے راتوں رات مکان بکا تھا۔ لیصر صاحب

نے کا رو ہار بھی اسی طرح فروخت کیا تھا۔ اس کے بعد وہ

کہاں گئے کسی کو ظن نہیں تھا۔ اب اور ہمارے گھر والوں کے

پاس ان کے جتنے کچھ گھر تھے وہ سب آ رہے تھے مگر

سب بند جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ماضی سے ہر تعلق

توڑ کر یہاں سے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ہر نشان اور پتہ

کر گئے تھے۔ کوئی قلم نہیں تھا جو بتاتا کہ وہ کس طرف

گئے تھے۔ بہت دن تک ہم حیران رہے تھے کہ وہ کہاں چلے

گئے۔ سالن کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ انسانی لسیاں نے ان

کی یاد دہانی کر دی اور ہلاخوردہ تقریباً بھول ہی گئے

تھے۔ اب شاید ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔

راحیلہ نے بیٹے کو جنم دیا تو سب بہت خوش تھے۔ اس

خوشی میں ابو نے شاعرانہ حقیقت کیا۔ سامنے قاعدان اور جانے

والوں کی دعوت کی تھی۔ اس میں ابو کے وہ واقعہ کار بھی

آئے تھے جو ان کے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ تقریباً ایک

لان میں تھی۔ میں سب سے مل رہا تھا اور مبارک ہادیں

وصول کر رہا تھا۔ جب اس میز کے پاس پہنچا جس پر ابو کے

واقعہ کار بیٹھے تھے تو نعمان الکل نے اچانک کہا۔ ”بارہ

لیصر صاحب نہیں تھے جو اچانک کچھ ہارنگ کر چلے گئے۔“

”پھر ابو میرے پڑوسی تھے؟“ ابو چلے گئے۔

”پھر ان کو کچھ دنوں لاہور میں دیکھا۔“

”تم طے ان سے؟“

”نہیں۔۔۔ میں جس ہوٹل میں ٹھہرا تھا اس کے سامنے

سے ہائیک پر جا رہا تھا۔ طبعاً خوب لگ رہا تھا۔ ابھی بڑی

ہوئی تھی۔

"پار نہیں دھوکا ہوا ہوگا۔ میں نے آج تک قیصر کو خراب چلے میں نہیں دیکھا۔" ابو نے کہا۔

"تم جانتے ہو مارکیٹ میں میرا اس کا کئی گھنٹوں کا ساتھ ہوتا تھا۔ ہم ایک ہی کام تو کرتے تھے۔ میں اسے نہیں پہچانوں گا۔ پھر میں نے اسے آواز بھی دی تھی اور اس نے ہاتھ ہڑے سرگھا کر دیکھا بھی تھا۔ اگر وہ قیصر نہیں تھا تو نام پر سرکیوں گھا کر دیکھا۔" نعمان اہلک نے دلیل سے کہا۔

"بھئی وہ جس طرح گیا ہے لگتا تو ایسا ہے کہ شہر یا ملک ہی چھوڑ گیا ہوگا۔" ابو کے ایک اور دوست نے کہا۔ "اسی شہر میں رہتے ہوئے بچہنا آسان نہیں ہے۔ وہ قیصر ہی ہوگا۔"

اس کے بعد اس پر بات شروع ہو گئی کہ قیصر صاحب اس طرح کیوں گئے تھے۔ اکثر کی دوائے تھی کہ انہوں نے کوئی چکر چلایا تھا یا ان سے کوئی کہلا ہو گیا تھا۔ وہ آنے والی مصیبت یا قانونی کا مددوائی سے بچنے کے لیے اس طرح روپوش ہو گئے۔ مگر ان کے جانے کے بعد مفروضہ کہلا سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ یہ تقریب کا موقع تھا اس لیے موضوع زیادہ طویل نہیں کی جا سکا اور کچھ دیر میں کھانا لگ گیا تو لوگ سب بھول کر کھانے میں لگ گئے تھے۔ بعد میں ابو نے کہا کہ انہیں یقین نہیں آ رہا کہ نعمان صاحب نے قیصر صاحب کو دیکھا ہوگا۔ "وہ ہوتا کب تک سے خیال رکھنے والا شخص ہے، مارکیٹ میں جہاں کدوڑ پتی اور ادب پتی میلے چلے میں بیٹھتے ہیں وہ صاف سحر بردہ ہوتا تھا۔"

"ابو صاف سحر بردے تو آپ ہی رہتے ہیں۔"

"ہاں صاف سحر بردے جاتے ہیں آتے ہوئے دیسے نہیں رہتے ہیں۔ وہ تو جیسا جاتا تھا ویسا ہی آتا تھا۔"

یہ تو ہلکیک کہہ رہے تھے۔ شام کو قیصر صاحب آئے تو گن جیسے کسی اسے ہی آنس سے اٹھ کر آ رہے ہیں۔ اب پتا نہیں پہنچا تھا نعمان اہلک کو دھوکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ شانہ ہی ان کا ذکر ہوتا تھا۔ تھا شامیر کیا آیا کہ راجیلہ سب کو بھول کر اس میں ہی لگ گئی۔ دوسروں کا کیا کہنا بھی سنی گئی تھی۔ نظر انداز کر جاتی تھی۔ میں نے ان ہی دنوں ایک پوچھو سنی سے اب تک میں ایم سی ایس شروع کر دیا۔ یہی ہے میں نے کوہن بھی کیے تھے اور میرا تجربہ بھی خاصا ہو گیا تھا مگر آگے جانے کے لیے ڈگری لازمی ہوتی چاہیے اس لیے میں نے ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ آنے والے دو سال بہت بھ

گزرے تھے۔ صبح سے شام تک آنس اور پھر وہاں سے پوچھو سنی اور وہاں سے رات مجھے دایس پر چھکن آتی ہو چکی ہوئی تھی کہ راجیلہ اور شامیر سے بس دو باتیں کرتا اور آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ اتوار یا پچھنی کا دن مخصوص مصروفیتوں میں گزرتا تھا۔ بعض اوقات تو خود اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا تھا۔

شروع میں تو راجیلہ نے اتنا محسوس نہیں کیا مگر جب شامیر چلے پھرنے لگا۔۔۔۔ اور اس کا بیشتر وقت دادا دادی اور پھولی کے پاس گزرتا تو وہ اب یاد ہونے لگی تھی اور اس کا ہر دوسرا سوال اسی پاس سے میں ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ کب ختم ہوگا میں اسے بھلاتا تھا کہ جلد ختم ہو جائے گا۔ یہی بات ہے کہ خود میرا دل بھی ادب گیا تھا۔ آدمی کام بھی کرے خود چڑھے بھی تو یہ کام اس صورت میں آسان نہیں ہے جب آدمی اکیلا ہو، میرے ساتھ تو بی بی اور بچہ تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے یہ دو سال گزرے اور میرا ایم سی ایس مکمل ہو گیا۔ میں نے اور راجیلہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ شامیر غائب تھا کہ اب پاپا آنس سے جلدی آ جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات کہ مجھے اس لذت کا فوری صلہ بھی ملتا تھا اور مجھے اپنے شعبے میں شہر کی پوسٹ پر ترقی دی گئی تھی۔ مگر یہ تقریباً دو گنی اور دوسری مراعات بھی تھیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا مجھے لاہور جانا تھا۔ یعنی یہ ترقی ہیڈ آنس چلو لے سے شروط تھی۔ میں چنگھا رہا تھا۔ راجیلہ کا خیال تھا کہ مجھے مان لینا چاہیے۔ میں نے ابو سے پوچھا تو انہوں نے بھی یہی کہا اور میں نے ہاں کر دی۔

مگر والوں سے دور جانا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا جب میں کوہن کے لیے لاہور گیا تھا۔ اسی ابو سے دور نہیں رہا۔ شادی کے بعد بھی ان کے ساتھ رہا تھا اس لیے لاہور جانے کے بعد بہت دنوں تک اداس رہا تھا۔ اگر راجیلہ اور شامیر نہ ہوتے تو شاید میں یہ ترقی ٹھکرا کر بھاگ آتا۔ پہلے میں خود گیا تھا اور جب رہائش کا بندوبست ہو گیا تو میں نے راجیلہ اور شامیر کو بلوا لیا تھا۔ رہائش کرانے کی تھی مگر اس کا کرار یہ کہنی دے رہی تھی۔ اسی طرح مجھے گاڑی دی گئی تھی۔ نکو او بیسے ہی ابھی تھی اب دو گنی ہو گئی تھی۔ رہائش گاہرگ میں ایک چھوٹی کوشی کا ٹھکانا پوریشن تھا۔ اوپر مالک مکان رہتا تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز کے ساتھ لاؤنڈری اور ڈرائنگ روم تھا۔ طاقت بہت اچھا تھا اور جہاں مادے چڑھے کھسے اور سلجے ہوئے لوگ رہتے

تھے۔ راحیلہ نے چند دلوں میں کچلے دانوں سے ابھی خامی سلام دیا کر لی تھی اور اس کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔ چھٹی دانے دن ہم خریداری کے لیے جاتے تھے کیونکہ غائبانہ گھر تھا تو کسی نہ کسی چیز کی سامنے آتی رہتی تھی۔ اس دن بھی ہم شاپنگ کے لیے نکلے تھے مگر راحیلہ کو اپنی شاپنگ کرنی تھی۔ مگر میوں کی آمد تھی اور وہ مگرمی کے لحاظ سے کپڑے لینا چاہتی تھی۔ ہم بازار کی مارکیٹ میں تھے۔ راحیلہ ایک شاپ پر کپڑے دیکھ رہی تھی اور میں شاہر کو لیے باہر فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اچانک ہی سامنے ایک بانگ رکی اور اس سے گرتے فلوور میں ایک ہارٹس شخص اتر ا۔۔۔ بال سفید ہو رہے تھے اور چہرے سے مسکن کے آثار نمایاں تھے۔ میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا کیونکہ وہ قیصر صاحب تھے۔

میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ "قیصر صاحب یہ آپ...؟"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایک بڑا سا ڈھرا شوت کا بیگ اتار کر آگے بڑھے۔ میں ان کے سامنے میں آگیا۔ "قیصر صاحب آپ مجھے پہچانے نہیں؟ میں شاہر احمد ہوں، حمزہ احمد کا بیٹا۔"

"میں نے پہچان لیا ہے۔" انہوں نے کہا اور مجھ سے کھرا کر آگے بڑھے میں نے پھر سامنے میں آکر انہیں روکا۔ وہ مجھ سے نظریں ملانے سے گریز کر رہے تھے۔

"جب ایسا کیوں کر رہے ہیں کیا ادارے اور میاں اور تعلق قسم ہو گیا ہے۔"

"ہاں کیونکہ اب میں کسی سے تعلق رکھنے پر کسی کو روکھانے کے لائق نہیں رہا ہوں۔"

"لیکن کیا بات ہوگی قیصر صاحب؟"

"کیا تم نہیں جانتے؟ جان پوچھ کر میرے دھوکوں پر شک پڑ گیا ہے۔" انہوں نے سچے سچے لہجے میں کہا اور میرے پاس سے ہڑکتے چلے گئے تھے۔ اس بار میں انہیں نہیں روک سکا تھا۔ اسی لمحے راحیلہ آگئی۔ وہ مجھے تلاش کر رہی تھی۔

"واہ میں دکان میں تھی اور آپ قاعب ہو کر یہاں ٹہل رہے ہیں۔"

"راحیلہ میں نے ابھی قیصر صاحب کو دیکھا ہے؟"

"گفتہ ہائی کے شوہر؟" وہ بھی حیران ہوئی تھی۔ "وہ یہاں کہاں سے آگئے؟"

"شاہر کے حقیقی میں نعمان اکل نے کہا تھا کہ انہوں نے قیصر صاحب کو لاہور میں لاہر بہت بڑے حال

ایک انکم لے گا یا کہ روٹی سہ سے قتل و سرکرتی ہے اور اسے گزرنے کے لیے کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ واسطے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ فطال، ہم فطال اور غیر فطال۔ ایک انکم نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ جب روٹی کی سوراخ میں سے گزرتی ہے تو وہ سامنے کے پردے پر اس جسم کا اڈا نکس پاتی ہے جس میں سے کردہ آ رہی ہو گیا اس نے سولی چید کرے کا تصور پیش کیا۔

انتہاس: قاترات اسلامی سائنس ہنزہ انٹرنیشنل ورانی

نما دیکھا اور آج اس کی تصدیق ہوگی۔ وہ قیصر صاحب ہی تھے اور ان کی حالت ابھی نہیں تھی۔ یہ کھڑا ہانگ دیکھ رہی ہو یا ان کی ہے۔"

"وہ اتنی دہشتور بہت بڑے حال میں ہیں۔"

"آپک بیک اٹھائے اندر مارکیٹ کی طرف مجھے ہیں۔" میں نے کہا۔

راحیلہ کو بھی جھٹس ہوا تھا اس لیے ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور اٹھارہ گرتے رہے کہ وہ واپس آئیں۔ مگر آدھا گھنٹہ گزر گیا اور ان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ راحیلہ تھک گئی تھی اور لب شاہر بھی خند کر رہا تھا۔

اسے اس کی کریم کھلانے کا دلا سادے کر لائے تھے۔ مجبوراً ہمیں وہاں سے روانہ ہونا پڑا۔ میرے ذہن میں وہ روکر قیصر صاحب کا رخ تھا۔ گھوم رہا تھا۔ لیکن کیا بات تھی جو میرے علم میں ہوئی چاہے کئی گز نہیں تھی۔ لیکن یہ بہت زور دیا کہ

مجھ میں نہیں آتا۔ ہم واپس گھر آگئے حب گئی یہ بات میرے ذہن پر سوار رہی تھی۔ بلکہ اگلے دن جب میں دفتر میں تھا

حب بھی سوچتا رہا تھا۔ میرے ساتھ دو نو جوان لڑکے کام کرتے تھے۔ وہ میرے ماتحت تھے اور میں انہیں کام دیتا تھا۔ میں کام بھی کرتا تھا اور ان کے کام کی نگرانی بھی کرتا

وہ میں بھی کرتا تھا اس لحاظ سے میری ذہنی دلدلی تھی مگر یہ میری پست کا تھنا تھا اور اسی کی مجھے نگوہ دی جانی تھی۔

میں ایک بڑا کمرہ لایا گیا تھا۔ اس میں پارٹیشن کی حد سے میرا کنبہ الگ تھا اور ان دونوں کا حصہ الگ تھا۔ میں

شام کے وقت نکل رہا تھا اور کہیں سے باہر آتا تو وہ دونوں بائیں پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا

اور اس پر جو مہر تھا وہ اس چہرے سے مجھ سے بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ متاعی لڑکیوں اور عورتوں کی نازیبا تصاویر

تھیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔
 ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو انہوں نے بڑا کمر سائت بند کر دی اور مجھ سے معذرت کرنے لگے۔ میں نے ان کو کچھ سنا نہیں اور پھر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کچھ کہتا پکار تھا۔ انہیں کرباوی تھا جو ابھی کر رہے تھے۔ مگر اس واقعے سے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ جیسے جیسے میں اس پر سوچتا رہا مجھے لگا کہ کچھ بات ہے۔ میں گھر آیا تو راحیلہ زفر تیار کر رہی تھی اور شامیر بہت خوش گھوم رہا تھا میں نے پوچھا۔
 ”یہ کس چکر میں ہے؟“
 ”شادی کی سائگہ ہے۔“ راحیلہ نے کہا۔ ”مٹلے کے بچوں کو بلا رہا ہے۔“ میں اور شامیر بھی جانیں گے۔
 ”ابھی؟“

”ہاں بس ایک کانسٹے کی تقریب ہے۔“ وہ بولی۔
 ”آدمے کھنے میں آ جائیں گے۔“
 مجھے خیال آیا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ راحیلہ اور شامیر کی فیر موجودگی میں، میں آرام سے کام کر سکوں گا۔ کھانے کے بعد راحیلہ بھی ہلکا پھلکا تیار ہوئی، شامیر پہلے سے تیار تھا۔ شادی کا مکان کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ وہ شامیر کا ہم عمر ہی تھا۔ ان کے جاتے ہی میں نے اپنا لیپ ٹاپ لے لیا اور انٹرنیٹ پر سرچنگ کرنے لگا۔ یہ آسان نہیں تھا کیونکہ اس قسم کا اتنا مواد آگیا ہے کہ اس میں کوئی خاص چیز تلاش کرنا محنت والا کام ہے مگر یہ سب دیکھنا بھی آسان نہیں تھا۔ مجھے سائنس کا پتا نہیں تھا اس لیے میں سرچنگ کی حد لیتا رہا۔ مگر آدمے کھنے بعد بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میں تھک ہار کر چھوڑنے والا تھا کہ آخری ویب سائٹ پر مجھے ایک لنک نظر آیا۔

اس پر کلک ہوا تھا۔ پاکستانی ہوس ڈائلٹ بکچرز (پاکستانی ہوسٹوں کی تصویریں) میں نے اس لنک کو اوپن کیا۔ یہ ایک پرانی سائٹ تھی جسے اب ڈیٹ ہوئے بھی تین سال سے زیادہ وقت رہا تھا۔ اس میں تصویروں کے فولڈرز تھے۔ فولڈر پر نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ مگر ایک فولڈر دیکھ کر مجھے لگا کہ میں کامیاب رہا تھا اس پر کلک کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ لکھے الفاظ نہایت اہمیت اور ناقابلِ عیاں تھے۔ میں نے فولڈر اوپن کیا تو اندر درجنوں تصاویر تھیں۔ پہلی تصویر کھولی، یہ کلکتہ کی ہی تھی۔ مگر اس تصویر سے کہیں زیادہ عجیبائی جو میں نے چار سال پہلے دیکھی تھی

اور پھر میں ایک کے بعد ایک تصویر دیکھتا رہا۔ آگے بڑھتا ہوں تو ان قسم کی تصاویر تھیں اور بعض میں لیٹر صاحب بھی تھے۔ یہ تصویریں اب سے چار سال پہلے اب لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سائٹ کی ریٹنگ چیک کی۔ اب تو خاص نہیں تھی مگر چار سال پہلے اس کی ریٹنگ بہت زیادہ تھی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں روزانہ آتے تھے۔ یہ ایک سائٹ تھی۔ میں نے چیک کیا کہ یہ تصاویر حریر کتنی سائنس پر تھیں تو ایسا درجنوں سائنس نکل آئیں۔ ان سب پر یہ تصاویر چار سال پہلے لوڈ کی گئی تھیں۔ میں نے سر قلم لیا۔ اب میں جان گیا تھا کہ شرنے کیوں خودکشی کی تھی۔ اس نے یقیناً یہ تصاویر دیکھ لی تھیں اور شاید اپنے اسی دوست کے ساتھ دیکھی تھیں جس کے گھر وہ گیا تھا۔ اسی سے یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے گھر آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

میں نہیں جانتا کہ یہ تصاویر کسے لیٹر صاحب کے لیپ ٹاپ سے تھیں اور انٹرنیٹ پر آئیں مگر یہ سنا تھا کہ ان کے گھر کی بجائی اور در بدری میں ان تصاویر کا ہی ہاتھ تھا جو انہوں نے شوٹنگ میں لی تھیں۔ اکثر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں اور وہ اس کے نتائج کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ لیکن وجہ ہے کہ انٹرنیٹ ایسے مواد سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں روز بہ روز اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے لوگوں کو اس حوالے سے اب بھی محفل نہیں آتی ہے۔ میں سرگزشت کے ان صفحات کے توسط سے لوگوں سے اپیل کرتا ہوں خدا اور اچھے لمبے کی قدرتا کے لیے خود کو اور اپنے گھر کو آؤ پر مت لگا لیں۔ خاص طور سے شادی شدہ جوڑے۔ یہاں یہی ایک دوسرے کا لباس ہونے ہیں اس لباس کو یوں سر جام مت تاریں۔

شعبہ جلالی 2014ء کی منتخب کتابچیاں

ہادی بخش - آپ کا انتخاب

☆ اول: پھروسی طلحی... لعل (لاہور)

☆ دوم: بے حس... شاہد صدیقی (کراچی)

☆ سوم: وارث... ذریعہ (لاہور)

پچھلے اربے اربے اربے کے لیے آپ کی منتخب

ہم آپ کے لیے کا احاطہ



پیشکش

جناب مدبر اعلیٰ سرگزشت!
سلام تم نیت!

میں اپنے ایک دوست کا واقعہ ارسال کر رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر آپ
بھی لطف اندوز ہوں گے۔ اس نے صحافی بننے کے چکر میں کس
طرح ٹھوکر کھائی، آج کل کے یہ دوپہری لوگ کس طرح ہوام کو یہ
وقوف بنارہے ہیں۔ سبق حاصل کرنے کے لیے اسے ضرور پڑھیں۔

ابرار احمد
(سہالکوت)

میرا تعلق ایک میگزین سے تھا۔
آپ نے بھی اس قسم کے بے شمار میگزین دیکھے ہوں
میں۔ میگزین نکالنے والوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ بس کسی
طرح ڈکٹیشن حاصل کر کے کوئی عجیب نام کا میگزین نکالنا شروع
کر دیتے ہیں۔

ایسے میگزین میں ہندوستانی لبر ہالی ووڈ کے اداکاروں
کی نیم عریاں تصاویر ہوتی ہیں، ماڈل اور بچوں کو بے وقوف
بنانے کے ٹوکے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اگلے سیدھے مضامین

اگست 2014ء

۲۴۲۱

ملیانا سرگزشت

ہوتے ہیں۔

ان کی زندگی بڑی مشکل ہوئی ہے۔ عوام پر ملک۔ اس کام چل رہا ہے۔ کسی طرح دس چار ٹیکسوں اور سیرجیوں کے اشتہارات مل جاتے ہیں اور نام ہوتا ہے کہ لاکھوں آدمی رسالہ لکھ رہے ہیں۔ مگر وہ غیر فائدہ مند۔

تو ان دنوں میں بے روزگار تھا۔ جب مجھے اسی قسم کے ایک میگزین میں چاہی گئی تھی۔ اس میگزین کا نام "ہنگ ونگ" تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے اس نام کی وجہ پوچھی تو مسکرا دیے۔

واضح ہو کہ خورشید صاحب ہی اس کے مالک۔ ایلی بلر اور کپور دہی تھے۔ ان کے علاوہ ان کی بیگم بھی اس بے کار کام میں ان کا ہاتھ بٹا کر تھیں۔

ایک چھوٹا سا کراچی کے طبرستان ہسپتال ہوا کرتا۔ یہ کراچی کے گھر میں ہی تھا۔ میں نے جب خورشید صاحب سے ہنگ ونگ کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا۔ "میں نے یہ نام اس لیے رکھا ہے کہ اول تو اس نام کا کوئی میگزین میرے پاکستان میں نہیں ہے دوسرے یہ کہ مجھے اس کا مستقبل شاید نظر آرہا ہے۔ یہ ضرور چمکے گا۔"

اب اس کے بعد میں کیا کر سکتا تھا۔
"بھائی۔ تم کل سے کام شروع کر دو۔" خورشید صاحب نے کہا۔
"لیکن میرا کام کیا ہوگا۔ سارا کام تو آپ خود کر لیتے ہیں۔"

وہ بہت زور سے فیس دیے۔ "نہیں۔ اب ایسا بھی نہیں ہے۔ اب بھی بہت کام ہیں۔ مثال کے طور پر جتنے مضامین اور کہانیاں چالی ہوئی ہیں۔ ان کو سارے آؤٹ کرنا۔ لیڈز میں جا کر لوگوں کے اندر ہر لیڈ پر فیس کاپی لے جانا۔ اپنی مگرمل میں چھوٹا اور سادگی کا پیاں اٹھا کر کرنا۔"

"اور میری نگاہ کیا ہوگی۔"

"بھائی۔ جب یہ میگزین خود مجھے کچھ نہیں دے گا تو پھر تمہیں کیا دے گا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ یعنی میں فوری میں کام کروں گا۔"

"نہیں۔ فوری میں تو نہیں۔ دو پہر کا کھانا کھا کر سناٹھ کھائو گے اور چائے پتی رہے گی۔ اس کے علاوہ آنے جانے کے لیے ہزار روپے دے دینا کرنا۔"

"یہ تو بہت کم ہیں خورشید صاحب۔" میں نے احتجاج کیا۔

کیا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں نے جس بندے کو کل انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اس نے کیا آفر دی ہے۔"

"نہیں تو آپ ہی بتادیں کیا آفر تھی۔"

"اس نے یہ کہا تھا کہ وہ چھ مہینے تک ایک چیسائٹس لے گا اور دس ہزار روپے کی طرف سے کھائے گا۔"

"یعنی بالکل لکھائے گا۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔" خورشید صاحب کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ "ہر مذہبی پیسے خرچ کرتا۔"

"تو پھر آپ نے اس کو چاہی کیوں نہیں دی۔"

"اس لیے کہ وہ میری بیوی کو آنکھیں پھال بھلا کر دیکھ رہا تھا۔" خورشید صاحب نے بتایا۔ "اور مجھے ایسے بدتمیز لوگ پسند نہیں ہیں۔"

تھیک اسی وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے لے کر آئیں۔ اور میرا دوش چاہا کہ میں اس شخص کو کوئی بارشوں جو اس کی بیوی اور غیبی صورت صورت کی آنکھیں پھال بھلا کر دیکھ رہا تھا۔ کیا کھانا دینی پاپا اس نے۔

"آپ نے اچھا کیا جو اسے چاہی نہیں دی۔" میری زبان نہیں رک گئی تھی۔
"وہ کیوں۔"

"اس لیے کہ ایسا بددلی آدمی اس قابل ہی نہیں ہے کہ کہیں لو کری کرے۔" میں نے کہا۔

اس وقت خورشید صاحب کی بیگم چائے رکھ کر واپس جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرے اس بے لاگ تھمرے پر خورشید صاحب مجھے سے ہلکے اٹھیں گے، اس کی بجائے انہوں نے دھڑا دھڑا دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "میرے مزاج۔ میں خود بھی اس کی بددلی پر ماتم کرتا رہا ہوں۔"

خورشید صاحب نے ایسی بات کہہ دی کہ میں فیس پڑا۔ کیا سچائی تھی۔

"اچھا تو بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے میں جو ان کرنے کے بارے میں۔" خورشید صاحب نے پوچھا۔

"جواب۔ میرے پاس کوئی آپشن نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تیار ہوں۔ آپ یہ بتائیں میرا سب سے پہلا کام کیا ہوگا۔"

"تم کل صبح ہر ایک شے کا اندازہ لو گے۔" خورشید صاحب نے بتایا۔

"میں نے ہر ایک شے کا نام بہت سنا تھا۔ ان کے

حصہ دار میں نامی گرامی سیاست دان اور پیرو کرٹس حاضر ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک پورنل قسم کے ہوتے تھے۔ دوران کے بارے میں یہ بھی سنا گیا تھا کہ ان کی خبریں تو اخبار میں آتی ہیں۔ لیکن وہ کسی کو اطلاع نہیں دیتے۔

"ہاں تو کیا سوچتے تھے۔" خود شیو صاحب نے پوچھا۔
"آپ نے پہلا ہی اسکاتلینڈ ٹاک دے دیا ہے کہ میں بولتا کر رہ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم اسے لپچے لیے چلے گئے ہو۔" خود شیو صاحب مسکرا کر بولے۔ "چلو۔ میں یہاں تک کہہ رہا ہوں کہ اگر تم ان کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہو گئے تو میں اسی وقت تمہیں دو ہزار روپے دے دوں گا۔"

یہ ایک بڑی لالچی تھی۔ دو ہزار اس زمانے میں میرے لیے بہت تھے۔ میرے بہت کام لکھ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے جناب۔" میں نے چلنے قبول کر لیا۔ لیکن اس کے لیے مجھے بہت حد تک روکی۔ کچھ ہوم ورک کرنا ہو گا۔"

"کیا ہوم ورک؟"

"یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ پرنس بکریٹ ہے۔" میں نے کہا۔

"چلو یہ بھی منظر۔ اب تم اپنے جوہر دکھاؤ۔"

میں گھر واپس آ کر بہت دیر تک غائب کرتا رہا کہ یہ انٹرویو کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سنا تھا کہ بہت ہی بڑا صاحب قسم کا انسان ہے۔ خبروں کے علاوہ کسی صحافی و رپورٹر کو اپنے آستانے میں آنے کی نہیں دیتا۔ اس کو بہت اوشیاری سے قابو کرنا تھا۔ بہر حال میں دوسرے دن میرے ہاتھ شاد کے آستانے پر پڑ گئے۔ آستانہ کیا ابھی خاصی بڑی لکھی تھی جس کے گیٹ پر دو دو گارڈ کھڑے ہوتے تھے۔

اگر گیٹ پر ہی ایک نوٹس لگا ہوا تھا جس پر خود صاحب سے ملاقات کے اوقات لکھے ہوئے تھے۔ صبح نوے گیارہ بجے سیاستدانوں اور پیرو کرٹس کے لیے۔ پھر سہ پہر چھ بجے سے شام چار بجے تک تاجروں اور صنعت کاروں کے لیے۔ شام سات سے رات نو بجے عام افراد کے لیے۔ اور نوے دس بجے پھر سیاست دانوں کے لیے۔ اس کے بعد خود صاحب آرام اور اپنے وضائف کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

میں چونکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے ملنے ملا تھا۔ اسی لیے مجھے شام سات بجے آنا تھا۔ میں اس شام سات بجے پھر پہنچی گیا۔ گیٹ پر بہت سے لوگ تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے

چونکہ عام طور پر عام لوگ پریشان حال ہی ہوا کرتے ہیں۔ اسی لیے سب ہی پریشان حال تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک کٹھری تھی۔ جس کی کٹھری باہر کی طرف نکلتی تھی۔ اس کے اندر ایک آدھی بیٹھا ہوا لوگ دے رہا تھا۔ خود صاحب سے ملنے والے باقاعدہ لوگ لے کر چلا کرتے تھے۔

گیٹ کے ساتھ ایک بڑا سا شہنشاہ تھا۔ لوگ لے کر اندر جانے والے اس شہنشاہ کے نیچے رنگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جانا کرتے۔ یہ انتظار گاہ تھی۔

اس کے بعد باقاعدہ اعلان کیا جاتا تو کسی نمبر 12 توکن نمبر چالیس، دغیرہ وغیرہ۔ جس طرح ڈاکٹر کے یہاں یا شنگوں میں ہوا کرتا ہے۔

پھر ملاقاتی اندر چلے جاتے۔ یہاں خود صاحب اسے شرفِ طاقت بخشا کرتے۔ پھر انہیں باہر نکالتے۔ اسی لیے مجھے کچھ ہراسنا کرنا پڑا۔

میں خود صاحب سے ملنے کے لیے ہوم ورک مکمل کر کے گیا تھا۔ معاملہ پیچھے کا تھا۔ ایک بندے نے اس کمرے تک درجہ عالی کی جس میں خود صاحب اپنی پوری شان کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔

وہ خامے صحت مند انسان تھے۔ مشاق احمد پوتلی صاحب نے ایسے بزرگوں کے لیے ٹیک بہت خرچے کا جملہ لکھا ہے کہ ان کی صحت کا راز یہ ہے کہ یہ سادہ کھانے اور ورزش سے پرہیز کرتے ہیں۔

خود صاحب ایک چھوٹے سے تخت پر بیٹھے تھے۔ جس پر ایک بے دارغ سفید چادر بھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے تحاشہ ان کے بعد سے صحت مند ہاتھ چومنے شروع کر دیے۔

"بس مل گئی۔ مل گئی۔ اب مجھے کہیں نہیں چلتا۔ آپ ہی کے پاس بیٹھا گیا ہوں۔ اور برسوں کے بعد روٹنی مل گیا ہے۔ آپ ہی ہیں۔ سو فیصد اور آپ۔ آپ کے علاوہ کوئی اور ہی نہیں سکتا۔"

"ات کیا ہے۔ کیوں اتنے بے قرار ہو رہے ہو۔" خود صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

"خیر۔ مجھے آپ کے پاس بیٹھا گیا ہے۔" میں نے بہت سادہ ہو کر بتایا۔

"کس نے بیٹھا ہے۔"

"حضرت ہوشیار شاہ قندری نے۔" میں نے بتایا۔ "ناگید والے۔"

"اوپر ناچو دوائے" میر صاحب نے مجھ سے بھی بڑھ کر مارا کیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کمرے میں چار پانچ آدمی بھی تھے۔ یا تو وہ ساکین میں سے ہوں گے یا میر صاحب کے خاص بندے ہوں گے۔ اسی لیے میر صاحب نے ایسے تھاک کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہاں حضور نے کس لیے بھیجا ہے تمہیں۔" میر صاحب نے دریافت کیا۔

"خواب میں آکر۔ آپ نے شاید میرے وہاں حضور کا نام نہ سنا ہو۔ ابھد شاہ بخاری۔ وہ قلعہ دی بابا کے جانشین ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے قلعہ دی بابا سے ہمارے خاندان کا بہت قریبی رشتہ ہے۔"

"تو بابا قلعہ دی تمہارے خواب میں آئے تھے۔" اس بار میر صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جی حضور۔ انہوں نے مجھے آپ کی صورت دکھائی تھی۔ آپ اس وقت الیکٹریک کے کعبے پر چڑھے ہوئے تھے۔"

"کہا۔" میر صاحب کچھ جڑبڑھانے لگے تھے۔

"جی حضور۔ بابا قلعہ دی نے آپ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا کہ اس کو تلاش کر۔ جو وہی پھیلانے کا کام کرے گا۔ الیکٹریک کے کعبے پر چڑھنا اس بات کا اشارہ ہے۔"

"سبحان اللہ بھائی۔۔۔" کرے مثل موجود وہ چوروں زور زور سے دہر کر رہے تھے۔

خود میر صاحب بھی اپنی اس بزرگی سے حائر ہونے لگے تھے۔ اس بار انہوں نے بڑی شگفتگی بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "خدا جنت الفردوس میں جگہ دے قلعہ دی بابا کو، وہاں کیا لہرا رہے تھے۔"

"انہوں نے مزید فرمایا کہ میں آپ سے جا کر کہوں کہ میرا اور پتا سے بھڑا لہاں ہے۔" میں نے بتایا۔

میں نے دیکھا کہ یہ سن کر میر صاحب ہلک سے دھمکے تھے۔

"واہ۔" میر صاحب نے قلعہ دی بابا کے لیے کہا۔ "میں حضرت قلعہ دی بابا کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کروں گا۔" پھر انہوں نے کمرے میں موجود افراد سے کہا۔ "آپ حضرات وراما پر تشریف لے جائیں۔ مجھے اس نوجوان سے معرفت کی باتیں کرنی ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد میر صاحب نے فرمایا۔ "آخر کیا

ہے یہ سب۔ یہ میرا پتا اور لہاں یہ کیسے اشارے ہیں۔"

"حضور۔ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے ہاتھ بائو لیے۔ "مجھے جو حکم دیا گیا تھا وہ میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتا۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ یہ قلعہ دی بابا کا حوالہ کہاں ہے۔" میر صاحب نے مجھے کریدنے کی کوشش کی۔

"حضور۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ناچو دوائے کے لوازم میں ہے۔" میں نے بتایا۔ "اکثر خواب میں دیکھا کرتا ہوں۔"

اس کے علاوہ قلعہ دی بابا سے بھی خواب میں ملاقاتیں ہوتی ہیں۔

"قلعہ دی بابا کا طریقہ بتاؤ، صورت حال بتاؤ۔"

"حضور۔ آپ کیوں مجھنا چیز کا امتحان لے رہے ہیں۔ ایسے قلعہ دیکھنے چوروں کے ساتھ سامنے کہاں آتے ہیں۔ وہ تو جب آتے ہیں ان کے چہرے پر خواب ہوتا ہے۔"

میر صاحب واقعی سوچا میں پڑے تھے۔ ان کی کچھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کون ہوں، اور جو میں کہہ رہا ہوں اس کی کیا حقیقت ہے۔

میں تو اپنا نوم روک کر کے گیا تھا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ میرا پتا اور لہاں کون ہیں۔ یہ دراصل واڈا پر جس کی لڑکیاں تھیں۔

میر صاحب کے تعلقات میرا لہا پنا سے تھے۔ جبکہ لہاں نے وہ پہاڑ میں آکر لہو کر دیا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ چونکہ میر صاحب کا تعلق اسی کے گاؤں سے تھا۔ اسی لیے میر صاحب پر اس کا حق زیادہ تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا واقعی قلعہ دی بابا نے میرا پتا اور لہاں کے لیے اشارے دیے تھے۔" میر صاحب نے پوچھا۔

"ظاہر ہے سرکار۔ ورنہ مجھے کیا معلوم کہ یہ کیسے اشارے ہیں۔ آپ ہی بتائیں یہ کیسے اشارے ہیں۔" میں نے انہیں سوال کر لیا۔

"بھائی۔ یہ معرفت کے درجات ہیں۔" میر صاحب نے اب زمینان سے فرمایا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے سرکار۔"

"تمہارا۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکا ہوں۔"

"قلعہ دی بابا کا حکم ہے کہ میں آپ کے پاس سے راجست ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ قلعہ دی بابا کا اشارہ سراسر آنکھوں پر۔" میر صاحب کچھ سوچ کر بولے۔ "لیکن کسی طرح دولت ہو گے۔"

لال دیتے ہیں۔ جس سے اس کا نشہ گنا بدھ جاتا ہے۔ اور وہ شراب خاص خاص لوگوں کے لیے لائی جاتی ہے۔ جبکہ عام لوگوں کے لیے عام شراب ہوتا ہے۔

"کمال ہے۔ کیا آپ نہیں کوئی مظلوم" میں نے پوچھا۔

"سب جانتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جن خاص لوگوں کو شراب معرفت پلائی جاتی ہے۔ وہ بڑے بڑے حاکم ہیں۔ سب کس میں اتنی اہمیت ہے کہ وہاں چھاپا رہے۔"

"تو اب قاتل۔ کرنا کیا ہے۔ یہ صاحب تو بہت بڑا جرم کر رہے ہیں۔"

"یہ مکمل اور جملی اور پولیس سے تو نہیں ادا لیکن اپنی بدنامی سے بہت ڈرتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "تم اب اس پر یہ ظاہر کر دو کہ تمہیں اس کا راز مظلوم ہو گیا ہے اور وہ سارے اخبارات اور رسالوں کو بتا دیا جائے گا۔ اس میں یہ کوئی جرم کرنے کے لیے تمہارا اتنا کہنا ہی بہت ہوگا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"اس کے بعد میرے پاس دو تین راتیں ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ تمہیں غیبی کی کوئی شے کرے گا۔ ظاہر ہے کہ تم اس کی باتوں میں نہیں آؤ گے۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ خود شے کرنے لگاؤ۔ جس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ بہت ہی اذیت قسم کا آدمی ہے۔ اور تیسرا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ راتوں رات یہاں سے بھاگ لے۔"

"تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ذہنی قسم کا آدمی ہے تو پھر ایسا کیوں کرنے لگا۔"

"اس لیے کہ ہمارے یہاں کے کرپٹ حضرات جرم یا بکڑے جانے سے نہیں ڈرتے۔ جتنے جرم کی کاپی سے ادا کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

اس کی بات سن کر میں نے ہنس دیا۔ میں اس پر تیار ہو گیا۔ یہ دیکھیں کہ یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ میں ایک اخبار میں انٹرویو کے لیے پہنچا۔ اس نے میرے انٹرویو کی شرط لگا دی۔ میں نے منظور کر لیا۔ اور اب میں اس کے کو بیگ میل کرنے جا رہا تھا۔

دو دنوں کے بعد میں پھر میرے صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

پہلے کی طرح اس دن بھی ان کے کمرے میں ان کے خاص بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے کی طرح ڈرامے کرتے ہوئے ان کے ہاتھ جوڑے اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

"ہاں اسے سعادت مند تو جہان۔ یہ بتاؤ کیا قلعہ دہلی بابا

"یہ تو آپ جانتے سرکہ۔" میں نے کہا۔ "میں تو حکم کا قلام ہوں۔ جو فرما میں گے۔ میں وہی کروں گا۔"

"اچھا جاؤ۔ میں تمہارے لیے سوچتا ہوں۔" میرے صاحب نے فرمایا۔ "تم دونوں کے بعد آ جانا میرے پاس۔"

میں نے آدمی کا سیالی تو حاصل کر لی تھی۔

قلعہ دہلی بابا دراصل میرے صاحب کا خاص چیلر مقصود تھا۔ میں نے کسی طرح اسے توڑ لیا تھا۔ وہ برسوں سے میرے صاحب کی خدمت کیے جا رہا تھا اسی نے یہ پیش بہا معلومات مجھے فراہم کی تھیں۔

میں نے جس اہم دورک کی بات کی ہے۔ وہ بھی اہم دورک تھا۔ میرے صاحب سے ملاقات کے بعد میں نے مقصود کو فون کر کے اس شخص کو بھیج دیا تھا۔ جہاں ہماری ملاقات ہوا کرتی تھی۔

مقصود کو میں نے رشوت نہیں دی تھی اور نہ ہی میرے پاس اتنے پیسے تھے کہ میں اسے بگودے سکھا۔ مقصود کا پرانہ یہ تھا کہ وہ میرے صاحب کا بہت گروہ اس کی جگہ خود اپنے آپ کو رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھ سے معاہدہ کرتے ہوئے بتا دیا تھا۔

"میں اس جملی کی حرکتوں سے تنگ آ چکا ہوں۔ نہ جانے کتنے مظلوم لوگوں کو اس نے برباد کر کے رکھا دیا ہے۔ میں اس کے انڈر کا آدمی ہوں۔ اسی لیے اس کے بارے میں سب جانتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اس کے بارے میں جو کچھ مظلوم ہو۔ بتاتے جاؤ۔ پھر ہم دونوں مل کر اس کا کھارہ کر دیں گے۔"

اسی نے مجھے ہیرا ہٹا اور ملایا اس کے بارے میں بتایا تھا۔ اب میں نے اسے پھر بلایا تھا تاکہ کچھ اور باتیں جان سکوں۔ وہ کام کا آدمی تھا۔

وہ آیا تو میں نے چائے اور سٹک وغیرہ کا آمرا دے دیا۔ چائے پیچے کے دو تین میں اس نے انگشٹاف کیا۔ "آپ کو مظلوم ہے جناب۔ ہمارے میرے صاحب شراب معرفت کی پہلی چلار ہے ہیں۔"

"یہ کیا چیز ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"مٹی شراب۔ وہ تو چورنگی سے آگے اس شراب کو بنانے کی ایک خفیہ پہلی ہے۔ چند ہی لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔ جب شراب تیار ہو جاتی ہے تو کچھ لوگوں کو میرے صاحب اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ اور ان میں کوئی خاص دور

“*Wu*”

“**45**”

تجربہ کیا کہ یہ کہہ کر صاحب نے نہ تو خود کشی کی اور نہ ہی

آهسته آهسته بهت میزدند -

ایسے عیروں کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔

یہ امر بھی یحییٰ کرتا ہے۔ اپنا اقتدار بچانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کرتی چلتی ہیں۔ ورنہ ہر انصاف پر ایسے جبروں پر ماتحت ملدے۔

مجھے چاہیے کی سزا ہوگی تھی۔ لورڈ صاحب کو جاننے میں سے ہمارا کیا تھا۔

اس لیے میں اپنے بڑے والوں کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نیک تو اس قسم کے بہروں، تقیروں، سیاست دانوں جاگیرداروں وغیرہ کو نہ پیچڑیں، لوہا گر بجھڑی رہے ہیں تو اپنا ہر دم و رک کھل رہ گئیں۔ منظور جیسے لوگوں سے نہیں۔



رازِ دل اپنا

جذاب لہزنہ سرگزشت |

السلام علیکم |

میں آج اپنی ایک بے وفائی کا احوال سناتے آیا ہوں، گوکہ یہ قصہ اس طرح رونما نہیں ہوا مگر میں نے اسے لطافت سے آراستہ کر دیا ہے لیکن واقعہ یوں ہی ہے۔

اختر

(کراچی)

~~~~~

میں اس وقت ایک دکان سے باہر نکل رہا تھا جب راجیلہ پر نظر پڑی۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ میں آنکھیں میاڑیاد کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں عام طور پر اس قسم کی خواتین بہت پلاننگ کے ساتھ کرتا ہوں۔ چند لمحوں جھلے ہیں جنہیں میں نے رٹ لیے ہیں انکا دہرائے پر اکتفا کرتا ہوں۔

راجیلہ نے جب یہ دیکھا کہ کوئی شخص اسے گھور گھور کر

مجھے کے عالم میں دیکھے جا رہا ہے تو مجھے سے بھاتی ہوئی میرے پاس آگئی۔" کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہیں۔ کیا بھی کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔"

"ہزاروں لڑکیاں دیکھی ہیں۔" میں نے گہری سانس لی۔ "لیکن خوبصورتی کا یہ معیار میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ صاف کہنے لگا۔ میں ایک سہلپ انسان ہوں لیکن اس وقت خود پر قابو نہیں رہا۔ سوئی۔ اگر آپ میری وجہ سے ڈسٹرب ہوئی ہیں تو ویری سوئی۔"

یہ ایک ایسا حیرت انگیز تھا۔ جس سے بہت سی کم لڑکیاں ہکا بھکی ہوں گی لیکن وہ صاف گل گل ہلکے اس نے منہ ہکا کر کہا۔ "بس بس۔ زیادہ کھنکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری تعریف کا حق صرف اسی کو ہوگا جو میرا جیون ساتھی ہوگا۔"

اس نے ایک اشارہ تو دے دیا تھا۔ "نیک بخت تمہارا جیون ساتھی کون ہوگا؟"

"جس کو میرے ابا چاہیں گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"اور تمہارے ابا کا معیار کیا ہے۔"

"وہ آ رہے ہیں ابا۔ ان ہی سے پوچھ لو۔"

اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کی فکر کرتا۔ وہاں سے نکل پڑا۔ اس کا ابا وہاں کی طرف سے سودا ہو گیا۔ کیا بڑا خطرناک ابا تھا۔

پورا پہلو ان تھا۔ یہ قدر یہ بھلی ہوئی چھانیاں۔ یہ بھی موٹھیں۔ سب کچھ خطرناک۔ بہت بڑے کھیرے کی شکل اور گوت پہنے ہوئے۔ مجھے وہ پورے شکل ریسر ہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ "کیا بات ہے بھئی۔ کون ہے یہ۔" اس نے راحیلہ سے پوچھا۔

"ابا۔ وہ جو میری دوست ہے نا قہہ ہلا، یہ اس کے بھولی زاد بھائی ہیں۔" راحیلہ نے مجھے صاف بچالیا۔ "یہ مجھے یہاں مل گئے تو خیریت پوچھنے گئے۔"

"اچھا اچھا۔" ابا نے معاملہ کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس سے معاملہ کیا تو ایسا لگا جیسے میرا کانہا ہی اتر گیا ہو۔ انگلیاں کڑکڑانے لگی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا گئے تھے۔

"تو جیوان۔ کچھ کھایا یا کرو۔" ابا نے بے تکلفی سے میرے شانے پر ہاتھ مار دیا۔

شانے پر جیسے پھڑک رہا تھا۔ میں نے دیکھا راحیلہ

رہا لب مسکرا رہی تھی۔ اس وقت وہ مجھے اور بھی آنکھیں لگی۔ اس پہلو ان کی بھلی رانچی بہت شاندار تھی۔ "تو جیوان، کبھی ہمارے گھر بھی آؤ۔" اس کے ابا نے کہا۔

"ضرور ضرور۔" میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے گردن ہلا دی۔ "ضرور آؤں گا۔"

"بھئی۔ اس شریف لڑکھان کو ہمارا پتا تو معلوم ہوگا۔" پہلو ان ابا نے راحیلہ سے پوچھا۔

"نہیں ابا۔ یہ کبھی ہماری طرف نہیں آئے۔"

"تو جیوان، ابا پتا ہے۔ ایف سٹرو، دھیرے کا کوئی کچھ نہ گئے۔"

"کی ہاں کچھ گیا۔" میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تھا کہ اسے ابھی تو جیوان تم ہمارے یہاں ضرور آؤ اسی لیے اس نے اپنے ابا سے غلط طاقی کی تھی۔

"اچھا بچا۔ میں سامنے والی دکان سے اپنے لیے بادام اور پستے لے کر آتا ہوں۔ سب ختم ہو گئے ہیں۔ تم جب تک ان سے باتیں کرو۔"

ابا جلدی سے ایک طرف چلا گیا۔

اس کے بچے ہی راحیلہ نے میری طرف دیکھا۔ "اب جلدی سے اپنا نام بتا دو، ورنہ ابا کیا کہیں گے کہ دوست کے بھائی کا نام بھی نہیں معلوم ہاؤ میرا نام تو سن ہی چکے ہو۔ راحیلہ۔"

"میرا نام اختر ہے۔" میں نے بتایا۔ "اختر مالم۔ میں ہر تھوڑے نام آباد میں رہتا ہوں اور ایک غرم میں کام کرتا ہوں۔"

"بس اتنا ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن تم ضرور آؤ۔"

اسی دوران میں اس کا ابا ہا دام اور پستے لے کر آچکا تھا۔ پھر وہ دونوں ایک طرف چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی ہڈیوں کا جائزہ لیا۔ کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ویسے اس کا ابا خطرناک آدمی تھا۔

اپنے قیام میں وہاں آکر بھی میں اسی کے ہارے میں سوچتا رہا۔ اس کا ابا چاہے جیسا بھی ہو۔ راحیلہ بہت دل کش تھی۔ اس کے چہرے پر جو طراحت تھی، وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

اس کے ابا خطرناک ہیں لیکن وہ تو ٹھیک تھی اور میں



نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بھی دیکھے تھے۔ اس کا ہاتھ پارتھا تھا۔ ایف سترہ بوجھ گیا۔

میں دوسری شام کو اس ملائے میں پہنچی گیا۔ وہ ایک اسٹریٹ تھی۔ جس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے عام سے مکانات بنے ہوئے تھے۔

یہ عقیدہ پڑا لوگوں کی آبادی تھی۔ عام طور پر بڑے لکھے رہا کرتے۔ مجھے اچھ سترہ تلاش کرنا تھا۔ کراچی میں ایک مصیبت یہ ہے کہ لوگ مکانوں کے گیٹ پر نمبر کے علاوہ سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ کہاں کے رہنے والے تھے، باپ دادا کے نام کیا تھے۔ کس صیغے میں پیدائش ہوئی۔ کون کون سی ڈگریاں حاصل کیں۔ یہ سب لکھا ہوتا ہے۔ صرف مکان نمبر نہیں لکھتے۔ خدا جانے یہ کون سا نولہا ہے یا کسی قسم کی احتیاط۔

مجھ پر ایک مکان کے سامنے بیٹھے کچھ لوگوں سے ایف سترہ معلوم کرنا پڑا۔ ان میں سے ایک مجھے دیکھ کر زور زور سے چنے لگا۔ اس کی بدتمیزی پر مجھے خصر آ گیا تھا۔ "شرع ہے بھائی۔ یہ تم مجھے دیکھ کر فحش کیوں رہے ہو۔ کیا میرے سر پر سیگ لگ آئے ہیں۔"

"نہیں بھائی۔ ابھی نہیں۔ لیکن ایف سترہ سے دیکھی ہو سیگ ضرور لگ آئیں گے۔" اس نے کہا۔

اب وہ سب کے سب چنے لگے۔ بدتمیز قسم کے لوگ تھے۔ میں بھنا کر وہاں سے چلنے لگا تھا کہ اس آدمی نے جو زور زور سے فحش رہا تھا۔ کونے والے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ مکان دیکھ رہے ہوتا۔ وہی ایف سترہ ہے۔"

میں جب اس مکان کی طرف جانے لگا تو اس نے آواز لگائی۔ "بھائی جان۔ دائیں میں اپنی بیگمیں ضرور دکھا دینا۔"

میں ان کی بدتمیزی پر انہیں دل ہی دل میں برا بھلا کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ویسے وہ لوگ اس قسم کی جو باتیں کر رہے تھے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔

بھر حال یہی سب سوچتا ہوا میں ایف سترہ تک پہنچ گیا۔ جس کا گیٹ لوہے کا تھا۔ میں نے گیٹ پر دستک دے دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے اسی پہلوان ابا کی فراہم شالی نکلی۔ "کون ہے یہ۔"

"جناب۔ میں ہوں اختر۔"

دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ پہلوان ابا انگوت ہاتھ سے

میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ بہت خطرناک قسم تھا اس کا۔ اکدم کسا ہوا۔ درویشی۔

"ابا بھائی۔ کون ہے تو۔" اس نے پوچھا۔

"جناب۔ میں اختر عالم ہوں۔" میں نے پریشان ہو کر بتایا۔ "آپ کو یاد ہوگا۔ اس دن مارکیٹ میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ بارام لینے گئے تھے۔"

"ابے بارام بہت تو میں روز لینے جاتا ہوں۔ تو کس خاص دن کی بات کر رہے۔"

"جس دن آپ کی صاحب زادی بھی آپ کے ساتھ تھیں۔"

"وہ تو روز میرے ساتھ ہوتی ہے۔ سب بتا۔"

"جناب۔ اس نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اس کی دوست کا بھائی ہوں۔"

"کبے۔ وہ تو ہر ایک کے لیے بھائی بنتی ہے۔ تو میں کیا خاص بات ہے۔"

اب اس پہلوان سے بحث کرنی ہے کار علی تھی۔ "لڑک ہے صاحب۔ آپ نہیں پہچان رہے ہیں تو جہنم میں ڈالیں۔ میں دائیں جا رہا ہوں۔"

"کیسے کیسے دائیں چلا جائے گا۔" اس نے جو میری گردن میں ہاتھ ڈال کر مٹھلایا ہے تو میں سیدھے لان میں جا کر ان جو پوری طرح کھدا ہوا تھا۔ یعنی وہ لان اس پہلوان کے لیے کھادے کا کام کرنا ہوگا۔

اس وقت کچھ میں آ گیا کہ وہ لوگ ایڈریس پوچھنے پر کیوں میرا مذاق اڑا رہے تھے اور یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ دائیں میں میری بیگمیں لگ آئیں گی۔

انکا بے عزتی تو پہلے ہی نہیں ہوئی ہوگی۔

اس نے میرے قریب آ کر میرا گریبان پکڑ کر مجھے اٹھرایا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرنا۔ داخلہ رحمت کے فرشتے کی طرح اندر سے نمودار ہو گئی۔ "ابا۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔" اس نے پوچھا کر کہا۔ "یہ اختر صاحب ہیں۔"

"کون اختر صاحب ا۔"

"اے اے وہی جو اس دن ملے تھے۔ میری دوست شہناز کے پھوپھی زاد بھائی۔"

"اچھا اچھا یہ وہ ہے۔ (فاصلہ کم کریں) پہلوان ابا خلیف ہو کر بولا۔ "لو جوان۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"بتایا تو تھا جناب۔ لیکن آپ نے پہچان ہی نہیں۔"

میں نے اپنے لباس سے مٹی جھالتے ہوئے کہا۔  
 "صاف کرنا تو جوں۔ آج کل میری پاؤداشت کچھ  
 کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک دن پہلے کے وہ انتہات بھول  
 جاتا ہوں۔"

"جناب۔ آپ اگر ہر بار اسی طرح بھولتے رہے تو  
 پھر میں آجیدہ تو آنے سے رہا۔"  
 "تو کوئی بات نہیں۔" اس نے راحیلہ کی طرف  
 دیکھا۔ "جاؤ بیٹا۔ ان کو اندر لے جا کر چائے پلاؤ۔  
 میں جب تک ہتھکیں لگا کر آتا ہوں۔"

راحیلہ مجھے مکان کے اندر لے آئی۔ چھوٹا سا تھا لیکن  
 سلیقے سے پہلایا گیا تھا۔ پہلوان لہا سے تو ایسی خوش روئی کی  
 امید نہیں تھی۔ یہ سب راحیلہ کا رتا ہو سکتا تھا۔

"آخر مجھے اسوں سے کہہ دیا کہ اہا نے تمہارے ساتھ بیٹا  
 سلوک کیا۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ اہا کی عادت ہے۔ وہ  
 عشق کا احسن اسی طرح لہا کرتے ہیں۔"  
 "عشق کا احسان؟ لیکن میں ان سے عشق کب کر رہا  
 ہوں۔"

"کوہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں آنے والا ہر شخص مجھ  
 سے عشق کرنے آتا ہے۔"  
 "کیا اور بھی کچھ لوگ آچکے ہیں۔"

"دیکھو بیٹا۔ میں ایک ماڈرن لڑکی ہوں۔" اس نے  
 کہا۔ "لاکھوں سے دوستی تو رہتی ہے۔ جیسے کالج کے نصاب  
 اور دوستی دونوں کے ساتھ اچھی دوستی تھی۔ محلہ کا ہر شخص تو گلے  
 پڑ گیا تھا۔ اس لیے اس کے ساتھ بھی ایک دو پاؤ بھول جانا  
 پڑا۔ افضل اور نسیم سے بیٹھ پر دوستی ہوئی تھی۔ پھر ملا کا نہیں  
 ہونے لگیں۔ لہذا تو بالکل بڑا اس میں ہی رہتا تھا۔ جواد اور  
 ساجد سے مارکیٹ میں ملاقات ہوئی تھی۔ خورشید تو غیر  
 غائبانہ ہی کا تھا۔"

"ماشا اللہ۔ ماشا اللہ۔" میں ہلکا کر ہلکا۔ "بہت ہی  
 مختصر فہرست ہے تمہارے چاہنے والوں کی۔"

"اب سب کے نام تو یاد نہیں ہیں نا۔ انہی میں  
 کہے ہوئے ہیں، کہہ تو انہی لے آؤں۔"

"نہیں رہے وہ۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم  
 مجھے کس کھاتے میں ڈال رہی ہو۔"

"یار کے کھاتے میں۔" وہ مسکرا کر بولی۔  
 "کیا مطلب؟"

"یار سے آخر عالم صاحب۔ میں نے جتنے نام

بتائے۔ یہ سب میرے دوست تھے۔ صرف دوست۔ جبکہ تم  
 سے عیار کا رشتہ استوار ہونے لگا ہے۔"

"کب ہے۔"

"جب سے اہا نے تمہاری لہکائی کی ہے۔" اس نے  
 بتایا۔ "تم میری بات کو غنائی مت سمجھو۔ میں تمہارے لیے  
 واقعی سچیدہ ہو گیا ہوں۔"

پھر اس نے میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیا اور میں  
 اس طرح باطل کیا جیسے موسم کو چھ لے پر رکھ دیا گیا ہو۔

"راحیلہ۔ تم یہ بتاؤ۔ تمہارے اہا کو راضی کر لے کے  
 لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"تو ایک شرط پوری کرنی ہوگی۔" اس نے بتایا۔  
 "اور وہ شرط یہ ہے کیا۔"

"وہ شرط یہ ہے کہ جو انہیں رہا سلگ میں ہر اسے  
 لہا سے اپنا لہا دے گا میں گے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے اس دوج وگل لہا  
 کو ہر اکوں گا۔"

"یہ سوچنا تو تمہارا کام ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تم  
 مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا پڑے  
 گا۔"

"میں کیوں نہ تمہارے اہا کے لیے کرائے کے کسی  
 ریسلر کا بندہ دست کر لوں۔" میں نے کہا۔ "وہ میرے ہا  
 ہا پر لڑے گا۔"

"تو پھر اہا اس سے میری شادی کر دے گی۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑی مصیبت ہے۔" میں نے  
 کہا۔ "چلو۔ تم گھڑت کرو۔ میں کچھ نہ کچھ سوچتا ہوں۔"

"دیکھو، میرا دل مت توڑنا۔ ایسا نہ ہو کہ اہا کے  
 در سے تم غائب ہی ہو جاؤ۔" اس نے کہا۔ "میں اپنی اس  
 زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ لہذا یہ ایسا کوئی نہیں ہوگا جو  
 آکر میرا ہاتھ تمام لے۔"

اس وقت میں اس کے لیے سچیدہ ہو گیا۔

اس کا ہاں اس کے عشق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا  
 تھا۔ کوئی بھی معقول آدمی اس کے گھر میں اپنا رشتہ لے کر نہیں  
 آ سکتا تھا۔

راحیلہ کی آنکھوں میں اگر آنسو تھے تو وہ اپنی قسمت پر  
 ماتم کرنے کے لیے حق بجانب تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔

خوبصورت، سلیقہ مند۔ اس کے گھر کو دیکھ کر اس کے سلیقے کا  
 احساس ہونے لگا تھا۔



اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔  
 باپ علی ایسے پرورش کی ہے۔ اس نے اپنا سب تک تعلیم بھی  
 حاصل کر رکھی تھی۔

اس نے پھول بٹانے اور آرائش کی دیگر چیزوں کے  
 کوہ سز بھی کر رکھے تھے۔ یعنی وہ ہر طرح اپنانے جانے کے  
 قابل تھی لیکن اس کی بد قسمتی کہ اس کو باپ ایسا لگا تھا۔  
 میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے وعدہ کر لیا کہ میں  
 ہر قیمت پر اسے حاصل کر لوں گا۔ چاہے کچھ بھی کرنا پڑے۔  
 لیکن سوال یہ تھا کہ میں کیا کرتا۔

گھر آ کر سوچتا ہی رہا۔ کیسے کر دوں اس کے باپ  
 پر۔ لیکن کیسے کیا ہے گا کچھ بھی نہیں۔ اگر آنے والے  
 دامادوں سے کسی لڑتا ہے تو اس میں تالون کیا کر سکتا ہے۔  
 یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اس کو کرائے کے کسی  
 پہلوان سے لڑا دوں لیکن ایسی صورت میں غلغلو یہ تھا کہ  
 کس سے لڑا دوں اس پہلوان سے راجیلہ کی شادی نہ کروا دے۔ اس  
 باپ کے آدمیوں کا کوئی بھروسہ بھی نہیں ہوتا۔ پھر ایک  
 بات ذرا غور میں آئی۔

مجھ سے سامنے ایک بڑا اخبار پڑا تھا۔ اس اخبار کو  
 دیکھ کر ہی وہ بات ذہن میں آئی تھی۔ حامل ہانا۔ نامکون کوٹنگن  
 کو دینے والے۔ محبوب آپ کے قدموں میں۔ فلاں  
 سو سالہ شہزادہ ہانا۔ برما کے جنگل میں تیس برس تک عبادت  
 کی۔ شیش، درود پتی کی طاقت سے کام لیتے والا، شریطہ  
 کا میاں بلی ماوروت جانے کیا کیا۔ میں بھی ایسے چمروں میں نہیں  
 پڑا تھا۔ لیکن اس دن مجھ پر کسی سے سوچ رہا تھا کہ کیا نہ کسی کو  
 آزمایا جائے۔

میں نے دماغ اخبار اٹھا لیا۔  
 اس باپ کے درجنوں اشتہارات تھے۔ اصل کام تھا  
 سلیشن، پھر ایک اشتہار پر نظر جم کر رہ گئی۔ حامل خرم نسیم،  
 ماڈرن نام تھا۔ اور اس نے زیادہ دھوے بھی نہیں کیے تھے۔  
 صرف یہ لکھا تھا کہ آپ ایک ہارمیں بھی آزما کر دیکھ لیں۔  
 ایک سو پاگل نمبر بھی دیا ہوا تھا۔

میں نے اسی وقت سو پاگل کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف  
 سے فوراً ہی جواب مل گیا تھا اور وہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔  
 بہت خوبصورت اور دلکش آواز۔

”کیا آپ خرم نسیم صاحب کے یہاں سے بدل رہی  
 ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“

”مجھے ان سے ملنا تھا۔“

”کب ملنا تھا۔“

”آپ جب کہیں۔ ویسے آپ کون ہیں۔“ میں نے  
 پوچھا۔

”میں ان کی سیکرٹری ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں  
 آپ کو ایک نمبر دے رہی ہوں۔ یہ آپ کا نوکرن نمبر ہوگا۔ آپ  
 ہمارے دفتر آ کر اس نمبر کے حوالے سے بات کر سکتے ہیں۔“  
 بتا دیں۔ ”نہیں۔ نمبر ہی دے دیا، اور ان کی نہیں

”نہیں، فرسٹ وزٹ کے جواز روپے ہوتے  
 ہیں۔ اس کے بعد ہر وزٹ کے تین سو۔“ اس نے بتایا۔  
 ”اوکے۔ آپ نمبر دیں۔“

اس نے مجھے نمبر دیا۔ میرا نام پوچھا اور شاید کوئی  
 ڈائری وغیرہ دیکھنے کے بعد بتایا کہ میں کل شام کو خرم  
 صاحب سے ملنے آ سکتا ہوں۔

واہ۔ کیا سروس تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ڈاکٹر  
 سے اپنا کلفٹ لے رہا ہوں۔ خرم نسیم نے اپنے ساتھ چایا

Alternative & Integrated medicine

میں ہر وقت دیکھتا ہوں کہ ہمارے مریضوں کو کیا ہے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے

شادی کی کوری براے مرد حضرات

مردوں میں جڑو مسوں کی کمی اور کمزوری کو دور کر کے اور اپنا  
 کرنے کے قابل بناتا ہے۔ مقوی و مثلاً ہے

شادی کی کوری

صرف غیر شادی شدہ مردوں کے لئے زائل شدہ توانائی کی  
 بحالی کا مستقل اور مکمل کوریس۔ اللہ، اللہ کسی قسم کی کمی اور عروہ  
 محسوس نہ ہوگی

بارداری کی کوریس

شادی شدہ حضرات کے لئے بحالی قوت کا فوری اور مستقل  
 طمانی۔ کامیاب طور پر والدینی زندگی کے لئے سہولت فرمیں کوریس

زور دے کر ایک گویہ ہمارے ساتھ  
 0121 6521501, 01204452436  
 email: b2studieshop@gmail.com

دفعہ ہر کام چلا نہیں لگا تھا۔ بالکل جدید اشیاں پر کام کرنے والی پارٹی معلوم ہوتی تھی۔

میں دوسری شام اس کے دفتر پہنچی کیا۔

جی ہاں۔ وہ کسی باادبیہ کے آستانے جیسا نہیں تھا۔ بلکہ باقاعدہ آفس تھا۔ بہت شاندار شیشے کے ہوئے۔ کپڑے ہر کام کرتے ہوئے لوگ۔ ایک کاؤنٹر جس کے پیچھے ایک اساتذہ کی بیٹی بیٹھی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے رجسٹر کھول کر بتایا۔ "آپ کو کون نمبر بارہ دیا گیا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے گردن چاکی۔ پھر پوچھ لیا۔ "شاید کل آپ علی سے میری بات ہوئی تھی۔"

"جی ہاں۔ میں ہی سر کی سیکرٹری ہوں۔" اس نے بتایا۔ "آپ شریف رکھیں۔"

سامنے دو دروازے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں انتظار کرنے والے خاصے مالدار اور بڑے لکھے لوگ معلوم ہوتے تھے۔

یعنی عام رعایتی باہاؤں کے پاس جس قسم کے لوگ چلا کر سکتے ہیں۔ یہ ان سے بہت فرق ہے۔ دو دروازے لگی تھیں اور وہ بھی پچھلی لکھی رکھائی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایک نوکرنے نمبر پکارا گیا۔ اور ایک آدمی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کی داہنی ہاتھ وہاں صوفے کے پاس ہوئی تھی۔ پھر دوسرا اس کے بعد ایک عورت، پھر میری باری آئی۔

میں اس کے کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کمرہ جدید انداز سے سجا ہوا تھا، دیوار پر بڑی سی پینٹنگ۔ دیوار کے ساتھ خوبصورت صوفے، شیشے والی بڑی سی میز اور ایک ڈائرینگ سا آدمی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا۔

پیسہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہو رہی تھی۔ "کیا بات ہے۔ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔" اس نے جھپٹے ہوئے پوچھا۔

"سب کچھ میرے اعزاز کے بالکل برعکس ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں۔ میں روایتی باہاؤں کی طرح نہیں ہوں۔ یہاں نہیں اگر قباں جیسی ہوئی اور شیر کی کمان اور گیلہ کی کھوپڑی نہیں ملے گی۔"

"اوی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" اب میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"ہمارے یہاں ہر کام جدید انداز سے ہوتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "دعا، تعویذ اور چلہ و پیرہ کا ہمارے پاس رواج نہیں ہے۔"

"تو پھر کیسے کرتے ہیں۔"

"جدید علوم کے ذریعے۔ جو جدید نہیں۔ بہت قدیم ہیں۔ لیکن سائنسک ہیں۔" اس نے بتایا۔ "جیسے ٹیلی فون، مسر پروم، روکیا وغیرہ۔"

"ہاں۔ میں نے بھی ان کے بارے میں سن رکھا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا ان سے کام ہو جاتا ہے۔"

"سو فیصد۔" اس نے کہا۔ "ان کے اثرات تعویذ گنڈوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنا مسئلہ بتائیں۔"

"بہت قریب ڈھنگا مسئلہ ہے۔"

"کوئی دل کا معاملہ ہے کیا؟"

"ہاں۔ دل کی کا معاملہ ہے۔ لیکن کس بہت ہے لگا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ بتائیں مجھے۔"

میں نے اسے راجلہ اور اس کے باپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت دیر تک ہنسا رہا تھا۔ "واقعی بہت دلچسپ کہیں ہے۔ ایسا باپ تو لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہوگا۔"

"جی جناب۔ لاکھوں میں ایک ہے۔"

"ابھی۔ اس کا ایڈریس لکھوا دیں۔ آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" اس نے کہا۔

"حل ہو جائے گا؟ کیسے۔ کیا آپ مجھے ٹارڈن بنا دیں گے کہ میں اس سے کتنی ٹرسکوں۔"

"جی نہیں۔ میں ٹیلی فون میں اور مسر پروم کی حالت سے اس شخص کو آپ کے لیے ہموار کر دوں گا۔" اس نے بتایا۔ "اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ناممکن کو ممکن بنایا جاتا ہے۔"

"مگر اب ہو جائے تو پھر کہاں ہو جائے گا۔"

"آپ ٹھہر نہ کریں۔ آپ کا کہیں ہمارے پاس آچکا ہے۔" اس نے کہا۔ "آپ کے لیے کامیابی کا کامیابی ہے۔"

"آپ کی نہیں کتنی ہوئی ہے۔"

"سیکرٹری نے بتا دیا ہوگا۔ ٹیلی فون کے ہزار۔"

اس کے بعد تین تین سو۔

"جی ہاں۔ اس نے بتا دیا تھا۔"

"آپ جاتے ہوئے گاؤنٹ پر پیسے جمع کروا دیجئے"



1987 سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تھابلی پیروں کا شراب بے ضرر علاج

پیشہ کی  
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی  
ابولڈ  
بولڈر  
اجمل زیدی  
کیلوری واپس آگیا مسٹر مگا مسٹر ویرنگ



ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD OF  
BEST ACHIEVEMENT

9-اپریل 30% مٹی  
9-اگست 30% مٹی  
9-دسمبر 30% مٹی  
مکرمہ 182 خرمہ 22: مٹی 201-4  
سوالیہ 22: مٹی 201-4  
فون 22: مٹی 201-4  
سوالیہ 22: مٹی 201-4  
فون 22: مٹی 201-4



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA

14-نومبر 27% مٹی  
14-جولائی 27% مٹی  
14-اکتوبر 27% مٹی  
کلف سینٹر  
آفس: 10  
پتہ: 10  
فون: 10  
سوالیہ: 10

14-نومبر 27% مٹی  
14-جولائی 27% مٹی  
14-اکتوبر 27% مٹی  
کلف سینٹر  
آفس: 10  
پتہ: 10  
فون: 10  
سوالیہ: 10

13-مارچ 27% مٹی  
13-اپریل 27% مٹی  
13-مئی 27% مٹی  
کلف سینٹر  
آفس: 10  
پتہ: 10  
فون: 10  
سوالیہ: 10

13-مارچ 27% مٹی  
13-اپریل 27% مٹی  
13-مئی 27% مٹی  
کلف سینٹر  
آفس: 10  
پتہ: 10  
فون: 10  
سوالیہ: 10

گا۔" اس نے کہا۔ "اور مجھے ایڈریس لکھوا دیں۔"

میں نے اس کو راحیلہ کا ایڈریس لکھوا دیا۔

"آپ ایک ہفتے کے بعد آجائیں۔" اس نے

کہا۔ "ایک ہفتے کے بعد آپ کو پر رٹ مل جائے گی۔"

میں نے کاؤنٹر پر ہزار روپے دے دیے۔ دل کچھ مطمئن بھی تھا۔ اور کچھ ہے اطمینان بھی اور ہی نہیں۔ پتا نہیں۔ یہ سب کیسے ہوا۔

میں راحیلہ کی طرف بھی نہیں جاسکتا تھا کہ کہیں اس کے باپ سے نہ بھڑھڑانے کا خطرہ تھا اور میں فی الحال اپنے کے موزا میں نہیں تھا۔ اتنی مشکلوں سے تو مکمل ٹھکانے کے اثرات کم ہوئے تھے۔

ایک ہفتہ میں نے بڑی بے ترادی میں گزارا تھا۔ پتا نہیں۔ ایک ہفتے بعد کیا ہوا۔

اس کی سروس بہت ہی پر اپر تھی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد اس کی سکرٹری کا فون آگیا۔ "سر آپ کو خرم صاحب لے یاد کیا ہے۔ ٹھیک چار بجے آپ کی میٹنگ ہے۔"

دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے بیٹھا کوئی کارنامہ دکھا دیا ہوگا۔

میں ٹھیک۔ پارکے اس کے دفتر پہنچ گیا۔

انتظار کے مرحلوں سے گزرے بغیر ہی اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اور بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"آئیے جناب۔ آئیے۔"

"آپ نے خود ہی بلا لیا مجھے۔" میں نے کہا۔ "اور میں شاید گل آتا۔"

"جی ہاں۔ میں نے سوچا کہ آپ کو وہ خبر مل چکی ہوگی۔" ضرور سنائیں جناب۔ میں تو بے چین بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔

"جناب۔ میں خود آپ کے بتائے ہوئے ایڈریس پر گیا۔ پہلے تو اس پہلوان بابا سے ملاقات ہوئی۔ پھر اس کا بیٹا سے ملا۔"

"کیا بابا آپ نے اسے؟" میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ "بہت اچھی لڑکی ہے۔ اپنے باپ کے بالکل برعکس۔" اس نے بتایا۔ "ایسی لڑکی کسی بھی شخص کے لیے مبارک ثابت ہو سکتی ہے۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ راحیلہ کی تعریف مجھے

ابھی لگی تھی۔

"پھر کیا ہوا جناب۔"

"میں نے اس کے پہلوان بابا سے اپنے حربے آزمائے۔" اس نے بتایا۔ "میں نے پہلے اسے چٹا ٹوک کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی قوت اور وہی بہت مضبوط ہے۔ اسی لیے یہ حربے کام نہیں آئے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی اعتماد ہوا تھا۔ وہ آدمی اس طرح قابو نہیں آئے دلا۔"

"اس کے بعد میں نے اپنا دوسرا خطرناک ہتھیار یعنی ٹیلی جنٹس استعمال کیا۔ اور اس میں کامیاب ہوتا چلا گیا۔"

"ولو۔ یہ بات ہوئی نا۔"

"میں نے اس کو اپنی اس طاقت سے ذرا کر لیا۔" اس نے بتایا۔

"بہت بہت شکریہ خرم صاحب۔" میں نے کہا۔ "یعنی اب میں اس کے گھر جاسکتا ہوں۔"

"کیا کریں گے وہاں جا کر کیونکہ راحیلہ اب میری نگہبیر ہے۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" میں تو بھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ "تمہاری نگہبیر ہے۔"

"اں جناب۔ چونکہ میں نے اس کے باپ کو ذرا کر لیا تھا۔ اس لیے اس نے خود ہی راحیلہ کی بات کر لی۔ اور راحیلہ تو مکمل ہی نظر میں خود مجھے بھی پسند آگئی تھی۔ اسی لیے میں نے فوراً ہی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔"

"لعنت ہو تم پر ذلیل انسان۔" میں غصے سے بھڑکنا جا رہا تھا۔

"دیکھیں گالیاں شدید۔ اس کی جو شرط تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"بورہ۔ وہ راحیلہ۔"

"اور ابھی اس دشت پر بہت خوش ہے۔" اس نے بتایا۔

میں اسے برا بھلا کہتا ہوا جب کمرے سے جانے لگا تو اس نے آواز لگائی۔ "سُنیں۔ چنگا آپ کا کام نہیں ہوا ہے اس لیے کاؤنٹر سے اپنی فیس واپس لے لیجئے گا۔"

میں فیس لیے بغیر ہی ہوا میں آگیا۔

اس کہانی کو بیان کرنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ بھی زبانِ حیر سے شرع آواز نہ کریں۔ ورنہ یہی کہنا پڑے گا کہ "رقیب بن گیا آخر کو کھانا جو دارواں اچھا۔"







## طالع

محترمہ انقرا لاسول !  
السلام علیکم !

میں سرگزشت کی بہت پرانی پڑھنے والی ہوں، کافی عرصہ سے  
سوچ رہی ہوں کہ سرگزشت کی قارئین کو اپنی انوکھی داستان  
مخفاؤں لیکن حوصلہ نہیں پورہا ہے، کسی بھی ڈائجسٹ یا اخبار  
میں کہیں کچھ نہیں لکھا، تعلیمی دور میں بھی مضمون لکھنے سے  
جان جاتی تھی، پھر بھی تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی داستان لکھ لی ہے۔  
امید ہے یہ انوکھی داستان ہلکے ہونے کی وجہ سے انوکھا مگر  
سائیکالوجک طریقہ علاج آپ کو بھی پسند آئے گا، اگر ممکن ہو تو  
ضرور شائع کریں۔

نانہ

(فیصل آباد)

تو اندر سے آ رہی تھی۔

اوغدا۔ یہ آوازیں تو فصل خانے سے آ رہی تھیں  
جہاں میرے شوہر گھنٹہ گھنٹے کے لیے گئے تھے۔ وہ دختر  
جانے سے پہلے ضرور نہایا کرتے۔ چاہے کوئی بھی موسم ہو۔

نہ جانے کیا ہوا تھا۔

میں نے آوازیں سنیں جیسے کوئی زور زور سے  
دروازے پر لائیں، مادرِ ماہو۔ میں اس وقت بچہ تھا چائے  
خارہی تھی۔ یوگلا کر دو دن سے کی طرف بھاگی لیکن آوازیں

اگست 2014ء

251

ماہنامہ سرگزشت

میں نے غسل خانے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے پوچھا: "محسن۔ محسن۔ دروازہ کھولیں۔ کیا ہوا۔"

لیکن جواب میں دروازے پر لاکھیں پڑی رہیں اور ساتھ ہی محسن کے تنکھانے کی آواز آئی۔ وہ کچھ کہہ رہے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔

میں پریشان ہو کر اپنے قلیٹ سے باہر آئی۔ برابر کا قلیٹ ارشد صاحب کا تھا۔ میں نے زور زور سے دستک دے دی۔ ارشد کو کھلائے ہوئے باہر آئے تھے۔ "کیا ہوا بھائی۔" خیریت تو ہے۔"

جلدی آئیں۔ خدا جانے محسن کو کیا ہوا ہے۔ وہ ہاتھ روم میں ہیں۔"

ارشد بھی میرے ساتھ آ گئے۔ ان کی بیوی بھی ساتھ ہی آئی تھی۔ دروازے پر ابھی تک لاکھیں پڑی تھیں لیکن ان کی قوت بہت کم ہو گئی تھی۔ جیسے محسن جھک گئے ہوں۔

ارشد نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اس دوران میں ارشد کی بیوی قلیٹ کے ایک اور آدمی کو بلا کر لے آئی تھی۔ چہ کیدار بھی آ گیا تھا۔ اب تینوں میں دروازہ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

"زہمت" ارشد نے اپنی بیوی کو قاطب کیا۔ "بھائی! کو دھڑکے میں لے جاؤ۔"

میں وہاں سے ہٹا نہیں چاہتی تھی لیکن نہ بہت مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی تھی۔ اس دوران میں وہیں مسلسل کانپتی رہی۔ میرے اصحاب جواب دے رہے تھے۔ میں نے رونما شروع کر دیا تھا۔

دوسرے کمرے سے دروازہ ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ لوگ کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ارشد کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ متا ہوا تھا۔ "بھائی۔ ہم نے محسن صاحب کو ڈرائنگ روم میں لٹا دیا ہے۔"

"خدا کے لیے بتائیں تو کسی کیا ہوا ہے ان کو۔"

"فالج۔" ارشد نے بتایا۔ "خدا کا شکر ہے کہ بائیں طرف ہے۔ بائیں حصہ ٹھیک ہے۔ اسی ٹانگ سے وہ دروازے پر ٹھکر مار رہے تھے۔"

میرے پیروں تلے سے زمین ہی گل مل گئی تھی۔ محسن جیسے جہان، خوش حراج اور اساتذہ محسن پر فالج ہو گیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں دلدلی ہوئی ڈرائنگ روم میں نکلی گئی۔

جس کے ایک صوفے پر محسن بے بسی کی تصویر بنے

لیٹے تھے۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن ان کی زبان ہی ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

دایاں حصہ لائچ سے برقی طرح متاثر تھا۔ اس دوران میں ارشد نے فون کر کے ایس۔ اینس منگوائی تھی۔ میں نے محسن اور اپنے گھر والوں کو فون کر دیا۔ ذرا سی دیر میں سب ہی جمع ہو گئے اور محسن کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسپتال پہنچتے ہی محسن کا علاج شروع ہو گیا تھا۔

میں صرف رو رہی تھی۔ محسن کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ تو صحت مند آدمی ہیں۔ جتنے پوتے ہوئے۔ عمل حدود۔ انکس فالج کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سبدم حقیقت ہمارے سامنے تھی۔

☆ ☆ ☆

ہماری بٹھادی کچا بھی صرف ایک سال ہوا تھا۔ ایک سال ہو ہی گیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ یہ ہماری اورچ میرج تھی۔ دلوں کے گھروالوں نے یہ رشتہ لگا دیا تھا۔

محسن کے ابو میرے ابو کے دوست تھے۔ بس یہ تعلق تھا اور شادی طے ہو گئی تھی۔ ہم دونوں ہی اس معاملے میں خوش نصیب تھے کہ محبت ہمیں شادی کے بعد ہی ملی تھی۔ نہ تو کوئی محسن کی زندگی میں آئی تھی اور نہ ہی کوئی میری زندگی میں آیا تھا۔

میرے گھر کی تربیت ہی ایسی تھی کہ بوجھ اور دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور محسن اپنی تعلیم کے بعد اپنا کیریئر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ اسی لیے ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔

لیکن شادی کے بعد ہم دونوں نے لوٹ کر ایک دوسرے سے محبت کی تھی۔ محسن نے شادی سے کچھ پہلے ایک چھوٹا بھوت سا قلیٹ خریدا تھا۔

ہم دونوں میں عائلیاتی حس موجود تھی۔ اسی لیے ہم نے بہت خواہشورائی سے اپنے قلیٹ کو ڈکھوٹ کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان مکمل ڈال ہی ہم آ گئی تھی جس پر ہم دونوں ہی خدا کے شکر گزار تھے۔

میرا سارا وقت قلیٹ کی دیکھ بھال میں گزر رہا تھا۔ ہم بہت خواہشورائی سے شکر خریدا لائے تھے۔ جنہوں نے اس گھر کی خواہشورائی میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔

ہمارا معمول تھا کہ شام کے وقت ہم ڈرائنگ پر گل



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی ویب سائٹ

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنگ نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](http://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](http://twitter.com/paksociety1)

جائے۔ رات کا کھانا عام طور پر باہر ہی کھایا جاتا۔ یعنی خدا نے ہر طرح کی خوشیاں دے دی تھیں اور ہم بہت خوش تھے کہ اچانک یہ حادثہ ہو گیا۔

ایک قیامت تھی۔ قیامت۔

حسن ہسٹل کا ہو کر رہ گئے تھے۔ جس ہی ان کی ساری ضروریات کا خیال رکھا کرتی۔ یوں کچھ لیں کہ وہ کسی بچے کی طرح ہو گئے تھے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس وقت ہم اس قابل تھے کہ ان کا علاج کروا سکتے۔ حسن اور میرے چنگ اکاؤنٹ میں بھی رقم تھی۔ اس کے علاوہ دلوں کے گھروالے بھی اس مشکل وقت پر ہمارے ساتھ آکر رہے ہوئے تھے۔ اس طرف سے تو کوئی پریشانی نہیں تھی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اچانک ہو گیا کیا ہے؟ حسن کو بہت کیسے ہوئی۔ خدا نہ کرے کیا وہ اسی طرح ایک ذمہ داری کی طرح ہسٹل پر پڑے ہوئے ہیں گے۔

اسپتال سے فارغ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ "اب ان کو اسپتال میں رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایسا مرض ہے جس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب ٹھیک ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ مہینوں لگ جائیں۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا ہر دن ملک بھی ملن کا علاج نہیں ہو سکتا۔"

"میرے خیال میں نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہمب اصل احسان آپ کا ہے۔ میری مائیں تو آپ ان کے لیے سبیل نرس رکھ لیں۔ ان کو سنبھالنا آپ کے بس کا مدد نہیں ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ کیا یہ پھر سے چلنے پھرنے اور لوٹنے کے قابل ہو جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"چلنے پھرنے کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کچھ دلوں کے بعد وہ ان کی اٹھیں ختم ہو جائے گی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "کم از کم بولنا تو شروع کر دیں گے اور ویسے بھی اس قسم کے مریضوں کا علاج خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ایسے مریض اپنی قوتِ ارادی ختم کر کے اپنے آپ کو اپنے مرض کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ لڑنا نہیں چاہتے۔"

"تو پھر کیا کیا جائے۔"

"ابھی نہیں۔ کچھ دلوں کے بعد انہیں نفسیاتی علاج کی ضرورت ہوگی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "تا کہ ان میں پھر سے جینے کا حوصلہ اور خواہش پیدا ہو جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے بے شمار ہدایات اور نصیحتوں کے بعد ہمیں اسپتال سے فارغ کر دیا۔ ہم حسن کو لے کر گھر آ گئے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر دل خون کے آنسو روایا کرتا۔

زندگی سے پھر پھر کسی شخص کے ساتھ ایسا ہو جائے تو پھر جو کچھ نہ کیا جائے، وہ کم ہے۔ اسپتال میں کچھ دلوں رہنے کے بعد کم از کم اتنا تو ہو گیا تھا کہ حسن کی زبان کی گفت بولی حد تک دور ہو چکی تھی۔ اب وہ جو بولتے وہ کم از کم سمجھ میں آ جاتا کرتا۔ ویسے تو ہم نے ان کے لیے ایک سبیل نرس بھی رکھ لیا تھا لیکن عام طور پر میں ہی ان کی خدمت میں لگ رہا تھا۔

حسن ایسے سوتلوں پر آنسو بہایا کرتے۔ "نانک میں نہیں زندگی کا کوئی سکھ نہ دے سکا۔" وہ کہا کرتے۔ "ابھی ہماری شادی گودن لایا کتے ہوئے ہیں کہ تم پر یہ پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تم صرف میری خدمت کی ہو کر رہ گئی ہو۔"

"حسن نہ کریں لکی باتیں۔" میں خود پر جبر کرتے ہوئے کہتی۔ "خدا نے چاہا تو آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"نہیں نانک۔ اب کوئی امید نہیں ہے۔ میں نے اس مرض سے کسی کو شفا پاتے ہوئے نہیں دیکھا۔" حسن کے لیے میں بے پناہ مایوسی ہوتی۔

اس وقت میں اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے کسی کام کا بہانہ کر کے حسن کے پاس سے ہٹ جاتی اور اداس حشر سے بھرے دیکھتے رہتے۔

میں سمجھ گئی تھی کہ حسن نے اس پھوڑ دی ہے۔ وہ زندگی بھر موت کی اس چنگ میں سرپیچہ کرنے لگے ہیں اور یہ بہت خطرناک علامت تھی۔

میں نے ان ہی ڈاکٹر سے مشورہ کیا جس کے وہ ذہن علاج تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "ہاں ایسا ہوتا ہے۔ اس قسم کے مریض مایوسی ہو جاتے ہیں۔ ان میں جا کی چنگ لڑنے کی طاقت نہیں رہتی۔"

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ جب ایسا کیفیت شروع ہو جائے تو کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کریں۔ اب آپ کے شوہر کا نفسیاتی علاج شروع ہوگا۔ یہ بھی بہت اہم



"دیکھیں۔ میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ آپ کے شوہر زندگی سے ماہوس ہوتے جا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "ان میں مثبت تحریک دینے حوصلے اور ولولے کی ضرورت ہے۔ وہ حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ کوئی شدید جذبہ۔ کوئی شدید خواہش۔ ویسے میلہ۔ یکل وہ بہت حد تک ٹھیک ہو چکے ہیں لیکن نفسیاتی طور پر انہوں نے اپنے آپ کو مردہ سمجھ لیا ہے۔"

"خدا کے لیے کچھ کریں ڈاکٹر صاحب۔"

"کوشش کرنا میرا کام ہے۔" ڈاکٹر ڈیشان نے کہا۔ "اس کے بعد جو خدا کی مرضی۔"

ڈاکٹر ڈیشان کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک محسن کو سمجھاتی رہی کہ وہ خود میں حوصلہ پیدا کرے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ وہ صحت کرے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ڈاکٹر ڈیشان نے ہاتھ دیکھ کر آنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ مجھے بھی محسن کے ساتھ کمرے میں بیٹھنے کی اجازت دے دیا کرتے۔

اس کے بعد باتیں شروع کر دیتے۔ ان کی باتیں ہی بہت دلچسپ ہوا کرتیں۔ جس مزاح بھی بہت نرم و پرست تھا۔ ان کی باتیں سن کر میں بے حواس نہ ہوتی رہتی۔ کبھی کبھی محسن بھی اس کی باتوں پر ہنس چکے ہوتے۔

یہ سب تو تھا لیکن ابھی تک محسن میں بہتری کی خاص علامات ظاہر نہیں ہوئی تھیں اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کا علاج ہے۔

کیا صرف باتوں کے ذریعے محسن کا علاج ممکن ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے نہ جانے کتنے سوالات تھے۔ دوسری طرف میں ایک عجیب بات محسوس کرنے لگی تھی۔

وہ بات جس کا احساس عورت کو بہت جلد ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیشان میرے شوہر سے زیادہ اب مجھ میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

وہ جب میری طرف دیکھتے تو ہنس دیکھتے ہی رہ جاتے جبکہ میں شرما کر اپنی گردن پر حرا اُدر کر لیتی۔ جب مجھ سے باتیں کرتے تو ان کی آواز میں خاص قسم کی محاسن شامل ہو چلتی۔

ظاہر ہے کہ یہ سب مجھے پسند نہیں تھا لیکن میں محسن کی سہ سے مجبور تھی۔ میں ہر صورت میں ان کی صحت یابی چاہتی تھی۔

مرحطہ ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب۔ میں تو کسی سائیکاٹرسٹ کو نہیں جانتی کیونکہ ابھی ابھی مرحلہ سامنے نہیں آیا تھا۔" میں نے جڑی بے بسی سے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو ڈاکٹر ڈیشان کے پاس بھیج رہا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ میرے جاننے والے ہیں۔ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں اور اب پاکستان میں پریکٹس کر رہے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے علاج وغیرہ کا دستور نہیں ہے اسی لیے ڈاکٹر ڈیشان کے پاس بہت کم مریض ہوں گے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کہ وہاں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

زیادہ تر پیشہ خاتونوں کے رہنے والے دکھائی دے رہے تھے۔ کھانے پیچے لوگ۔ ان کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسے لوگ بھی نفسیاتی مریض ہو سکتے ہیں۔

بہر حال بہت دیر کے بعد میری ہاسٹی آئی۔ ڈاکٹر ڈیشان کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ میری توقع کے برعکس نوجوان آدمی تھے۔

اسمارٹ اور خوش لباس۔ میں نے جب محسن کے بارے میں بتایا تو بہت دیر تک سوچنے کے بعد بولے۔

"دیکھیں۔ ان کا ٹریٹمنٹ کمرے ہی کیا جائے گا کیونکہ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ وہ تو اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر ایسی صورت میں مجھے آپ کے کمرے آنا پڑے گا اور ایسے مریضوں کا علاج ایک دو محنتوں میں نہیں ہوتا۔ بلکہ کئی سیشن کرنے پڑتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں۔"

"اوکے۔ تو پھر میں آپ کے کمرے آ رہا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس دے دیں۔"

ڈاکٹر ڈیشان نے جو وقت دیا تھا وہ اسی وقت پہنچے۔ انہوں نے کمرے سے مجھے بتا دیا تھا اور بہت دیر تک محسن سے باتیں کرتے رہے تھے۔

پھر جب وہ اس کمرے سے باہر آئے تو میں ان کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ "جی ڈاکٹر صاحب۔ کیا اندازہ لگایا آپ نے؟" میں نے پوچھا۔

اسی کمرے سے باہر جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ تاریک سا ہو گیا تھا۔

پھر ڈاکٹر صاحب دونوں تک نہیں آئے۔ تیسرے دن جب وہ آئے تو میں نے ان سے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب! اس دن صبح نے آپ سے کیا باتیں کی تھیں؟" نے کہا: "ارے کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔" ڈاکٹر "وہ کہہ رہے تھے ان کو نہیں کوئی ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں کہا تو تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں کی۔" اب باتیں وہ سچ بول رہے تھے یا صبح نے واقعی کوئی بات نہیں کی تھی۔

لیکن اسی دن اس کہانی کا اختتام بھی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک ایسی حرکت کی۔ جس کا میں نے تصور ہی نہیں کیا تھا۔ اس دن بھی جب اس نے مجھے اس کمرے میں بیٹھنے کے لیے کہا تو صبح نے بہت سا ہو کر چمچا: "آخر چکر کیا۔" تم میرا علاج کرنے آتے ہو یا میری بیوی کی صورت دیکھنے۔

"سچ یہ ہے کہ میں تمہاری بیوی کی صورت ہی دیکھنے

اس لیے مجھے اپنے آپ پر جبر کرنا پڑا ہوا تھا ورنہ ڈاکٹر ڈیٹان کی تیز نگاہوں کی بخش میری برداشت سے باہر تھی۔ کئی بار سوچا کہ انہیں ٹوک دوں کہ ڈاکٹر صاحب آپ مریض پر توجہ دیں۔ میری طرف دھیان نہ دیں تو بہتر ہے۔

لیکن پھر وہی خوف کہ اگر ڈاکٹر نے برا مان لیا تو پھر کیا ہوگا۔ صبح کا علاج رک گیا تو میں کسی اور سائیکالوسٹ کو تو جانتی بھی نہیں تھی۔ اسی لیے دل پر جبر کر لی رہی۔

ایک دن صبح معمول ڈاکٹر ڈیٹان نے جب مجھے بھی ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو صبح بول پڑے: "دیکھیں تاہم تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے ڈاکٹر صاحب سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

میں سمجھ گئی تھی کہ صبح کو بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اب اس کے سامنے بھی مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگے ہیں۔

وہ اپنا سچ بھی دینی منظور نہیں تھے۔ دوسرا سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے مجھے کمرے سے چلے جانے کو کہا تھا۔

**لکڑیوں کے اسیر**

اکثر ہاتھ کی ریکھائیں قدموں تلے ایسے رستے بچھا دیتی ہیں کہ ٹھوکر لگنے کے باوجود چلنا مجبوری میں جاتا ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر عبدالرب بھٹشی کا نیا انداز

**فقیر دوست**

تاریخ کے سمندر سے واقعات کی سرکش موجوں کا احوال..... ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر مساجد امجد کے قلم کی روانی

**ستاروں پر کمند**

بعض اوقات لرزیدہ قدموں کو محبت ایسا استحکام بخشتی ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ طاہر جاوید صغل کا دلربا انداز

**ماروی**

ہم شکل، ہم مزاج مگر تھریکی انفرادیت کا دلہنا تماش کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے..... محسن الدین نواب کے خیالات کی اڑان

اگست 2014ء کا شمار

رمضان اور عید کے لمحات کے ساتھ

خواہشات کہانیوں کا مجموعہ

**سپیس ٹائم**

مزید

خطوط کا نقش

عشق و شہر و سخن

جہانک مشرق حیات کی عرق و تیزی

کاشف ذہیر ڈاکٹر شیر شاہ سید: تصویر ریاض منظر امارات سلیم انور کی دلچسپ نگاہ

(اگست 2014ء)



آتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔  
 "کیا؟" محسن کے ساتھ ساتھ میں بھی حیران رہ گئی تھی۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔" محسن نے غصے سے کہا۔  
 "ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تم ایک ایسا انسان ہو۔ تمہاری بیوی جوان اور خوبصورت ہے۔ یہ کب تک تم جیسے کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتی ہے۔ اسے آزاد کرو دینا کہ میں اس سے شادی کر لوں۔"

"خاموش وکیل انسان۔ خاموش۔" محسن دباؤ سے کہتے تھے۔  
 ڈاکٹر نے اس کی ہڈا کیے بغیر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "جان من میں تمہیں اپنا ماننا چاہتا ہوں۔"

"حیرتی تو۔" محسن نے ایک موٹی سی گالی دی۔  
 اور اچانک وہ بستر سے مجھے اتر آئے۔ اس جہل میں ہی۔ وہ مجھے سے کانپ رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن وہ بستر سے اتر کر ڈاکٹر پر بھجوت پڑے تھے۔

ڈاکٹر ڈیٹان پو سب دیکھ کر فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ محسن کمرے کے درمیان آکر ڈاکٹر آکر گر پڑے تھے۔

میں نے انہیں سہارا دے کر بڑی مشکل سے بستر پر لٹا دیا تھا۔  
 "یہ تم کس کیلئے کوئے آئی تھیں۔" محسن نے مجھ سے کہا۔

"میں کیا جانتی تھی کہ وہ ایسا آدمی بنے گا۔"  
 "تم اس ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ جس نے اس کو بھیجا تھا بلکہ کل مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔"

"ہاں۔ آپ بھی چلیں میرے ساتھ۔ صحت ہے ایسے ڈاکٹر پر۔"

دوسرے دن میں کسی نہ کسی طرح محسن کو اس ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جس نے محسن کے قاقی کا علاج کیا تھا اور یہ دیکھ کر ہم حیران رہ گئے تھے کہ وہاں ڈاکٹر ڈیٹان بھی موجود تھے۔

اس کو دیکھتے ہی میں ہنس پڑی تھی۔ "کہتے انسان۔ تم جیسے ڈاکٹر والے اس پیچھے کو بدنام کر کے دکھا دیا ہے۔"

"سسر محسن آپ کیوں بلا رہے ہیں۔ بے چارے پر ہمارا ہورہی ہیں۔" پہلے والے ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھیں کہ اس نے کل کیا حرکت کی تھی۔"

"سسر محسن۔ آپ کو میری حرکت یاد ہے لیکن بھول گئیں کہ اسی جوش میں محسن صاحب بستر سے اتر کر کئی قدم چل پڑے تھے۔" ڈاکٹر ڈیٹان نے کہا۔  
 "ہرے۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"یہ ڈاکٹر ڈیٹان کا فریڈنٹ تھا سسر محسن" پہلے ڈاکٹر نے کہا۔  
 "ہی ہاں۔" ڈاکٹر ڈیٹان نے بتایا۔ "میں نے کہا تھا کہ شدید قسم کا کوئی ہڈیاں کو اپنے ہیروں پر کھڑا کر دے گا اور وہ ہڈیاں پاؤں محبت ہو سکتا تھا یا شدید غلغلہ۔ انہوں نے مجھ سے شدید غلغلہ محسوس کی۔ ان میں تحریک پیدا ہوئی اور یہ کئی قدم اپنے ہیروں پر چل پڑے۔"

"اخذ۔" محسن نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ علاج تھا آپ کا۔"

"ہاں۔ آپ میں زندگی کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں، میں چوٹی طرح کا مہاب رہا اور اب کچھ دنوں کے علاج کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پہلے کی طرح اپنے ہیروں پر چلنے لگیں گے۔"

"میرے خدا۔" محسن نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید۔"

"شاید تھا آپ کی سسر کو پسند کرنے کا ہوں۔"

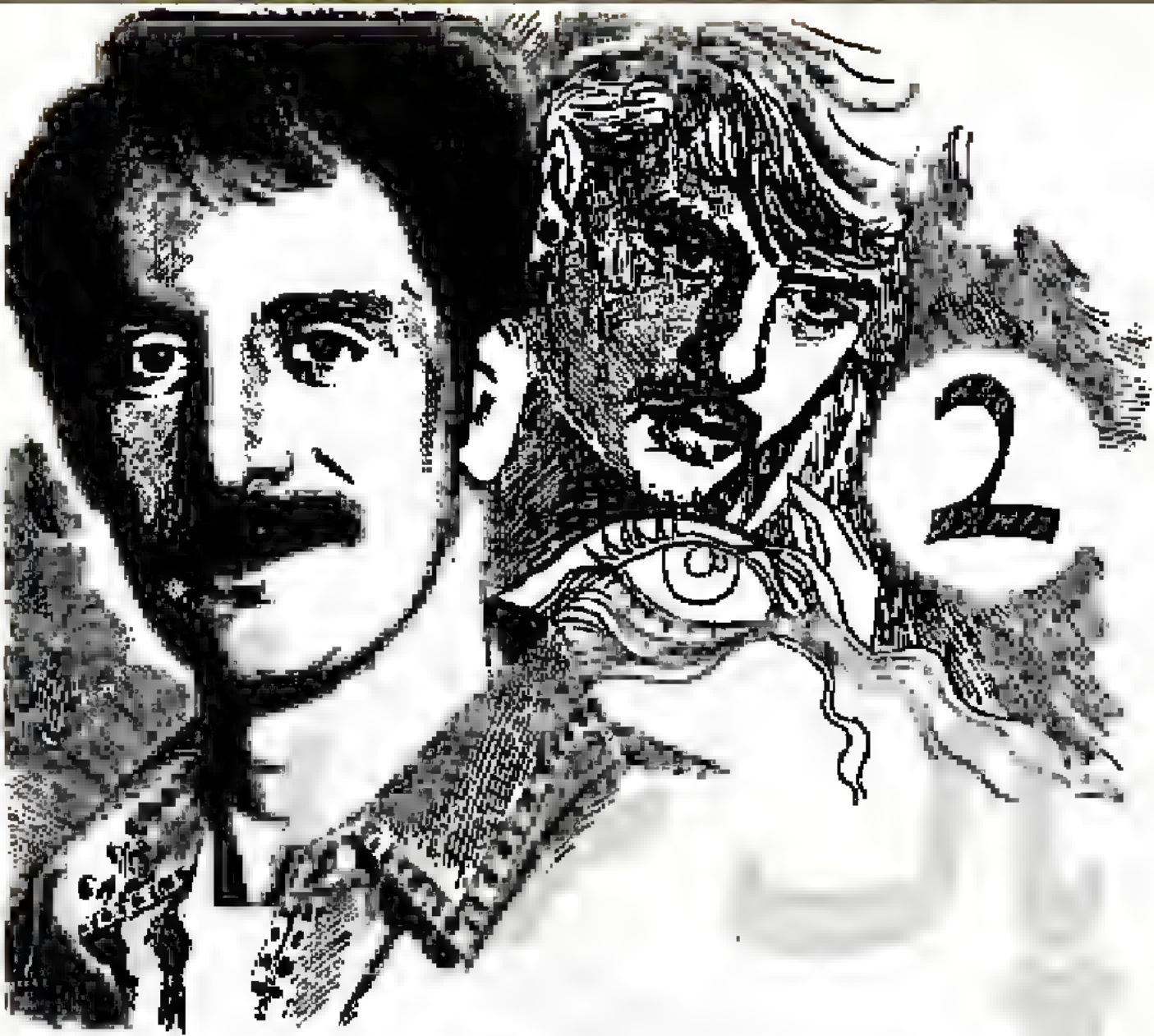
ڈاکٹر ڈیٹان نہیں پڑے۔ "دیے پسند تو کرتے ہوں اگر آپ کو احترام نہیں ہو۔"

"نہیں۔ اب مجھے کوئی احترام نہیں ہے۔" محسن بھی مسکرا دیے۔

اور اب محسن بالکل ٹھیک ہو چکے ہیں۔ اپنے ہیروں پر چلنے لگے ہیں۔ ان کی دو ٹکی ہاری ہیں، حربے نئے تو ہر پارٹی بھی ہورہی ہے۔ اور سب کچھ ٹھیک ہوتا جا رہا ہے۔ ان میں جینے کی امنگ پیدا ہو چکی ہے۔

اور وہاں ڈاکٹر ڈیٹان اب ہمارے نیلی فریڈنٹ بن چکے ہیں۔ ان کی بہت سی بیماریاں بھی غلطی میری بہت امنگی دوست بن گئی ہیں۔

اور میں یہ سوچتی ہوں کہ اچھا ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو بعض پرہیزگار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ڈیٹان نے محسن کی بخش پر بالکل بھروسہ کیا تھا۔



## چھوٹا آدمی

جناب ایڈیٹر صاحب!  
آداب و نیاز و

ایک معمولی سے آدمی کی سرگزشت بھیج رہا ہوں کہ عشق انسان  
کو کیا سے کیا بنادیتا ہے۔ وہ ایک معمولی سا آدمی تھا مگر اس نے  
عشق کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

عزیز ہمدانی  
(ملتان)

اس کی آنکھوں میں ایک بے نامی اداسی کی کیفیت  
رہا کرتی۔

ایسے لوگوں پر کلن دھیان دیتا ہے۔ کس کو اتنی فرصت  
ہوتی ہے۔ لیکن جبراً کام ہی ایسا تھا کہ میں ایسے کرداروں کی  
حاش شدہ ہا کرتا۔

میں ان کے چہرے کی کتاب پڑھتا۔ ان کو غور سے  
دیکھتا۔ ان کا مشاہدہ کرتا۔ ان کے بارے میں جاننے کی  
کوشش کرتا اور جب کچھ معلوم ہو جاتا تو پھر ان کی کہانیاں

اگست 2014ء

2571

ماہنامہ سرگزشت



میرا آرڈر لینے کے بعد فوراً ہی آرڈر کی تکمیل کر دیا کرتا۔  
جو کہ میں تقریباً ہر مدت وہاں آنے لگا تھا۔ اسی لیے  
وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ کبھی کبھی ہاتھ بھی کر لیا کرتا۔ میں  
بھی اس کی خیریت معلوم کرتا۔

ایک دن میں نے اس کا نام پوچھ لیا۔ "نمبر دو  
ہوں جناب۔" اس نے کہا۔  
"کیا مطلب؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف  
دیکھا۔

"یہ کیسی۔" اس نے اپنے سینے پر لگے بٹے کی  
طرف اشارہ کیا۔ جس پر دو لکھا ہوا تھا۔ "یہ میرا نمبر ہے  
جناب۔ ہم جیسوں کے نمبر ہی ہوا کرتے ہیں۔ نمبر ایک، نمبر  
دو، نمبر گیارہ وغیرہ۔"

اس کی باتوں نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔  
اس کی باتوں سے سننے کے ساتھ ساتھ بہت ہی اور  
تفصیلات بھی سمجھیں۔ سوچنے کا موقع فراہم کرتی ہوئی باتیں  
تھیں۔ اس نے اپنی باتیں جاری رکھیں۔ "یہ میں اس لیے  
کہہ رہا ہوں جناب کہ یہاں کوئی ہمیں نام سے نہیں پکارتا  
ہے۔ بس یہی آوازیں آتی ہیں۔ دو نمبر ادھر آؤ۔ دو نمبر  
کونڈارنگ لے آؤ۔ دو نمبر جلدی سے مل لے آؤ۔ ہم  
چھوٹے لوگ ہیں صاحب۔ چارے نام لکھتے ہوتے۔ نمبر  
ہوتے ہیں۔"

اس کی باتوں نے اور بھی حیرت زدہ کر دیا تھا۔  
"نہیں بھائی۔ دنیا میں کوئی بھی شخص چھوٹا نہیں ہوتا۔  
اس کی حرکتیں اسے چھوٹا بنا دیتی ہیں اس کا کام نہیں۔ کام  
نو شخصروں کی میراث ہوا کرتا ہے۔"

"آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں صاحب۔ دل  
میں اڑ کر رہی ہیں۔ ایسے صاحب آپ خود کیا کرتے ہیں۔"  
"میں کہاں نہیں گھومتا ہوں۔" میں نے بتایا۔  
"اس لیے تو۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اس  
لیے آپ انکا باتیں کر رہے ہیں۔ کیونکہ کہنے والے بہت  
درد مند دل رکھنے والے ہوا کرتے ہیں۔"

"لگتا ہے تم بڑے کلمے بھی ہو۔" میں نے کہا۔  
"جی ہاں صاحب۔ میں نے اعتراف کر رکھا ہے۔"  
اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور باتیں کرتا۔ کسی نے اسے  
دو نمبر کہہ کر آواز دی اور وہ بے چارہ اس کی پیروی چلا گیا۔  
بہرحال اس کے بعد آہستہ آہستہ اس سے میری  
باتیں ہونے لگیں۔ اس نے اپنا نام فرمایا تھا۔ ایک دن

لکھ لیا کرتا۔  
جی ہاں۔ میں کہاں کہاں لکھا کرتا تھا۔ اسی لیے  
کہ وہ لوگوں کی تلاش رہا کرتی اور چہرے دیکھتا رہتا۔ اس  
مخلط نے انسانوں کو بچھڑا رکھا ہوا تھا۔

کیسے کیسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی کیسی کہانیاں  
ہوتی ہیں۔ پریشان کر دینے والی، خوفزدہ اور ناخوش  
کر دینے والی کہانیاں۔

خدا جانے ہماری دنیا میں اتنے دکھ کیوں بکھرے  
ہوئے ہیں۔ آج تک کسی ایسے انسان سے میری ملاقات  
نہیں ہوئی ہے۔ جس کی زندگی میں مکمل خوشیاں بھری  
ہوں۔ جس سے بات کر کے اس کے ساتھ دکھ ہوتے ہیں۔  
شاید خوشیوں کی کہانیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بلکہ کہانیاں  
انہی ہی اس وقت ہیں جب زندگی میں دکھ شامل ہو جائیں۔  
تو مجھے اس کے چہرے پر بھی کئی کہانیاں دکھائی دے  
سکتی تھیں۔

انسانوں کو بچھڑانے کا یہ ہنر مجھے بتا دیا کہ کیا کہ کسی  
نے اپنے سینے میں طوفان چھپا رکھا تھا۔  
وہ ایک ہوٹل کا بیڑ تھا۔

یہ ہوٹل اس محلہ میں تھا جہاں پچھلے دنوں میں کرائے  
کے قلیں میں گیا تھا۔ ہوٹل کا نام ہی بہت اچھا تھا۔ پکوان  
مگر۔ صاف ستھری میزیں اور کرسیاں۔ باقاعدہ چمپا ہوا  
میو، کھانے بھی بہت لذیذ اور صاف ستھرے ہوا کرتے۔  
چونکہ یہ ہوٹل میرے مزاج اور جیب دونوں کے مطابق تھا۔  
اسی لیے عام طور پر رات کا کھانا میں اسی ہوٹل میں کھایا  
کرتا۔

میرے قلیں سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہیں  
مفت کی دواک پر تھا۔  
میں اکیلا رہا کرتا تھا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔  
صرف بیوی تھی۔ وہ بھی دوسرے شہر میں۔ یہاں میں اپنے  
روزگار کے سلسلے میں رہتا تھا۔

دن بھر ایک آفس میں کام کرتا اور جو وقت ملتا۔ اس  
میں کہاں کہاں لکھا کرتا۔ ان کہانیوں کی وجہ سے میری پذیرائی  
ہوا کرتی۔ لوگ مجھے جانتے لگے تھے۔  
بہرحال وہ دیر گئے اس پکوان مگر میں دکھائی دینا  
تھا۔

ایک شریف سا انسان جس کے چہرے پر کہاں نہیں  
ہوئی تھیں۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے مسکرا کر سلام کرتا اور

اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بھی میری کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ "سبزی پر تم کسی اور جگہ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔" یاسم نے کوشش ہی نہیں کی۔

"کوشش کی تھی جناب، اور ایک دفتر میں ملازمت بھی مل گئی تھی۔"

"تو پھر یہاں کیوں آ گئے۔" میں نے پوچھا۔

"کیا آپ میری کہانی لکھیں گے صاحب۔ میں نے یہاں ایک خاص شخص سے ملازمت کی تھی۔ ہوسکا ہے کہ آپ کو یہ سب سن کر حیرت ہو۔ لیکن کیا کروں صاحب۔ مجبوری اس ہوئی تک لے آئی ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔ آج کل زندگی بہت دشوار ہونے لگی ہے۔"

"جیسا صاحب۔ وہ چیزیں والی مجبوری نہیں۔ بلکہ کوئی اور مجبوری مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔"

"اور کون سی مجبوری رہ جاتی ہے۔"

"محبت کی مجبوری صاحب۔" اس نے بتایا۔

"محبت کی مجبوری؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں نہیں سمجھا۔ محبت نے کیسے مجھ کو کام کو"

"بتاتا ہوں صاحب۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر "رات گیارہ بجے میں یہاں سے گھنٹی کر جاتا ہوں"

صاحب۔ آپ مجھ سے گیارہ کے بعد ملیں۔ پھر میں آپ کو اپنی مجبوری بتا دوں گا۔"

چونکہ میں بھی مجلس میں جلا بر گیا تھا۔ اسی لیے رات گیارہ کے بعد میں نے اس سے ملاقات کر لی۔ میں اسے اپنے ساتھ اپنے قہقہے میں لے آیا تھا جو کہ ہونک سے

قریب ہی تھا۔ وہیں اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

"وہ بہت ہی خوبصورت ہے صاحب۔" اس نے بتایا۔ "اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی جذبات پائی جاتی ہے، اور اس کی آنکھیں۔ بس صاحب ایسی آنکھیں، جن کے بارے میں شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان آنکھوں کے لیے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ادب جانے کو

دل چاہتا ہے۔"

"واہ ذریعہ تم تو شاعری کرنے لگے۔" میں نے کہا۔

"ہاں صاحب۔ آپ ایک نظر اسے دیکھیں تو آپ

کو میرے جیون کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے صاحب۔ بہت ہی خاص ہے۔ کم از کم میرے لیے تو بہت خاص ہے۔"

وہ چٹکی روالی سے ایسی سلیپی ہوئی باتیں کر رہا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ صرف انگریز لڑکی یا تو نہیں بلکہ تقسیم یافتہ بھی ہے۔

"میں اس زمانے میں اس ہوئی میں ملازم نہیں تھا صاحب۔" اس نے کچھ دیر بعد پھر یوں شروع کر دیا۔ "آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس ہونک کے سامنے ایک فاسٹ فوڈ بھی ہے۔ برائنڈ فاسٹ فوڈ کارنر۔"

"ہاں دیکھا ہے میں نے۔"

"تو میں اس کے کاؤنٹر پر بیٹھا کرتا تھا اور وہ لڑکی عام طور پر اپنے گھر والوں یا اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس ہونک میں پکا کر لیتی تھی۔"

اس کے آنے کا وقت تو اوروں کے درمیان ہوا کرتا تھا۔ اس وقت میری نگاہیں اسی ہونک کی طرف مگی رہتی تھیں۔ سامنے ہی تو ہے۔ جب وہ دکھائی دیتی تو میں سراپا شوق بن جاتا تھا۔ میری نگاہیں صرف اور صرف اس کو دیکھتی رہتیں۔"

"یعنی تم اس سے محبت کرنے لگے تھے۔"

"محبت تو ایک عام سافٹ ہے صاحب۔" اس نے کہا۔ "میں اس سے شوق کرنے لگا تھا۔ شوق کی تو کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ محبت میں تو پھر بھی کچھ حاصل کر لینے کا شوق ہوتا ہے۔ جبکہ شوق ایسا باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ چاہے محبوب کو اس کی خبر بھی نہ ہو کہ اس کو کوئی اس طرح بھی چاہنے والا ہے۔"

"تھک کہتے ہو ذریعہ۔ شوق میں محبوب سے کچھ مانگ نہیں جاتا۔ لگتا ہے سب کچھ سونپ دیا جاتا ہے۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے صاحب۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔" اس نے کہا۔ "میں صرف اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اور اس کے گھر والے عام طور پر آیا کرتے اور جب دو چار دنوں تک وہ لوگ نہیں آتے تو میں بے چین ہو جاتا کرتا۔ بہت اداس ہو جاتا۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا صاحب، اور جب وہ دکھائی دے جاتی تو جیسے ہر طرف پھول پھرجاتے۔"

"واہ ذریعہ۔ تم تو میری بھی ایک مشکل آسان کرتے جا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

اگست 2014ء



”وہ کیا صاحب۔“

”تم اسے اچھے اور خوبصورت انداز میں اپنی کہانی سنا رہے ہو کہ مجھے اس میں اپنی طرف سے کچھ لگانے اور اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اے صاحب محبت نے بولنا سکھا دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور میں تو ایک جاہل سا انسان ہوں۔ ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔“

”نہیں بڑے۔ لیکن بات نہیں ہے۔ تم میں جو ملتا ہے نا۔ وہ میں نے بہت کم لوگوں میں پایا ہے۔ خیر آگے سناؤ۔“ میں نے اپنی ڈائری اور قلم سنبھال لیا تھا اور وہ جو بول رہا تھا۔ وہ میں سمجھتا جا رہا تھا۔

”پھر یہ ہوا صاحب کہ میرا جنون اس حد تک بڑھ گیا کہ میں اس سے صرف دو باتیں کرنے کے لیے بے چین ہوتا رہا۔ اگر وہ ہمارے فاسٹ فوڈ سینٹر کی طرف آئی تو شاید اس سے بات کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن وہ تو سیدھی ہوٹل کی طرف چلی جاتی تھی اور اس سے بات کرنے کی خواہش پوری کرنے کا بھی طریقہ تھا کہ میں خود اسی ہوٹل میں کام کرنے لگ جاؤں۔“

”اوہ۔“ میں مسکرا دیا۔ ”اب سمجھا۔ تو تم نے اس لیے ہوٹل کی لوکری کر لی۔ ایک ویٹر بن گئے۔“

”جی صاحب صرف اسی لیے۔ اس سے بات کرنے کی خواہش میں۔ اسے قریب سے دیکھ لینے کی آرزو میں۔ ہوٹل والے ابھی مجھے ابھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ابھی حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن انہوں نے مجھے تو کڑی دوسے دی تھی۔“

”جی ہاں صاحب۔ وہ جب بھی آتی۔ اس کو میں ہی سرا کیا کرتا۔ کسی دوسرے ویٹر کو اس کی طرف جانے نہیں دیتا تھا۔ اس طرح اس سے بات ہونے لگی۔ وہ اور اس کے گھر والے ابھی مجھے نام سے جان گئے تھے۔ میرا نام لے کر بلا کر رہے۔“

”آپ تو جانتے ہیں صاحب کہ ایسے موقع پر لاگوں کی جیسے کئی کام کرتی ہیں۔ انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ کون ان کی طرف کس کا ہاتھ سے دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ اس لیے وہ مسکرا کر دیکھا کرتی۔ ابھی خبریت بھی معلوم کر لیتی۔ میرے لیے تو ابھی بہت تھا صاحب۔ وہ دل کی بھی بہت اچھی بات بولی تھی۔“

”کیا تم نے اس سے کھل کر بات نہیں کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں صاحب۔ میری اتنی ہمت کہاں تھی۔“ اس نے کہا۔ ”میری کیا حقیقت تھی صاحب۔ میں تو ایک ہوٹل کا معمولی سا ویٹر تھا اور وہ مسکرتھی۔ میں اس سے کیسے کوئی بات کر سکتا۔ لیکن خاموشی کی تو اپنی زبان ہوا کرتی ہے صاحب اور خاموشی کی زبان بہت کچھ کہہ دیا کرتی ہے۔“

میں اس کی باتیں سننے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس کم بخت محبت کے بھی کھیل نرالے ہوا کرتے ہیں۔ یہ کیسے کیسے خواب دیکھ لیا کرتی ہے۔ انسان اس کے ہاتھوں میں آکر کھ پکلی میں گر رہ جاتا ہے۔

”تو صاحب ایک بار ایک بہت اچھا موقع مل گیا۔“ نذر نے بات آگے بڑھائی۔ ”اس رات وہ اکیلے آئی تھی۔ اس کے گھر والے اس کے ساتھ نہیں تھے۔ میں ایک کراس کے پاس پہنچ گیا۔“ ”یہاں۔ آج آپ اکیلے آئی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”یہاں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”گھر والے راستے میں ہیں۔ میں نہیں اور سے ہوتی ہوئی آئی ہوں۔“

”لڑا نہیں کیا چٹا کر اس۔“ میں نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”اوہ۔“ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”نذر۔ تم تو بہت بڑے مجھے معلوم ہوتے ہو۔ پھر اس ہوٹل میں ویٹر کیوں ہو گئے۔“

دل چاہا کہ اسے بتا دوں کہ میں نے یہ لازمت صرف اسی کے لیے کی ہے۔ اس سے قریب ہونے کے لیے۔ اس سے دو چار باتیں کرنے کے لیے۔ لیکن پھر وہی اپنی حیثیت کا خیال آ گیا صاحب۔ اس لیے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”بھئی مجبور ہاں ابھی انسان کو ابھر سے اُدھر کر دیتی ہیں ہاں۔ میں سامنے والے فاسٹ فوڈ میں ہوا کرتا تھا۔“ ”ہاں۔ میں نے تمہیں کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔“ اس نے تالا۔

”یہاں۔ پھر کوئی طاقت مجھے یہاں کھینچ کر لے آئی۔“ میں نے کہا۔ ”بعض حالات بہت بے رحم ہوتے ہیں ہاں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ہٹایا ہے۔ وہاں وہ اپنی مراد حاصل کر سکے گا یا نہیں۔“

"ارے واہ۔" وہ چونک پڑی۔ "یہ تم نے کیسی بات کہی۔ یہ تو بہت غلطیانا اور شاعرانہ جملہ ہے۔"

"بس بی بی۔"

"بی بی کون۔ راجہ۔" اس نے کہا۔ "میرے گھر والوں کے سامنے تم بی بی کہہ سکتے ہو۔ اس کی اجازت ہے۔ لیکن جب میں آؤں تو پھر نام سے پکارا کرو۔"

"یہ آپ بہت بڑی بات کی اجازت دے رہی ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ تم بھی انسان ہو۔" اس نے کہا۔ "تم بھی اس معاشرے کے لیے اتنے ہی اہم ہو جتنے دوسرے ہو سکتے ہیں۔ تم میں خوبیاں ہیں۔ تو پھر کس بات کی احساس کمتری۔"

"ایلی حیثیت کو دیکھنا ہوں تو شرم آنے لگتی ہے۔"

"پانچ ہو تم۔" وہ اس بڑی۔ "کیا کئی ہے تمہاری حیثیت میں۔ محنت کرتے ہو۔ کس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ اور رزق حلال کھاتے ہو۔ ایک انسان میں اس کے علاوہ اور کیا خوبی ہوتی ہے۔"

"واللہ۔ آپ دوسروں سے الگ مانگی کرتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مجھ سے اس طرح کی باتیں کسی نے نہیں کیں۔"

"لیکن میں تو کر رہی ہوں نا۔"

"اسی بات پر تو حیران ہو رہا ہوں۔"

"خیر۔ چھوڑو لہذا باتوں کو۔ اب چلے گی سے کچھ لے کر آؤ۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گی۔"

"ارے۔ تمہاری بات کا برا کیا مانا۔"

"آج کاٹنی میں دوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔"

"چلو لھیک ہے۔" وہ ہنس دی۔ "لیکن اب لے کر آ جاؤ۔"

"واہ خیر۔" میں نے کہا۔ "یعنی تم اپنے مقصد میں کامیاب ہونے لگے تھے۔"

"ہاں صاحب۔ میری سب سے بڑی آرزو پوری ہوتی جا رہی تھی۔ یعنی اس سے بات کرنا۔ اس کو قریب سے دیکھنا۔ اس کی باتیں سننا۔ ورنہ میرے نصیب ایسے کہاں تھے۔ میرے لیے تو وہ شوکیس میں لگی ہوئی کسی خوبصورت چیز کی طرح تھی۔ جس کو صرف دیکھا جاسکا ہے۔ فریادیں

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے صرف ایک بار مجھے دیکھا اور اپنی گردن ہچکالی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے میری بات سمجھ لی ہو۔ یا بالکل نہیں سمجھی ہو۔ انسان تو ایسا ہی خوش گم ہوتا ہے صاحب۔ وہ بہت لمبے سیدھے خواب دیکھنے لگتا ہے۔"

"خیر کچھ دیر بعد اس نے اپنی گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور دیر سے بولی۔ "نہیں بند۔ ایسی بات نہیں ہے۔ انسان کا ارادہ اگر پختہ ہو اور اس کی طلب پکی ہو تو منزل میں لگا جاتی ہے۔"

"میں تو یہ سن کر نہال ہو گیا تھا صاحب۔ کیونکہ اس نے نہ صرف میری بات سمجھ لی تھی۔ بلکہ مجھے اشارہ بھی دے دیا تھا۔ اس نے میرا دل نہیں توڑا تھا۔ بلکہ حوصلہ افزائی کی تھی صاحب۔"

"ہاں۔ تم لھیک کہتے ہو۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "میں کی اس بات سے تو سبکا اعزازہ ہو رہا ہے۔"

"میں صاحب۔ بالکل سچی بات تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کچھ اور باتیں کروں۔ کچھ لار پھجوں۔ لیکن اس دوران میں اس کے گھر والے بھی آ گئے اور میں ان کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔"

خیر صاحب اس کے بعد دو چار دنوں تک نہیں آئی۔ ظاہر ہے کوئی بھی ہو بار بار ہوئی تو نہیں آ سکتا۔ یہ تو ایک طرح کی آؤٹنگ ہوتی ہے صاحب۔ جی چاہا اور فرصت ہوئی تو چلے آئے۔ اس لیے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔"

"حالانکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ پہلی کہاں رہتی ہے۔ اس لڑکی کا نام کیا ہے۔ اس نے میرا نام جان لیا تھا۔ لیکن میں اس کا نام نہیں معلوم کر سکا تھا۔ آخر کس طرح اس سے نام پوچھتا۔"

تین چار دنوں کے بعد پھر آ گئی۔ اس بار بھی وہ اکیلے آئی تھی۔ اس نے بتایا۔ "آج میرے گھر والے نہیں آئیں گے۔ میں اکیلے آئی ہوں۔"

"بی بی۔ کیا آپ کبھی قریب رہتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارا گھر زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور دوسری بات یہ ہے کہ میرا نام بی بی نہیں راجہ ہے۔ بتاؤ کیا نام ہے۔"

"بہت خوبصورت۔" میں دیر سے بولا۔ "آپ کے حوالے سے جو کچھ بھی ہے۔ وہ خوبصورت ہی ہوگا۔"



جاسکتا۔

اس نے پھر ایک ایسی بات کہہ دی تھی۔ جس سے اس کے ذہنی معیار کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہمارا بھی کیا معاشرہ ہے۔ کسے کسے لوگ اس طرح بد وقت ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی گفتگو بہت سے چڑھے لوگوں کی گفتگو سے بھی اچھی تھی۔

”وہ دن میری خوش نصیبی کا تھا صاحب۔“ اس نے پھر کہا شروع کیا۔ ”میں نے تو صرف یہ خواہش کی تھی کہ اس کے قریب ہو سکوں۔ اس سے دو چار باتیں کر سکوں اور قسمت نے اتنی بڑی مہربانی کر دی تھی کہ اس نے میری پیشکش قبول کر لی تھی۔ آپ کو میری خوشی کا اندازہ نہیں ہو سکتا صاحب۔“

”نہیں نذیر۔ اندازہ کر سکتا ہوں میں۔ تم نے جس انداز کی بغیر زندگی گزاری اس میں اگر بارش کے چھینٹے چڑ جائیں تو ایسی ہی خوشی ہوتی ہے۔“

”نئی ہاں صاحب۔ یہی بات ہے۔ لیکن صاحب۔ اس کے بعد وہ کچھ ہو گیا۔ جس نے مجھے آسمان سے لا کر زمین پر پھینک دیا۔“

”وہ کیا ہو گیا تھا۔“

وہ کچھ تانے سے پہلے سوچا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ”صاحب۔ وہ اس دن کے بعد سے کئی دنوں تک نہیں آئی۔ آپ سوچ لیں کہ میری یہ قراری کا کیا عالم ہو گا۔ لگا ہوا سامنے تک رہیں کہ شاید وہ لکھا۔ سے آ رہی ہو۔ لیکن نہ سکی۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی۔ آ کر جائے۔“

”تو کیا وہ پھر نہیں آئی۔“ میں نے پوچھا۔

”آئی صاحب۔ وہ آئی۔ وہ ایک نوجوان کے ساتھ آئی تھی۔ اس کی طرح اسٹارٹ اور غریب صورت۔ دونوں بہت بے تکلفا شاعر میں ہو گئی میں داخل ہوئے تھے۔ ہتے بولتے ہوئے۔ نہ جانے کیوں صاحب۔ یہ وہ کچھ کہ میرا دل پیٹنے لگا تھا۔ بہت برا لگ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ لیکن نظر انداز کر گئی تھی۔ اس نے آ کر دیر رہا تھا صاحب لیکن میرے غم سے نہیں صاحب۔ دو نمبر سے۔ دو نمبر ادھر آؤ۔ اور میں دو نمبر بٹرن کیا تھا صاحب۔ ایک معمولی سا دہر۔“

پھر یہ ہوا کہ اس نوجوان نے اس کے کان میں کوئی بات کہی اور وہ فوراً سے نہیں بڑی۔ اس وقت وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہاں لگا جیسے وہ شخص میرا

لحاظ الازار رہا ہو۔ میرا دل ٹوٹ گیا تھا صاحب۔ اس کو کیا حق پہنچتا تھا کہ میرا مذاق الازار اور یہ تو دیکھیں کہ وہ لڑکی اس کے ساتھ بیٹھ کر ایک مضروری کسٹرمین گئی تھی۔ اس کے نزدیک میری تو اب کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

”تمہاری کیلیت کو کچھ سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”صاحب میں بے بس آدمی تھا۔ لیکن میرے اندر لاوا اٹھنے لگا تھا۔ تم فوراً مجھے کی ایسی کیفیت تھی کہ بتا نہیں سکتا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا مجھے۔ شاید ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے آمیزہ سرد کرتے ہوئے ایک پلیٹ اس آدمی پر اس طرح گرا دی جیسے اتکا ٹا کر گئی ہو۔“

”پھر کیا تھا صاحب۔ اس نے مجھے برا بھلا کہا شروع کر دیا۔ جاہل۔ بد تمیز۔ دو کوڑی کا انسان۔ اور حال اس نے اتنی باتیں سنائی صاحب کہ خود مجھے بھی طعنے آ گیا۔ میں نے اس کی بات کا جواب اسی تھی سے دیا۔ اس کو تو اور آگ لگ گئی۔ شاید اس نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ اس لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک بات کہی اور وہ بات ایسی ہے صاحب کہ اس کے بعد شاید مجھے زعمہ نہیں رہتا چاہئے تھا۔“

”کیا کہہ دیا تھا اس نے۔“

اس نے کہا تھا۔ ”جانے دو غم۔ چھوٹے آدمیوں کے من نہیں کھتے۔“

اتفاقاً کراس نے گردن جھکائی۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی حالت پر قہر پاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں صاحب۔ میں تو چھوٹا آدمی ہوں۔ اور ایک چھوٹے آدمی کو ایسے خواب دیکھنے کا۔ ایسی محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسے تو مر جانا چاہئے۔ لیکن میں مرا نہیں۔ زعمہ ہوں صاحب۔ اور اب تک اسی ہو گئی میں وغیرہ ہوں۔ اس کے بعد وہ پھر آج تک نہیں آئی۔ لیکن وہ چھوٹا آدمی اسی جگہ اسی ہو گئی میں ہے۔ اس کی راہ دیکھتا ہوا ایک بے حیثیت انسان۔“

یہ تھی اس کی کہانی۔

میں جب یہ کہانی لکھ رہا تھا تو یہی خیال آ رہا تھا کہ محبت پر تو کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ پھر کوئی انسان کیا محبت کے بازار میں بھی چھوٹا بڑا کم قیمت یا بیش قیمت ہو سکتا ہے۔





## چھپارستم

محترم مدیر سرگزشت !

السلام علیکم !

ایک مسجداً واقعہ جس میں کہانیت لانے کے لیے میں نے کچھ لوازمات شامل کر دیے ہیں آپ کی خدمت میں ارسال ہے، اگر یہ سرگزشت میں شائع ہو جائے تو بہت سے لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ جائے گا۔  
سید طاہر شاہ طاہری

”اس کا تو پتا نہیں... البتہ اس کی لاش آج سویرے  
میں نے کے درخت سے لگی ہوئی ملی ہے۔ تجربے پرے پر  
زخم تھے ہیٹ پر۔“ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔  
”پلو اچھا ہوا... شمس کم جہاں پاک۔ اب اس کی

”چھوٹے شاہ جی ایا سو سہار قتل ہو گیا ہے“ میں  
نے حیرت اور خوشی کی ملی ملی کیفیت میں امام صاحب کو خبر  
دی۔

”کیا اور کیسے؟“

اگست 2014ء

263

ماہنامہ سرگزشت



لاش کہاں ہے؟" امام صاحب نے پوچھا۔

"دو تو پلیس لے گئی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوں.... اور کچھ چاہئے تو بتانا۔" اسکا کہہ کر امام

صاحب نے تپائی پر کھیلے قرآن پاک پر لگا ہوا بھائی، رمضان کا  
مہینہ تھا اور انہیں رات کو تراویح میں سنانا ہوتا تھا اس لیے  
میں جب بھی مسجد میں آیا انہیں قرآن پاک کی تلاوت کرتے  
پاؤ۔

میں نے سلام کیا اور اگلے قدموں واپسی کی راہ لی۔  
گھر پہنچنے سے پہلے سارے راستے میرے ذہن میں ایک ہی  
خیال گردش کر رہا تھا کہ آخر کس نے اتنی جرأت دکھائی اور  
ایک بے غیرت سے اس ترمین کو پاک کر دیا پھر خود ہی بڑبڑایا  
۔۔۔ کسی غیرت مند کی بہن بچی پر لگا لڑائی ہوئی تو اس نے بھی  
اسے دلو جہنم پر ڈال دیا ہوگا لیکن مجھ پر کرموں کی بجائے  
اتنا غیرت مند اور جرأت مند ہے کون؟ اس پر سے گاؤں  
میں تو کوئی نہیں تھا، یہاں تک کہ گاؤں کا شیخ بھی ہاسو سے  
ڈرتا تھا۔ شاید کسی ساتھ والے گاؤں کا۔ جو بھی ہوگا پولیس  
جتا لگالے گی مجھے اپنا داماد کھانے کی کیا ضرورت۔ اس  
سوچ کے ساتھ ہی میں حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا۔

ابا جی کے ساتھ جھوٹے پر چارہ بولنے کے بعد میں  
ایک ہار پھر جائے وقوعہ پر تھا۔

"اوئے گاے ہڑا" مجھے صوب سے چاہے غلام  
رسول کی نقابست بھری آواز سنائی دی۔ میرا نام تو غلام محمد تھا  
لیکن گاؤں والے سارے مجھے گاامی کہتے تھے۔

"جی چاچا!" میں نے جواب دیا۔  
"اوہتر مجھے تو کمر کی نذر (دود) لے ملے پھرنے کے  
قابل نہیں چھوڑو، وہ تیری بہن تو بہت لاکڑ گئے پاس گئی تھی  
میری ودا لی، لیکن ابھی تک واپس نہیں آئی، اس کا تو بتا کر  
اے۔ کھسے، وگئی۔"

پہلے تو ریت کو میری بہن کہنے پر میں نے دل ہی دل  
میں چاہتے کو پاچے ساتھ سنا لیا۔ بچپن سے نہ جانے میں اس  
کے بارے میں کون کون سے خواہدوں میں بچلے بیٹھا تھا اور چاچا  
جب بھی ملتا تھا سارے خواہوں پر اس بڑال دیتا تھا۔ میں "اچھا  
چاچا" کہتا لاکڑ کے کھینک کی طرف ہل پڑا۔

دو کیفیت مہور کرنے کے بعد سیدھی گلی لاکڑ کے کھینک  
کو جاتی تھی۔ ابھی میں گلی میں داخل ہی ہوا تھا کہ مجھے اسلم  
منہو کی حوصلی میں ریت کی جھٹک ٹھہر آئی۔ اس کی میر سولہ  
سال ہو گئی تھی جبکہ اپنی عمر سے وہ دو تین سال بڑی ہی لگتی تھی

لیکن ابھی تک وہ اپنے بچپن سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہی الہ  
پن، وہی شرارتیں اور وہی مصیبت۔ کچھ بدلتا تھا تو صرف  
اس کا قد کاٹھ اور نہ ابھی تک وہ وہی لگی تھی جو کیتوں میں  
ہمارے ساتھ آکھ بھولی بھولا کرتی تھی یا کیتوں میں لگی لڑا۔  
بیر کی ایک لمبی شاخ سے وہ جاکن بھاڑ رہی تھی اور جو جاکن  
ڈٹن پر کرتا اسے اٹھا کر اپنی بھولی میں سیٹ لگتی تھی۔  
"زیڑا" میں نے آواز لگا لی۔

"کیا ہے۔" اس کی بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ  
ہر ایک سے اسی لہجے میں بات کرتی تھی اسی لیے زیادہ تر  
لوگ اس سے دور رہ کر ہٹا پسند کرتے تھے۔  
"تیرا انا چچے با رہا ہے۔ اس نے تجھے دوائی لینے  
بھجوا تھا اور تو یہاں جاکن اکٹھے کر رہی ہے۔"  
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے! قاتی ہوں میں تو جا۔۔۔ اسے  
کہہ دے آ رہا ہے۔"

کوئی اور بات کرنے کی بجائے میں نے وہاں سے  
بھینکنے میں ہی حالت تھی۔ ورنہ اس کا کیا پتا میری کی شاخ  
سے میرے ہی لئے لینے لگ جاتی۔ ابھی کھلے ہتھے ہی اس  
نے ہاسو کے ایک ڈھکڑے کی دھولی باٹ بند کر ڈنگ توڑ  
دی تھی۔ ہاسو ٹھٹھا پاؤ کا کافی تھا لیکن اس کے بھالی رستے طرف  
ٹپکے نے اسے ٹھٹھا کر لیا تھا۔

ہاسو دو سال پہلے ہمارے گاؤں "بسم اللہ گڑھ" میں  
آیا تھا۔ یہ ٹھکڑ گڑھ کے نواح میں ہارڈر کے قریب واقع  
ہے۔ یہاں بجلی تو کسی نہ کسی طرح لگی ہو گئی ہے لیکن گیس  
ابھی تک جیس بکس کلو میٹر دور ہی ہے، پچھلے کئی سالوں سے  
من رہے ہیں کہ گیس آرہی ہے، پتا نہیں لبا کیسے دی ہے۔  
شاید خود ہی آرہی ہے اور راستے سے لگی بے خبر ہے۔

ہاسو ایک چھٹا ہوا بد معاش تھا۔ اس کے ہارے میں  
کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ جو  
بھی جانتا تھا اس اسکا کہ یہ جو کہتا ہے سر جھکاؤ اور مان لو۔۔۔  
ابتداء میں یہ صرف ہستالیا کرتا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ گاؤں  
والوں کی لڑکیوں پر نظر رکھنی شروع کر دی۔ اگر کوئی اس کی  
راہ میں رکاوٹ بنتا تو اس کے دن کسی کیفیت میں اس کی لاش ملتی  
تھی۔ پولیس میں کئی دفعہ رپورٹ درج کروائی لیکن کوئی  
فائدہ نہیں ہوا، پولیس کو ہر سب سے ان کا حصہ بچتا ہوا تھا، انہیں  
کیا تکلیف تھی بلاوجہ ٹانگ اڑانے کی اور اگر کسی کو  
ایسا اندازی کا نشانہ بنے گا تو چند دن بعد وہ کس اور شہر  
میں بیٹھا ہوتا تھا۔ تیکہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ اس سے چار

کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ سارے گاؤں والے پریشان تھے کیونکہ چھوٹے شاہی کو وہ سب اپنے بچے بیٹوں کی طرح ہی سمجھتے تھے۔

چھوٹے شاہی کا اصل نام عبدالماسد تھا جس سب ان کو ان کے بچپن سے ہی چھوٹے شاہی کہا کرتے تھے۔ وہ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد عالم تھے۔ وہ نہایت غلیظ نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ گاؤں والے انھیں بزرگ کے ان پر اعتماد کرتے تھے، ان کے پاس اپنی لامنتہا رکھواہ جن میں بھی خیانت نہیں ہوئی۔ چھوٹے شاہی کی والدہ ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں۔ اور ان کی پرورش ماں کے والد کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔

میں نے اور چھوٹے شاہی نے دس بھائیوں گاؤں کے اسکول میں اسٹڈی پڑھی تھیں۔ ہم بچپن سے ہی اچھے دوستوں کی طرح تھے۔ بے غلیظی کی نئی حد میں عبور کرنے کے باوجود دن کا ایک احترام ہمیشہ میرے دل میں رہا۔ اور ویسے بھی وہ اتنے سلیبے ہوئے اور شریف شخص تھے کہ کوئی کچھ کہہ بھی دیتا، چاہے غلطی دوسرے کی ہوتی یہ معذرت کر لیا کر لیا کرتے تھے۔ میٹرک کے بعد میں لہاری کے ساتھ کیت لور جالور سنبھالنے لگا اور ساتھ ساتھ پرائیویٹ پڑھائی بھی جاری رکھی جبکہ چھوٹے شاہی شہر کے ایک بڑے مدرسے میں داخل ہو گئے۔

باسو گھارہ ابھی گاؤں میں نیا تاجی وارد ہوا تھا کہ چھوٹے شاہی کے والد صاحب فوت ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد چھوٹے شاہی نے کچے ہی شہر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ کالج میں بھی پڑھ رہے ہیں جس کے بعد میں انہوں نے خود تصدیق کر دی تھی اور پھر پورے دو سال بعد وہ اچانک گاؤں میں لوٹ آئے۔ ان کی آمد پر گاؤں والوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور پھر گاؤں والوں نے اس مولوی کو فارغ کر دیا اور چھوٹے شاہی نے اپنے والد صاحب کی منہ سنبھال لی۔

چھوٹے شاہی کو یہاں آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے والد ہی کی طرح غلیظ، سہراہن اور نیک تھے۔ انہوں نے گریجویٹ کے ساتھ مدرسہ تعلیم بھی پوری کر لی تھی اور پھر اس زمین کی طرف لوٹ آئے تھے جہاں انہوں نے ملکی ہار آکھ کھولی تھی۔ اور آج اس شریف شخص نے ایک ہرمایش کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ جہاں

قدم آئے تھے لیکن ٹھٹھا کر کے کھانے کا عادی تھا۔ بھار کو اس طریقے سے گھیرتا تھا کہ بھار کو ٹھٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ دوسراں میں کئی لڑکیوں کی آمدورفتی ہوئی اور کئی لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن ان دو بھائیوں کی صحت پر کیا اثر پڑنے والا تھا چاہے پورا گاؤں ہی اپنے گھریا چھوڑ کر نکل جاتا۔ سارے گاؤں کی غیرت جو سول ہوئی جن میں میں بھی شامل تھا۔

اور آج دو سال بعد پاسو کی لاش پھیل پر پھٹی ہوئی ملی تھی۔ گاؤں والوں کے چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے لیکن وہ مکمل کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو شاید کل ہی جگہ ان کی اپنی لاش بھی نظر آتی کیونکہ یہ تو ابھی زندہ تھا۔

اگلے دن لاش واپس آ گئی۔ ایک امام صاحب کے پاس پہنچا کہ وہ جنازہ پڑھا دیں۔ اور اس وقت پورے گاؤں نے ایک حیرت کن منظر دیکھا جب امام صاحب نے سماں اطمینان سے کہا: "میں کسی کا لڑکا جنازہ نہیں پڑھا سکتا" جس کے سامنے کسی کی لہجہ آواز نہیں نکلتی تھی اس کے سامنے کل کا یہ لڑکا اس کے بھائی پر کلر کا لتوی لگا کر جنازے سے انکار کر رہا تھا۔

ٹیکے کا چہرہ غصے سے لال بھوکا ہو گیا۔ اس نے دانت پیچے اور امام صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مگر چاہا۔ "کیا گھارہ وارہ بدل ڈرلا۔"

"میں نے کہا میں کسی کا لڑکا جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ بہرہ ہو گیا ہے تو چاہئے کان کا علاج کروا۔" امام صاحب نے دوسری بار گرج کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑنے ہوئے کہا۔

ٹیکے کا دایاں ہاتھ گھوما اور امام صاحب کے منہ پر پڑا۔ امام صاحب کے قدم ڈگمگائے اور ہاتھوں سے خون بہہ لگا۔ ٹیکے نے اس پر ہنس نہیں کی بلکہ انہیں روکنے کی طرح دھمکے رکھ دیا اور ہم اسی بے حس کی تصویر بنے کھڑے رہے۔ ہم میں سے کوئی آگے نہ بڑھا کہ اس کا ہاتھ روک لے۔

"اسے اٹھا کر ڈھیرے پر لے جا دو یہاں میں یہ کیسے جتاؤ نہیں پڑھا تا۔ اس کا تو پاس بھی جنازہ پڑھا سکتا گا۔" اس نے اپنے ایک گرجے کو اشارہ کیا۔

باسو کا جنازہ ہو گیا۔ جنازہ کی اور مولوی نے پڑھا یا تھا۔ نین دن گزر چکے تھے چھوٹے شاہی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا



سب حیران تھے وہیں ان کی صلاحی کی دعائیں بھی کر رہے تھے۔ قرین اذقیاس تھا کہ ٹیکے نے کہیں ان کو مروا ہی نہ دیا ہو۔

باسو کی لاش لے جانے کے بعد پولیس دواہرو گاؤں میں نظر نہیں آئی۔ لوگوں کا بھی کہنا تھا کہ ٹیکے نے پولیس کو قتل کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب حقیقت کیا تھی، اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

چوتھے دن شام کے وقت اقبال عرف والا مجھے ملا۔ میں اس وقت سائیکل کے پیچھے ڈول لادے ساتھ والے گاؤں میں دودھ دینے جا رہا تھا۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے بولتا "گائے تجھے پتا ہے پھر لے شاہ جی ڈیرے سے بھاگ گئے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا "تجھے کس نے کہا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ تجھے پتا ہے مارے مسل سے میری تھوڑی گل بات ہے۔۔۔ وہ ٹیکے کا چنہ ہے، اسی نے قالا ہے۔۔۔ یہ تو آگے کسی کو نہ بتانا، ٹیکے نے یہ بات سب سے چھپا کر رکھی ہے۔ تجھے بھی اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تو اپنا پکا ڈیرہ ہے۔" اس نے اپنی آواز کو دہاتے ہوئے منہ میرے کان کے نزدیک کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیو بات پکیا ہے نا۔ یہ جھوٹ ٹیکے نے امام صاحب کو مروا دیا ہو اور دینا تجھ سے جھوٹ بولی رہا ہو۔" میں نے تشویش کا اظہار کیا۔

"سو لڑا نے پکیا بات ہے۔"

اس کی بات نے میرے اندر خوشی کی ایک لہر دوڑا دی۔ "واہ بالیا کیا خبر سنائی ہے۔۔۔ بولی کرتا ہے کہ تیرا منہ چوم لوں۔" میں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

بس نہیں۔۔۔ اتنا بھی خوش نہ ہو کہ لوگ حیرانہ چہرے کی آؤڑو کرتے لگیں۔

اس کی بات کا واضح مطلب تھا کہ میں کہیں بات آگے نہ کر دوں۔

"میں نے آج تک کوئی بات آگے کی ہے نا؟" میں نے غلی سے منہ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"جائن من! اسی لیے تو تجھے بتائی ہے کیونکہ تیرا لپیٹ اتنی ہاتھیں لو سنے سے بھی زیادہ برداشت کر جاتا ہے۔" اور پھر ہنستا ہوا دوسری گلی میں مڑ گیا۔

اس دن میں بہت خوش تھا۔ خوش ایسی تھی کہ چھپائے

چھپ نہیں رہی تھی۔۔۔ حالانکہ ابھی تک اس بات کی کوئی پکی تصدیق نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی مجھے یقینی سا ہو گیا تھا کہ امام صاحب ٹیکے کی قید سے بھاگ گئے ہیں۔۔۔ جب میں دودھ دے کر واپس لوٹا تو دھکی آواز میں سٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا سانسے ہی اماں چوہے کے سامنے بیٹھی انگاروں پر خشک گلزاریں رکھ کر پھونکی سے پھونک کر انہیں بڑھکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔" اماں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "کچھ نہیں اماں! بس ایسا ہی۔" کہتا ہوا میں اپنے کمرے میں گھس گیا۔

رات دو بجے کا وقت ہو گا، اماں نے مجھے چکایا "گائے پتر اللہ بڑے زرد کا مینڈ (بادش) آیا ہوا ہے۔۔۔ میں رات ڈگر باہر ہی پائندہ آ رہا تھا۔۔۔ جا انہیں دروازے (مکھن) میں کر آ۔۔۔ بے جا دے پوری رات لٹختہ میں کھڑے رہا دعائیں ہی نہ دیتے رہیں۔"

"اچھا ابائی۔" کہہ کر میں نے گرم بستر چھوڑا، برساتی لی اور حویلی کی طرف چل دیا۔ ابھی میں حویلی سے کچھ دور ہی تھا کہ میں نے کسی کو کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے چادر کی ہلک بادرنگی تھی۔ بتارے گاؤں میں ڈیروں پر مدفع حاجت کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لیے لوگ کھیتوں کا سرخ ہی کرتے ہیں۔۔۔ اگر موسم خوشگوار ہوتا تو میں ایسا ہی سمجھتا لیکن اسے خراب موسم میں کسی کا اتنی دور کھیتوں میں آنا خلاف عقل تھا۔ میں تجسس سے مجبور اس کے پیچھے چل دیا۔ مخصوص قاصد رکھ کر میں اس کے پیچھے پیچھے غلہ کھیت عبور کر کے اس نے اپنا سرخ ٹیکے کے ڈیرے کی طرف موڑ لیا۔ کچھ دیر وہ ٹیکے کے ڈیرے کے پاس کھڑا سن گن لیتا رہا پھر وہ گھوم کر ڈیرے کی گھنگلی جانب مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پکا لیکن اتنی دیر میں وہ کھیت عبور کر کے ایک گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ میرے کچھے کچھے اس کا نام دنگان ناہیدہ ہو چکا تھا۔

پتا نہیں وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا اور کہاں صاحب ہو گیا۔۔۔ ٹیکے کے ڈیرے کے پاس وہ کیا لیتے گیا تھا۔۔۔ انہی سوچوں میں غللاں میں حویلی پہنچا۔ ڈگر کھول کر اندر پائندہ سے اور گھر لوٹ آیا۔ غینہ کی آغوش میں گم ہونے سے پہلے مختلف قسم کے گلی سوال میرے ذہن میں گھللا رہے تھے۔ اگلے دن وہی معمول کے کام نہانے کے بعد میں چائے قلام رسول کے گھر چلا گیا۔ ڈیرہ گھر میں جمنا شو دے رہی تھی ابود چاچا چار پائی پر بیٹھا تھے کے کشش لگا رہا تھا۔

چاہے کا حال احوال پر مجھے کے بعد میں زینو کے پاس چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بولی۔ "گائے چھوٹے شادی کی کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں... نہیں... مجھے تو کچھ نہیں پتا تھے کچھ پتا ہے تو بتایا..." میری زبان لڑکھڑکی لیکن پھر میں نے اسے قابو کر لیا۔ وہ دماغ غنیمت تھی جس کے سامنے مجھے جھوٹ بولنا مشکل ہو جاتا تھا۔

"وہ اٹلا کہہ رہا تھا کہ چھوٹے شادی کی ٹیکے کے ذریعے سے بھاگ گئے ہیں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"گنگ... کیا وہ کب اور ہائے کو کس نے کہا۔" مجھے اُمید تو تھی کہ ہائے کے پیٹ میں بات نہیں رہے گی لیکن یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ اس کو بھی بتا دے گا۔ زینو کا پیٹ اتنا چٹا تھا کہ لگے چھ گھنٹوں میں پورے گاؤں میں یہ بات پھیل جاتی تھی۔

"اسے دیکھنے نے بتایا ہے... وہی جس کی پچھلے جتنے میں نے ٹانگ توڑی تھی۔"

"جیل میں پتا کرتا ہوں بات یہی ہے یا کسی نے ایویس ہی پہنایا دی ہے۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے اٹھا اور سیدھا ہائے کے گھر کے سامنے بریک لگا لی۔

بالا گھر میں ہی تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس کے لئے اپنے شرود کر دیے۔" مجھے تو بڑا کہہ رہا تھا کہ بات پیٹ میں دیکھ خود جا کے ذینو کو بتا دیں۔ اب پورے گاؤں کو پتا چل جائے گا۔" میں نے غصے اور تنگی کی فیملی کیفیت میں کہا۔

"تجھے بتا دیا اس نے۔" اس نے حیرانگی سے کہا۔ "نہیں؟ مجھے تو الہام ہوتا ہے... سویرے جاگا تو الہام ہوا کہ تو نے زینو کو بتایا ہے۔" میں نے الفاظ چبائے ہوئے کہا۔

"جیل چھوڑ پار... بس بندہ کس پر اعتبار کرے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی کو نہیں بتائے گی۔"

"اور تو اس کے وعدے پر اعتبار کر گیا... دلو واو..." اس نے دماغ کے قاعدے میں نے بھی اپنے اپنے کی بات بھی چھپائی ہے۔ اس دن گاؤں میں اعلان کرنی پھرتی تھی "ہائے کی سوتے میں دھرتی کھل گئی..." جس کو ابھی تک یہ نہیں پتا کہ کیا بتانا ہے اور کیا نہیں اسے تو جا کے سب بتا آیا ہے۔ جیل پتر اب تو بھی تیار ہو جا یا سودا کی جگہ کھٹے کے لئے۔"

"جیل اب تو قلعہ بن گئی ہو گی آجندہ میری تو بہ جول سے کوئی بات بتائی۔"

"آجندہ کے لیے اگر تو بچا تو پھر سوچیں گے۔" "یار ڈرا تو نہیں۔"

"میں ڈرا نہیں رہا حقیقت بتا رہا ہوں... جیل اب مجھے اجازت دے رہے ہے آج شہر جانا تھا... گھر میں لانا اسکی ہو گی کوئی کام ہی پڑ جاتا ہے تو وہ کہاں لاسوڑتی پھرے گی مجھے۔" میں نے اجازت طلب کی اور گھر آ گیا... اب اپنی شہر جاتے تھے... اہاں چار دہائی پر چھٹی چار سال کر رہی تھی... میں گھر میں داخل ہوا تو لاناں کی آواز کانوں سے نکرائی۔ "گائے ہر تیرا کہا کہ گیا تھا کہ آج وہ ڈنگروں کا ڈاکٹر آئے گا اس بھری گاؤں (گائے) کو چکا لگا لیتا... تین دن ہو گئے ہیں وہ وہ کم دے رہی ہے۔"

"اجھا لانا۔" کہہ کر میں چیت پر چڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد اکثر آپا تو میں اسے لے کر چلی چلا گیا۔

یہ رات کے غالباً اٹھ بجے کا وقت ہو گا... جب کسی نے دروازے پر زور دار دھتک دی... میرا کمر اٹھیا کہ دروازے کے ساتھ ہی تھا اس لیے میں فوراً اٹھ گیا... اس کے ساتھ ہی چاہے غلام رسول کی آواز سنائی دی۔ "لو گائے پتر!" میں تیزی سے بستر چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا کہ چاہے کو اتنی رات میں کوئی مشکل ہی ہو گی جو پھر ہی کے باوجود خود ہی آ گیا... اتنی دیر تک اپنا جی جگ چکے تھے۔

میں نے دروازہ کھولا... جا چا فوراً آگے بڑھا اور روتے ہوئے بولا۔ "پتر وہ کینڈہ زینو کا تھا کرے کیا ہے۔"

میرے حیران تھے سے زینو ہرک تھی... مجھے نہیں پتا کہ کس نے مجھے روکا تھا... اب میرے پیچھے لپکا لیکن میں اپنے ہوش کھو چکا تھا... میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا... پیرا رخ ٹیکے کے ذریعے کی طرف تھا اور مجھے اس کی خبر نہیں تھی کہ میں کہا کر سکتا ہوں... ذہن میں بس یہی تھا کہ وہاں زینو ہے اور آج مجھے غیرت مند بننا ہے... زینو کو اس درد سے کے ہاتھوں بچانا ہے یا خود مر جانا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں ذریعے پر پہنچتا میں نے چیخ سنی... آواز ذریعے کے ساتھ سے آئی تھی اور کسی مرد کی معلوم ہوتی تھی... میں سامنے اٹھ بیٹھے ہائے طاق رکھ کر تیزی سے ذریعے کی طرف بھاگا۔

ذریعے میں داخل ہو کر میری سب سے پہلے جس شخص



پر نظر پڑی وہ ہلکے تھا... اس کی قیاس خون میں تھری ہوئی تھی اور وہ پشت کے بل زمین پر پڑا تھا۔ اسی شام میں میری نظر ایک سائے پر پڑی جو دیوار پھاٹک کر ڈیرے سے باہر جا رہا تھا... میں اس کے پیچھے لپکا اتنی دیر میں وہ دیوار پھاٹک چکا تھا... میں نے جوتی دیوار پھاٹکی وہ میرے سائے آگیا... اس کا چہرہ دیکھ کر میری زبان گنگ رہ گئی وہ چھوٹے شاہی تھے۔

”جج... چھوٹے شاہی آپ...؟“ میرے منہ سے پھنس پھنس کر الفاظ نکلے۔

”ہاں میں... اب جلدی کرو زنت کو لاؤ اور گھر جاؤ... اور کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں... سویرے میں خود سارے گاؤں والوں کے سامنے بتا دوں گا کہ ٹیکے کو میں نے مارا ہے۔“

”کل... لیکن آپ نے...؟“ میں بھٹک اٹھا یہ کہہ سکا۔

”ہاں غلام محمد میں تے۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ ایک ایسا شخص جو دوسروں کی غلطیوں پر بھی خود معافی مانگا کرتا تھا آج قاتل بنا سامنے کھڑا ہے۔“ ایک ڈنگی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر لہرائی اور پھر معدوم ہو گئی۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ”غلام محمد تمہیں پتا ہے اسو کو کس نے مارا تھا...؟“

”نہیں چھوٹے شاہی!“ میں نے جواب دیا۔

”اسے بھی میں نے مارا تھا!“ انہوں نے اطمینان سے کہا۔

”تنگ... کیا... اسے... بھی آپ نے مارا تھا؟“

”ہاں! اسے بھی میں نے ہی مارا تھا لیکن کیوں مارا

تھا یہ میں سویرے گاؤں والوں کے سامنے بتاؤں گا۔“ اتنا

کہہ کر وہ رکتے نہیں اور گاؤں سے باہر جانے والے راستے

کی طرف چل دیے۔

میرا دیرے میں واپس آیا۔ زینو چار پائی سے بندھی

ہوئی تھی۔ میں نے اسے کھولا اور سہارا دے کر گھر لے آیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی اس ڈیرے

سے صحیح سلامت واپس آئی تھی۔ سب حیران تھے اور یہی سمجھ

رہے تھے کہ یہ سب میں نے کیا ہے۔ چاہے غلام رسول کے

لبوں سے دعا میں لکھ رہی تھیں۔ جن کا بس چلنا تو وہ ساری

دعا میں قبول کر رہا تھا چھوڑتے۔

زینو بھی پہلے سے کچھ بدل بدل لگ رہی تھی۔ کیونکہ

حقیقت حال کا اسے بھی نہیں پتا تھا۔ سارے گاؤں والے جان چکے تھے کہ لکھ مر چکا ہے اور کیا کچھ ہے تھے کہ اسے میں نے مارا ہے لیکن حقیقت کیا تھی یہ سرب میں جان تھا اور وہ جس نے اسے مارا تھا... انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ پولیس مجھے لے جائے گی۔ اس بات نے کئی لوگوں کے چہرے پر سوگاری طاری کر دی تھی لیکن جب میں نے انہیں حقیقت حال سے روشناس کر دیا تو وہ سب پہلے سے زیادہ حیران نظر آنے لگے۔

تنگ کے آنکھ بجے تھے۔ پچائیت لگی ہوئی تھی۔ پولیس موجود تھی۔ یہ اسپیکر دانا آتا تھا اور سنا تھا کہ ایمان دہر بھی ہے۔ سب کو کسی کا اکتھار تھا اور اٹھوہ آگیا۔ جونہی چھوٹے شاہی نے پچائیت میں قدم رکھا ہر چھوٹے بڑے کی نگاہ ان پر جم گئی۔

”اسلام علیکم!“ چھوٹے شاہی نے سلام کیا اور ایک خالی نشست پر بیٹھ گئے۔

سلام کا جواب دینے کے بعد سب سے پہلے اسپیکر

نے علی ان سے سوال کیا۔ ”مولوی صاحب کیا آپ نے علی

ٹیکے اور اسو کو قتل کیا ہے؟“

”جی!“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”کیوں...؟“

”بختیار کو جانتے ہو...؟ اس نے اسپیکر کی طرف

دیکھتے ہوئے استغماہ کیا۔

”ایم ایم انے بختیار کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں وہی... یہ دونوں بھائی اسی کے لیے کام کرتے

تھے... اور مولوی صاحب بھی ایسی موت نہیں مرے انہیں بھی

ان دونوں نے قتل کیا تھا۔“ انہوں نے انکشاف کیا اور

پچائیت میں موجود گاؤں کے لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ مولوی صاحب کون ہیں؟“ اسپیکر نے پوچھا۔

وہ جن کے والد صاحب تھے... بیچ نے جواب دیا۔

گاؤں والے شروع سے ہی چھوٹے شاہی کے والد

کو مولوی صاحب ہی کہا کرتے تھے جن کی دیکھا دیکھی

چھوٹے شاہی نے بھی ان کو مولوی صاحب کہا شروع کر

دیا تھا۔

”وہ کب فوت ہوئے...؟“ اسپیکر نے پھر پوچھا۔

”تقریباً دو سال ہو گئے ہیں۔“ بیچ نے جواب دیا۔

”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ بختیار کے

بھے ہیں اور انہوں نے ہی تمہارے باپ کو قتل کیا ہے...“

جبکہ سارے گاؤں والے جانتے ہیں کہ وہ فیسی موت مرے تھے۔ "انسپکٹر نے چھوٹے شامی سے پوچھا۔  
چھوٹے شامی کے آنے سے پہلے ہی سچ انسپکٹر کو ان کے بارے میں سب کچھ بتا چکے تھے۔

"جو میں چاہتا ہوں وہ گاؤں والے نہیں جانتے... سب سے پہلے مجھے جب تک بڑا تھا جب میں شہر سے لوٹا تھا اور مولوی صاحب کی چار پائی کے سر ہانے دا میں پائے کے ساتھ ہن کی تسبیح گری دیکھی تھی... مولوی صاحب سوتے وقت تسبیح ہمیشہ نیچے کے نیچے رکھ کر سوتے تھے اور آج تک ان کی تسبیح کبھی چار پائی سے نیچے نہیں گری... یقیناً بات ہے کہ کسی نے ان کے سر کے نیچے سے نکی لالا تو تسبیح نیچے جا گری اور پھر ہاں نیچے کے ساتھ ان کا منہ بند کر دیا اور وہ ہمارا ہی طرح کھپان کے سر کے نیچے رکھ دیا... دوسری بات یہ کہ سب سے پہلے انہیں دیکھنے والا چاچا اللہ بخش تھا، ان کا کہنا ہے کہ مولوی صاحب سر تک چادر بوڑھے سو رہے تھے جبکہ میں نے اپنی چھ مہینہ سالہ زندگی میں آج تک انہیں سینے سے اوپر چادر لے کر سوتے نہیں دیکھا... اور تیسری بات شاید کسی نے بھی غور نہیں کیا کہ دروازہ احمد سے کھلا تھا... جبکہ کوئی بھی رات کو اسے گھر کا دروازہ کھول کر نہیں سوتا۔" چھوٹے شامی اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

"گاہکوں والے جانتے ہیں کہ تمہارے والد صاحب ان دنوں بیمار تھے اور اس بیماری کی وجہ سے ہی ان کی موت ہوئی... اور باقی سب تو اتفاقات میں آتا ہے یہ تو کوئی شہوت نہ ہوں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بھی سمجھیں میں ان سے پوچھ لیوں کیا مولوی صاحب اسے بیمار تھے کہ وفات پا جاتے... انہیں ان سب کو اتفاق مان لیا لیکن یہ تو اتفاق نہیں ہے۔" چھوٹے شامی نے ایک موبائل فون نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے...؟" انسپکٹر نے پوچھا۔  
"موبائل فون ہے گی۔"

"وہ تو مجھے بھی پتا ہے کہ یہ موبائل فون ہے... میں اتنا بھی گھماؤ نہیں ہوں... اس میں کیا شہوت ہے۔" انسپکٹر نے منہ ہاتے ہوئے کہا۔

چھوٹے شامی نے موبائل دیکھیں لے کر ایک ویڈیو چلائی اور انسپکٹر کے سامنے کر دی... انسپکٹر نے ویڈیو دیکھنے کے بعد چھوٹے شامی کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا "یہ ویڈیو تمہیں کہاں سے ملی اور یہ بتائی کس نے ہے...؟"

"ویڈیو کس نے بتائی یہ تو ہندی ہی بہتر جانتا ہے... البتہ مجھے یہ ہاسو کے ڈرامے سے ملی ہے اور موبائل بھی ہاسو کی ہے۔"

"اس ویڈیو میں کیا ہے انسپکٹر صاحب۔" سچ نے پوچھا۔  
"آپ غور ہی کر لیوں۔" انسپکٹر نے موبائل ان کی طرف بڑھا دیا اور پھر وہ ویڈیو بہت سے لوگوں نے دیکھی... اس ویڈیو میں ہاسو کھار مولوی صاحب کے منہ پر تکیہ رکھ کر ان کو مار رہا تھا۔

"لیکن ہاسو کی تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی۔" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"ہاسو کی مولوی صاحب سے کوئی دشمنی نہیں تھی... اس کی دشمنی پاکستان سے تھی اور میرے والد صاحب کو پاکستان سے محبت تھی بس یہی بدولت انہیں لے گئی۔"  
"تم بات بہت گھما بھرا کر کرتے ہو جہاں بات ہے وہ صاف صاف بتاؤ۔"

"یہ آج سے ڈھائی سال پہلے کی بات ہے... اس وقت پاکستان میں لڑکے داریت کا حضرت شہزادوں سے ہو کر سادہ لوح اور عورتوں کو نکالنے کے لیے لگا... میں ان دنوں شہر میں بڑھتا تھا۔ کبھی کبھی ہی گاؤں کی طرف جکر گھٹتا تھا... ایک دن لوٹا تو مولوی صاحب کافی پریشان تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ کچھ لوگ قریب قریب اشتہار ہانتے پھر رہے ہیں جن سے فرقہ واریت کو ہوا ملے گی اور گھر گھر لٹا دیا جائے گا... اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ انہیں بھی اس بات پر مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ بھی اس ہم میں شامل ہو جائیں... جب کہ ان کی ساری زندگی سب کو ایک کرتے گزرتی ہے... اور اس سب کے پیچھے بھتیجا تھا... جو کہ اسلام مخالف گھروں کا آلہ کار ہے... اس کی شہ پر جگہ جگہ کفر کے نعروں کا ہزار گرم تھا... جب مولوی صاحب نے صاف انکار کر دیا تو انہیں لڑکی دیکھ کر دی گئی اور ایک دن وہ ایسے سوئے کہ وہ بارہ اٹھ ہی نہ سکے۔

ان کے گل سے دو ماہ پہلے ہاسو اور اس کا بھائی لکھ اس گاؤں میں وارد ہوئے تھے... ہاسو اور لکھ نہ بھائی تھے اور نہ ہی مسلمان ہم نے پوری چھان بین کی ہے۔ ان کے نام شروں کو اور شہید منہا ہے، یہ دونوں انڈیا کے تپ کلاس کے غلے تھے جنہیں ہائر کر کے تخریب کاری کے مقصد سے پاکستان بھیجا گیا تھا جہاں انہیں بھتیجا کی معاونت کرنی تھی... اور اس سے انہیں تخریب کاری کیا ہوتی کہ مسلمانوں کو آگ میں ہی بڑا دیا جائے... شروع شروع میں



انہوں نے صرف لوگوں پر اپنی دھاک بٹھائی اور جب وہ جان گئے کہ اس گاؤں کے لوگ اسے بزدل ہیں کہ اگر ان کی عزتیں بھی خراب کر دی جائیں تو یہ چوں بھی نہ کریں گے، تب انہوں نے اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیا... جس کی وجہ سے گاؤں کے اکثر لوگ شہروں کی طرف بھاگ گئے۔

پھر گاؤں میں ان کی مرضی کا ایک مولوی آیا وہ بھی کہتا تھا جس کا اسے حکم دیا جاتا تھا۔ شروں اور شیوم نے صرف اس گاؤں پر ہی بس نہیں کیا تھا بلکہ وہ دوسرے گاؤں پر بھی منہ مارتے تھے اور ان کی پشت پناہی اختیار کرتا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی پولیس والا ان پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتا تھا... اور اگر کسی کو ایسا اندازہ ہی کا بھرت چڑھ بھی جاتا تو اسے لٹا کر کسی اور شہر میں پھینک دیا جاتا... پھر وہاں پہلے میں اس گاؤں میں آیا۔ گاؤں والوں نے جب دوسرے مولوی کو چلتا کیا تو شروں اور شیوم میرے پاس آئے اور وہی بات سامنے رکھی جو احوالی سال پہلے مولوی صاحب کے سامنے رکھی تھی... اگر میں جب انکار کر دیتا تو آج ان دونوں کی جگہ میں اوپر بھی چکا ہوتا۔

میں بڑے ہیٹھ تک راتوں کو جاگ جاگ کر ڈیرے کی ریکی کرتا رہا کہ کوئی موقع ملے اور میں کچھ کر سکوں اور آخر ایک دن مجھے موقع مل گیا... اس دن شروں (باسو) ڈیرے پر آ گیا تھا اور شیوم شہر گیا ہوا تھا... میں دوپہر چھ بج کر ڈیرے میں داخل ہو گیا میں انی وقت شروں رینگ جاتے کے لیے ڈیرے کے ایک کمرے سے باہر نکلا اور میں اس کمرے میں گھس گیا... وہ دس منٹ بعد لوٹا انی دیر میں میں کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا... برہانے پر ایک خنجر بھی میری تحویل میں آ چکا تھا اور تب مجھے شروں کا انتظار تھا... جو خنجر وہ فراغت کے بعد کمرے میں داخل ہوا میں نے وہ دو ہتے کی ادھ سے نکل کر پہلا وار اس کے سینے پر کیا اور آدھا خنجر اس کے سینے میں ترانہ ہو گیا... میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پے در پے پانچ مزید وار کیے اور جب وہ لٹھکا ہو گیا تو چار پائی کی نوا سے اسے پھندا لگا کر ڈیرے کے اندر ہی پھینک کے درخت سے لٹکا دیا۔

تلاشی کے دوران میں جو چیزیں میرے ہاتھ لگی تھیں ان میں ایک یہ سونا ہل بھی تھا... جس میں شروں نے ویڑیے ڈالی تھی شاید اسنے آقا کو اپنا کارنامہ دکھانا چاہتا ہو... اسے چاہیے تو یہ تھا کہ سونا ہل ہی خالص کر دیتا لیکن اس نے صرف ویڑیے پوزیلیٹ کرنے پر ہی اکتفا کر لیا... مجھے جب سونا ہل ملا تو میں نے "ڈیجاری کور" کے ڈیرے میں اس کا سارا ڈیجاری کر دیا

اور اسی ڈیجاری میں یہ ویڑیہ بھی ملی... جس بات کا پہلے مجھے صرف لک تھا اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی... میں کوئی مجرم نہیں تھا لیکن جب انسانیت پر ضرب پڑنے لگی تو شیوم اور محلی چھوڑ کر شمشیر تھامی پڑی۔ جب انسان کی بات کا حکم ارادہ کر لیتا ہے تو اللہ خود ہی راستے پیدا کرتا جاتا ہے۔

میرے ہاتھ کی پن کی وجہ سے ارجن کو میری کارکردگی کا علم ہو گیا اور اگلے دن وہ چٹانے کے بھانے مجھے لٹا کر ڈیرے پر لے گیا۔ جہاں سے میں موقع پا کر فرار ہو گیا... تین چار دن میں نے چکر لگائے کہ کوئی موقع ملے اور میں ارجن کا بھی کچھ کر سکوں اس دوران میں گاؤں کے ایک شخص نے میرا بیٹا بھی کیا لیکن میں نے اس پر غور نہ ہونے دیا کہ میں اس کے بیٹا کو مارنے سے واقف ہوں اور اسے ہل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ چھوٹے ملازم کاواشیخ اشتار میری طرف تھا۔

"اور کل راستہ دو چارے نظام رسول کی بیٹی زینت کو اٹھا لے گیا۔ اس وقت اس کے ڈیرے پر اس کے سوا کوئی نہیں تھا... پھر سب اس بات کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ اسے اور سہلت دے جائے... لہذا کل میں نے اس کو بھی اس کے منہ پر لے بھاگی کے پاس بھیج دیا۔"

"تم ان کو قانون کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔ قانون کو اسے ہاتھ میں کیوں لیا؟"

"جس وجہ بات میں یہ غلطی ہوئی۔ مجھے قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے تھا۔ میں نے برا کیا۔ اب اسے سنبھالنا آپ کا کام ہے۔"

ٹھیک ہے۔ یہ تین سونا ہل ہیں، ان میں میسجور کالز کے مکمل دیگر اس موجود ہیں اور کچھ ٹوکوں کے ٹک کی ویڈیو بھی... جن میں تین بڑے بڑے اور دو سیاہی لیڈرنگ شامل ہیں۔

اسپیکٹر ثبوت اور چھوٹے شاہ جی کو لے گیا... چند ماہ بعد وہی ہوا جس کا ذکر مجھے تھا... بختیار کو با عزت بری کر دیا گیا اور چھوٹے شاہ جی کو وہ بے قصور لوگوں کو قتل کرنے کے جرم میں سزا سنائی گئی... جس دن ان کو سزا ہوئی اس کے ایک ہفتہ بعد سننے میں آیا کہ وہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں اور ان کے فرار کے کچھ ہی دن بعد بختیار اپنی حویلی میں مردہ پایا گیا... اس کے جسم پر بھی خنجر کے چھڑخم تھے۔

بختار کو مرے آج تین سال ہو گئے ہیں لیکن وہ چچا رستم آج تک پولیس کو نہیں مل سکا... جس کی شرافت کی سارا گاؤں مثالیں دیا کرتا تھا۔



## باریگر

جناب معراج رسول

السلام علیکم

اس دنیا میں کسے کسے بہرہ لیتے ہیں اس کا ایک نمونہ حاضر ہے۔  
یقین کریں اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں اسے بھول نہیں سکا ہوں۔  
نصرت حسین کاظمی  
(کراچی)

میں راڈ مارکیٹ میں اسٹیشنری کی دکان کے  
سامنے گئے جب اسٹینڈ پر تھے مینے کاسٹ گزشتہ تلاش کر رہا  
تھا۔ رسالہ نظر نہیں آ رہا تھا اور تاریخ ہو چکی تھی۔ لب تک  
رسالہ لازمی آ جانا چاہیے تھا۔ میں رسالوں کے پیچھے واپس  
ہوئے رسالے نکال کر دیکھ رہا تھا کہ وہ میرے برابر میں  
آکھڑا ہوا۔ سالو لا رنگ جو سفید شلووار لیس میں نور بھی  
نمایاں ہو رہا تھا۔ دھبہ داروں پر معمولی سے ہال اور تھوڑی  
کے نیچے چکی داڑھی اور آنکھوں میں سرمہ تھا۔ سر پر سفید جالی



اگست 2014ء

271

ماہنامہ سرگزشت





دھوکا اور غریب اتار پارہ ہو گیا ہے کہ آدمی کیسے کسی کا اعتبار کرے۔

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے وہی اعزاز میں کہا۔  
 "آپ کے افسوس کا شکریہ لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ یقیناً زکوٰۃ خیرات لٹاتے ہوں گے۔ میں آپ سے اس سے زیادہ لوں مانگتا ہوں آپ نے کسی کو دینا ہی ہے اس میں سے مجھے دے دیں اور چاہیں تو اسپتال میں کر میری بہن کو بھی دیکھ لیں تاکہ آپ کو یقین آجائے کہ آپ کی زکوٰۃ خیرات ملے ہاتھوں میں نہیں چار دیواری ہے۔"

"دیکھو میرے پاس وقت نہیں ہے میں جا رہا ہوں۔" وہ آدھی ہوں۔ سنا جاتا ہوں اور شام کو آتا ہوں۔ یہ بھٹی کا دن ملتا ہے تو گھر کے کام دیکھتا ہوں۔ میں کہاں اسپتالوں میں بھرتا بھرتا ہوں؟

"میں جانتا ہوں۔ میں آپ سے زیادہ توقع بھی نہیں لگا رہا۔ آپ کسی دن اپنے قیمتی وقت سے صرف ایک گھنٹہ نکالیں، آپ کہاں کام کرتے ہیں۔"

"میں ایک سو پانچ دنوں گھنٹی میں کام کرتا ہوں جس کا دفتر شاہراہ فیصل پر ہے۔" اس نے اس طرح بوجھا کہ میں نے بے ساختہ ہٹا دیا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ "یہ تو... ہسپتال کے الٹن نزدیک ہے آپ کو آدھا گھنٹہ بھی نہیں ملے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ "میں بھی تو رمضان میں وقت ہے ہم اپنی زکوٰۃ رمضان میں نکالتے ہیں۔"

"اگر آپ رمضان سے پہلے دے دیں گے تو کسی غریب مجبور کے کام آئے گی۔" الفاظ کی عاجزی سے قطع نظر وہ ایک مخصوص لون میں بول رہا تھا اور اس دوران میں اس کی آنکھیں مستقل میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں اٹھنے سے مسلسل ہٹتا رہتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے اپنے غرائز میں لے رہا ہے۔ اس نے عام دھوکے باز بھکاریوں کی طرح مجھے پڑے بغیر بہت نرمی اور آہستگی سے میرے قریب جگہ خالی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"میں سوچوں گا۔"

"ضرور جناب زکوٰۃ بھی ایک عبادت ہے اور اسے پوری چھان بین کر کے لو کرنا چاہیے۔ آپ کا کوئی موبائل نمبر ہوگا۔"

"تمہارے پاس موبائل ہے؟" میں نے کسی قدر

طربیا عاز میں بوجھا۔

"یہ ہے۔" اس نے جیب سے ایک نہایت قدیم اور کھسا ہوا موبائل نکالا۔ وہ ماڈل اب نہیں نظر نہیں آتا تھا۔ اس پر جگہ جگہ ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہو گیا۔ "میں گزرا سڑک کے لیے ہے۔۔۔ کبھی کبھی اسکرین پر نمبر آتا بند ہو جاتے ہیں تو اعزاز سے سے ڈائل کرنا پڑتا ہے۔ آج کل اس کے بغیر گزارا بھی نہیں ہے۔"

"تمہاری بہن کا کیا نام ہے اور کس وارڈ میں ہے؟"

"میرا نام خمس الدین ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میری بہن کا نام نورانسا ہے اور وہ کینسر کے جرنل وارڈ میں ہے۔ لیڈر اور بچوں والے وارڈ میں۔ پینڈ نمبر سولہ ہے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"نصرت خمس" میں نے نام بتایا۔

"آپ کا سبب نمبر؟"

میں نے اپنا نمبر دینے کی بجائے اس کا نمبر لیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے میں فرصت نکال کر دیکھوں گا اور پھر تم سے رابطہ کروں گا۔ اگر میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں تو۔۔۔"

"ساری بات اللہ کی توفیق کی ہے۔ اگر اس نے آپ کے نصیب میں لکھی ہے تو مجھے ضرور ملے گی۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس سے کچھ سواک اور دمال لیے۔ یہ ساری چیزیں کہاں کی بھی نہیں تھیں لیکن میں نے اسے سودے دینے۔ گھر جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ فراڈ یا نہیں تھا تو میں کچھ اس کی کچھ مدد کروں گا۔ میرے پاس ایک قلیٹ تھا جو کرائے پر دیا ہوا تھا اور میری بیوی ذریں کے پاس تقریباً بیس تو لے گولڈ تھے۔ پچھلے سال میں نے تقریباً ساٹھ ہزار روپے زکوٰۃ دی تھی۔ اس سال گولڈ کی قیمت بڑھ گئی تھی اور میرا اعزاز تھا اس بار ستر ہزار تک زکوٰۃ جائے گی۔ میں نے گھر جا کر ذریں کو ساری بات بتائی تو اس نے کہا۔ "نصرت وہ آپ کو فرالہ یا لگ رہا تھا تو آپ نے یہ سب کیوں لیا اور اب آپ زکوٰۃ دینے کی بات کر رہے ہیں۔"

"دیکھو یاد بعض اوقات آدمی وہ نہیں ہوتا جو نظر آتا ہے اور میں ابھی طرح تصدیق کر کے ہی زکوٰۃ دوں گا۔"

"مرضی آپ کی، یہ آپ کا شہر ہے۔" ذریں نے بے نیازی سے کہا تو میں نے اسے کھرا۔

"زکوٰۃ جناب کے ذمہ دات کی جاتی ہے۔"

"تو یہ زیور آپ اور آپ کے بچوں کے کام آئے گا؟"



کون سا میں اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں گی۔" اس نے چمک کر کہا۔ "یہ مکان خریدنا تھا تب بھی تو میں نے اپنا آدھا گولڈ ریا تھا کہ نہیں... آج ہمارا مکان ہے اور آپ کوڑکوا بھی کم دینا پڑتی ہے۔"

"تم لاجواب کر دیتی ہو۔" میں نے اس کر کہا۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ ایک چٹا ٹھٹھ جومات سال کا ہے اور بیٹی رانی پانچ سال کی ہے۔ دونوں اسکول جاتے ہیں۔ صبح میں دفتر جاتے ہوئے انہیں اسکول چھوڑ جاتا ہوں اور دوپہر میں زرین جا کر انہیں لے آتی ہے۔ اسکول پاس ہی ہے۔ زرین پیدل چلی جاتی ہے یا موسم گرم ہو تو رکشا کر لیتی ہے۔ جب سے اسکول دینوں میں بچوں کے ساتھ آنے والے حادثات دیکھے اور سننے جب سے ہم لے بچوں کی اسکول دین چھڑا دی تھی۔ بچے بھی خوش تھے کہ آتے جاتے ماں باپ کا ساتھ بھر جاتا تھا۔ خاصا طور پر آٹا پیرے ساتھ جاتے ہوئے خوش ہوتی تھی۔ وہ پاپا کی دیوانی تھی۔ شام کو میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ پہلے سے دروازے پر منتظر ہوتی تھی۔ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہر سہولت اور آسانی دی ہے۔ اس لیے میں اور زرین دوسروں کا خیال کر کے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھر سے دفتر جانا شروع کیا اور پھر ہمیشہ مصروفیت رہتا تھا۔ کیونکہ اتوار کو ہونے والی ٹرانسکشن بھی اکاؤنٹس میں آتی تھیں اور کام دوگنا ہو جاتا تھا۔ سرکھانے کی فرسٹ ٹیم لیتی تھی اور عام طور سے آٹھ بجے سات آٹھ بجے جاتے تھے۔ پھر والے دن میں ہمیشہ اینٹ گھراٹا باقی دلوں میں میں چھ بجے تک گھماتا تھا۔ اس روز بھی دفتر سے اٹھتے ہوئے مارے سات بج گئے تھے۔ مجھے باہر نکل کر خیال آیا کہ میں نورالتسا کو کچھ لوں تصدیق ہو جاتی کہ جس الدین کی کہہ رہا تھا یا جھوٹ، مگر پھر ہمت نہیں ہوئی۔ جسک بہت زیادہ تھی، سہارا دن کمر سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور بڑی مشکل سے لے گیا تھا۔ میں نے یکساں گلے روئے کے لیے ملوئی کیا اور گھر روانہ ہو گیا۔ اب اتفاق کی بات تھی آنے والے ہر روز کوئی نہ کوئی کام یا مصروفیت نکل آتی تھی جس کی وجہ سے اسپتال جانا ملوئی ہو جاتا تھا۔ مگر بات ہے مجھے سرکاری اسپتال جا کر وحشت ہوتی تھی۔ وہاں کا ماحول، گندگی اور سب سے بڑی بات انسانوں سے بددیوانی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے میں جب بھی کسی سرکاری اسپتال گیا دل پر جبر کر کے ہی گیا۔ شاید اس لیے بھی

میں روز نال جاتا تھا۔

پورا ہفتہ گزر گیا اور اتوار آیا۔ میں عام طور سے شام کے وقت جا کر بیٹے بھر کا سامان لے آتا تھا۔ لیکن کا تازہ سامان جیسے گوشت، مہری اور پھل زرین خود لیتی تھی۔ میں جرنل اسٹور اور دوسری دکانوں سے ملنے والا سامان لاتا تھا۔ بیکری آٹم ہمارے ہاں کم آتے تھے۔ زرین ناشتا بھی خود پاتی تھی۔ اس لیے مجھے پورے ہفتے میں بس ایک بار جانا پڑتا تھا۔ زرین مجھے لہرست بنا دیتی تھی اور میں چیزیں لے آتا۔ یوں سمجھیں کہ ہمارے ہاں ماہوار کچھ بجائے ہفتے وار سامان آتا تھا۔ اس بار سامان زیادہ تھا اس لیے میں گاڑی لے گیا۔ ریلوے مارکیٹ کی پارکنگ میں جیسے ہی گاڑی سے اترا مجھے مانتے سے جس الدین آٹا دکھائی دیا۔ ظاہر وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ مرجھائے آ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگا وہ میری طرف آ رہا ہے۔ اس نے پاس آ کر سر اوپر اٹھایا اور مجھے دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسا بھی نظر نہ کیا ہو۔

"اگر بت بھائی۔" اس نے غصوں لے لے میں کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے... تم سناؤ۔"

"وہی تو اللہ کا شکر ہے۔" اس نے سر آدھ بھری جو اصل میں اشارت تھا اور پھر وہ شروع ہو گیا۔ "مگر نور کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے لیے انجکشن کہا ہے اس سے وہ بہتر ہو جائے گی مگر انجکشن چندہ ہزار کا ہے اور یہاں اتنی رقم نہیں ہے۔"

"سوری مجھے وقت نہیں ملا تھا۔" میں نے مطرت کی۔ "یہ پورا ہفتہ بہت مصروف رہا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" زندگی بہت مصروف ہو گئی ہے۔ یہ وعدہ لوگوں کے لیے ہے۔ مگر جن کی جان ان کی ہوا ان کے لیے تو ایک ایک پل صدی بن کر گزرتا ہے۔" اس نے السرو کی سے کہا۔ "اللہ مالک ہے۔ اگر نصیب میں ہو تو نورالتسا کی زندگی میں آپ کو فرصت مل جائے اگر نصیب میں نہ ہو تو... وہ بولتے ہوئے چپ ہو گیا اس کا لہجہ آدرا تھا۔ "معاف کیجئے گا آپ کام سے آئے ہیں اور میں اپنے دکان سے لے کر بیٹھ گیا۔"

آج اس نے ازار بند کے ٹکٹ تمام رکھے تھے۔ مجھے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن میں نے اس سے ایک ٹکٹ لے لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم تلف سامان

کیوں رکھتے ہو؟

”سواک تو میں لازمی رکھتا ہوں۔ یہ ہمارے  
حمیلتے کی سنت ہے اور ہر مسلمان کو سواک کرنی چاہیے۔  
چاہے وہ خوشہ پیٹ کیوں نہ استعمال کرتا ہو۔ ہاتی چیزیں  
میں بلیکٹن سے لیتا ہوں جو چیز سستی مل رہی ہو وہ اٹھا لیتا  
ہوں۔ میرے پاس یہ زیادہ پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ لٹن سے بنی  
خریداری کرتی ہوتی ہے۔ شام تک دو تین سو روپے قف  
جاتے ہیں جس سے گھر کا چوکھا جتا ہے۔“

میں نے خریداری کی اندواہیں آپا تو میرے اندر  
بلسردگی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ واقعی بہت ضرورت  
مند ہو۔ زربین اور بند کا پکٹ دیکھ کر کچھ تھی۔ اس نے  
کہا۔ ”آج پھر وہی ملا تھا؟“

”ہاں یاد کام کی چیز تھی میں نے سوچا لے  
لوں۔۔۔ جھانک نہیں جائے گی۔“

”آپ عید قمریہ پر دو تین جوتے بخواتے ہیں ان  
کے لیے تو یہ پکٹ دس سال بھی چلے گا۔“ اس نے طر کیا تو  
میں مسکرا کر رہ گیا۔

”کوئی بات نہیں بار دوسروں کو ملے گی ہانت دیں گے۔  
ڈیڑ سو کا پکٹ تو ہے۔“

”بات ڈیڑ سو کی نہیں ہے۔ میں آپ کے لیے جو  
ارادہ لاتی ہوں ایک کی قیمت پچاس روپے ہوتی  
ہے۔ لیکن آپ اس سے لگ کر آتے ہیں یہ مجھے اچھا نہیں  
لگتا ہے۔ وہ خرابا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے بات ختم کرنے کے لیے  
کہا۔ ”اب اسی سے کچھ نہیں لوں گا۔“

”مرضی ہے آپ کی۔“ زربین نے منہ پھلا کر  
کہا۔ ”پیسے تو آپ کے ہی خرچ ہو رہے ہیں۔“

زربین کی بات نے مجھے اکسا یا کہ میں جس الدین کی  
اصلیت جانتے کی کوشش کروں اور میں نے سوچ لیا کہ میں  
کل اسپتال ضرور جاؤں گا چاہے مجھے دیر ہو جائے۔ اگلے  
دن دفتر سے نکل کر میں اسپتال روانہ ہوا مگر مجھے خیال نہیں  
رہا کہ سات کے بعد ملاقات کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ میں  
واہڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں  
ملی تھی۔ البتہ وہاں کاؤنٹر سے امداد ملتی ہوگی کہ یہاں انہیں  
سالہ نور القسا نامی لڑکی داخل ہے اسے دوسرے درجے کا  
کینسر ہے اور اس کا علاج چاہی ہے۔ میں نے اس کے  
ڈاکٹر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے ڈاکٹر ڈیو لی پے

تھا۔ میں نے اس سے نور القسا کے بارے میں پوچھا تو اس  
نے بتایا کہ اسے ملے کینسر ہے۔ گویا کس الدین اس حد تک  
درست تھا کہ اس کی بہن کو کینسر تھا اور اسے علاج کی  
ضرورت تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

”کیا مریضہ کو کوئی انجکشن بخورچا ہوا جس کی مالیت  
پندرہ ہزار ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔ ہم نے اس کے بھائی سے کہا ہے کہ وہ  
بندوبست کر لے کیونکہ حکومت کے پاس اس کا اسٹاک نہیں  
ہے۔“

”اگر اسٹاک نہیں ہے تو مارکیٹ سے خرید کر دیا  
جائے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔“  
ڈاکٹر مسکرایا۔ ”وہ انہیں کی خریداری کے لیے ہندے  
پاس بچت بندہ ہوتا ہے۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ”اس تک میں حوام کے لیے ہرج  
مورد ہے۔ یہ بتائیں کہ اگر انجکشن مل جائے تو جی پر کیا  
فرق پڑے گا؟“

”کینسر کے خلیوں کی افزائش کی دوا دیکھ ہو جائے گی  
اور ہمیں کیمو تھراپی کے لیے زیادہ وقت ملے گا۔ ہم زیادہ  
سے زیادہ دو مہینے میں ایک بار کر سکتے ہیں۔“

”میں کچھ گیا۔“ میں نے کہا۔ اب میں مطمئن تھا۔  
اسپتال سے نکلنے کے بعد میں نے جس الدین کا نمبر ملایا۔  
اس نے کال ریسیڈ کی۔

”یو ٹو کن ہول رہا ہے؟“  
”نصرت عظمیٰ بات کر رہا ہوں۔“  
”نصرت بھائی۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”کہیے مجھ

فریب کو کیسے یاد کیا؟“  
”میں اسپتال سے آ رہا ہوں تمہاری بہن کو تو دیکھنے  
نہیں دیا لیکن میری ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی ہے۔“

”وہ کیا کہہ رہا ہے؟“ اس نے اسی انداز میں کہا۔  
”اس کا کہنا ہے کہ انجکشن سے انہیں نور القسا کے  
علاج کے لیے مزید وقت مل جائے گا۔ تم ایسا کر دو کل مجھ سے  
آ کر رقم لے لو۔“

”کہاں آنا ہوگا؟“ وہ خوش ہو گیا۔  
”براڈو تھا آ جاؤ میں ایک سے ٹکوا کر دیں لے  
آؤں گا۔“

”کس وقت؟“  
”شام میں تم وہیں ہونے ہو میں آؤں گا تو کال کر



لوں گامات ساڑھے سات بج سکتے ہیں۔  
 "یہ آپ کا نمبر ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ اب یہ کال کتنا رہے گا۔ مگر اس نے کال نہیں کی۔ میں نے رات درین کو بتایا کہ محسن الدین کی بہن جی جی کینسر کی سرینس ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے علاج کے لیے پندرہ ہزار کے ایک انجکشن کی ضرورت ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں زکوٰۃ کی رقم میں یہ رقم محسن الدین کو دے دوں۔ درین بھی متاثر ہوئی تھی اس کے خیال میں محسن الدین فرالو پا تھا مگر اب ثابت ہو گیا تھا کہ اس نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ جی جی ضرورت مند تھا۔ درین نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اسے چند ہزار دے دے عدیہ یا چاہیں تو پور بھی دے دیں اس ہار زکوٰۃ بھی زیادہ جائے گی۔ اگر ہزاری زکوٰۃ سے کسی لڑکی کی جان بچ جائے تو بہت اچھی بات ہے۔"

"فی الحال تو پندرہ دے رہا ہوں۔ پھر دیکھوں گا۔" اگلے دن دفتر سے واپسی پر میں نے چیک سے رقم نکلائی۔ چیک مئی گلستان جوہر میں تھا۔ میں نے سوچا مگر جاننے سے پہلے یہ کام نمٹا دوں۔ راز دار کیٹ آؤ تو محسن الدین مجھے باہر ہی مل گیا تھا۔ کار دیکھتے ہی وہ ہلک کر آیا۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "اچھا جاع... آج کل یہاں شیرے گھومتے رہتے ہیں سوچ پاتے ہی رقم موپا ل چھین لیتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مکی ہار اس کا لہجہ کسی قدر مضطرب تھا۔ "میں جانتی تھی کہ جب میں نے نور افسا کو بتایا کہ اس کے لیے انجکشن کا بندوبست ہو گیا ہے تو اس کے کیا تاثرات تھے۔ وہ آپ کو دعا میں دیتے نہیں لک رہی تھی۔"

"اللہ اسے صحت اور زندگی دے۔" میں نے جیب سے رقم نکال کر اس کے حوالے کی۔ "میں لو پورے پندرہ ہزار دیتا ہوں۔"

"گفتا تو وہ ہے جو بدلے میں کچھ دیتا ہے۔ میرے پاس تو سوائے دعاؤں کے کچھ نہیں ہے۔" اس نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بس تو پھر دعا کرنا... انجکشن جلد لگوا لو ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اگر دیر ہوئی تو انجکشن بیکار جائے گا۔"

"کل صبح وہ اس کی مارکیٹ کھلتے ہی میں سب سے

پہلے یہی کام کروں گا۔ کل عیا سے لگ بھی جائے گا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ انجکشن بہت فٹ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مریش کو طاقتور غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انجکشن اپنا کام ٹھیک سے کر سکے۔ خیر اللہ مالک ہے جیسے انجکشن کا بندوبست ہوا ہے اسی طرح نور افسا کے لیے اچھی خوراک کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

مجھے درین کی بات یاد آئی اگر ہماری وجہ سے ایک لڑکی کی زندگی بچ جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے پریم سے ایک ہزار روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ روکھ لو... اس کے لیے کھانے پینے کا سامان لے لیتا۔"

اس نے کھلی قدر ہنگامہ ہٹ کے ساتھ نوٹ لے لیا۔ "آپ بہت کرم ہے ہیں۔ میں جی جی آپ کا شکر یہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پندرہ ہزار میں نے زکوٰۃ سے دے دی ہے لیکن یہ ہزار میری طرف سے ہے۔"

اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ کاٹا اور مجھے اتر کیا۔ میں گھر کی طرف روانہ ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے سر سے کوئی بوجھ اتار گیا ہو۔ میں نے درین کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ "آپ نے اچھا کیا، واقعی صرف علاج سب کچھ نہیں ہوتا ہے مریش کو اچھی غذا کی ضرورت بھی ہوتی ہے جب ہی وہ بیماری سے ٹک سکا ہے۔"

"بس یہی سوچ کر میں نے ہزار روپے دیئے تھے۔"

آنے والے اتوار میری پھر محسن الدین سے ملاقات ہوئی اور وہ بہت خوش تھا اس نے بتایا کہ نور افسا کی حالت اچھی ہے۔ اودان بعد اس کی اگلی کیو تھراپی ہے۔ "اب امید ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"اللہ اللہ۔" میں نے کہا۔

"آپ نے جو رقم دی تھی اس سے اسے اچھی خوراک دی ہے۔ رقم تو نہیں لیکن اب ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کیو تھراپی کے بعد وہ دو تین دن ویسے ہی کچھ نہیں کھائے گی۔"

"تم اگلے اتوار کو ملنا شاہ میں تمہارے لیے اب کچھ کرائں۔"

وہ خوش ہو گیا۔ "میں یہیں ہوں گا۔"

شرورج میں مجھے لگا تھا کہ وہ ملن لوگوں میں سے ہے جنہیں ایک ہار کچھ روٹو پھر وہ جان کو آ جاتے ہیں اور اس

دلت تک پہنچا نہیں چھوڑتے جب تک آدمی اپنی طبیعت پر چر کر کے انہیں دھکا نہ دے۔ مگر خدا اس کو فتح دے ایسا ثابت نہیں ہوا تھا۔ وہ پیچھے تو نگار ہا لیکن ایسے طریقے سلیقے سے کہ ناگوار نہیں گزرتا تھا۔ اپنی ضرورت مہذب انداز میں پیش کی اور پیشہ ور بھکاریوں والا رویہ نہیں اپنایا تھا۔ جس سے چڑ آتی ہے۔ اس نے میرا نمبر پاس ہونے کے باوجود ایک بار بھی مجھے کال نہیں کی تھی۔ اب تو ذرین بھی اس سے حائر ہو چلی تھی۔ اسے ٹس الدین اور نور انسا سے جھڑپی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ارادہ ٹس الدین کو حریصہ دے دینے کا ہے تو وہ نہ صرف متفق ہو گئی۔ بلکہ اس نے نور انسا کے لیے اپنے کچھ پرانے لیکن اچھے جڑے بھی لٹائے۔ ساتھ ہی کچھ چیزیں اور بھی تھیں۔

"یہ سب بھی اسے دے دیجئے گا۔" ذرین نے کہا۔ "اچھا ہے کسی کے کام آجائے گا۔"

ٹس الدین کے بارے میں ابتدائی تاثر جو تھا لیکن اس کی بات بھی ثابت ہونے کے بعد ہمارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ آ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی ہم دل سے اس کی مدد کرنا چاہ رہے تھے۔ اگلے اتوار کو میں مارکیٹ چلی تو وہ وہاں موجود تھا۔ میں نے کپڑوں اور سامان کا شاپ دیا اور ساتھ ہی اس کی بہن کے لیے کچھ رقم دی تھی۔ وہ بہت شکر گزار ہوا تھا۔ ممنونیت کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اس کا نگار بندھ گیا تھا۔ "نصرت بھائی وہ دلو بہت بے لوگوں نے کی لیکن آپ نے جس طرح اپنا نبیت کے ساتھ کچھ کیا ہے اس کے لیے میں اپنے جذبات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

"حالانکہ تم بہت اچھا بولتے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں نے بہت کم لوگوں کو تمہاری طرح اتنا نپاٹا بولتے سنا ہے۔ تم بڑے مہذب لگتے ہو۔"

"اسکول تک بڑھا ہے اور یہ تو آپ جیسے مہربانوں کا ساتھ ہے جو مجھے چند الفاظ لانا آ گئے ہیں۔"

ٹس الدین سے بات کر کے میں احمد آباد۔ ذرین نے کاسٹیکس شاپ سے کچھ چیزیں منگوائی تھیں۔ اس کے مالک تو قیر سے مہری بہت اچھی سلام دعا بلکہ گپ شپ بھی۔ اگر وہ ٹاسک ہوتا تو ہم بات کر لیتے تھے۔ میں اس کی شاپ پر پہنچا تو جیسے وہ یہاں منتظر تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد چوہٹے ہی کہا۔ "نصرت بڑے کس کے پکر میں پڑے ہو؟"

میں چمکا۔ "پکر میں اور میں؟"

"ہاں تم اس بنگالی کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ مجھے پہلے بھی کسی نے بتایا تھا لیکن آج تو میں نے خود اسے آپ سے بات کرنے دیکھا اور آپ نے اسے کچھ دیا بھی تھا۔"

"ہاں یار وہ ضرورت مند ہے۔"

"ضرورت مند۔" تو قیر ہنسا۔ "نصرت بھائی دو ایک نمبر کا لڑا لیا ہے۔"

"نہیں یار کچھ ضرورت مند ہے اس کی بہن کینسر کی مریض ہے اسپتال میں داخل ہے۔"

تو قیر نے ٹکی میں سر ہلایا۔ "اس کا ہجر ہو گا لوگوں سے اسی قسم کی کہانیاں کی مدد سے رقم ٹھکا ہے۔ اس مارکیٹ میں آنے والے بہت لوگوں کو ٹھک چکا ہے۔ دکاندار تقریباً سب جانتے ہیں اس لیے دوسروں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔"

"دکانداروں کو کون لوٹ سکتا ہے اس ملک کی سب سے بڑی ذکیت ایسوی انٹرن تم لوگوں نے ہا رنگی ہے۔" وہ لوں ہاتھ سے محام کو لٹ دے ہو۔"

"مگر بدلے میں چیز تو ایتے ہیں۔ اس جیسے لوگ تو دھوکے کے سوا کچھ نہیں دیتے۔ یہ بتاؤ کہ آپ نے کچھ دیا تو نہیں ہے۔"

اگر میں تو قیر کے سامنے اقرار کر لیتا کہ میں اسے نہ صرف اٹھارہ ہزار سے اوپر رقم دے چکا ہوں بلکہ مہری بھی نے خاصا سامان بھی دیا ہے تو یہ بے وقوف بننے کا اقرار کرنے والی بات ہوتی۔ دوسرے مجھے تو قیر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ کم سے کم نور انسا نام کی لڑکی اسپتال کے کینسر وارڈ میں تھی اور اس کی وہی کیفیت تھی جو ٹس الدین نے بیان کی تھی۔ اس نے اس بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اب مجھے لگ رہی تھی کہ کہیں میں کچھ تو دھوکا نہیں کھا گیا تھا۔ میں گہرا آیا تو ذرین نے پوچھا۔ "آپ نے سامان دیا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ بہت شکر یہ ادا کر رہا تھا۔"

"اللہ کرے اس کی بہن ٹھیک ہو جائے۔" ذرین نے غلام سے کہا تو میں نے سوچا کہ وہ اس کی بہن تھی میں یا نہیں؟ لیکن میں نے یہ بات ذرین کو نہیں بتائی۔ پہلے میں اس معاملے میں پوری چھان بین کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دن میں دفتر سے فوراً جلدی اٹھا تھا۔ میں آج نور انسا کو دیکھنا چاہتا تھا۔ چوبیسے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا تھا اس



کے بعد کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ ٹریک کے باوجود میں خوش قسمتی سے چھپتے میں وہی محنت پہلے پہنچ گیا۔ وہاں بے شمار لوگ اپنے اپنے عروجوں سے اُٹے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے بھی نہیں روکا۔ مجھے بیلڈر یا دھند۔ بیلڈر پر دو طرفہ اسکرین کھڑی ہوئی تھی اور ایک طرف سے کھلا ہوا تھا۔ میں اندر آیا تو بیلڈر پر ایک لوجوان اور ساتھی بنگالی نقوش والی لڑکی لپٹی ہوئی تھی۔ چارمی نے اسے گھلایا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ کیونکر اپنی کی وجہ سے اس کے بال جھڑ گئے تھے اور سر پر دو بال بندھا ہوا تھا۔ وہ خندوکی میں گئی یا اسے کوئی دروازی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو میں چوٹا کیا کہ اس کے جسم پر زریں کا ایک سوٹ تھا اور یہ بات حد و خشک کر کے پینا ہوا تھا۔ میں اس سوٹ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وہاں پہلے لگا تھا کہ لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر چوکی۔

”آپ... آپ ڈاکٹر ہیں؟“

میں نے کسی قدر لگایا ہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔ ”ہاں جیسا میں آپ کو دیکھنے آیا تھا آپ سوری تھیں۔“

”میں اب بہتر ہوں۔“ وہ ہنسی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب میں تھک ہو جاؤں گی؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے تسلی دی۔ ”تمہارا علاج آتا اچھا چل رہا ہے امید ہے چند مہینوں میں تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

”جج ڈاکٹر صاحب؟“ اس کا چہرہ ہلکا تھا۔

میں نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”میں اللہ دین تمہارا کیا لگا ہے؟“

”بھائی۔“ اس نے سلوکی سے جواب دیا۔ ”میرا بہت خیال رکھتا ہے بہت اچھا ہے۔“

”ہاں وہ بہت اچھا ہے۔“ میں نے دل ہی دل میں غم ہوتے ہوئے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ ایک تو میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا لیکن اصل صداقت مجھے کس اللہ دین پر شک کی ہو رہی تھی۔ میں تو قیر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ ایسے لوگ عام طور سے دھوکے باز اور بھکاری سمجھ لیے جاتے ہیں جو کمانے کے لیے ایسی چھوٹی موٹی چیزیں لیے جھگڑ رہے ہوتے ہیں ان میں سے اکثر بھکاری ہی ہوتے ہیں۔ بہت بار میں نے ایسے لوگوں سے خاص طور سے بچوں سے کچھ لیے بغیر انہیں رقم دی تھی۔

کیونکہ میں انہیں بھکاری ہی سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جس اللہ دین دھوکے باز نہیں لگتا تھا اور نہ اس کو دہی چلنے والی زکوٰۃ بھی ضائع جاتی۔ اس سے زیادہ مجھے زریں کا خطرہ تھا۔ وہ مجھے اس حماقت پر آسانی سے معاف نہ کرتی جیسا کہ بیویوں کا دھیرہ ہوتا ہے۔ سالوں تک مجھے اس کے طعنے متنازع تھے۔ اب میں مطمئن تھا۔

اگلے اتوار کو مجھے مارکیٹ میں شمس اللہ بن نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ آج نہیں آیا تھا۔ دوسرے دنے بھی نظر نہیں آیا تو وہ میرے ذہن سے نکلنے لگا تھا۔ ایک مہینے بعد میں نے اس کا نمبر بھی صاف کر دیا تھا۔ اس لیے جب چند دن بعد اس کی کال آئی تو میں نمبر سے شناخت نہیں کر سکا میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔۔۔“

”حضرت بھائی۔“ ایک ہلکی سی آواز آئی تو میں پہچان نہ سکا۔

”ہاں میں حضرت ہوں کون بات کر رہا ہے؟“

”آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں۔۔۔ شمس اللہ دین ہوں۔“

میں حیران ہوا تھا۔ ”تمہاری آواز بالکل نہیں پہچانی جا رہی ہے۔“

”میری تو آواز بھی نہیں لگی رہی ہے۔“ اس نے روتے لہجے میں کہا۔ مجھے کھٹکا ہوا۔

”کیا ہوا آخریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے۔۔۔ نور القسا کی دنیا سے بہت پیار تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔“

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ ”انا اللہ ہے وانا الیہ راجعون۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”مگر کیسے اس کی حالت تو ٹھیک ہو رہی تھی۔“

”بس مئی اللہ کی مرضی۔“ وہ رونے لگا۔ ”ہم بھی خوش تھے۔۔۔ مگر ایک دن پچھلے اس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ آج اس نے آخری سانس لی۔۔۔“ وہ اب زور و شور سے رونے لگا تھا۔

”شمس اللہ دین مت رو۔۔۔ مرد بنو یا۔۔۔“ میں اسے تسلی دینے لگا۔ اس وقت میں گھر میں تھا بیوی بچوں کے ساتھ رات کے کھانے کے بعد لی وی دیکھ رہا تھا۔ زریں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آہستہ سے اسے بتایا۔

”نور القسا کا انتقال ہو گیا ہے۔“

"اور۔۔۔" وہ بھی دنگی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں شمس الدین کو چپ کر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ چپ ہوا اور پھر بھرائی آواز میں بولا۔

"نصرت بھائی۔۔۔ اٹھ گواہ ہے۔۔۔ ابھی میں اسپتال میں اس کی لاش کے ساتھ ہوں اور میری جیب میں دس پچھپے نہیں ہیں کہ اسے ایس۔ اینس میں گھر لے جاؤں۔۔۔ ایک تختے سے کام پر نہیں گیا۔ صبح شام اس کے سرانے رہا۔ آپ میری پوزیشن کا اعتراف کر سکتے ہیں۔ ابھی تو لورائسا کو آخری آرام گاہ تک پہنچاتا ہے۔ میری جگہ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں تو آپ کو کال کر دی۔۔۔ اگر آپ کو یہ ملگا ہو۔۔۔"

"نہیں یاد۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تم ایک منٹ دو جن میں کال کرتا ہوں۔"

میں زورین کو دوسرے کمرے میں لا یا۔ یہاں کے سامنے اس قسم کی باتیں کرنا مناسب نہیں۔ میں نے زورین کو مختصر الفاظ میں شمس الدین کے بارے میں بتایا۔ "وہ مجھ سے توقع نگار رہا ہے کہ میں اس کے لیے کچھ کروں گا اس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کفن دفن تو کیا لاش گھر لے جانے کے لیے ایس۔ اینس کا کرایہ بھی نہیں ہے۔"

زورین نے جلدی سے کہا۔ "نصرت ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"میرے پاس وہی ہزار ہیں۔۔۔ وہ دسے آتا ہوں۔۔۔ آج کل کفن دفن بھی سستا نہیں ہے۔"

"ایک منٹ میرے پاس بھی کچھ رقم ہے۔" زورین نے کہا اور الماری سے دم لکال لایا۔ یہ کچھ نوٹوں پر مشتمل تھی اس نے گئی۔ "سات ہزار دو سو روپے ہیں۔۔۔ سو دے سے جوئی جاتے ہیں وہ میں ایک طرف رکھ دیتی ہوں۔"

میں سترہ ہزار روپے لے کر اسپتال کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں میں نے شمس الدین کو کال کر دی کہ میں آ رہا ہوں۔ اس نے بتایا۔ "ڈاکٹر نے لاش کو ٹولیکس تیار کر دیا ہے۔ لاش ابھی سرد خانے میں ہے۔ میں بھی وہاں ہوں۔"

"بس میں منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

شمس الدین مجھے سرد خانے کے باہر لے گیا۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوتی ہوئی تھیں۔ اس نے ملکی سی شلووار نہیں پہن رکھی تھی۔ وہ مجھے سرد خانے میں لے گیا۔ وہاں لورائسا کی لاش چھری سل پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر رو دیا تھا۔ میں اسے سلی دیتا رہا اور میری تعین کرتا رہا۔ پھر میں نے اسے رقم دی۔ "اب تم لیجے گا ڈی ریلیز

کرنا۔"

"میں ڈاکٹر سے اجازت نامہ لے کر آتا ہوں۔" شمس الدین نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اپنا کام کر دیا تھا اس لیے اب میں چلا ہوں۔ اس سے نیاں ہنسی کی اور کیا مدد کر سکتا تھا۔ اس لیے میں واپس چلا ہوا۔ گھر آ کر زورین کو بتایا تو وہ بھی المردہ ہو گئی تھی۔ اس رات ہم بہت بوجھل دل سے سوئے۔ رورہ کر خیالی آ رہا تھا کہ جب جوان لڑکی کی لاش گھر پہنچے گی تو شمس الدین کے گھر والوں پر کیا گزیرے گی؟ آگے دن بھی میں دفتر جاتے ہوئے المردہ تھا۔ پھر دفتر کی مصروفیت میں ذہن سے نکل گیا اور میں کام کر رہا تھا کہ زورین کی کال آئی۔ وہ جوان میں تھی۔

"نصرت ہم بے وقوف بنائے گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ دھوکے باز تھا۔۔۔ میں نے ابھی اخبار میں خبر پڑھی ہے۔ لورائسا نامی لڑکی کا سرکاری اسپتال میں گیسمر کی وجہ سے انتقال ہوا ہے۔ وہ لا وارت تھی کیونکہ اس کے روتا اسے داخل کر کے قاتل ہو گئے تھے اور لڑکی نے جو بتایا تھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ پولیس تحقیق کر رہی ہے اور لڑکی کی تہفیں ایک خیراتی ادارے نے کی ہے۔"

میں نے سر قیام لیا تھا۔ آج کے دور میں کوئی اتنی ویدہ دلیری سے آنکھوں میں دھول جھونک سکتا ہے میں نے سوچا ابھی نہیں تھا۔ دفتر سے ہانسی کے بعد میں اسپتال پہنچا تو وہاں تین افراد اور بھی موجود تھے جو اسپتال انتظامیہ سے جھگڑ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شمس الدین نامی شخص اس لڑکی کا بھائی بن کر ان سے لاکھوں روپے ہونڈ کر لے گیا۔ انتظامیہ کا ایک آدمی ان سے کہہ رہا تھا کہ یہ ان کی غلطی ہے اس میں اسپتال انتظامیہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ لڑکی لا وارت تھی اور شدید بیمار تھی۔ وہ سینے سے وہ اسپتال میں داخل تھی۔ جھگڑا بڑھ گیا کیونکہ شمس الدین ان لوگوں کو آزادانہ اسپتال میں لا کر لڑکی سے ملو اتار رہا تھا اور یہ اسپتال کے عملے کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ جھگڑا بڑھے گا یا ختم ہو جائے گا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا کیونکہ شمس الدین اپنا کام کر کے جا چکا تھا۔ اب وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ میں غصہ کی سانس لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔





محترم معراج رسول!  
السلام علیکم!

پرانے کاغذات سے مہاں صاحب کا ایک اور واقعہ نکل آیا۔ یہ روشن واقعہ لوگوں کی اصلاح کی خاطر میں بھیج رہا ہوں جو لوگ خدا کے حضور سجدہ کرنے کی بجائے شیطان کو اپنا مددگار بناتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو جائے گا۔

عفايت حسين حسيني  
(احمد آباد)

بزرگانہ انداز میں مخاطب کیا۔

”خادم کو عبدالمتان کہتے ہیں۔ میں حیدرآباد میں رہا ہے قلعہ کے قریب کھیتی میں رہتا ہوں۔“

”میرے پاس آنے کا سبب کیا ہے؟“

”اس سال میں میٹرک کے امتحان دے رہا ہوں میاں صاحب۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”مشتمل امتحان میں بس گرتے پڑتے پاس ہوا تھا اس لیے آپ دعا کر دیں کہ اب سالانہ امتحان میں ناکام نہ ہوں“ عبدالمتان نے سوڈا نائٹ میں درخواست کی ”اگر ناکام ہو گیا تو پھر تعلیم کا سلسلہ بھی جاری نہ رکھوں گا۔“

”سلسلہ قطع ہو جانے کا کوئی سبب بھی ہوگا؟“ میں نے اس کے چہرے کی نفوذ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے سر سے والد صاحب کا سایہ اٹھ گیا ہے میاں صاحب۔ ماں کے علاوہ ایک دن سال کی بہن ہی ہے۔“ عبدالمتان نے دک-دک کر بات جاری رکھی۔ ”والد صاحب کے مرتے کے بعد ان کے دفتر والوں نے جو رقم دی تھی اسی سے اولے پانے گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ میں نے ایک جنرل اسلور میں شام کے اوقات میں ملازمت کر دی ہے۔ سالانہ امتحان میں پاس ہونے کی صورت میں والد صاحب کے دفتر والوں نے لکڑی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ناکام ہو گیا تو مجھے جنرل اسلور پر تنج سے رات تک ایڑی دینی ہوگی۔۔۔۔۔ تعلیم کا سلسلہ جاری نہیں رکھوں گا۔“

”تمہاری بہن کیا کرتی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ

حسب معمول میں مصر کی قنصل سے فارغ ہو کر

بحرے میں داخل ہوا تو سکندریہ میں پہلے سے موجود تھا۔ میرا روزمرہ کا معمول بھی یہی تھا کہ جب میں اپنے تخت پر بیٹھ جاتا تو سکندریہ سے ایک دو باتیں کرنے کے بعد ہی اس بات لی اجازت دیتا تھا کہ وہ ضرورت مندوں کو ترسیب دہا

لندہ میں بھیجا شروع کرے۔

آنے والے ماہیتوں میں عورتوں کے ضمن میں میری خاص ہدایت تھی کہ انھیں مغرب سے پہلے فارغ کر دیا جائے۔ سکندریہ ای ہدایت کے غائب نظر مل کر نہ کا عادی تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میرے عقیدت مند بھی سکندریہ کی عزت کرنے لگے تھے اس لیے اگر کسی مرد کے غیر پر کسی عورت کو مغرب کے پیشتر فارغ کرنے کی ہدایت کے غائب نظر میرے میں بھیجا جاتا تو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا تھا۔

میرا حال میں نے تخت پر بیٹھنے کے بعد سکندریہ سے آنے والوں کی تعداد کے بارے میں اور ایک دہائی کی جس کے بعد سکندریہ لے جا کر بیٹھک میں جا کر ضرورت مندوں کو اندر بھیجا شروع کیا۔ پہلا نمبر ایک نوجوان کا تھا جس کی عمر بھی کوئی سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ بس اوسط درجے کا نظر آ رہا تھا۔ بحرے میں داخل ہو کر اس نے مجھے بڑے ادب سے سلام کیا پھر فرش پر گھسی ہوئی چائے پر بیٹھ گیا۔

”تمہارا نام کیا ہے برخواستہ؟“ میں نے اسے

پوچھا۔

”میرا نام کیا ہے برخواستہ؟“ میں نے اسے

پوچھا۔

”میرا نام کیا ہے برخواستہ؟“ میں نے اسے

پوچھا۔

”میرا نام کیا ہے برخواستہ؟“ میں نے اسے

کے اختیار میں نہیں۔۔۔ ہوتا ہی ہے جو اسے منظور ہو لیکن صدقِ دل سے جو دعا مانگی جائے وہ بھی اسے قبول کرنے سے گریز نہیں کرتا۔" میں نے عبدالمنان کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ "میں تمہیں ایک وظیفہ بتا رہا ہوں، اسے کم از کم چالیس روز تک بلا تاخیر پابندی سے پڑھتے رہنا۔ میں بھی تمہارے حق میں دعا کروں گا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری صحت وایمان ٹھوس جائے گی۔"

"میں صاحب....." عبدالمنان نے پیلو بدل کر شرمندگی کا اظہار کیا۔ "میں نے قرآنی تعلیم نہیں حاصل کی اس لیے وظیفہ کیسے یاد کروں گا۔"

"یہ بھی انسان کی بد قسمتی ہے کہ وہ دنیا کے بیش و عشرت کے لیے تو مارے پاؤں تلک لیتا ہے لیکن آخرت کے لیے اس کتاب کو سینے سے نہیں لگاتا جو قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ بہر حال وظیفہ آسان ہے جو تم یاد کر سکتے ہو..... اوتھ اوتھ اُتر گیا وہ کیا وہ یا رسولہ و شریف ہو درمیان میں گیا وہ اُٹھ پھر "رب زدنی علک (اے رب میرے علم کو زیادہ کر) پڑھنا ہے۔" میں نے عبدالمنان کو یاد کراتے ہوئے کہا۔ "روز رات کو سونے سے قبل اسے پابندی سے

بھی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔"

"جی نہیں۔۔۔ حالات کی گلی نے گھر کی چار دیواری تک قید کر رکھا ہے۔" اس بار عبدالمنان نے تھوڑے وقفے سے اپنی کیفیت بتائی۔ "ماں نے کہہ دیا ہے کہ آنے والے وقتوں کے پیش نظر آنت کے لیے کچھ دلم بھی جوڑنی ہوگی۔۔۔ میری ناکالی کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس غریب کو بھی آس پڑوس میں گھر کے اوپری کام کرنے کی ملازمت کرنی پڑے جو میری عزت گوارا نہیں کرے گی اسی لیے کسی کے مشورے پر آپ کی قدم پوی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی نظر کرم ہوگی تو میرا مستقبل بھی سنور جائے گا۔"

عبدالمنان کی محسوس باتیں میرے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ سترہ سال کی عمر میں قدرت نے اس غریب کو آپ کے سایہ سے محروم کر کے جن امتحان سے دوچار کیا تھا وہ ہر اعتبار سے ایک آزمائش تھی۔ حجرے میں کچھ دیر خاموش رہی میں نے آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا پھر وہ بارو آنکھیں کھول کر عبدالمنان سے کہا۔

"بد خود دار..... سادہ قانون اٹھ ہوتے ہیں۔ لوح محفوظ پر ازل سے جو رقم کر دیا جائے اس کو تبدیل کرنا انسان





پڑھنا۔۔۔ خدا نے چاہا تو وہ جیسیں کا سیانی سے ہم کنار کرے گا۔ ایک بات اور یاد رکھو۔۔۔ مجھ سے بڑے ابرہہ ملے رہتے کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں اسے پورا کرنے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔"

عبدالمنان نے مجھے شکراۃ نظروں سے دیکھا پھر ادب سے سلام کر کے دخصبت ہو گیا۔ میں یہاں چھرمین کے لیے عرض کروں کہ مراقبے کے دوران میں مجھے محض ایک اشارہ ملا تھا کہ عبدالمنان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی ورنہ۔۔۔ طیب کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتا۔ جو حقیر و فقیر ہو کر بھی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں وہ محض اپنی دکان چمکالے کی خاطر ضرورت مندوں کی جیب پر ڈاکا مارتے ہیں۔ قادر مطلق ایسے رنگے سیاروں کو بھی معاف نہیں کرے گا جو اس کی حقوق کو فریب میں مبتلا کر کے اپنی روزی کماتے ہیں!

عبدالمنان کے جانے کے بعد دوسرے خبر پر ایک برقع پوش خاتون نے حجرے میں قدم رکھا۔ مجھے سلام کرنے کے بعد اس نے از خود حجرے کا نقاب الٹ دیا! میں نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی عمر کا تخمینہ میں اور فطرس کے درمیان لگا دیا تھا۔

"کیسے ذمت کی بی بی؟ میں نے اس کے پیچھے کے بعد حسب معمول لحاظ انداز میں سوال کیا۔

"بھئی بات یہ عرض کروں میاں صاحب کہ میں حیدر آباد کی رہائشی نہیں ہوں۔" اس نے سنبھل کھنچ کر گفتگو شروع کی۔ "لیصل آباد سے آئی ہوں۔ کسی نے یہی کہا تھا کہ بس آپ تک بچے جاؤں تو میری سہری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

"ہر حاجت مند یہی کہتا ہے لیکن یہاں نہیں ہے۔" میں نے سمجیدگی سے کہا۔ "ہوتا وہی ہے جو شیست ایز دی کو منکور ہے؟ میں بھی اسی کے دربار سے ہاتھ جوڑ کر مانگا ہوں۔ اس کی مرضی سے چاہے لو اور دے۔"

"لب میں اتنی دور سے آپ کے در سے آس لگا کر آئی ہوں تو خالی ہاتھ نہیں جاؤں گی۔ خاتون جنہوں نے میرے در یافت کرنے پر اپنا نام حسہ بی بی بتایا تھا پہلو بدل کر اپنی اہمیت کا اظہار کر دیا۔ "کٹھ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ آپ میرے حق میں دعا کرتے کی خاطر جو نذرانہ طلب کریں گے میں اس سے زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔"

"ایک بات میری بھی سن لو حسہ بی بی۔" میں نے

پہلو بدل کر بے حد صاف گوئی سے عرض کیا۔ جس کام کی بنیاد لائی سے وابستہ ہو وہ کسی حسب تو فیلی پورا نہیں ہوتا۔ نذرانہ کے بارے میں تم سے جس نے کہا ہے، غلط بیانی کی ہے، لیکن دین کا کام محض دیا میں ہوتا ہے۔ اس کے دربار سے مانگنا ہے تو پھر دل کے سارے میل دور کرتے پڑتے ہیں۔ ریا کاری کسی کام نہیں آتی۔"

"میں سحانی جانتی ہوں میاں صاحب۔" حسہ نے بات بنانے کی کوشش کی۔ میں نے نذرانہ کی بات اس لیے کی تھی کہ کسی کا مقصد پورا ہو جائے تو بعد میں غریب میں نذر و نیاز بھی دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسی دستور ہے۔"

"میرے پاس وقت کم ہے حسہ بی بی!" میں نے اس بار قدرے بے رنگی سے کہا۔ "باہر خشک مٹی اور بھی حاجت مند اپنی باری کے منتظر ہوں گے۔ تم کھل کر اپنے آنے کا مقصد بیان کرو۔"

"مجھ سے کوئی بھول ہو گی تو معاف کر دیں میاں صاحب۔" حسہ ایک دم ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ "میں پہلے ہی تعبیر بنی تھی ہوں۔ آپ نے بھی نظریں پھیر لیں تو پائلن ہی در بدر ہو جاؤں گی۔ قادرے بھی لات مار کر الگ کر دے گا۔"

"یہ قادرے کون ہے؟" حسہ موم کی طرح نرم پڑ گئی تو میں نے سمجیدگی سے سو یافت کیا۔

"نام تو اس کا قدیر احمد ہے لیکن پیار سے سب اسے قادرے ہی کہتے ہیں۔" حسہ نے کسمسہ کر اپنی چٹا آواز کیا۔ "چار سال پہلے میری مالا بیٹا تھا لیکن اب ایسی آنکھیں دکھاتا ہے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ آپ ہی بتائیں میاں صاحب۔۔۔ اگر قدرت ہی کو منظور نہ ہو تو پھر میں غریب کیا کر سکتی ہوں۔"

حسہ روانی میں اپنا جملہ کہہ گئی جب احساس ہوا تو نظریں جھکا لیں۔ میں اس کے آنے کا مقصد سمجھ گیا۔ "قدیر احمد کرتا کیا ہے؟" میں نے وید وادانتہ ایک جالوی سوال کر لیا۔

"جدی پستی ٹھیکیدار ہے۔" حسہ نے کسمسہ کر کہا۔ "اوپر والے نے بھی پچھڑ پھاڑ کر دے رکھا ہے مٹی کو بھی ہاتھ لگاتا ہے تو وہ سونا بن جاتی ہے اس کے کارندے دن بھر خون پینا ایک کرتے ہیں۔ خود وہ شام ڈھلے حویلی نما مکان کے سامنے نیم کے جھاڑتے تخت پر لو لہوں کی طرح بیٹھ کر دن بھر کا حساب کرتا ہے۔ ایک ایک پیسے پر نظر رکھتا ہے۔ کسی کی

بھول چک بھی صاف نہیں کرتا اور۔۔۔۔۔"

"تم بتا رہی تھیں کہ چار سال سے قدرتی آلودگی سے تھک چکی ہیں۔۔۔۔۔" میں نے اصل مقصد کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی تو سنبھل کر بیٹھ گئی۔ نظریں جھکا کر دہلی زبان میں اپنے آنے کا دعائیہ بیان کر دیا۔

"قادر سے میری شادی کو چار سال ہو گئے ہیں صاحب لیکن ہماری بکلی ہری نہیں ہوئی۔ اسی لیے آپ کی چوکت پر بڑی آس لگا کر آئی ہوں۔"

"کسی خالی پلہڈی ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا ہو گا؟"

"سارے جن جن کر چکی ہوں لیکن شاید نئی چھتری ڈالنے کی کو۔۔۔۔۔"

"نہیں بی بی۔۔۔۔۔ نہیں" میں نے حسد کو ٹوکا۔ "اس کے نظام میں کبھی کوئی بھول پاکی نہیں ہوتی۔ یہ بھی جگہ ہے کہ اس کے علم کے بغیر کوئی سکھاتا بھی اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتا۔"

"میں نے بھی قادر سے کو بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کھنڈ کے دلی میں بامددستوں نے یہ بات جینا دلی کہ میرے اندر ہی کوئی کمی ہے۔" حسد نے عاجزی کا اظہار کیا۔ "دو چار گھر کی عورتیں بھی اپنی لڑکیوں کے ہاتھ پہلے کرنے کی خاطر قادر سے پر نظر میں عسائے بیٹھی ہیں۔ آج میرا کاٹا درمیان سے نکل جائے تو کل وہ قادر سے کورشت دینے میں دیر بھی نہیں کریں گی۔"

"میں تمہاری بھوری سمجھ گیا ہوں بی بی۔" میں نے حسد سے بھڑکی کا ہر کرتے ہوئے تسلی دی۔ "تم اپنی دور سے چل کر آئی ہو تو میں تمہیں پہلی ہاتھ دالیں بھی نہیں لٹاؤں گا۔ آج مشکل ہے اور تمہارا مطلوبہ تعویذ میں جھرات کو تیار کروں گا۔ تم جھوٹا پیچہ کو کسی وقت بھی آکر لے جانا لیکن ایک بار پھر یہ یاد کرو کہ ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہو اس لیے تم بھی اللہ سے نہایت عاجزی اور انکساری سے ہاتھ اٹھا کر برا بدعا مانگتی رہنا۔"

حسد چلی گئی تو میں نے سکندر علی کو بلا کر دوسرے ضرورت مندوں کو بلا کر کو کہا۔۔۔۔۔ یہاں ایک بات یہ بھی عرض کروں کہ حسد کی موجودگی میں، میں نے اس کے بارے میں مراقبہ بھی کیا تھا۔ جو اشد سے لے کر وہ بھی کیا تھے کہ حسد بی بی اور اس کی اولاد کی خواہش کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ ضرور تھی جس کے درمیان سے ہٹ جانے کے بعد ہی اس کی اور قدرتی آلودگی پوری ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔ وہ

رکاوٹ کیا تھی؟ اس بارے میں مجھے کوئی واضح اشارہ نہیں ملا تھا۔

اس رات میں سوتے کے لیے لیٹا تو سکندر علی حسب معمول میرے لیے پانی کا جگ بگور گلاس رکھنے کی خاطر آیا۔ یہ اس کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں موند لیں، کچھ دیر تک میں حسد بی بی کے بارے میں طے والے اشاروں پر غور کرتا رہا۔ خاص طور پر میرا ذہن اس رکاوٹ کے لیے ڈھلی گھوڑے دوڑانا رہا جس کی وجہ سے حسد اور اس کے شوہر کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی لیکن کوششیں بسیار کے باوجود جب کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکا تو میں نے حق بچھا کر سونے کا ارادہ کیا تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے خواب گاہ میں کوئی ذی نفس بھی موجود ہے۔

فوری طور پر میرے ذہن میں ارسلان نائی جن کا خیال ابھرا جو دہلی والے حضرت خواجہ کے حوالے سے بھی اکثر و بیشتر میرے کام آتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ جس عرصہ میں تھا اس میں بارہا آچکا تھا اس لیے میں نے مسکرا کر حسب معمول بڑی اہمیت سے دریافت کیا۔ "اس وقت کیسے صحت کی برخوردار؟"

"سب سے بیشتر اس بات کی معذرت چاہوں گا محترم کہ اس وقت کل ہوا۔" ارسلان نے ادب سے جواب دیا پھر مسکرا کر بولا۔ "میں یہ محسوس کر کے آیا ہوں کہ شاید آپ کو خا کسار سے کوئی خدمت درپیش ہو؟"

"میں انکار نہیں کروں گا برخوردار۔" میں نے بے تکلفی سے کہا۔ "ایک گھنٹہ ہے جلد وہ کر ڈھن میں الحمد للہ ہے۔"

"سمجھ گیا۔ آپ شاید حسد بی بی اور قدرتی آلودگی کے بارے میں دریافت کرنا چاہتے ہیں۔" ارسلان نے سمجھدگی سے کہا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس شخص میں خادم صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ حسد کو جو مشکل درپیش ہے اس میں حسد بی بی سے زیادہ قدرتی آلودگی ایک قطعی کو دخل ہے جو اسے کی رکاوٹ بن گئی ہے۔"

"اس قطعی کی کوئی تفصیل بھی ضرور ہوگی۔۔۔۔۔؟"

"تھا ہی لیکن آپ جانتے ہیں کہ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جس کے سلسلے میں ہمیں ضرورت سے زیادہ زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"تمہارے اس جواب سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں؟"



"حضرت خواجہ کی جوتیوں کے خصل مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کے پیش نظر فی الحال بھی عرض کروں گا کہ آپ حسد کو اس کی خواہش کے مطابق تعویذ لکھ دیں یہ بھی تاکید کر دیں کہ قدر احمد کو اولاد کے سلسلے میں کسی خوشخبری کے لیے چار پانچ ماہ انتظار کرنا لازم ہے اور اس عرصہ میں وہ کوئی لفظ قدم نہیں اٹھائے گا۔"

"فقط قدم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی تو ارسلان نے کچھ توقف سے دہلی زبان میں پھر اپنی مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک تعویذ قدر احمد کے سلسلے میں بھی لکھ کر حسد بی بی کے حوالے کر دیں۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کر دیں کہ وہ پانی یا شربت میں گھول کر شوہر کو اس طرح پلا دے کہ اسے پتا بھی نہ چلے ورنہ سارا کھیل خراب ہو سکتا ہے۔"

"اوہ....." میں نے ارسلان کی تجویز پر ایک تمبیہ افندہ کرتے ہوئے کہا "گویا جو فطری حسد کے آڑے آ رہا ہے اس کا کچھ نہ کچھ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے۔۔۔" ارسلان نے اس یاد بھی کل کر جواب اپنے سے گریز کیا تو میں نے دوسرے رخ سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"نیک ہے میں تمہاری تجویز اور قدر احمد کے لیے بھی ایک موثر تعویذ لکھ دوں گا لیکن تم حسد کے سلسلے میں کیا کہہ سکتے؟"

"میں سمجھا نہیں یہاں صاحب....." ارسلان چڑکا۔  
"میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ جو فطری قدر احمد سے سرزد ہوئی، کیا کسی نہ کسی زاویے سے حسد بھی اس کی ذمہ دار ٹھہرائی جاسکتی ہے؟"

"حضرت خواجہ کی خاص نظر کرم آپ پر ہے تو پھر میری کیا حقیقت؟" ارسلان نے بڑی انکساری سے مگر سنبھل کر جواب دیا۔ "ویسے یہ بات دنیا جانتی ہے کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی۔"

میں ارسلان کی مجبوری کے علاوہ اس کے جوابات پر بھی بطور خاص غور کر رہا تھا چنانچہ جب اس نے ایک ہاتھ سے تالی نہ ہٹنے والی مثال کے ساتھ حضرت خواجہ کا حوالہ بھی دیا تو مجھے تعجب ہوا قدرتی امر کا اس لیے کہ مراقبہ کے بعد مجھے جو اشارے ملے تھے اس میں کم از کم ایسی بات واضح طور پر نظر نہیں آتی تھی جس کی بنیاد پر میں حسد کے کردار میں کوئی عیب محسوس کر سکتا، میں اسی نکتے پر غور کر رہا تھا جب

ارسلان نے دبے لہجے میں کہا۔  
"خاکسار کا وہ مطلب نہیں تھا میرے محترم جو آپ کے ذہن پر غور ہے۔ مرد اپنی برتری کے احساس کی وجہ سے عورت کو خود پر مادی نہیں ہونے دیتا۔ یہ بھی درست ہے کہ وہ جس عورت کو دل و جان سے چاہے اور اس کے حسن پر فریفتہ ہو تو ہرگز اسے بھی کام لیتا ہے لیکن عورت کی زبان اگر تیز سے تیز تر ہوتی جائے تو مرد کی برداشت کا پیمانہ گہر چ جو کر پھٹک بھی جاتا ہے۔ حسد کے سلسلے میں بھی اس کی زبان اور ذہن چڑھ کر باتیں کرنے کا کچھ مسئلہ درپیش تھا جیسا کہ قدر احمد سال دو سال سے برداشت کرنا رہا۔۔۔ پھر جو کچھ درمیان میں آڑے آئی اس کی بنیاد سے قاعدہ افشا کر کسی نے ایسی ڈگڈگی بھائی کہ سب ہی بے بس ہو کر رہ گئے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بھی یقین ہے کہ آپ نے اگر خدا کے حکم سے نظر کرم کر دی تو حسد کی ابھی ڈور بھی سلج جائے گی۔"

کچھ دیر بعد ارسلان چلا گیا تو میں نے حق بھائی پھر کروٹ لے کر آنکھیں سوند لیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ ارسلان کے جانے کے بعد بھی حسد بی بی کا مسئلہ خاصی دیر تک میرے ذہن میں پھرنا رہا۔ خاص خود پر جو اشارے دہلی زبان میں ارسلان نے دیے تھے وہ بھی میری درجنائی کے لیے یقیناً مفید تھے لیکن ایک ایسی بات جو میرے لیے بطور خاص قابل توجہ تھی وہ اس لائق کی تھی جس نے قدر احمد اور حسد بی بی کے درمیان ہونے والی رسائی سے قاعدہ افشا کر ڈگڈگی بھائی شروع کر دی تھی۔ ارسلان نے ڈگڈگی کا حوالہ بھی ایسے انداز میں دیا تھا جس کے کئی پہلو نکلتے تھے۔ بہر حال خاصی دیر تک ان ہی باتوں پر غور کرتے کرتے میں سو گیا۔

میں نے حسد بی بی کو تعویذ کے سلسلے میں جمعہ یا منگل کو آنے کا کہا تھا لیکن جب وہ نہیں آئی تو میرے ذہن میں بھی خیال ہوا کہ یا تو قدر احمد آ کر اسے سمجھا بجا کر لے گیا ہے یا پھر اس نے بہرہ فقیر کے پکڑوں میں وقت خراب کرنے کی بجائے کسی اور راستے پر قدم اٹھانے کی ٹھان لی ہے۔ میں نے بہر حال حسب وعدہ اس کے لیے ایک آزمودہ تعویذ جبروت کو معشاء کی نماز کے بعد لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

اس دن التوا رہا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر حسب معمول جواڑے میں آ کر بیٹھا تو کچھ دیر بعد سکندر علی بھی آ گیا۔ میں اخبارات کی الم غم خبریں پڑھنے کا عادی نہیں تھا

اس لیے سکندر ملی نے بطور خاص از خود اتوار کے دن مجھے چھوڑے جلتے کی خاص خاص خبریں سنانا اپنا معمول بنالیا تھا۔ ہفتی دوم وہ خبریں سنانا رہتا تھا میں آگن میں ہی کیاری کے پلوؤں کو دیکھتا رہتا۔ وہ کیاری بھی سکندر ملی نے ہی بنائی تھی۔ لیکن کو بانی رہا اور تراش غراش کا سارا کام بھی وہیے حد تک ہی سے کرتا تھا۔ ان پلوؤں میں خاص طور پر موتیا کا پورا تھا جس کی شکل اب مندرجہ تک پہنچ گئی تھی۔ موسم کے اعتبار سے اس میں کلیاں بھی پھونکنے لگی تھیں۔ میری نظریں اس وقت بھی اسی پودے پر مرکوز تھیں جب کسی نے دروازے پر دستک دی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اتوار کے دن میں کسی ضرورت مند سے نہیں ملتا تھا۔ یہ بات میرے عقیدہ مندوں کو معلوم تھی۔ چنانچہ دستک کی آواز پر سکندر ملی کے علاوہ میں بھی چونکا۔ ایک خیال یہ بھی گذرا کہ ممکن ہے کہ میرے چڑی اندال احمد جو جلتے دو جلتے میں ایک آدھ چکر ضرور لگاتے تھے۔ ان سے میری یاد دل کی ایک خاص چیز یہ بھی تھی کہ ان کے گھر پر فون موجود تھا جس سے میں بھی بھیجی استعارہ کر لیا کرتا تھا۔ لیکن کوئی خاص آدمی مجھے فون کرتا تو اندھیل احمد کا بیٹا احمد مجھے بلانے آ جاتا۔ ہاپ بیٹے دونوں ہی نہ صرف نہایت مہذب اور منسار تھے بلکہ چاندی و دیگی میں بھی ہر طرح سے میری دیکھ بھال کا پورا خیال رکھتے تھے۔

”اس وقت کون آگیا؟“ سکندر ملی نے اٹھتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا تھم ہے میاں جی کوئی ضرورت مند ہو تو اسے ٹال دوں۔۔۔۔۔“

”دیکھ لو کون ہے؟“ میں نے جمیدگی سے کہا۔ ”مگر تم سمجھو کہ وہاں کسی سکتی ہے تو اسے اندر ہی بلا لیتا۔“ سکندر ملی چلا گیا تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ دو منٹ کے بعد اس نے واپس آکر مجھے حنہ بی بی کے آنے کی اطلاع دی تو میں ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گیا۔ قارئین کو بھی یہ بات بتاؤں تو معلوم ہے کہ میں جبرے میں بھی خواتین کو اول وقت ہی فارغ کر دینے کا عادی تھا۔ پہلے بھی میں نے کسی خاتون کو گھر بلانے یا آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ بہر حال حنہ بی بی کے سلسلے میں چونکہ ارسلان بھی مجھ سے وابستہ کر چکا تھا اس لیے میں نے فوراً ہی کوئی فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا۔

”وہ تنہا آئی ہے میاں جی اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو مجھ کو مل کر ادھر ہی بیٹھا دوں۔“ سکندر ملی نے میری

خاموشی کو غائبانہ نیم رخا مستی جان کر پوچھا تو میں نے ہاؤں ناخواستہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

پندرہ منٹ بعد میں نے جبرے میں قدم رکھا تو حنہ بی بی میری پٹھری میں نے جمیدگی سے اسے قاطب کیا۔

”بی بی۔۔۔۔۔ میں اتوار کے دن کسی سے نہیں ملتا۔۔۔۔۔ تمہیں میں نے بعد پانچ گھنٹے کی تاکید کی تھی۔“

”میں ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتی ہوں میاں صاحب۔“ حنہ بی بی نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اتوار کے دن آنے کی وضاحت بھی کر دی۔ ”کچھ ضروری باتیں تھیں جو میں۔۔۔ آپ کو تفصیل سے بتانا چاہتی تھی اس لیے آج بڑا آئی اگر آپ ناراض ہوتے ہیں تو بھر کئی۔۔۔۔۔“

”اب آگئی ہو تو میں تمہیں خالی ہاتھ واپس بھی نہیں کر دوں گا۔“ میں نے تیار شدہ تعویذ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کو اگر ممکن ہو تو کسی ہرے جبرے کا در درخت کے نیچے اس طرح دبا دیا کہ نہ کسی کی نظر پڑے نہ ہی ہے حتمی کا کوئی اندیشہ ہو۔“

”جیسا آپ کا حکم ہے ویسا کروں گی میاں صاحب۔“ پہلا تعویذ حنہ بی بی کے حوالے کرنے کے بعد میں نے دوسرا تعویذ نکالا جو ارسلان کے اشارے پر قدر احمد کے لیے تیار کیا تھا۔ یہ ایک اور تعویذ ہے جو میں نے خاص طور پر قدر احمد کے لیے لکھا ہے۔ میں نے ہدایت کی۔ اسے پانی یا شربت میں گھول کر اس طرح اسے پلا دینا کہ اسے کس قسم کا پتا نہ ہو۔“

”یہ کام بھی میں آسانی سے کر لوں گی میاں صاحب لیکن۔۔۔۔۔ کچھ باتیں اور ہیں جو میں آپ کو تفصیل سے بتانا چاہتی ہوں۔ اس لیے اتوار کے دن آپ کو زحمت دینے آئی ہوں۔“

”تم شاید یہ بتانا چاہتی ہو کہ گزشتہ دو سال سے قدر احمد اور تمہارے درمیان پیدا ہونے والے کھنڈ کی کیا وجہ ہے؟“ میں نے ارسلان کی گول مول باتوں کی روشنی میں ایک ممکنہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے حنہ بی بی کو متاثر کرنے کی خاطر کہا۔ ”کوئی فتنہ ہے جو تم دونوں کے درمیان آڑے آگیا ہے؟“

”آپ نے اصل بات کی جڑ کو پکڑ لیا ہے میاں صاحب۔“ حنہ بی بی نے چونک کر جواب دیا پھر اپنی نفرت



کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "اس جذبات نلتے کا نام نور جمال ہے لیکن قادرے سے بڑے لالہ سے نور جمال کہہ کر لگاؤ کی باتیں کرتا ہے۔"

"یہ نور جمال غالباً تمہارے قادرے کی کوئی قریبی عزیز ہے؟"

"نہ ہوتی تو میرے سامنے بیسی نکال کر قادرے سے کوئی گل بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔" اس بار حسہ بی بی نے اپنی زبان کی تیز طراری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ "قادرے کی خالہ کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اس حرافہ کی مستیابی جوتوں تلے رگڑنے میں دیر بھی نہ کرتی۔۔۔۔۔۔ ساری جوانی کا تشنگال کر رکھتی اس کی پھیلی پر۔"

"بری بات ہے حسہ بی بی۔" میں نے اسے سرد لاش کی۔ اپنی زبان پر قابو رکھنے کی عادت ڈالو۔ تم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ کسی عورت کی زبان سے بھلے نہیں کہتے۔"

"مم۔۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں میاں صاحب لیکن دی بس کی گانٹھ بھی ہے۔"

"ایک بات اور معلوم کرنا چاہوں گا۔" میں نے ارسلان کی گھٹی ہوئی ہاتوں کی روشنی میں حسہ بی بی کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر بے حد سنجیدگی سے دریافت کیا۔ "کیا تم نے قدیم احقر کو اپنے قابو میں کرنے یا نور جمال اور اس کے درمیان جدائی پیدا کرنے کی خاطر کسی تعویذ گنڈے کرنے والے سے بھی رابطہ قائم کیا تھا؟"

"میرا انکار نہیں کروں گی۔" حسہ بی بی نے کچھ توقف سے بدستور زہر بھرے لہجے میں اتر کر کہا۔ "اے سہاگ کو بد قرار رکھنے کی خاطر میں نے جو جن کے وہ نیکی پھنتری والا بھی جانتا ہے۔۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔۔ میں نے نہیں کی تھی۔ نیکیتے اور تعویذ گنڈوں کا کام بھی پہلے نور بانو یا اس کے گھر والوں نے شروع کیا تھا۔۔۔۔۔۔ میں خاموش بیٹھی تماشا دیکھتی رہتی تو شاید وہ کم ذات لوگ کامیاب بھی ہو جاتے۔"

"قسمت میں ایک ہمارا کاتب تقدیر کی جانب سے جو رقم کروایا جائے وہ اٹل ہوتا ہے۔ کوئی تعویذ یا گنڈا کسی کام نہیں آتا۔"

"میاں صاحب۔۔۔۔۔۔" میرا جواب سن کر حسہ بی بی نے اپنی تاخیر پکاری کی بناء پر دلی زبان میں کہا۔ "اگر پورے والے کا لکھا اٹل ہے تو پھر آپ کے تعویذ بھی کیا کر سکیں گے؟"

"میرے تعویذ اور دعا میں نیک مقصد اور صرف اور صرف اس ذوالجلال والا کرام کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں بی بی۔۔۔۔۔۔ اس کے جوش میں کسی سائل کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتا۔۔۔۔۔۔" اس بار میں نے قدرے خشک لہجہ اختیار کیا۔ "تم نے بھی پہلی ملاقات میں یہی کہا تھا کبھی کسی بزرگ یا اہل دین کے فریڈے کی بھول نہ کرنا۔"

جواب میں حسہ بی بی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں ایک بار بھر معافی کی درخواست کروں گی میاں صاحب۔ آپ بس کچھ ایسا کریں کہ میرا قادرے مجھے واپس مل جائے۔۔۔۔۔۔ اس کے سوا مجھے کچھ اور نہیں چاہیے۔۔۔۔۔۔"

"اس کے لیے تمہیں خدا پر توکل کرنا پڑے گا جو سزا اور جزا کا مالک ہے۔ صبر و ضبط اور برداشت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔" میں نے حسہ بی بی کی آنکھوں کو نشانہ بناتے ہوئے دیکھ کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "اس مالک دو جہاں نے بندوں کی قسمت میں جو لکھ دیا وہی اٹل ہے۔ انسان زندگی میں جو عمل کرتا ہے اس کا مکمل اختیار بھی اسے محض اس لیے دیا گیا ہے کہ قدرت کو اس کی آزمائش قصود ہے۔ نیکی اور بدی کے فرشتے شب و روز ہماری ایک ایک نفس و حرکت بلا کم و کاست رقم کرتے رہتے ہیں۔ اسی کی روشنی میں ہر روز قیامت جنت و جہنم کا فیصلہ بھی صادر ہوگا۔ دنیا میں جو نا عاقبت اندیش ہیں وہ تقیر اور تعویذ گنڈا کرنے والے تقدیر کے لکھے کو بدلنے کا دعویٰ کرتے ہیں روز قیامت ان کا انجام بھی قابل ہمت ہوگا اس لیے اب تم تعویذ گنڈوں کے لیے جان لوگوں سے دور رہو جو محض دولت پسینے کے لیے اپنی طاقت کے ساتھ ساتھ بے گناہ ضرورت مندوں کو بھی غریب میں جلا کرتے ہیں۔ اپنی زبان پر بھی قابو رکھنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔ خدا نے چاہا تو تمہاری سر ہو سکتی ضرور پوری ہوگی۔ اس لیے کہ اس کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں ہے۔"

"آپ نے جیسا کہا ہے اب میں ویسا ہی کرنے کی کوشش کروں گی۔" حسہ نے مجھ سے وعدہ کیا پھر دونوں تعویذ لے کر رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے میں نے احتیاطاً حسہ بی بی کو اپنا پتہ لکھوا دیا۔ یہ تاکید بھی کرائی کہ اگر کوئی قابل ذکر بات ہو تو وہ مجھے فوری طور پر بذریعہ ایک آگاہ کر دے۔۔۔۔۔۔"

دوسرے روز سے میں حسب معمول اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے میرے گھرے میں روزانہ پندرہ بیس حاجت مند آتے جاتے ہیں اس لیے ہر

قابل ذکر بات میرے علم میں نہیں آئی جسے جان کرنا ضروری ہے لیکن اس کے بعد حالات نے عجیب انداز میں جبرخ اختیار کیا اس کی تفصیل بھی ضروری ہے۔

اس روز مغرب کی نماز میں نے حسب معمول اپنے حجرے میں ادا کی۔ نماز کے دوران میں سکندر علی اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ میری عبادت میں کوئی غلطی نہ پیدا ہو۔۔۔۔۔ نماز ادا کرنے کے بعد میں اٹھا تو حجرے میں ایک بوز جا شخص اس انداز میں سر جھکانے بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ سکندر علی نے اس سائل کو کب اور کن حالات میں آنے کی اجازت دی مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میں نے براہ راست اس بوز سے کوئی خطاب کرنے کے بارے میں سوچا علی تھا کہ اس نے چہرہ اٹھا کر بڑی مصیبت سے کہا۔

”میرے محترم۔۔۔۔۔ میں ادھر سے گزر رہا تھا تو خیال آیا کہ کچھ دقت آپ کی صحبت میں بھی گزرا ہوں۔ آپ اپنا کام جاری نہ کریں۔ میں مل ہونے کی گستاخی نہیں کروں گا۔“ ”خیر خود دار۔۔۔۔۔“ میں نے اور سلاطین کو پہچان کر کہا۔ ”تمہاری آمد بھی خالی از حیت نہیں ہوتی، خاص طور پر حجرے میں تم جب بھی آتے ہو اس کی پشت پر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جو میری دہشتناکی بھی کرتا ہے۔“

”آپ مجھے گھبرا کر رہے ہیں میرے عزیز۔۔۔۔۔ اور سلطان نے انکساری سے جواب دیا۔ ”چہ نسبت خاک دراما عالم پاک“

اور سلطان سے ایک دو بات کرنے کے بعد میں نے سکندر علی کو بلا کر حاجت مندوں کو حجرے میں بلانے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس بار پہلے نمبر پر جو شخص احمد آیا وہ اوجیز عمر کا تھا۔ حجرے میں آنے کے بعد اس نے مجھے سلام کیا پھر میرے قدموں کو ہاتھ لگانے کے ارادے سے آگے بڑھا تو میں نے اسے روک کر تنبیہ کی سے چاہت کی۔

”ایسی فضول رسموں سے پرہیز کی عادت ڈالیں جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔“

آنے والا جس نے بعد میں اپنا نام لوادش علی بتایا تھا ثقیف سا ہو کر میرے سامنے چاندنی پر بیٹھ گیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں بزرگ۔۔۔۔۔“ اس نے دوبارہ انکساری سے کہا۔ ”آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔“

”فرمانیں۔۔۔۔۔ آپ نے اس دقت میرے پاس آنے کی زحمت کیسے کی؟“

ایک کو یاد رکھنا بھی میرے لیے ممکن نہیں ہے البتہ کچھ معاملات ایسی خاص نوعیت کے ہوتے ہیں جو ذہن میں لکھ نہ سکیں اپنی جگہ بھی بتا دیتے ہیں۔ میں بطور خاص قادر مبین کے لیے بھی عرض کر دوں کہ میرے حجرے تک جو لوگ آتے ہیں ان میں ہر کوئی کھرا سکہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی انسان کی غفلت ہے کہ وہ خود کو ہمیشہ مظلوم سمجھتا ہے اور دوسرے فریق کو ظالم ظاہر کرنے کی خاطر قصور کا ایک علی درخ نشان کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کی اہم رویاں حاصل کرنے کی خاطر وہ کڑی بیعت کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا۔ جعلی اور دوسرے نمبر کے حامل ایسے لوگوں کی حمایت اگلے سترے سے کرنے کے لیے اس سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو ان کا گزراؤ بھی نہ ہو۔

نسبت کا حامل تو خدا کے سوا اور کسی کو نہیں معلوم ہوتا لیکن خدا کا کرم ہے۔۔۔۔۔ بزرگوں کی محبت اور حضرت خویہ کی جوتیوں کی طہنیں مجھے کشف اور مراقبے کے ذریعے ہر آنے والے کے حالات کا تھوڑا بہت علم ضرور ہو جاتا ہے۔ میں اس اصلیت کا اعتبار کر کے کسی سائل کو شرمندہ نہیں کرتا۔ اصل صورت حال کو ٹھیک بجا کر دیکھ لینے کے بعد ہی کوئی ایسا قدم اٹھاتا ہوں جو روز قیامت خدا کے حضور میری تکرار کا باعث نہ بنے۔ اس ممکنہ میں مجھے اور سلاطین جن کی حمایت بھی حاصل تھی جو حضرت خویہ کے اشد سے پراکٹر و بیشتر میرے کام آتا رہتا تھا۔ اسی نے مجھے اس اہم بات سے آگاہ بھی کیا تھا کہ حسد بی بی اور قدیم احمد کے درمیان دوسرے کسی کی ایک وجہ خود حسد بی بی کی زبان تھی۔

قدیم احمد کے بارے میں حسد بی بی نے جو تفصیل بتائی تھی اس کے مطابق وہ خاصہ دولت مند تھا چنانچہ اس کی خالہ نے حالات سے فائدہ اٹھاتے اور بی بی جی نور جمال کا مستقبل بنانے کی خاطر ایک طرف بی بی کو قدیم احمد سے گلے ملنے کا اشارہ کیا۔ دوسری طرف اس نے کسی تعویذ گنڈا کرنے والے سے رابطہ کر کے حسد بی بی اور قدیم احمد کے درمیان مستقل جدائی کے اوجھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے جس کو ہر چل نیک قدم نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی اس کا در مطلق کا کرم تھا جو حسد بی بی اور قدیم احمد کے درمیان جدائی کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ میں نے جو تعویذ حسد بی بی کو دیا تھا وہ بھی میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والی خلاء کو پُر کرنے اور قائم و دائم رکھنے کی خاطر دیا تھا۔

حسد بی بی کے جانے کے پھر بیاچار ماہ تک کوئی ایسی



"ایک کام الیہ گیا ہے بزرگو۔۔۔ ضرور ختم ہوں اس لیے راستہ تلاش کرتے ہوئے آپ کے مجھے تک بھی پہنچ گیا۔"

"مشکل پوری کرنا خداوند کریم کا اختیاری کام ہے۔۔۔ بندہ صرف دعا کر سکتا ہے۔"

میرا جواب سن کر اس نے ہلکا ہلکا پھر دلی آواز میں بولا۔

"میری ایک ہی بیٹی ہے بڑے صاحب، ہم نے اسے بڑے لڑ پیار سے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ اب خدا کے فضل سے اس کے ہاتھوں میں ہندی رہ جانے کا وقت بھی آ گیا ہے لیکن۔۔۔ ایک شکل درمیان میں آئے آ رہی ہے۔"

"کچھ مال پریشانی یا کوئی اور بات ہے؟"

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے بزرگو۔۔۔ اس کی ہاں نے تھوڑا تھوڑا اجڑ کر سارا سا ماہی بھی تیار کر رکھا ہے۔" نوازش علی نے رک رک کر دوبارہ بات شروع کی۔ "رشتہ بھی خاندان میں موجود ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرنے لگے تھے لیکن ایک کالی ملی راستہ کاٹ رہی ہے۔ آپ ایسا تعویذ عطا کر دیں کہ ساری رکاوٹیں درمیان سے ہٹ جائیں۔"

"کافی ملی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ہے ایک آفت کی پرکالہ جو ہماری مصوم بیٹی بھور ٹڑکے کے درمیان آنے کی خاطر مارے پتھر کر رہی ہے۔" نوازش علی نے بڑی عاجزی سے استدعا کی۔ "آپ کوئی تعویذ دیں یا ایسا عمل کر دیں کہ اس کا خانا درمیان سے نکل جائے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں نوازش علی۔" میں نے نہایت صاف گوئی سے کہا۔ "میں دونوں کے درمیان ہدائی ڈالنے کا عمل نہیں کرتا۔"

"ہدائی ڈالنے میں پہل تو دوسری لڑکی نے کی ہے بڑے صاحب۔ میں دو چار چٹکڑی پر اب بھی ہاتھ پھیلا کر آچکا ہوں۔ سب نے ایک ہی بات کہی ہے کہ دوسری لڑکی نے کوئی ایسا عمل کر لیا ہے کہ لڑکے کا دل میری بیٹی کی طرف سے اچاٹ ہو گیا۔"

"اگر دوسروں نے ایک بات کھل کر کہی ہے تو پھر تم ان ہی سے خیال عمل کا توڑ کیوں نہیں کراتے؟"

"لن کا مطالبہ پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔" نوازش علی نے اپنی ٹنگ دامن کی کاٹھن بڑے دل گرفتہ انداز میں کیا۔ آپ کے پاس یہ سن کر آیا ہوں کہ آپ نہ صرف خدا کے نیک بندے ہیں بلکہ فی کمل اللہ بھی ہم سب کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔"

نوازش علی کا لہجہ میرے دل پر اثر کر گیا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں میں نادانگی میں ناحق کسی حقدار کو اپنے در سے خانی ہاتھ نہیں بولتا ہوں میں نے مرا تپے میں جا کر اصلیت کی کھوج لگانی چاہی لیکن اس کے بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے مجھے مستحضر کر دیا۔ "آپ کے مرا تپے اور سخت کسی کام نہ آ سکیں گے بزرگو اس لیے کہ میں نے آپ کو اپنا دام اور کام کی نوعیت بتانے میں ایک دہائی برابر بھی راست گوئی سے کام نہیں لیا۔ صرف اس ناپاک مراد سے آئے ہیں کہ آپ کو اپنی کچھ چڑی باتوں سے حائر کر کے کوئی ایسا تعویذ حاصل کر لوں جو حسد لی بی کے لئے والے گھر کو جاڑ کر کھنڈر بنا دے۔ یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ اگر آپ نے میری مراد میں مانگ پھرانے کی کوشش کی تو پھر آپ کو بھی یہ سزا ملے گی۔"

میں نے حیرت سے نوازش علی کو آنکھیں کھول کر دیکھا تو مستحضر رہ گیا۔ وہ بدستور کسی صورت بتائے میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ایسا بگ کسی خیال سے میں نے نظر میں گھا کر ارسلان کی سمت نظر ڈالی تو وہ اپنا جگہ بگھا سکر رہا تھا۔ مجھے حیرت زدہ دہر کچھ کر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"محرت خولہ کی دور رس نگاہوں نے آپ کا انتخاب غلط نہیں کیا تھا۔ خدا کا کریم آپ کے شامل حال ہے لیکن بے عیب ذات خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہوتی۔ ہر شخص کو کمال بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اس عالم رنگ و بو میں سب کچھ مراب ہے۔ جو دامن بھا کر چلتے ہیں وہی کامیاب کہلاتے ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ایک ذرہ بھی دوسرے کے کام آ جاتا ہے۔ اس وقت مجھے آپ کے پاس آنے کا حکم بھی محرت خواہ نے دیا تھا تا کہ آپ کو بد وقت یہ بتا سکوں کہ آپ کے سامنے نوازش علی جو نیک کا لہر شاہ بنا بیٹھا ہے ایک نمبر کا جھوٹا فریاد اور غاباز ہے جو آپ کو اپنی کچھ چڑی باتوں سے غلط راستے پر ڈالنے کا منصوبہ بنا کر آیا ہے۔ میں نے اس وقت اس کی اصلیت کو بے غائب کرنے کی خاطر حق طور پر اس کے جسم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کی زبان سے اس کی اصلیت بھی اگھوا دی۔"

ارسلان کی بات سن کر میں مہر چھری لے کر رہ گیا۔ یہاں یہ بھی کارمچی کی معلومات کے لیے عرض کر دوں کہ اجنبی کے گروہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس نے خدا کے کسی محبوب بندے کو مقدس کتاب کی تلاوت کرتے سنا اور خدا پر ایمان لے آیا۔ اس گروہ کے جس کسی کے ہر خواہ گئی ہوتے۔ نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے اکثر شیطان کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ان سے ہر قسم کی خداحت کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ انجالی خطرناک اور دغا باز ہوتے ہیں۔ اپنے کسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یہ کسی نئی نو انسان کی جان لینے سے بھی نہیں بچتے۔

جنوں کے یہ دونوں اقسام اپنی صورت عمل اور وضع و قطع ہونے کی قدرت رکھتے ہیں۔ غیبت قسم کے جن زیادہ تر سیاہیلی کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ ان کو کاہل کرنا اور کس سال کو ان خدائشوں سے بچانا بھی بڑے جان جو کھوں کا کام ہوتا ہے۔ خود میں نے بھی اس قسم کا عمل کرنے والے اکثر عالموں کو دیکھا ہے۔ یہ چار ہوتے دیکھا ہے۔

بہر حال..... لو ازش ملی کی اصلیت معلوم ہو جانے کے بعد میں نے دل ہی دل میں دوبارہ آپ آکر ہی پڑھ کر خود اپنے اوپر دم کی مہرے کو دھار میں لیا پھر تو ازش ملی سے مخاطب ہوا۔

”ایک بات ذہن نشین کر لو کہ جو لوگ قلعہ بیانی کر کے کسی کو گمراہی کے راستے پر لانے کی حثایت کرتے ہیں ان کا انجام بھی بخیر نہیں ہوتا۔“

”میں اپنی ضرورت لے کر آپ کی پمکٹ پر حاضر ہوا ہوں تو پھر جوٹ کیوں بولوں گا بزرگو؟“ لو ازش ملی نے بدستور مصرمیت سے کہنا۔ ”اگر آپ کے اختیار میں بھی میری مشکل آسان کرنی نہیں ہے تو پھر کسی دوسرے رو کی تلاش کروں گا۔“

”تم اپنی جس بیٹی کے راستے کی دوری ختم کرنے کے مقصد سے آئے ہو اس کا نام کیا ہے؟“

”مجھے السوس ہے بزرگو۔ کسی خاص وجہ سے میں اس کا نام درمیان میں نہیں لانا چاہتا۔“ لو ازش ملی نے پھر ہاتھ جوڑ کر حاجتی سے درخواست کی۔ ”موصوم بچیوں کی عزت بھی کالج کی طرح ہوتی ہے۔ ایک بار ہال آ جائے تو پھر وہ بھی نہیں چاتا۔“

”تم للہ بھی نہیں کہہ رہے ہو۔“ میں نے اسے

دوسرے طریقے سے ٹھکرا دیا۔ ”اگر لڑکی کا نام بتانا مناسب نہیں سمجھتے تو اس لڑکے کا نام بتا دو جس لڑکے سے تم اسے چاہتا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر تم نے جسے کالی ملی کہا تھا اسی کا نام بتا دو۔۔۔۔۔ نام بتانے پھر کوئی بھی نہ تو کوئی عمل کر سکتا ہے نہ ہی توفیق مل سکتا ہے۔“

لو ازش ملی نے اس پر بھی فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک مایوسی کے اعزاز میں نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے نظریں باخاک کرکسماٹے ہوئے کہا۔

”بزرگو۔ اگر میں کالی ملی کے ماں باپ کا نام بتا دوں تو کیا کام نہیں بن سکتا؟“

”پارہی بتا دو۔“ میں نے ارسلان کا اشارہ پا کر اپنی آمیزگی کا اعتبار کیا تو لو ازش ملی نے اس پر بھی تندی سے چٹپٹا کر کہا۔

”میں اس کے باپ کا نام کبیر دین ہے۔ ماں کو علاتے کی ساری عمر غمی مغربی بی کے نام سے جانتی ہیں۔“

میں نے نظر کا راویہ بدل کر ارسلان کی طرف دیکھا تو اس نے ہنسنے لگا۔

”میرے محترم اگر آپ اجازت دیں تو میں اس غیبت کو گردن سے قدام کر باہر پھینک آؤں اس لیے کہ یہ نابکار جو نام بتا رہا ہے وہ حسنہ بی بی کے والدین کا ہے۔“

”گو یا خود اس کا تعلق پھر نور جمال سے ہوگا؟“ میں نے دل ہی دل میں ارسلان سے دریافت کیا۔

”میں نہیں۔ اس بدذلت کا تعلق اس کم ذات سے ہے جو لوگ ارسلان ہونے کے باوجود ڈگڈگی بھانے کا گھڑا کاروبار کر رہا ہے۔“ ارسلان کا چہرہ طیسے سے تھمتانے لگا۔

”اسی نے قدیم احمد اور حسنہ بی بی کے درمیان جہائی ڈالنے کی خاطر نور جمال کے والد سے ابھی خاصی رقم مانگی ہے۔“

ارسلان کی دہائی مجھے تصویر کے دوسرے رخ کے بارے میں ظلم ہوا تو میں بھی تھلا کر رہ گیا۔ حسنہ بی بی نے بتا تھا کہ نور جمال قدیم احمد کی خالہ کی بیٹی ہے۔ اسکی صورت میں محض ایک فریق اگر اپنی کسی لالچ کی غرض سے دوسرے فریق کے حق میں زہر کے پھل پھینکے تو اسے خود غرض ہی کہا جاسکتا تھا۔ میرے سامنے ایسی بیٹکڑوں میں نہیں پہلے بھی آچکی تھیں جہاں خونی رشتے بھی ایک دوسرے کے جانی دشمن بن کر مرنے یا مارا لے پڑا ہوا جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے عمل کی سزا بھی خاطر خواہ ہونی ضروری ہے۔

وہ فرد بھی قتل و سزا کا مستحق ہے جو کسی ایک طریق کو نہ صرف



ایسی شرمناک اور معیوب حرکت پر اکسائے بلکہ اس کی مدد کی خاطر خود بھی آمادہ ہو جائے۔

غضب پہلوؤں پر خود کرنے کے بعد میں نے بھی ایک امریکا کی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ میں نے جو تعویذ حسنہ بی بی کو دیئے تھے ان کے بارے میں کسی نہ کسی طور پر بحال کے والدین کو بھی علم ہو گیا اور اب شاید انہوں نے لاگڈگی بھانے والے سے رابطہ قائم کرنے کے بعد اسی کے طور پر پر نوازش ملی کی خدمات حاصل کی تھیں جو اس وقت کی صورت بنائے میرے سامنے موجود تھا۔

”آپ کس سوچ میں گم ہیں بزرگ؟“ نوازش ملی نے میرے چہرے کے بدلنے تاثرات سے کچھ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا مجھے آپ کے در سے بھی خالی ہاتھ ہی جانا پڑے گا؟“

”تم نے غلط اندازہ لگا دیا ہے۔“ میں نے اس بد بخت کو اسی کے حربے سے سزا دینے کا ارادہ کر کے بات بنائی۔ ”تم نے اپنی بیٹی کے سلسلے میں جو کچھ میری داستان سنائی ہے اس کے پیش نظر میں تمہیں کوئی ایسی آزمودہ اور موثر تعویذ دینے کے بارے میں غور کر دیا ہوں جس سے سائب بھی اپنے انجام کو پہنچے اور لاٹھی بھی سنا مت رہے۔“

میں بھی اس لگا کر تو آپ کے قدموں میں بیٹھا ہوں۔ آپ کے فضل میری بیٹی کا گھر آباد ہو جائے تو بگ بگ دعا میں دوں گا۔“

نوازش ملی خاصہ عجیب زبان تھا جس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا۔ چنانچہ اس کی چالچل میں نے حاشا کرنے کی بجائے اور ہوا دی۔ میں نے یہ سوچ کر ایک تعویذ لکھنا شروع کیا سب سے پہلے اسی بد بخت کو تعویذی بہت سزا دی جائے جو ارملاں کے بیان کے موجب مجس میں چنگاری لائی کرتا تھا دیکھنے کی خاطر درمیاں کر دار ادا کر دیا تھا۔ اسی بہانے اس لاگڈگی بھانے والے کو بھی یہ اندازہ ہو جاتا کہ میں خدمتِ خلق کے سلسلے میں ان ماطوں میں شہر نہیں کیا جاتا جو کسی معمولی خطرے کو ہی بھانپ کر وہ مہمان سے ہٹ جاتے ہیں۔

میں تعویذ رقم کرنے میں مصروف تھا جب میرے میں ملک و غیر کی وہ باتوں خوشبو بھیلنے لگی جو حضرت خواجہ کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ میں نے غم روک کر اسرارِ ماسر جھکا یا اور آنکھیں موند لیں۔ خوشبو آہستہ آہستہ بھیلنے لگی پھر حضرت خواجہ کی نغم اور مسعود کن آواز میرے کانوں میں برس

گھولنے لگی۔

”میاں ولایت حسین۔ تمہیں قدرت نے جس کام پر معبود کیا ہے اس پر قدم قدم پر تمہارا امتحان بھی مقصود ہے۔“

ایک حصولی سی نیکی کا ثواب بھی اس سے سات سو درجے ہے لیکن یہ خیال بھی پیش نظر رکھنا کہ اگر کبھی کوئی تعرض ہوگی تو پھر اس مالکِ کلوں مکان کی امداد سے عدالت ممکن آلود بھی ہو سکتی ہے۔ جو قدم بھی اٹھانا نہایت غور و خوض کے بعد اٹھانا ورنہ نیکی پر بارو گناہ لا ذمہ داری صورت بھی پیش آ سکتی ہے۔“

”میری آنکھیں بند تھیں لیکن سرمستی کے عالم میں بھوم رہا تھا۔ میری خوش بختی تھی جس نے خدا کے ایک برگزیدہ بندے کو مجھ پر مہربان کر دیا تھا جو پہلے بھی خاص خاص موقعوں پر میری رہنمائی کر چکے تھے۔ ان کی حمایت کر دے“ جبرک سفید انوں والی تسبیح ”ابھی تک میرے پاس محفوظ تھی۔ خدا کے اس ولی محبت اور مغرب بزرگ کی اس وقت آمد میرے لیے جیسا رہنمائی کا ایک ذریعہ تھی۔“

”میں کم لیب۔۔۔ آپ کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوں میرے محترم۔“ میں نے حسبِ مراتب اور مقامِ ادب کا خیال ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نہایت ادب سے کہا۔ ”مجھے اس وقت آپ کی رہنمائی کی ضرورت بھی درپیش ہے۔“

”تم نے کیا سوچا ہے؟“ بزرگ نے غلط انداز میں دریافت کیا۔

”میں اس وقت جو تعویذ رقم کر رہا ہوں اس کا مقصد نوازش ملی کو ایک ذرا جھکا دینا ہے جو محسوم لوگوں کے وہ مہمانِ خفاہ کے بیچ لو نے میں جٹا جٹا ہے۔“

”جو لوگ جوش میں ہوں سے بیکار ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔“

”بھگداز میں فیصلے کرنے سے گریز کی عادت ڈالو ولایت حسین۔۔۔ کسی مظلوم کی مدد کرنا خداوند کریم کے نزدیک یقیناً پسندیدہ عمل ہے مگر کسی کو ایذا پہنچانا بھی اسے پسند نہیں۔“ بزرگ نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ ”جو ناواقف اندیش اپنی شیطانی قوتوں سے وہ تعویذ

مسلم دنیا میں خصوصی توجہ حاصل کرنے والے شعبہ طب یعنی علم چشم اور امراض چشم پر لکھنے والے مصنفین میں جنسین ابن النخعی شایع پہلا مصنف تھا جس نے علم چشم پر مکمل تصاویر و اشکال کے ساتھ ایک باقاعدہ رسالہ تصنیف کیا۔ اس کی تصنیف میں بعد کے لکھنے والوں نے اضافے کیے۔ یہ آج بھی موجود ہے۔

840ء اور 860ء کے مابین لکھے جانے والے دس رسائل ہیں جنہیں اس کے شاگرد اور پیچھے پیش نے مکمل کیا۔ جنسین نے آنکھوں کی بیماریاں اور بصری اعصاب نیز آنکھ کی لطیفات امراض اور علاج پر بحث کی ہے۔ اگرچہ اس نے یونانی کتابوں سے بھی بہت کچھ نقل کیا ہے لیکن حدود نئے ذہنی مشاہدات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ الرازی نے جس کی تصانیف دوسری صدی سے نقل رکھتی ہیں غالباً سب سے پہلے حدیثی خطرہ کا تذکرہ و تشریح کی ہے۔

اسلام: ظاہرات اسکی سائنس بالذات علم طب وراثی

علم کے بغیر ایک قدم بھی اٹھاؤں۔"

نوازش علی میرا جواب سن کر اپنی کامیابی کے خواب دیکھنے لگا۔ میں نے جو تعویذ تحریر کرنا شروع کیا تو اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دوسرا پڑھ کر پھر اٹھا کر اس پر چار دھنوں پر تکی بند سے لکھے پھر درمیان میں الٹی سیدھی لکیروں کے جال بنائے گئے۔ اس قسم کے کچھ میں آنے والے تعویذ وہ عالی حاشے ہیں جو شیطان علی کا توڑ کرتے ہیں کچھ سیدھے رکھتے ہیں۔ کافہ پر لکیروں کے گول غول اور الٹے سیدھے جال بنا کر میں نے اسے بڑی احتیاط سے لپی تھام کر کے ایک ٹھکر تعویذ کی شکل دی پھر اسے سیاہ رنگ کا کورا کپڑا چھڑا کر زبرد و حاشے سے خوب اچھی طرح لپیٹا اور نوازش علی کی طرف بڑھاتے ہوئے ہوا۔

"اس تعویذ کو یہاں سے جانے کے دو دنوں کے اندر اندر قبرستان چاکر کسی پرانی قبر کے سر پرانے سیدھے ہاتھ کی جانب اس طرح دھاوا چاکر کسی اور کی طرف نہ چلے۔۔۔۔۔ لوگوں کو دکھانے کی خاطر ہاتھ اٹھا کر قاضی بھی بڑھ لیا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔" میں نے بے حد عجیبگی سے ٹھٹھکو چھری دہکی۔ "یہ ایک آزمودہ تعویذ ہے جو عام لوگوں کی کچھ بھی نہیں آتا لیکن اس کا نتیجہ چالیس دنوں کے اندر ہی سامنے آجاتا ہے۔۔۔۔۔ اگر کچھ دیر سویر ہو تو بھی اپنے احباب کو حیرت زدہ ہونے دیتا۔"

"آپ نے جیسا کہا ہے میں ویسے ہی کروں گا بزرگو! نوازش علی نے اٹھتے ہوئے پھر اکساری سے دروغ گوئی کی۔ "آپ کے حکم سے اگر میری بیٹی کے خصب جاگ گئے تو تمام زندگی آپ کو دے دوں گا۔"

نوازش علی کے جانے کے بعد بھی میں اس کی خواہش، حضرت خواجہ کی بروقت آمد کے بارے میں غور کرتا

پڑھ سکتا ہے جو تم نے حسد لی لی کو روکا تھا۔ وہ اس تعویذ کو بھی ضرور کھٹکا لے گا جو تم نوازش علی کے لیے تم کرنا چاہتے ہو جو قدم بھی اٹھانا بہت سوچ کچھ کرنا تھا۔ "خدا کے اس برگزیدہ بندے نے کچھ توقف سے کہا۔ "کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا جو دشمن کو انھیں میں جھکا کر دے۔ اس سے زیادہ میں تمہاری رہنمائی کا اختیار نہیں رکھتا۔"

حضرت خواجہ کا ہولناکیوں سے لوہا بھل ہو گیا تو میں نے نظریں کھول دیں۔ نوازش علی کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نہ جانے وہ بد بخت میری اس خاموشی اور مدہوشی کو کیا تصور کر رہا تھا۔ میں نے ارسلان کی طرف نظر پھیری تو وہ مجھے میں موجود نہیں تھا۔ حضرت خواجہ کے آخری جیلے میرے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر گونج رہے تھے۔

"بڑے صاحب۔۔۔۔۔" نوازش علی نے ایک بار پھر میری خاموشی کو محسوس کر کے دہلی زبان میں عرض کی۔ "اگر آپ کو کوئی مشکل پیش آ رہی ہو تو پھر میں اسے اپنی قسمت سمجھ کر لے لوں۔"

"تمہارا اندازہ غلط ہے نوازش علی۔" میں نے حضرت خواجہ کی آمد اور ان کی مخصوص رہنمائی کے پیش نظر نوازش علی کو پہلی بار بے حد اچانکیت سے مخاطب کیا۔ "میں بطور خاص تمہاری بیٹی کے مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ تم خوش نصیب ہو جو ایک انتہائی مناسب طریقہ میرے ذہن میں آگیا۔۔۔۔۔ میں نے جو تعویذ سوچا ہے وہ تمہارے اور صاحب معاملہ دونوں کے لیے حیرت انگیز طور پر سولہ آنے سود مند ثابت ہوگا۔ شرط یہ ہے کہ میں جو کہوں تم اس پر عمل بھی کرو۔"

"میری کیا کمال ہے بزرگو! میں آپ کی مرضی اور



رہا پھر دوسرے ضرورت مندوں کو گھرے میں بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

نوازش علی کے جانے کے دس بارہ روز بعد میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ مجھے یاد ہے کہ گزشتہ رات میں روزمرہ کے تمام معمولات کی ادا نگاہی کے بعد نہایت سکون کی فیر سو گیا تھا۔ صبح حسب معمول تھپہ کے نوافل، تلاوت کلام پاک اور پھر فجر کی نماز کے بعد دوبارہ سونے لیٹ گیا تھا۔ بعد ازاں نگر بیا تو بچے سکندر علی نے باہر سے آواز دی تو میں جاگ گیا۔ ہاتھ منہ دھو کر میں باہر آیا تو سکندر علی ناشائلا چکا تھا۔ ناشائستہ کے دوران میں ہی مجھے پہلے تو شدید چکر محسوس ہوئے پھر جی ملتانے لگا تو ناشائستہ پھوڑ کر واپس گھر آ گیا۔

"خیریت تو ہے یہاں جی۔" سکندر علی نے دریافت کیا۔ "آج آپ نے ناشائستگی ٹھیک سے نہیں کیا۔ نصیب دشمن آپ کی طبیعت تو سامان نہیں ہے؟"

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن بکھرت ہوں محسوس ہوا جیسے کوئی زخمہ کسی حلق کے نیچے اتر گئی ہو۔ پھر مجھے اٹنی ہوئی تو جو کچھ کھایا ہوا تھا وہ بھی نکل گیا۔ سکندر علی مجھے شاتوں سے ہلارے پشت سہلا تا رہا پھر ہانگ کر پانی لے آیا۔ میں نے کلی کی۔ حلق صاف کیا تو سکندر علی نے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں جی۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک کر پڑوسی کے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع کر دوں۔ وہ بھی آپ کے نام کی مالک ہے جتنے ہیں کوئی رواجیز کریں گے فوری آ رہا تھا جائے گا۔"

"یاد رہے انہیں زحمت نہ دے سکندر علی۔" میں نے سکندر کو بلانے کی خاطر کہا۔ "تو ہونا معمول کی بات ہے۔ اچھا ہے ہیپ صاف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد آرام بھی آ جائے گا۔"

سکندر خاموش ہو گیا۔ "لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ میری طبیعت پر اضمحلالی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا، خواہت بڑھنے لگی تو وراثت سے میں پڑے تخت پر لیٹ گیا۔ سکندر علی کے چہرے پر خطرناکی کیفیت بھی بڑھنے لگی۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر کو اطلاع کرنے کی تجویز پیش کی جسے میں نے جال دیا پھر روزانہ پے درپے ہوئی تو وہ لپک کر چلا گیا۔ والہاں آتا تو میرے پڑوسی العدال احمد کا بیٹا ابراہیم بھی ساتھ تھا۔

"کیسے ہو یہ خوردار۔" میں نے پوچھا۔ "تمہارے والد صاحبہ خیریت سے ہیں۔"

"لو پر والے کے کرم اور آپ کی دعا سے اب ٹھیک ہیں۔" ابراہیم نے کہا۔ "اس وقت آپ کو بچہ نے آیا تھا۔ فیصل آباد سے کسی حسد بی بی کا فون دوبارہ آچکا ہے۔ پھر وہ حسد بعد انہوں نے پھر کال کرنے کو کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بیٹے۔" میں نے کہا، "تم چلو میں سکندر علی کے ساتھ آتا ہوں۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے حسد بی بی کو صرف اپنا ڈاک کا پتہ لکھوایا تھا پھر اسے فون کا نمبر کہاں سے مل گیا؟ فون اس کے کہ میں اس شخص میں حریفانہ پرزور دیتا تھا سکندر علی نے نظریں جمکا کر اعتراض کیا۔

"میں محتاطی چاہتا ہوں یہاں جی۔۔۔ دراصل حسد بی بی نے جانتے وقت بڑی ہوشیاری سے درپخت کیا تھا کہ اگر اسے کوئی فوری ضرورت پیش آ جائے تو رابطہ کی کیا صورت... ہو سکتی ہے۔ میں نے تو اس کا کر اسے انضال احمد صاحب کا فون نمبر گھسوا دیا تھا۔"

"تم نے بڑا کیا سکندر علی۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے تاکید کی۔ "آئندہ مجھ سے اجازت لیے بغیر ایسی غلطی نہ کرو۔ تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو کہ صبح کے وقت ہر گھر میں روزمرہ کی ضروری ضرورت ہوتی ہیں۔ انضال صاحب پہلے آدنی ہیں جو انہوں نے اس وقت مجھے خبر کرادی ورنہ دوبارہ بھی حسد بی بی کو جال چکے ہیں۔"

سکندر علی نے دوبارہ بدامت کا اظہار کیا پھر مجھے سہارا دے کر انضال احمد کے گھر لے گیا۔ وہ پہنچے نہیں بیٹھک میں موجود تھے۔ میں نے نارت تکلیف کے لیے معذرت کی تو انہوں نے اکسیری سے بات سنہاتے ہوئے کہا۔ "پڑوسیوں کا تو ویسے بھی ایک دوسرے پر برا حق ہوتا ہے مگر... آپ تو اسے بھی ہیں اور ہم باں بھی ہیں۔"

ہمارے درمیان وہی گفتگو اور ہی جی کہ حسد بی بی کا فون آ گیا۔ انضال احمد نے کال ریسرو کی پھر ریسرو مجھے دے کر اندر چلے گئے۔ میں نے کال جی تو حسد بی بی نے بغیر کسی تہیہ کے بڑی اہلٹ میں کہا۔

"میں نے اس وقت آپ کو تکلیف دی تو اس کا سبب بھی تھا یہاں صاحب۔ کچھ ضروری باتوں سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں سن رہا ہوں بی بی۔۔۔" میں نے کہا۔ "کہا کوئی اہم بات تھی جس کا فوری تانا بڑھ ضروری تھا؟"

"ایسا نہ ہوتا تو آپ کو بھی پریشان نہ کرتی۔۔۔ سکندر

علی بھائی نے بھی تاکید کی تھی کہ کسی خاص سبب کے بغیر یہ سہرا استعمال نہ کرنا۔

”اب کیا خاص بات ہوگئی؟“ میں نے دریافت کیا۔

”سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ کا دیا ہوا تحویز میرے حق میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔ قادرے اب میرے حق میں بہت نرم چمکا ہے۔... خوشی کی اُمید کی ایک شعاع کی کرن بھی نظر آرہی ہے لیکن اس صورت حال کو دیکھ کر دشمنوں کی چھائی پر پھر سانپ لوٹنے لگے ہیں۔ خاص طور پر نور جمال کو جیسے پتے لگ گئے ہیں۔ اس کی ماں بھی اگلے توڑے کی طرح اندر ہی اندر سگ رہی ہے۔“

”تمہیں جو اُمید کی کرن نظر آرہی ہے لی بی وہ میرے تحویز کا نہیں بلکہ خداوند کریم کی نظر کرم کا اثر ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔ ”جو لوگ دوسروں کی خوشی پر نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی سکون سے نہیں رہتے۔ تم اس کی گھڑی کرنا۔ اپنے کام سے کام نہ کھو۔“

”میاں صاحب۔ میں جلتے والوں کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔“ حسہ بی بی نے قادرے سے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اس وقت آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ان جل گزری ماں جلیوں نے دل کے پھوڑنے کی خاطر مجھے بھی بات بات پر لعن طعن کرنی شروع کر دی ہے اور خاص طور پر کل نور بھائی کی ماں نے مجھ سے کل کر ایک بات براہ راست بڑے فحشہ میں کہی تھی کہ بی بی۔۔۔ تم جس کھوتے پر اچھل رہی ہو۔۔۔ ہمیں اس کا پتا بھی چل گیا ہے۔۔۔ ہم تم کو اور تمہارے ہوتوں سبوتوں کو بھی دیکھ لیں گے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔“

”ایک خاموشی سو بچا کوٹالشی ہے بی بی۔“ میں نے اسکا کر پوچھا۔ ”اس وقت تمہارے فون کرنے کا مقصد کیا تھا؟“

”میں آپ کو رب نواز کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔“ حسہ بی بی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ ”وہی جذبات ہے جو جو تک کی طرح میری خوشیوں سے چٹ کر رہ گیا ہے۔ سارے نہار کی جڑ بھی وہی ہے۔“

”تم سے اسے کیا پرخاش ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”ہمارے محلے میں رہا کرتا تھا حرام کالج۔“ حسہ بی بی نے حسب عادت غلط زبان استعمال کی۔ ”مجھ سے شادی کرنے کے خواب دیکھتا تھا اور مجھے شروع سے اس سے

نفرت تھی۔ قادرے سے شادی کے بعد میرا خیال تھا کہ وہ کہیں اور منہ کالا کر لے گا لیکن وہ سارے کی طرح میرے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں میاں صاحب۔ اور ایک ڈیڑھ سال سے اس نے نہ جانے کیسے نور جمال کے ہاتھ سے کہیں دور کا رشتہ جوڑ کر آنا جانا بھی شروع کر دیا ہے۔ قادرے بھی اسے پسند نہیں کرتا لیکن خالہ کی وجہ سے چپ ہو گیا۔“

”کیا قادرے کو علم ہے کہ رب نواز تم سے شادی کرنا چاہتا تھا؟“

”نہیں۔۔۔“ حسہ بی بی نے بڑے یقین سے کہا۔ ”میں بھی چپ رہی اس لیے کہ قادرے لمحے کا بڑا زہریلا ہے۔ اگر میں اسے بتا دوں کہ اس نے خالہ سے کیوں رشتہ جوڑا ہے تو قادرے گڈا سے اس کا قہر بنا کر پھیل کوں کو کھلا دے گا۔“

”میں سمجھا نہیں کہ رب نواز اب تم سے کیا چاہتا ہے؟“

”وہ اب بھی مجھے اپنانے کے خواب دیکھ رہا ہے اس لیے اس نے نور جمال کی ماں سے رشتے دہری لال لی ہے۔“ حسہ بی بی نے اس بار ذرا تفصیل سے بتایا۔ ”مجھے پہلے بھی شہ تھا کہ نور جمال اور قادرے کا پھر چلوانے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے لیکن دروازہ پہلے میں نے چسپ کر ان دونوں کی بات سنی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی نے نور جمال اور قادرے کی شادی کے سلسلے میں کسی مکر اطم کرنے والے سے قہقہے لاکر دیے ہیں جسے ایک ایک کر کے سلامت دن جلاتا ہے۔ خدا عاقبت کرے کم ذات کو۔۔۔ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میری خوشیاں پوری نہیں ہوں گی۔۔۔ جس نے قہقہے دیے ہیں اس نے یہ یقین بھی دلایا ہے کہ میری خوشیاں تین ماہ بعد عاقبت ہو جائیں گی جس کے بعد قادرے۔۔۔ خدا نہ کرے۔۔۔ مجھے چھوڑ دے گا لیکن۔۔۔ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے ہاتھوں سے قادرے کو جہنم رسید کر کے خود بھی بیلا تھو تھا کہ اگر جان پر کھیل جاؤں گی۔“

”خدا کی ذات سے نا اُمید نہ ہو بی بی۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وہ قادر مطلق رب نواز کو اس کی گندی جال میں کا سہا پ نہیں ہونے دے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے میاں صاحب لیکن رب نواز کا آپ بھی بڑا انگڑا کالج تھا۔ اس جہنم رسید نے بھی ایک عورت کو شادی کا جھانڈا دے کر اس کی عزت لوٹ



لی تھی۔ عورت نے بٹائی سے بچنے کی خاطر کمر میں چلا گیا کہ جان دے دی۔ بعد میں جب یہ داز نکلا کہ اس غریب کو بے آبرو کرنے والا لوازہ علی تھا تو اسے بھی مرقہ ہو گیا مگر جہاں وہ اڑ پڑاں رگڑ کر جہنم رسید بھی ہو گیا تھا۔

میں لوازہ علی کے حوالے پر چونکا۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ رب لوازہ نے اپنا نام بتانے کی بجائے مجھے اپنے مرحوم باپ کا نام بتایا تھا۔ ارسلان نے دغبر کے لوازہ علی کی حقیقت ضرور بے نقاب کر دی تھی کہ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اصل لوازہ کس قاش کا آدمی تھا۔ حضرت خولید کے برداشت آجانے کے بعد میں نے ان علی کے کہنے کے مطابق ڈگڈگی بجائے (گندھل کرنے) والے کو اندھیرے میں رکھنے کی خاطر ایسا قدم اٹھا یا تھا جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

”مساں صاحب.....“ حسہ بی بی نے اس بار دہری ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کی دعاؤں سے مجھے جدوروشی کی کرن نظر آئی ہے اس کو ہمیشہ قائم رکھنے کی خاطر میرے حق میں برابر دعا کرتے رہے گا اور..... کچھ لیا کر دیں کہ کسی طرح رب لوازہ کا میرے گھر آنا بھی ختم ہو جائے۔“

”کیا بھتری والے کی ذات پر بھروسہ رکھو حسہ بی بی۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”میں اسی کے بھروسے پر نہیں لیکن ولایت ہوں کہ رب لوازہ کا انجام بھی اس کے باپ سے مختلف نہیں ہوگا۔ جو لوگ دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں وہ خود اس میں منہ کیے مل گرتے ہیں۔“

میں حسہ بی بی کو تسلی دے کر گھر آیا تو ارسلان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اپنی طبیعت کے پیش نظر سکندر علی کو کچھ بولی اور سنا گو دانہ تیار کرنے کی ہدایت دی تو وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ارسلان سے دریافت کیا۔

”اس وقت کیسے صحت کی؟“

”میں معذرت خواہ ہوں میرے محترم کہ میں نے آپ کو رب لوازہ کے سلسلے میں صرف اس کی ذاتی حیثیت سے آگاہ کرنے کا فرض ادا کیا تھا ورنہ حسہ بی بی نے آپ کو اس کے باپ کے بارے میں جو بتایا ہے..... میں اس سے زیادہ بھی بہت کچھ جانتا ہوں مگر آپ کا بھی یہی کہنا ہے کہ خداوند کریم جب جوئی کو پسند نہیں کرتا۔“

”اگر تمہیں میری اور حسہ بی بی کی باتوں کا علم ہو گیا ہے تو اب تم رب لوازہ کے سلسلے میں کیا کہو گے؟“

”کل کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں خدا کے سوا اور کوئی کچھ نہیں جانتا۔“ ارسلان نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ ”جو لوگ مستقبل کا حال بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے..... رب لوازہ جس گندھل کرنے والے کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے وہ بھی اس بات سے عداوت ہو گا کہ آج اگر وہ دوسروں کو ڈگڈگی پر لپٹانے کی بجائے چوڑی باتیں کر رہا ہے تو ایک روز وہ خود بھی اوپر والے کی ڈگڈگی پر دیوانوں کی طرح تاجتیا نظر آئے گا۔“

”یہاں ایک نکتے کی بات اگر بنی تو م انسان سمجھ لے تو اس کے سارے دلدادہ دور ہو جائیں۔“ میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا پھر ارسلان سے دریافت کیا۔ ”حسہ بی بی کے سلسلے میں گندھل کرنے والا خباثتیں کر رہا ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟“

”پہلے کی بات اور تمہیں میرے عزیز۔ اس وقت اگر میں چاہتا تو اس بدکردار کے جسم میں طول ہو کر اسے دیکھتے نور میں بھی چلا گیا لگانے پر مجبور کر سکتا تھا مگر جب سے حضرت خولید کا دامن تھا ہے میں نے تمام شیطانی عمل سے توبہ کر لی ہے۔“ ارسلان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”حسہ بی بی ضرور بے قصور ہے لیکن قدرِ احمد بھی اگر نور جمال کو قریب آنے کا موقع نہ دیتا تو اس رسالت کی قربت ہی نہ آتی جواب درخشاں ہے۔“

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں پر خور و مرغ فی الوقت جو کر دادر رب لوازہ ادا کر رہا ہے اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”آپ حکم دیں تو میں اسے تھوڑی بہت مزادے سکتا ہوں جس سے وہ دلی طور پر خوفزدہ ہو جائے لیکن سارے نساد کی جڑ وہ ہے جس نے اب آپ کے لیے بھی قلیتے جانے شروع کر دیے ہیں۔“

”حضرت خولید کی دعاؤں سے وہ غلٹے بھی میرا ہاں بیک نہیں کر سکیں گے..... اس، اگر قدرت کو کچھ اور منظور ہے تو اسے بھی میں اپنے حق میں بھتری علی سمجھوں گا اس لیے کہ وہ جو بھی کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ کوئی بھلائی ضرور تصور ہوتی ہے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”کوشش کرو کہ کسی طرح رب لوازہ کا نور جمال کی اس سے ملنا جتنا ترک ہو جائے۔“ میں نے پہلو بدل کر

سجیدگی سے کہا: "رہا سنہ بی بی کے لیے خوشیوں کے جج  
بولنے کا سوا ہی تو اس کے لیے میں آج ہی سے ایک وظیفہ  
شروع کر دوں گا۔ اور والدے کی ذات ہمارے ہمارے ہے۔ امید  
ہے وہ اس نیک کام میں بھی میری مدد ضرور کرے گا۔"

سکھڑی کے والدین آنے سے ارسلان اور میرے  
درمیان گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جاتے جاتے ارسلان نے  
دلی زبان میں صرف اتنا کہا تھا کہ وہ اب نواز کو راہ راست  
پر لانے کی خاطر کوئی ایسا ہی سنی دے گا جو اسے ہمیشہ یاد  
رہے۔

اس رات سونے سے بستر میں نے بطور خاص سنہ  
بی بی کے لیے ایک آزمودہ تعویذ رقم کر کے محفوظ کر لیا۔ یہ  
تعویذ اس مقصد کے لیے تھا کہ سنہ بی بی کی خوشیاں ضائع  
نہ ہونے پائیں جب کہ وہ بول نہ لے اور قبول ارسلان کے کوئی  
ڈگڈگی نہ جانے والا اسی بات کے وہ بے تھا کہ سنہ بی بی کا  
کائنات کسی طرح درمیان سے نکال کر قہر یا احمد اور غور جمال کی  
شادی کر دے۔

انسان کی خلعت ہے کہ وہ اپنی کسی غرض کو پورا  
کرنے کی خاطر دوسرے کے لیے برا کرنے میں ذرا نہیں  
چھٹکتا۔ ہر ممکن طرح سے حریف کو زیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بھی  
نہیں سوچتا ہے کہ ایسا عمل خداوند کریم کے نزدیک ناقابل  
مقابل ہے۔ اسی کے برعکس اگر اس کا کوئی ذاتی کام بگاڑ  
جائے تو نہ صرف وہ دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہے بلکہ یہ  
بھی کہتا ہے کہ: "میں نے برا کرنے والے کو خدا کے  
حوالے کیا۔ اس نے چاہا تو جس نے میرے ساتھ برا کیا ہے  
روزی قیامت اس کا منہ کالا ہوگا اور دوزخ کا گندہ بنے گا۔"

جو لوگ سلی کا ناپاک اور جان لیوا عمل کرتے ہیں ان  
کا کوئی دھرم ایمان نہیں رہا، کسی کو اپنے گندے عمل سے  
موت سے ہٹانے کے بعد وہ اسی طرح خوشیاں  
سناتے ہیں جیسے انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو دوسرا کوئی  
نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بگڑے ہوئے طاقت نا اندیش لوگ سیاہ  
قلب ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سزا اور جزا کا حساب بھی  
اس لیے کوئی سنی نہیں رکھتا کہ یہ خود اپنے آپ کو حقو باہد  
بھگوان اور اس کا ادارہ سمجھتے ہیں۔

یہاں میں ہمارے نہیں کی معلومات کے لیے یہ بھی عرض  
کر دوں کہ ایک دو بار میں بھی خدا کے علم سے ایسے شیطان  
صفت لوگوں سے مدد و ہمت کر چکا ہوں لیکن میرے بزرگوں  
نے جن کی جوتوں کے نیل آج میں داسے، دے، دے، دے، دے

ضرورت مندوں کی خدمت کر رہا ہوں انہوں نے مجھے  
ہمیشہ یہی تاکید کی کہ حتی الامکان سلی کا عمل کرنے والوں  
سے بچ کر اپنے کی غلطی نہ کروں۔

بہر حال رات میں نے سنہ بی بی کی خاطر جو تعویذ  
رقم کیا تھا اسے فجر کی نماز کے فوراً بعد ایک پرانے قبرستان کی  
قدیم قبر کے پاس دفن کر دیا۔ یہ ایک آزمودہ تعویذ تھا اور  
مجھے اس قدر مصلحت کی دولت سے امید تھی کہ وہ کم از کم سنہ  
بی بی کی خوشیوں کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔

تعویذ دفن کرنے کے تقریباً دو ہفتے بعد تک مجھے سنہ  
بی بی کا نہ تو کوئی فون آیا نہ خط کے ذریعے کی صورت حال  
سے آگاہ کیا گیا بہر حال اس روز جمعرات کو عصر کی نماز کے  
بعد جب میں حجرے میں آیا تو سکندر علی نے میری اجازت  
حاصل کرنے کے بعد ضرورت مندوں کو حجرے میں بھیجنا  
شروع کر دیا۔ غالباً تیسرے یا چوتھے نمبر پر ایک پست قد  
مرد وہرے بدن کی عورت حجرے میں داخل ہوئی۔ مجھے  
اشتبہ سے سلام کر کے وہ چاندنی پر بیٹھ گئی۔ اس نے  
اپنے چہرے کو پوری طرح نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ  
کوئی قابل توجہ است نہیں تھی اس لیے کہ میرے پاس اپنی کسی  
ضرورت کی خاطر بیشتر خواتین ایسی ہوتی ہیں جو اپنے سر  
والوں یا خصوصاً شوہروں سے چھپ چھپ کر کسی مقصد کے  
لیے آتی ہیں لیکن وہ عورت بیٹھنے کے بعد بھی جس انداز  
میں مرد کو گھسار رہی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کسی نہ  
کسی بات سے خوفزدہ ضرور ہے۔

"خیریت تو ہے بی بی؟" میں نے کچھ دیر خاموشی  
کے بعد اسے از خود مخاطب کیا۔ "یہاں تک آئی ہو تو اس کا  
کوئی مقصد بھی ضرور ہوگا۔"

"مم..... میں آپ سے تجھے میں کچھ ضروری بات  
کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے رک رک کر کہا۔

"پریشان مت ہو..... جب تم یہاں موجود ہو تو کوئی  
دوسرا میری اجازت کے بغیر غل نہیں ہوگا۔"

میرا جواب سن کر عورت سنبھل کر بیٹھ گئی۔ حجرے سے  
نقاب بھی ہٹا دی۔ میں نے چکی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ  
لگایا جو پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اس نے جو  
ہاتھ سگھڑا کر رکھا تھا اس سے غالباً اس کا مقصد دوسروں کو  
متاثر کرنا ہوگا۔ مجھے ان فضولیات سے کوئی غرض نہیں تھی  
البتہ اس کی آنکھوں میں جو چمک مجھے نظر آئی وہ کسی نامکین  
سے مشابہت رکھتی تھی۔ میرے دل نے بھی یہی گواہی دی



کدو میرے حجرے تک اپنی کسی دلوں پر یاد ستانے کی بجائے  
اپنی ہنسی چڑی باتوں کے بحر میں جٹا کر کے میرے ہاتھوں  
کسی بے گناہ کو برہاد کرانے کے ہر اسے سے آئی ہے۔ لہذا  
میں قائل ہو گیا۔

میں نے خاتون کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی  
وہ کچھ غلط بھی ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ مجھے اپنا زانیہ  
دکھڑا سنا رہی تھی تو میں نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں  
کہا۔

”بی بی..... میرے پاس وقت کم ہے..... اگر تم براہ  
راست اپنے آنے کا مقصد محل کر بتاؤ تو زیادہ مناسب  
ہو گا۔“

”میاں صاحب..... میں نے ایک دو نہیں بلکہ اکثر  
بٹے بٹے داخلوں سے بھی سنا ہے کہ کوئی سائل آپ کے در  
سے خالی ہاتھ نہیں جاتا چنانچہ میں بھی بہت اس کا کراؤ  
ہوں۔“

خاتون نے جس انداز میں مجھے رام کرنے کی خاطر  
تعمید باندھی وہ بھی اس کی عیاری کی دلیل تھی۔ میں نے ہر  
گزرتے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”حاجت دروغی کرنا اس مالک دو جہاں کے اختیار  
میں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک سوکھا پتا بھی اپنا جگہ سے  
جھنک نہیں کرتا۔“

”جانتی ہوں میاں صاحب اور اسی مالک دو جہاں  
نے آپ کی دعاؤں کو تاثیر بھی عطا کی ہے ورنہ حاجت مند  
دور دور سے چل کر آپ کے پاس نہ آتے۔“

”تم کس مقصد سے آئی ہو بی بی؟“ میں نے اسے  
گزرتے وقت کا احساس دلا یا تو وہ ایک لمحہ خاموش رہی پھر  
دلہا زبان میں بولی۔

”میاں صاحب..... ایک لڑکی ہے جس نے ہم ماں  
بٹیوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں اس کے بارے میں  
اگر زبان کھول دوں تو وہ مشکوں میں در بدر ہو سکتی ہے۔ میرا  
بھتیجا جو کل تک ہمیں پکوں پر بیٹھا تھا وہ بھی اب ہم سے  
کٹرانے لگا ہے۔ ہم پر جو مصیبت لوٹی ہے وہ اسی دو کوڑی  
کی لڑکی کے سبب لوٹی ہے۔“

میں نے اس عورت کے بارے میں جو سوچا تھا وہ قلم  
نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد الزام ٹھہرا رہی  
تھی اس پر مجھے شہد تھا۔ میں نے اس کے انداز گفتگو کو جتنی  
طور پر در گزر کرتے ہوئے سوال کیا۔

”میں تمہاری کس طور پر در گزر سکتا ہوں؟“  
”آپ کچھ ایسا کر دیں میاں صاحب کہ اس خوشی کا  
کاٹاٹاری زندگی سے گلن جائے۔ میں آپ کو حسرت کی نہیں  
دیکھنے کو تیار ہوں۔“

”تم غلط جگہ آئی ہو بی بی۔“ میں نے تہجد بدل کر کہا۔  
”میاں ضرورت مندوں کو رقم کے ترانہ میں نہیں ٹولا جاتا۔  
سب کچھ فی سبیل اللہ ہوتا ہے۔“

”نور..... عورت کسسا کر بولی۔“ میں معافی  
چاہتی ہوں میاں صاحب۔“

”تم جو کاٹاؤ وہ میاں سے لگوانے آئی ہو۔ اس کا اور  
تمہارے بھائی کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟“

”میں اس معاملے میں اپنی زبان کھول کر منہ نہیں  
بنا چاہتی لیکن میرا اندازہ ہے کہ ان کے درمیان کچھ آگے ہٹا  
بھی ضرور ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک دونوں میں کچھ ان میں  
بھی تھی لیکن اس بار ایک ہی کمرے میں گھنٹوں بیٹھے نہ جانے  
کیا کانا بھونک کر رہے ہیں۔ کل کلاں کو اگر بتائی ہوئی  
تو دنیا ہم پر بھی تھوڑو کرے گی۔“ عورت نے گڑبڑا کر کہا۔

”آپ کے پاس عیاری درخواست لے کر آئی ہوں کہ اس سے  
پہلے کہ ہمارے منہ پر لوگ کا لگ تھوڑی آپ اس بد قماش  
کے لیے کوئی ایسا مل کر دیں کہ وہ کہیں اور چلی جائے۔ میں  
تلاش نہ کر کے آپ کا احسان فراموش نہیں کر دوں گی۔“

میرے دل میں اس عورت کی جانب سے  
شدید نفرت کا بیج جا بھرا۔ جس انداز میں وہ کسی لڑکی کو مورد  
الزام ٹھہرا رہی تھی اس سے بھی میں نے سبکی اندازہ لگایا کہ وہ  
انجانی مکار، جھوٹی اور دعا باز ہے۔ پہلا خیال میرے ذہن  
میں بھی آیا کہ اسے لگا سا جواب دے کر چلتا کر دوں لیکن  
اسی وقت ملک و حیر کی تیز خوشبو کا جھولکا میرے وجود کے گرد  
پھیلنے لگا پھر میری قوتِ سماعت میں حضرت خواجہ کی باتوں  
آواز سرسرا رہی ہوئی گونگی۔

”خداوند کریم جو کرتا ہے اس میں انسان کی کوئی نہ  
کوئی بھلائی ضرور مضمر ہوتی ہے۔ اچھا ہوا جو یہ عورت خود  
چل کر تمہارے حجرے تک آگئی۔ میں تمہیں مطلع کرنا چاہتا  
ہوں کہ سبکی بد بخت نور جمال کی ماں ہے جو حسد بی بی کو اس  
کے شوہر تقدیر احمد سے طلاق دلا کر اپنی بیٹی کا گھر آباد کرنے  
کے درپے ہے۔ ایسے بد کردار کسی رعایت کے مستحق نہیں  
ہوتے جو اپنی خوشی کی خاطر کسی کے آباد آشیانے پر بجلی  
کروٹنے کا خواب دیکھتے ہیں۔ انہیں جتنی بھی سزا دی جائے

کم ہے۔" میرے لیے کیا حکم ہے۔۔۔ میرے محرم۔" میں نے سرشاری کے عالم میں وہ بات کہی۔

"ایک بات اور ذہن نشین کرلو۔۔۔ اس عورت کا تعلق اس طاقتور خاندان سے ہے جو گندے عمل کر کے دوسروں کا گھر لچاڑتے ہیں۔۔۔ میرا اشارہ اس مردود کی جانب ہے جس کے بارے میں نور سلطان نے بھی تم کو یہی بتایا تھا کہ وہ اپنی ڈکٹ کی بجائے گھڑیوں کو گناہ گار کر رہا ہے۔ اس کی سرزنش بھی چشم نظر رکھنا۔ یہ عورت بھی اسی کے اشارے پر آئی ہے۔"

"آپ نے مجھے تو ہذا ہے تو میری مناسب رہبری بھی فرمادیں۔" میری نگاہیں عورت پر مرکوز تھیں لیکن دل و دماغ پر کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔

"کوئی ایسا تعویذ رقم کرو جو اس عورت ہی کے ہاتھوں سفل کا عمل کرنے والے کو بلا دیا جائے۔ اس کا ذہن پلٹ جانے کے بعد یہ عورت بھی خدا کے حکم سے حسد لیا لپی کے گھر سے دفع ہو جائے گی۔"

خوشبو کا وہ ہولناکتی جیزی سے آیا تھا اتنی ہی جیزی سے دور ہو گیا۔ میرے اوپر طاری ہوئی کیفیت دور ہوئی تو میں نے عورت کو دوبارہ تنگ لہجے میں مخاطب کیا۔

"تم جس کاٹنے کو درمیان سے نکالنا چاہتی ہو وہ نکل جائے گا۔۔۔ میں نے اس کے راز کو پالنا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں ہر انداز واری سے میری ہدایتوں پر عمل کرنا ہوگا۔"

"میں گلے گلے تیار ہوں میاں صاحب۔" عورت کی باچھیں کھل گئیں۔ "آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

میں نے عورت کو متاثر کرنے کی خاطر دوسٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنی ٹھوڑی سینے سے لگائی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے خدا کا استغیث کی باتیں معلوم کر رہا ہوں۔ دوبارہ آنکھ کھول کر میں نے عورت کو تدریجی نظروں سے گھور کر کہا۔

"تمہاری اور تمہاری بیٹی کی خوشیوں کے درمیان کوئی ایسا مردود ہے جو دعا پڑھ کر سے اپنا آلودہ صاف کر رہا ہے۔ تمہیں اس کا علاج بھی کرانا ہوگا۔"

"میں کبھی نہیں میاں صاحب کہ آپ کا اشارہ کس کی جانب ہے؟" اس عورت نے پھر سب کچھ کہتے ہوئے بھی انجانی بننے کی اداکاری کی تو میں نے ہنسنے لگا۔

"کن لکھون صرف اور صرف اس خداوند قدوس کے اختیار کی بات ہے جو دونوں جہانوں کا مالک ہے۔ ہم صرف کشف اور سراپے کے ذریعے اس کے اشاروں کو سمجھنے کے محتاج ہیں۔" میں نے پہلو بدلی کر عورت کو سرزنش کی۔ "تم میرے تجربے تک آگئی ہو تو پھر کھل کر بات کرو بی بی۔۔۔ لکھ بیانی کرو گی تو اس کا نقصان تمہیں نہیں کوئی ہوگا۔"

"مم۔۔۔ میں کبھی نہیں میاں صاحب کہ وہ کون دشمن ہے جو تمہارے ساتھ دعا پڑھ کر رہا ہے۔" عورت نے تدریسے ہم کر جواب دیا۔

"میں اس مردود کی بات کر رہا ہوں بی بی جو گندے عمل کرتا ہے۔" میں نے عورت کو جلالی نظروں سے گھورا۔ "کیا اس نے تمہیں میرے پاس آنے کا مشورہ نہیں دیا ہے۔" "مم۔۔۔ مم۔۔۔ میں سمجھ گئی میاں صاحب کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔" عورت نے میری نظروں سے مرعوب ہو کر کچھ اٹکی دیا۔

"ایک بات اور ذہن نشین کرلو۔۔۔ تم اس وقت میرے تجربے کے حصار میں ہو اس لیے اس بد بخت کی نظریں اور کان بھی یہاں کی سن گئی ہیں لے سکتے مگر۔۔۔ یہاں سے جانے کے بعد تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔۔۔ اگر اس ناچار کو تمہارے دل کا ہیرو معلوم ہو گیا تو پھر وہ تم کو اور تمہاری بیٹی کو بھی غارت کرنے سے باز نہیں آئے گا۔"

عورت کے چہرے کا رنگ بالکھت خوف سے زرد پڑ گیا۔ بڑی دقت سے گڑ گڑ کر بولی۔ "آپ نے اگر نساو کی جڑ نکالی ہے تو میری شکل بھی آسان کر دیں۔ میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کا وعدہ کرتی ہوں۔"

میں اسے حریف مرعوب کرنے کی خاطر غلام میں الجھا رہا پھر اسے مخاطب کیا۔ "ایک درنہائی آدمی نور بھی ہے۔۔۔ رب تبارک۔۔۔ مجھ سے نوادش ملی کے نام سے ملا تھا لیکن میں نے اس کی اصلیت بھی جان لی تھی۔۔۔ وہ بھی ہوا آدمی نہیں ہے۔"

عورت ہونٹ چبا کر چپ رہی تو میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"میں جس بد بخت کی بات کر رہا ہوں۔ رب تبارک اس کے کہنے سے ٹپتے بھی میری برہادی کے لیے جلاتا رہا ہے لیکن خدا کا کرم ہے کہ میں تمہارے سامنے زعمہ سلامت پیشا ہوں اور وہ۔۔۔ وہ بھی۔۔۔" میں نے دیدہ و دانستہ خاموشی اختیار کی عورت نے کسمسا کر اپنی غلظت کا اظہار کیا۔



"اس بدکردار کو بھی شاید آپ کی بددعا لگ گئی ہے۔۔۔ کھنیا پر پڑا موت کا اظہار کر رہا ہے۔"

"ایسا مت کہو بی بی۔۔۔ کسی کی موت کی دعا کرنا خداوند کریم کو پسند نہیں۔ زندگی اور موت اسی کے اختیار میں ہے لیکن جو کسی کا برا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے خطاب سے محفوظ نہیں رہتے بہر حال۔۔۔" میں نے خود سے توقف سے کہا۔ "میں نے جس بدکردار کا حوالہ دیا ہے کیا وہ تمہارے ہاتھ سے شربت یا دودھ کا گلاس پی لے گا؟"

میرا سولہاں سن کر موت کا سر عداوت سے جھک گیا تو مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی کہ ارسلان نے جس ڈگڈگی بجانے والے کا حوالہ دیا تھا اس کے اور عورت کے درمیان ذاتی میل جول بھی شرافت کی حدود پہلاٹک چکے تھے۔ میں نے اسے شرمندگی سے بچانے کی خاطر نتیجہ کی سے مطلب کی بات کی۔

"میں تمہیں ایک زعفرانی نقش دے رہا ہوں۔ کوشش کرنا کہ اسے پہلی فرصت میں کسی بھی پیٹھے شروپ میں پلا کر اس بدکردار کو چا دو۔ اس کے بعد خدا نے چاہا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا مگر۔۔۔ یہ خیال رہے کہ اسے تمہارے ارادے کی بجائے بھی نہ ملے ورنہ پانی پلٹ بھی سکتی ہے۔"

"آپ لکھ کر نہیں مہیاں صاحب۔" عورت نے سنبھل کر بڑے اصرار سے کہا۔ "میں کمر بچھتے ہی آپ کا تعویذ اسے گھول کر پلا دوں گی اور۔۔۔ آپ کی دعاؤں سے اگر میرا کام ہو گیا تو بڑے بڑی نیا بھی ضرور ہاتھوں کی۔"

"اس کے بھید ہی چاہتا ہے بی بی۔۔۔ قسمت میں جو لکھ دیا گیا وہی ملے گا۔"

میں نے حضرت خواجہ کے ارشاد کے مطابق رحمان کا ایک نقش تیار کر کے عورت کے حوالے کرتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "ایک بات اور یاد رکھنا۔۔۔ اب کسی ڈگڈگی بجانے والے کے پھر میں نہ پڑنا ورنہ بھی بھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بزرگوں کے اٹھائے ہوئے کسی ملا قدم کی سزا ان کے بچوں کو بھی چھیلی پڑتی ہے۔"

عورت جو نور جمال کی ماں کے سوا کوئی اور نہیں تھی مجھے دعا نہیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ میں نے دوبارہ ضرورت مندوں کو خبر سے میں بلا شروپ کر دیا۔

ایک ہفتے بعد میں حسب معمول خدمت خلق کے کام میں مصروف تھا جب میں نے ارسلان کو دیکھا جو ایک دیوار

سے لٹک لگائے بیٹھا بڑے سنی خیر انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "خیریت تو ہے بدکردار؟ اسنے دلوں سے کہاں قاصد تھے؟" میں نے تجلیہ ہوتے ہی اسے مخاطب کیا۔

"آپ کی بزرگی اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔" ارسلان نے درزالوں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کے حکم کے موجب میں نے رب نواز کی لسی گوشلی کر دی ہے کہ اب وہ کسی کے سامنے میں اثر ڈالنے کی بھی بھول۔۔۔ نہیں کرے گا۔ نیلی پھرتی والے نے اس مردود کو جس موڈ کی مرض میں مبتلا کر دیا ہے وہ آسانی سے اس بدوگ سے ہمتھرا نہیں پاسکے گا۔"

"اور کوئی نئی خبر۔۔۔؟" میں نے ارسلان کو ٹٹولا تو اس نے ہاتھ ہاندہ کر کہا۔

"حضرت خواجہ کے حکم پر میں نے خود کو ہمیشہ آپ کے قدموں کی وصول ہی سمجھا ہے میرے محترم۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ بزرگوں کی دعاؤں نے آپ کو نوازا رکھا ہے۔" ارسلان نے سنبھل کر جواب دیا۔ "آپ نے کیا عمل کیا؟" میں اس بات سے بدوائف ہوں لیکن جو مہتر اپنی نظروں سے دیکھ کر آئے ہوں اس نے دوسروں کو بھی انگشت بدشاں کر دیا ہے۔۔۔ کل تک جو بد بخت دوسروں کو اپنی ڈگڈگی پر بھلا کر رہا تھا آج وہ خود پاگوں کی طرح گلیوں اور بازاروں میں چلتا پھرتا رہا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اہم بات کا ذکر یہ بھی ہے کہ نور جمال کی ماں اپنی بیٹی کو لے کر بیٹل آباد سے اور کھنیا پل گئی ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد حسن بی بی اور تدریر احمد نے بھی سکون کا سانس لیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ نور جمال کی ماں بھی آپ سے ملی ہوئی اور اب جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ بھی یقیناً آپ کے کسی تعویذ ہی کا کرشمہ ہوگی۔"

"مجھے گنہگار نہ کرو بدکردار۔۔۔ ہوتا ہی ہے جو خدا کو مشکور ہو۔ تم نے بھی ایک بار یہی کہا تھا کہ آج جو بدعاقبت اندیش دوسروں کو اپنی ڈگڈگی پر بھلاتے ہیں۔ ایک دن وہ بھی اوپر والے کی ڈگڈگی پر پاگوں کی طرح اچھلتے پھرتے آتے ہیں۔ انسان اگر صرف اسی ایک نکتے کو سمجھ لے تو اس کے دل و دودھ ہو سکتے ہیں۔"

ارسلان کچھ دیر بعد چلا گیا تو میں نے اٹھ کر حسب عادت دو رکعت نماز شکرانہ پڑھا کی پھر کار خیر میں مصروف ہو گیا۔



# Ramadan Ka Maza (Shezan Mein Bhara



رمضان کا مہینہ



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریزیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب فورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)